

عبدالله

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PDFBOOKSFREE.PK

ہاشم ندیم

فہرست

- ۱۔ درگاہ (۱)..... ۹
- ۲۔ درگاہ (۲)..... ۱۶
- ۳۔ زہرا..... ۲۳
- ۴۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا..... ۳۰
- ۵۔ محبت سی ہو گئی ہے..... ۳۷
- ۶۔ نظر کی التجا..... ۴۴
- ۷۔ رقیب..... ۵۱
- ۸۔ پہلی کھوج کا خضر..... ۵۸
- ۹۔ دورِ جنوں..... ۶۶
- ۱۰۔ تعیناتی..... ۷۳
- ۱۱۔ عبداللہ..... ۸۰
- ۱۲۔ خضر راہ..... ۸۹

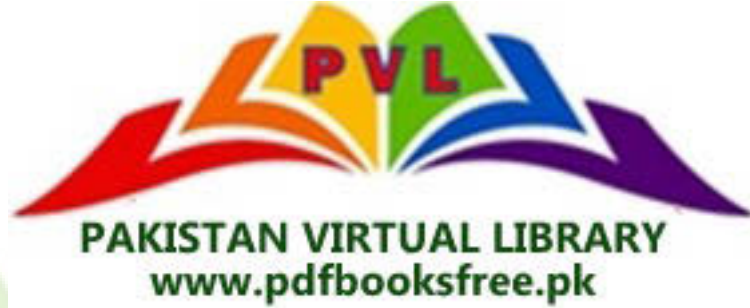
۳۰۵ تیسری رات	۳۳	۹۷ من کی لگن	۱۳
۳۱۶ معصوم قاتل	۳۴	۱۰۵ تربیت	۱۴
۳۲۶ پھر وہی محبت	۳۵	۱۱۴ پہلی جیت	۱۵
۳۳۶ پہلی رہائی	۳۶	۱۲۳ الوداع	۱۶
۳۴۸ دوسری منت	۳۷	۱۳۴ کالا پانی	۱۷
۳۵۷ خوابوں کا بیوپاری	۳۸	۱۴۲ آخری انتظار	۱۸
۳۶۷ خواب مرتے نہیں	۳۹	۱۵۱ آخری سجدہ	۱۹
			۱۶۱ عصا اور دیمک	۲۰
			۱۷۲ یاقوط	۲۱
			۱۸۳ آسیب محبت	۲۲
			۱۹۴ صلیب عشق	۲۳
			۲۰۵ ابھی کچھ دیر باقی ہے	۲۴
			۲۱۹ دامن اور چنگاری	۲۵
			۲۳۰ سود و زیاں	۲۶
			۲۳۹ درد اور مسیحا	۲۷
			۲۵۷ لاریب	۲۸
			۲۶۷ دوسرا مسیحا	۲۹
			۲۷۷ فاصلے ساتھ چلتے ہیں	۳۰
			۲۸۵ چھلاوہ	۳۱
			۲۹۴ ایمان فروش	۳۲

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش

درگاہ

(۱)

ساحل کی طرف جاتی ہوئی مرکزی شاہراہ، جو عام حالات میں کسی جوان بیوہ کی اُجڑی مانگ کی طرح بے رنگ اور سنسان پڑی رہتی تھی، اس وقت شہر کے امراء کی چند بگڑی ہوئی اولادوں کی خرمستیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ فضا میں اسپورٹس کاروں اور ہیوی بانکس کی چنگھاڑتی آوازوں نے ایک ہل چل اور طوفان سا برپا کیا ہوا تھا۔ معاملہ شہر سے ویران ساحل کی پٹی تک ریس کا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی یہ ریس ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے آگے صوبے کے ہوم سیکریٹری کے لاڈلے صاحب زادے وقار یعنی وکی کی مرسدیز اسپورٹس کار تھی۔ اس کے بعد ملک کے معروف صنعت کار بختیار احمد کی اکلوتی اولاد ساحر، یعنی میری منی، جیکو اتر تھی اور میرے پیچھے صوبائی وزیر مالیات کا بگڑا شہزادہ کاشف اپنی دوست ردا کے ساتھ ہیوی بانیک پر فرائے بھرتا، مختلف گاڑیوں کے درمیان لہراتا اور اپنا راستہ بناتے ہوئے صرف چند انچ کے فاصلے سے میری گاڑی کے ہمپ کو تقریباً چھوتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ باقی دوست اُس سے ذرا فاصلے پر تھے۔ لوگ ہمیں دُور ہی سے دیکھ کر سراسیمہ ہو کے ادھر ادھر اُچھل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ وکی نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہلکا سا چھو لیا۔ ٹھیلے والا ایک جانب کو کودا اور اُس کے ٹھیلے سے ناریل فضا میں یوں اُچھلے جیسے کسی شریر بچے نے ایک دم فضا میں بہت سے خاکستری غبارے چھوڑ دیئے ہوں۔ اُن میں سے ایک ناریل کسی گرینیڈ کی طرح میری کار کی ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور شیشے پر اگلے ہی لمحے مٹری کے جالے جیسی رگیں اُبھر آئیں۔ میری ساتھ گاڑی میں بیٹھی گورنر کی بھتیجی اور میری بہترین دوست عینی زور سے چلائی اور اُس کے منہ سے انگریزی گالیوں اور مغلظات کا ایک طوفان وکی کی شان میں اُٹل پڑا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے کاشف کی ایک سو پچاس کی اسپید سے دوڑتی ہوئی بانیک کا پہیہ ناریل کے اُوپر چڑھ گیا اور بانیک فضا میں یوں اُچھلی جیسے کسی توپ سے نکلا ہوا گولا..... لیکن کاشف نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بانیک کو زمین پر لگتے ہی ایک جانب کو جھکا کر اُلٹنے



سے بچالیا۔ البتہ اُس کے پیچھے آتے ہوئے دو موٹر سائیکل سوار خود کو بچا نہیں پائے۔ سڑک پر دُور تک اُن کی بانیکس کی پھسلنے کی آوازیں اور اسکرٹیکیں گونجتی رہیں۔ شاید ریس میں شامل ایک آدھ کار بھی پھسلی لیکن میں سڑک دیکھ نہیں پایا، کیونکہ اُس وقت میری ساری توجہ آگے سڑک پر دوڑتی وکی کی مرسیڈیز پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب ساحلی پٹی صرف چند کلومیٹر ہی دُور رہ گئی ہے، لہذا وہ اپنی گاڑی کو سڑک پر دونوں جانب لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ میری گاڑی کو آگے نکلنے کا کوئی راستہ نڈل سکے۔ کاشف گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ نکال نکال کر مجھے اشتعال دلانے کے لیے مختلف اشارے بھی کر رہا تھا اور اس عمل میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی، اُس کی ولایت پلٹ کزن ٹینا بھی برابر کا ساتھ دے رہی تھی، جو یعنی کو مزید مشتعل کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ آخری دس کلومیٹر کا بورڈ دیکھتے ہی یعنی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں ساحر..... اب ہم نہیں جیت سکتے..... فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم ہار گئے ساحر..... ڈیم اٹ یار.....“ میں نے عینی کو کوئی جواب نہیں دیا اور گیر بدل کر ایکسپلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ عینی بھی جانتی تھی کہ مجھے ہار سے کس قدر شدید نفرت تھی۔ میں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہم زندگی میں جیتنا سیکھیں، یا نہ سیکھیں، جیت ہمیں خود ہی سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں! البتہ ہار کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے کہ ہار آپ کو خود کچھ نہیں سکھاتی۔ لیکن میں خود فی الحال اس فن سے نا آشنا تھا۔ اور کم از کم آج تو میں کسی صورت ہارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مقابلے پر میرا زلی حریف وکی جو تھا۔

اس ریس کا آئیڈیال کل رات ہی ہمارے شیطان دماغوں میں اُس وقت آیا تھا جب ہم کلب کے نیلگوں دھوئیں بھرے ماحول میں اپنے اپنے ”بھرے“ ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ فضا میں دھوئیں اور بیڑکی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور دھواں کشید کرنے کے اس عمل میں ہم میں سے ہر ایک کا۔۔۔۔۔ جوڑا بھی پورے شد و مد سے شریک تھا۔ صرف عینی ہی اُن میں ایک ایسی لڑکی تھی جس کا دم اس مخصوص دھوئیں کی زیادتی سے گھٹنے لگا تھا اور تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے کلب روم سے باہر کھلی فضا میں کھینچ لائی تھی۔ ”اُف ساحر..... کیوں پیٹے ہو یہ زہر..... نفرت ہے مجھے اس دھوئیں سے۔“ لیکن کل رات عینی کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی وقار نے بحث چھیڑ دی تھی کہ اُس کے باپ نے گزشتہ ہفتے ہی اُسے جوئی

اسپورٹس مرسیڈیز لے کر دی ہے وہ اُسے ڈھائی سو کی رفتار سے دوڑاتا ہوا کالج آ سکتا ہے۔ کاشف نے چڑ کر اُسے ریس لگانے کا چیلنج دے دیا اور رفتہ رفتہ بحث نے اتنا طول پکڑا کہ ہم سب ہی نے اس ریس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے نتیجے میں آج ہم سب کی گاڑیاں اور بانیکس اس ساحلی سڑک پر آگ اُٹھتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔

ریس ختم ہونے والا پوائنٹ ساحل پر بنے ہوئے لکڑی کے ہٹس (Huts) کے عین سامنے جا کر ختم ہونے والی یہی کوئٹار کی سڑک تھی، جہاں پہلے ہی سے یونیورسٹی کا پورا ایک گروپ ہجوم کی شکل میں چیخ چلا کے اور نعرے لگا کر ہمارا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ انہی میں وہ دو لڑکے بھی موجود تھے جن کے ہاتھ میں سفید رومال تھے، جنہیں آخری جیت کی گواہی دینے کے لیے ہم نے بطور جج وہاں کھڑا کیا تھا۔ آخری پوائنٹ اب صرف دو کلومیٹر کی دُوری پر رہ گیا تھا اور ہماری اسپورٹس کاریں جس رفتار سے دوڑ رہی تھیں، اس حساب سے یہ دو کلومیٹر صرف دو لمحے کی دُوری پر تھے۔ وکی کسی صورت مجھے آگے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور مجھے بس ایک لمحے کی تلاش تھی اور پھر وہ لمحہ ایک اُونچے ریت کے نیلے کی صورت میں مجھے نظر آ ہی گیا۔ سڑک کے اختتام سے کچھ قدم پہلے سڑک کی بائیں جانب ریت کچھ اس طرح اکٹھی ہو گئی تھی کہ ایک اُونچا سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ میں نے گیر بدلا اور چلا کر عینی سے کہا۔ ”سیٹ بیلٹ اچھی طرح کس لو.....“ عینی نے شاید میری آنکھوں میں لپکتی چمک کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سرا سیمہ ہو کر چلائی ”نہیں ساحر..... پلیز..... فار گاڈ سیک ساحر۔“ لیکن عینی کی چیخ اُس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میری جیکو اور ریت کے ٹیلے پر یوں چڑھی جیسے کوئی گلائڈر اُونچی اڑان اڑنے سے پہلے کسی اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر بنی چٹان پر دوڑتا ہے اور اگلے ہی لمحے میری گاڑی بھی کسی شاہین کی طرح فضا میں تیرتی ہوئی اختتامی حد پر لگے ہوئے سرخ جھنڈے کو کراس کر گئی۔ فضا میں تیرتے ہوئے میری نظر نیچے دو فٹ پیچھے آتی مرسیڈیز میں بیٹھے وکی پر پڑی، جس نے جھنجھلاہٹ میں اپنا سر زور سے اسٹیرنگ پر دے مارا تھا۔ میری جیکو اور ایک زوردار آواز اور شدید جھٹکے کے ساتھ نیچے ریتلے ساحل سے ٹکرائی اور اس کے اگلے دونوں ٹائر زوردار دھماکے کے ساتھ برست ہو گئے۔ کار زور سے لہرائی لیکن اُس کے اُلٹنے سے پہلے ہی میں نے پوری قوت کے ساتھ ہینڈ بریک کھینچ لی۔ لیکن گاڑی کے بونٹ سے نکلنے ہوئے دھوئیں اور

نئے ماڈل کی یہ شہزادی تو اب ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔ میری تمام تر توجہ اُس شان دار گاڑی کی جانب مبذول ہو چکی تھی، جو اب ساحل کے کنارے موجود پہاڑی سلسلے کے اندر تراشی ہوئی سفید پتھر کی سیڑھیوں کے قریب آ کر رُک چکی تھی۔ گاڑی میں سے کچھ لوگ اتر کر ان سنگی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے جن کا اختتام پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی ایک درگاہ کے وسیع صحن میں جا کر ہوتا تھا۔ میں اس کار سے بہت دُور ایک دوسری پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں کار کی سواریوں اور اُن کے چلے پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔ بہر حال یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کہ اس جدید دور میں بھی ایسے اُونچے طبقے کے لوگ ایسی درگاہوں پر حاضری دینے کے لیے آتے تھے؟ ہم انسانوں نے خود کو تسلی دینے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراش رکھے ہیں..... اچانک میرے دل میں اُس گاڑی کو قریب سے دیکھنے کی شدید خواہش اُبھری۔ ویسے بھی میں یہاں بیٹھا بیٹھا اُسکاتے لگا تھا۔ میں نے چٹان سے نیچے ساحل کی جانب نظر دوڑائی تو سبھی کو مشغول پایا۔ کوئی باری کیو کی تیاری کر رہا تھا، تو کوئی اپنی گاڑی سے بڑے دیوقامت اسپرک اور میوزک سسٹم اُتار رہا تھا۔ یعنی نے دُور سے ہاتھ ہلا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جواباً اُسے اشارہ کیا کہ میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔ چٹان سے دوسری جانب اترنے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسری پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کار اب بھی وہیں کھڑی تھی اور ایک باوردی شو فر اُس کا بوٹ اٹھائے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ کہتے ہیں، سواری بھی انسان کی نفاست کو جانچنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس قول کی پرکھ اگر اُس گاڑی سے کی جاتی تو یقیناً اُس کا مالک انتہائی نفیس شخصیت کا مالک ہونا چاہیے تھا، کیونکہ گاڑی کو بڑے سلیقے سے سنبھالا گیا تھا۔ میں کچھ دیر دل چسپی سے گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ڈرائیور نے میری محویت نوٹ کر لی اور مسکرا کر بولا ”کیوں صاحب..... کیا دیکھ رہے ہیں..... گاڑی پسند آگئی ہے کیا؟“ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”گاڑیوں کا کوئی بھی شوقین پہلی ہی نظر میں اس گاڑی کا عاشق ہو سکتا ہے۔“ ڈرائیور میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا اور فخر سے بولا ”سچ کہا آپ نے..... دراصل ہمارے سیٹھ صاحب نے بھی ساری عمر میں یہی ایک شوق پالا ہے۔ بلکہ انہیں تو اعلیٰ سے اعلیٰ گاڑی رکھنے کا جنون ہے۔ اب اسی گاڑی کو دیکھ لیں۔ پچھلے مہینے ہی امریکا سے منگوائی ہے۔

گاڑی کے فریم کو دیکھ کر کوئی انارڈی مستری بھی یہ بتا سکتا تھا کہ اب یہ کار کم از کم میرے کسی کام کی نہیں رہ گئی۔ مجھے اپنی پسندیدہ گاڑی کے تباہ ہو جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میں نے ایک بار پھر وہی کوہرا دیا تھا۔ بینڈ بریک کھینچنے کی وجہ سے گاڑی نے گھومتے ہوئے ریت کا جو طوفان اٹھایا تھا وہ اب ختم چکا تھا..... یعنی، جس نے کار کے اڑان بھرتے ہی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا، نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور ایک تیز جھرجھری لے کر بولی ”تم بالکل پاگل ہو ساجر..... یو آر ٹوٹلی میڈ.....“ میں نے یعنی کی طرف ایک مسکراہٹ بھری نظر ڈالی اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سب دوستوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور سب ہی شور مچا رہے تھے۔ دُور کی کھڑا چلا رہا تھا کہ مقابلہ زمین پر گاڑی دوڑانے کا تھا نہ کہ فضا میں اڑانے کا۔ لیکن کوئی اُس کی بات نہیں سن رہا تھا اور سبھی اُس سے شرط ہارنے کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہم سب کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جہاں ایسی معمولی رقم روزانہ گھر کے نوکروں میں بانٹ دی جاتی تھی، لیکن اس رقم کی حیثیت سب سے الگ تھی، کیونکہ یہ میری جیت کی رقم تھی..... تبھی میں نے اس حقیر رقم کے لیے اپنی لاکھوں روپے کی نئی اسپورٹس گاڑی تباہ کر دی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنی ہر جیت کے لیے میں ساری زندگی روزانہ ایسی کئی گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں اُن سب کو لڑتا جھگڑتا چھوڑ کر ایک اُونچی چٹان پر بنے پتھر کے بچ پر جا کر بیٹھ گیا اور دُور سے آتی لہروں کو چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ میری شخصیت میں ایک عجیب تضاد بھی تھا کہ ہر جیت، فتح کے فوراً بعد میرے لیے اپنی اہمیت کھو دیتی تھی۔ سو، آج بھی یہی ہوا۔ ابھی چند لمحے پہلے میں نے جس جیت کے لیے اپنے ساتھ ساتھ اپنی عزیز از جان دوست یعنی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی، اب میرے لیے ماضی بن چکی تھی اور مجھے اس فتح کی ٹکرا کر سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے نیچے یعنی گروپ اور وہی کو لڑتے جھگڑتے دیکھا اور اُسکات کر سرگرمیت لگا لی۔ دفعۃً دھوئیں کے نیلے مرغولے کے درمیان سے ہوتی ہوئی میری نظر دُور سڑک پر دوڑتی ہوئی کالے رنگ کی بڑی سی شیور لیٹ کار پر پڑی۔ اچھی گاڑیاں بچپن سے میری کمزوری تھیں اور جو لوگ کاروں کے بارے میں تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ شیور لیٹ کو کاروں کی شہزادی کہا جاتا ہے، اور

میں، جس کی زیارت کے لیے اس گل رُخ کے کول قدم اتنی دُور تک اُٹھے تھے۔ دُور سے دیکھنے میں وہ درگاہ اتنی اُونچائی پر نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو پسینے سے شرابور اور ہانپ رہا تھا۔ وہاں خاصے زائرین موجود تھے، جو اپنے طور پر اپنی اپنی منتوں کی قبولیت کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر کر رہے تھے۔ کوئی پھولوں کی چادر چڑھا رہا تھا، تو کوئی لنگر خانے میں دلیکیں کھلائے بھوکوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ ایک جانب ایک حاجی صاحب دودھ میں زعفران اور روح افزاء گھولے اپنی سبیل چلا رہے تھے۔ ایک جانب چند افراد مورچھل لیے درگاہ کے اندرونی حصے کی صفائی کر رہے تھے۔ مجھے ایک لمحے کو یوں لگا کہ جیسے جس کا گناہ جتنا بڑا ہے وہ اُسی حساب سے کفارہ ادا کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کرنے سے ہم انسانوں کی منتیں پوری ہو جاتی ہوں گی.....؟ کفارے ادا ہو جاتے ہوں گے.....؟ میں اپنی سوچوں میں غلطاں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے ایک بھاری لیکن ملائم سی آواز اُبھری ”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں.....؟“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے میری ہی عمر کا ایک نوجوان ہاتھ میں تسبیح اور ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ سفید رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس اور چہرے پر کالی گھنی شرعی ڈاڑھی خوب بچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس تھی۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جی..... بہت شکریہ..... میں بس یونہی اس طرف چلا آیا تھا..... آپ کی تعریف.....؟“ ”تعریف کے لائق تو کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس..... ہاں البتہ تعارف کے لیے نام ’عبداللہ‘ ہے.....“

ہمارے صاحب کو جاپانی گاڑیاں بالکل بھی پسند نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ جاپان والوں نے گاڑیوں کو چھوٹا کر کے اُن کی توہین کی ہے۔“

ڈرائیور بات کرتے کرتے آہٹ پا کر اچانک مَوَدب سا ہو گیا اور جلدی سے بونٹ بند کر کے پچھلے دروازے کی جانب لپکا۔ میں نے چونک کر ڈرائیور کی نظر کے تعاقب میں اُوپر جاتی سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور چند لمحوں کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ اُوپر سے ایک اُدھڑ عورت کے ساتھ ایک پری رُخ ماہ جیسے دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اُس کی چال میں ایک ایسا وقار تھا گویا کوئی راج ہنسی پانی میں تیر رہی ہو۔ عورت اور لڑکی دونوں نے خود کو مناسب حد تک بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا اور اُس عشوہ طراز نے اپنے رُخ پر باریک نقاب کی تہ بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کا لہ نقاب نے اُس کے چہرے کا نور کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے پہلے حسن سے آشنا نہ تھا، لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسن اور معصومیت کو نئی تعریف اور نئے معنی دے جاتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی اور لاکھوں میں ایک تھا۔ ڈرائیور نے بھاگ کر دونوں پچھلے دروازے کھول دیئے تھے۔

لڑکی نے نظر اُٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور اک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی کے دروازے بند کیے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تبھی مجھے بھی جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے حواس میں واپس آ گیا، لیکن تب تک کار کا نئی دُور جا چکی تھی۔ مجھے خود پر شدید غصہ آیا۔ ایسی بھی کیا بے خودی؟ کم از کم مجھے گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود اپنی اس عجیب سی بے چینی اور کچھ کھودینے کی کسک کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ میں نے زور سے سر کو یوں جھٹکا جیسے خود کو ان بے حد اُداس اور ساکت جھیل جیسی آنکھوں کے سحر سے آزاد کروانے کی کوئی ناکام سی کوشش کی ہو۔

اچانک ہی میری نظر پہاڑی کی چوٹی پر پڑی اور میرے قدم خود بخود اُن پتھر پٹی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے، جن کا اختتام اُوپر بنی درگاہ پر ہوتا تھا۔ شاید میرے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش چمک اُٹھی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے اس پتھر کی بنی سفید اور سادہ سی عمارت

درگاہ

(۲)

میں نے عبداللہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اُس نے بات جاری رکھی۔ ”اسی درگاہ کا ایک مجاور ہوں..... خدمت کرتا ہوں یہاں آنے والے زائرین کی.....“ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا ”آپ اپنی گفتگو سے تو پڑھے لکھے لگتے ہیں..... پھر یہ سب کچھ.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔ وہ میری بات سن کر ہلکے سے مسکایا۔ ”شاید آپ بھی پڑھائی کا مقصد صرف کسی سرکاری نوکری کا حصول ہی سمجھتے ہیں۔ دیے میں نے بھی کچھ صفحے سیاہ تو کیے تھے لیکن یہاں آکر پتا چلا کہ اب تک صرف وقت ہی ضائع کرتا رہا..... بہر حال آپ بتائیے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟“ ”نہیں کچھ نہیں..... دراصل میرے دوست نیچے ساحل پر میری راہ تک رہے ہوں گے..... آپ سے مل کر اچھا لگا.....“ میں نے عبداللہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دبایا اور واپسی کے لیے پلٹا..... پیچھے سے عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ ”کوئی منت نہیں مانگیں گے آپ.....؟“ میں مسکرا کر پلٹا ”چلیں یہ وعدہ رہا..... جب کبھی کوئی منت مانگی ہوئی تو یہیں آپ کی اسی درگاہ میں آ کر مانگوں گا۔ اُمید ہے شنوائی ہوگی.....“ میری بات سن کر عبداللہ بھی مسکرا دیا ”مجھے انتظار رہے گا۔“ میں اُس کی جانب الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر سیڑھیاں اتر گیا۔ نیچے وہ بھی میرے لیے فکر مند ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب سے پہلے یعنی برس پڑی۔ ”ساحر..... یہ کیا مذاق ہے.....؟ تم جانتے ہو ہم سب یہاں تمہاری وجہ سے کس قدر ہلکان ہو رہے تھے..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کچھ ہمارا بھی خیال ہے تمہیں.....“ وہ روہانسی سی ہو کر چپ ہو گئی۔ میں نے اُن سب کے سامنے ہاتھ جوڑے ”معاف کر دو یار..... میرا ارادہ اتنی دیر لگانے کا نہیں تھا..... بس دیر ہو ہی گئی..... میں دوسری پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔“ میرے منہ سے ”درگاہ“ کا نام سنتے ہی وہ سب یوں اُچھلے جیسے میں نے اُن کے عین سامنے کوئی بم پھوڑ دیا ہو۔ ”درگاہ“.....؟..... ”ساحر تم.....؟“ ”خیریت تو ہے نا۔“ اُن سب

کی حیرت بجا تھی۔ ہم میں سے وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا، جس نے آج تک درگاہ تو کیا ”عید گاہ“ کی بھی کبھی زیارت کی ہو۔ ہم وہ تھے جن کے لیے لوگ منتیں مانگتے تھے، ہمیں بھلا ایسی جگہوں سے کیا واسطہ.....؟ ہم تو خود ایک ”منت“ کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ جنہیں بن مانگے ہی اس جہاں میں سب کچھ میسر تھا۔ پھر بھلا ہمیں کیا ضرورت تھی، ان درگاہوں اور مسجدوں میں ماتھا لیکنے کی.....؟ ہم سے تو ہمارا خدا ویسے ہی سدا کے لیے راضی تھا۔ میں نے جرمانے کے طور پر اسی رات سب ہی کو ہالڈے ان میں ڈنر کی دعوت دی، تب جا کر اُن لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن عینی ابھی تک رُوٹھی رُوٹھی سی تھی۔ وہ مجھ پر دوسروں سے کہیں زیادہ اپنا حق سمجھتی تھی اور اسی حق کا مان اُسے یوں رُوٹھنے پر مجبور بھی کرتا تھا۔ عینی کی یہ خاموشی واپسی پر بھی تمام راستے برقرار رہی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ حسب معمول آدھی رات کو مجھے فون کیے بنا اُسے نیند نہیں آئے گی، لیکن اس رات تھکن کی وجہ سے میں اس قدر گہری نیند میں تھا کہ نہ جانے کتنی گھنٹیوں کے بعد فون اُٹھایا۔ دوسری جانب سے عینی کی پریشان اور کسی قدر جھنجھلائی ہوئی آواز اُبھری ”اتنی دیر کیوں لگا دی فون اُٹھانے میں.....؟“ اُس کی جھنجھلاہٹ پر مجھے ہنسی آگئی۔ ”ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تم نے درجنوں لوگوں کی موجودگی میں یہ عہد کیا تھا کہ اب آئندہ تم مجھ سے کبھی بات نہیں کرو گی۔“ ”تم جانتے ہونا میں تم سے بات کیے بنا نہیں رہ پاؤں گی..... اسی لیے اتنا اُکڑتے ہو.....؟“ ”یار میری کیا مجال کہ میں گورنر صاحب کی اکلوتی بھتیجی کے سامنے ذرا سی بھی اُکڑ دکھانے کی جرأت کر سکوں.....؟ مجھے جیل جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ ”مذاق مت کرو ساحر..... میں بے حد سنجیدہ ہوں۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اچھا بولو..... کیا چاہتی ہو۔“ دوسری جانب سے عینی کی شرارت بھری آواز اُبھری ”تمہیں.....“ ”اچھا..... تو یہ تم سنجیدہ ہو.....؟“ ”عینی نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری ”یہی تو مسئلہ ہے..... تم نے کبھی میری محبت کو سیریس لیا ہی نہیں.....“ عینی پر ایسے دورے مہینے میں ایک آدھ بار ضرور پڑتے تھے اور لگتا تھا کہ آج کی رات پھر انہی راتوں میں سے ایک تھی جب ہماری زوردار بحث ہونے والی تھی، لیکن آج میں اُس سے بحث کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھا۔ ”اوہ کم آن عینی..... تم جانتی ہو کہ میں یہ محبت وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتا..... محبت صرف جسم کے حصول کی درخواست کا ایک مہذب ذریعہ ہے..... بس ایک لفظ ہے، اپنی

خواہشات پر پردہ ڈالنے کے لیے..... اور کچھ بھی نہیں.....“ وہ میری بات سن کر چپ سی ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”میں تو تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ تمہاری دل کی بنجر زمین پر یہ خود رو پودا اُگ جائے اور اس کے کانٹے تمہاری رُوح کو بھی اپنی کاٹ اور جھین سے زخمی کر دیں..... تمہارا قصور نہیں ہے ساحر..... شاید یہ میری آزاد خیالی ہی میرے جذبے کو بے وقعت کرنے کا باعث بنتی ہے..... سویت ڈریمز.....“ یعنی نے فون کاٹ دیا۔ میں حیرت سے فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اچانک..... آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس قدر ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ پھر میں نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید شام کی بیڑ نے اپنا اثر اس وقت دیر رات کو دکھانا شروع کیا ہو گا۔ میں نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں۔

اگلے چند دن تک میں ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں چونک سا جاتا تھا اور میری نظریں دُور تک اُس گاڑی کا پیچھا کرتی راتیں، لیکن مجھے وہ بڑی شیور لیٹ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ پتا نہیں، وہ اس شہر میں رہتے بھی تھے، یا پھر کہیں اور سے اس درگاہ کی حاضری کے لیے آئے تھے۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میری اس بے چینی کی اصل وجہ کیا تھی اور پھر سب سے پہلے کاشف نے میری یہ ”کاریا ترا“ محسوس کر لی اور چوتھے دن اُس نے مجھ سے آخر کار پوچھ ہی لیا ”کیا بات ہے یار..... یہ آج کل ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر تم اُس کے پیچھے ہی کیوں پڑ جاتے ہو.....؟“ میں نے اُس روز درگاہ پر ہونے والی تمام واردات اُسے تفصیل سے سنا دی ”اوہو..... تو یہ بات ہے..... اب سمجھا..... میرا بار دراصل گاڑی نہیں، بلکہ گاڑی والی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یار کسی کو تو بخش دیا کرو..... جو حلیہ تم نے اُس لڑکی کا ابھی ابھی بیان کیا ہے، اس سے ایک بات تو کنفرم ہے کہ شی از ناٹ یور ٹائپ“ ”اوہ شٹ اپ یار..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک تجسس ہے کہ آخر اس شہر میں ایسی کون سی فیملی ہے جو میری طرح گاڑیوں کا شوق رکھتی ہے، لیکن میں اُس سے واقف نہیں ہوں.....“ کاشف بولا ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس شہر سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں..... کہیں اور کسی دوسرے شہر سے وہاں آئے ہوں.....؟“ یہی تو اُلجھن ہے کہ یہ بات کیسے معلوم کی جائے کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے..... پتا نہیں کیوں..... لیکن میں اُس لڑکی کی اُداس آنکھوں میں جھپی داستان

پڑھنا چاہتا تھا..... لیکن افسوس پڑھ نہیں پایا.....“ کاشف کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتا رہا، پھر ایک دم اچانک کھڑا ہو گیا۔ ”چلو اٹھو.....“ ”کہاں.....“ ”آؤ اس آنکھوں کی کہانی کا راز جاننے کے لیے..... چلو اب دیر نہ کرو۔“ میں کاشف کی عادت سے واقف تھا۔ ایک بار جو بات اُس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی پھر اُسے نکالنا ہم میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد کاشف کی چروکی جیب تیزی سے اُسی سڑک پر رواں تھی جو اُسی ویران ساحل کی پٹی کی جانب جاتی تھی، جہاں وہ درگاہ واقع تھی۔

کاشف نے جیب بالکل سیڑھیوں کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا ”ہم یہاں کیوں آئے ہیں.....؟“ ”تمہیں وہ گاڑی یہیں نظر آئی تھی نا..... تو اگر ہمیں اس گاڑی کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ یہیں سے ملے گا..... چلو اُپر درگاہ میں چل کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میرے پاس کاشف کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے صحن تک جا پہنچے۔ باہر بیٹھے ایک مجاور نے ہمیں جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ جوتے اُتارتے ہوئے میں کچھ یاد کر کے چونک سا گیا۔ اُس روز بھڑکی وجہ سے شاید اس دروازے پر بیٹھے مجاور کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی تھی، لہذا میں جوتوں سمیت ہی درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھے تو ان آداب کا کچھ پتا ہی نہیں تھا، لیکن عبد اللہ کی نظر تو میرے جوتوں پر ضرور پڑی ہوگی۔ تو پھر آخر اُس نے مجھ سے جوتے اُتارنے کا کیوں نہیں کہا.....؟ میں اُسی سوچ میں گم کاشف کے پیچھے پیچھے درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ کاشف نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ”میں درگاہ کے متولی سے اُس گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو۔“ میں جانتا تھا کہ کاشف ایسے معاملات میں پیسے کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ضرور متولی کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے گا اور اُس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کاشف تیزی سے درگاہ کے پچھلے دروازے سے نکل کر کسی جانب غائب ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لی اور پیپل کے پیڑوں کے نیچے رکھے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک ہی پیڑوں کے پیچھے سے عبد اللہ آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا فورا تھا۔ شاید وہ پھولوں کو پانی دے کر واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظر بیک وقت ٹکرائی۔

ملاقات جلد ہوگی اور ہم دونوں تب ٹھیک طرح سے ایک دوسرے کو جان پائیں گے۔“ عبداللہ نے مسکرا کر مجھ سے جوابی مصافحہ کیا۔ ”جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سوتا ہے۔“ میں کاشف کی وجہ سے جلدی میں تھا، لہذا عبداللہ کی اس گہری بات پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ کاشف میرا فہم اس وقت اس قدر وسیع ہوتا اور عبداللہ کی اس پیش گوئی کو سمجھ پاتا کہ آئندہ میری زندگی میں کیسے کیسے طوفان برپا ہونے والے ہیں۔

جب میں درگاہ سے باہر نکلتا تب تک کاشف جیب میں سوار ہو چکا تھا۔ میری بیٹھتے ہی اُس نے ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔ ”کام بن گیا ہے۔“ میں نے پوری معلومات حاصل کر لی ہیں۔“ میں نے بے چین ہو کر کاشف سے وضاحت چاہی۔ ”زکوٰۃ..... بولتے رہو۔“ کاشف نے گاڑی ہائی وے پر ڈال کر ریس بڑھا دی۔ ”دراصل پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں ریس کے لیے آئے تھے، تب وہ جمعرات کا دن تھا۔ اسی لیے اُس دن یہاں جمعرات بہت زیادہ بھیڑ بھی نظر آئی۔ وہ گاڑی بھی یہاں ہر جمعرات کو آتی ہے۔ گاڑی کے مالکان کے بارے میں تو میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا، بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی جدی پشتی رئیس ہیں۔ جن دو عورتوں کو تم نے دیکھا تھا وہ ماں بیٹی ہیں۔ کبھی کبھار اُن کے ساتھ لڑکی کا باپ بھی چڑھاوا چڑھانے آ جاتا ہے۔ البتہ ماں بیٹی کا گزشتہ دو برسوں سے یہ پکا معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات کی شام یہاں آتی ہیں اور ہر ہفتے ہزاروں روپے کا چڑھاوا چڑھا کر واپس چلی جاتی ہیں۔“ ”تمہیں یہ سب کچھ کس سے پتا چلا..... میرا مطلب ہے کہ جمعرات کی شام آنے والے زائرین کی تعداد تو اچھی خاصی ہوتی ہوگی، پھر اُن کے درمیان ایک خاص خاندان کو یاد رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔“ کاشف زور سے ہنسا۔ ”آپ کی اسی معصومیت پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے جناب..... یار چاہے ہر جمعرات سیکڑوں لوگ درگاہ کی زیارت کو آتے ہوں، پر اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو ہر بار ہزاروں روپے کی نذر دیتا ہو..... اور پھر اُن کی گاڑی اور اُن کے رکھ رکھاؤ کو تو تم نے خود نوٹس کیا ہے..... ایسے لوگ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی ہوں تب بھی انہیں پہچانا جاسکتا ہے۔ اب اپنا زیادہ سرمت کھپاؤ..... صرف دو دن کی بات ہے..... اس جمعرات کو ہم خود یہاں درگاہ کے دروازے کے قریب ڈیرہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ صرف ایک بار کار کار رجسٹریشن نمبر پتا چل جائے، پھر اس خاندان کا کھوج لگانا میرے بائیں ہاتھ کا

عبداللہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ”ارے آپ.....؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ منت مانتے کا وقت اتنی جلدی آگیا.....؟“ میں ہنس دیا۔ ”نہیں..... ابھی وہ وقت نہیں آیا..... دراصل کاشف کی کھوج مجھے دوسری بار یہاں تک کھینچ لائی ہے۔“ عبداللہ نے غور سے میری جانب دیکھ کر ”میں دعا کروں گا کہ آپ کی کھوج تشنہ نہ رہے۔“ ”تھینک یو.....“ ویسے ایک بات کہوں، مگر بُری نہ لگے..... ہم دونوں ہی تقریباً ہم عمر ہیں اور یہ آپ جناب کے چکر میں پڑ کر ہم خواہ مخواہ ہی تکلف کے دھاگوں سے بندھے جا رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کریں تو میں بہت ایزی محسوس کروں گا.....“ عبداللہ مسکرایا۔ ”چلو ایسا ہی سہی..... لفظ اور القاب تو صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔“ ”ایک بات بتاؤ..... اُس دن پہلی مرتبہ جب میں اس درگاہ تک آیا تھا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے جوتے اُتارنا بھول گیا تھا، لیکن تم نے میرے جوتے دیکھ کر بھی مجھے اُتارنے کو نہیں کہا..... کیوں.....؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح اُن جانے ہی میں سہی، پر میں نے درگاہ کے فرش کی بے حرمتی کی تھی.....؟“ ”فرش تو پھر سے دھل سکتا ہے، سودھ لیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تمہیں تمہاری پہلی حاضری پر ہی ٹوک دوں۔“ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا مجاور ہے جو اپنی درگاہ کے فرش سے زیادہ دلوں کے میلے ہونے کو اہم گردانتا ہے.....؟ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ ”تم اپنے طور و اطوار سے کسی بھی طرح اس درگاہ کے مجاور نہیں لگتے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے.....؟“ عبداللہ کے چہرے پر اُس کی وہی ملیح سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”بس یوں سمجھا کہ مجھے بھی کسی کی کھوج یہاں تک کھینچ لائی ہے۔“ ”تو کیا تمہاری کھوج ابھی مکمل نہیں ہوئی.....؟“ ”میری کھوج تو شاید کبھی مکمل نہ ہو..... میں جس رستے کا مسافر ہوں، اس کی منزل آنے سے پہلے ہی زندگی کی شام ہو جاتی ہے۔ یہ درگاہ بھی صرف میرا ایک پڑاؤ ہی نہ ہے، جانے کب یہاں سے بھی کوچ کرنے کا پروانہ مل جائے.....“

میں حیرت سے عبداللہ کا یہ فلسفہ سنتا رہا۔ یہ میری اس نوجوان سے دوسری ملاقات تھی اور دونوں مرتبہ میں نے محسوس کیا تھا کہ عبداللہ وہ نہیں ہے، جو وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ اتنے میر کاشف درگاہ کے عقبی حصے سے نمودار ہوا اور اُس نے وہیں سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے عبداللہ سے رخصت چاہی۔ ”یہ ہماری دوسری لیکن تشنہ ملاقات تھی۔ اُمید ہے تیسری

کھیل ہے، جسٹ ویٹ میری جان.....“

اگلے دو دن میری زندگی کے شاید سب سے زیادہ بے چین شب و روز تھے۔ پر ”وقت کسی طور گزر رہی جاتا ہے“، سو یہ دو دن بھی کٹ ہی گئے اور جمعرات کی سہ پہر میں اور کاشف دونوں ہی اسی پہاڑی چٹان کی چوٹی پر بیٹھے اُس کار کا انتظار کر رہے تھے، جہاں سے پہلی مرتبہ میری نظر اُس گاڑی پر پڑی تھی۔ وقت بھی اُس کچھوے کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہا تھا، جو دور ساحل کے کنارے پانی میں اترنے کی کوشش میں سرگرداں تھا، لیکن ہر بار سمندر کی ایک بڑی لہر اُسے اٹھا کر پھر سے دُور ریتیلے ساحل پر پٹختی تھی۔ میں نے بھی جتنی مرتبہ اپڑ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، مجھے یہی لگا کہ میری گھڑی کی سوئیوں کو بھی وقت کی ایسی ہی کوڑا منہ زور لہر اٹھا کر بار بار پیچھے پٹختی دیتی ہے۔ شاید وہ میرا تیرھواں سگریٹ تھا، جب اچانک کاشف زور سے چلایا۔ ”وہ آگئی.....“ میں متوقع انتظار کے باوجود یوں زور سے چونک کر پلٹا، جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ دُور مل کھاتی سڑک پر وہی شیور لیٹ ریت اڑاتی دوڑی چلی آ رہی تھی۔

زہرا

ہمارے درگاہ کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے وقفے میں وہ دونوں ماں بیٹی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا چکی تھیں۔ کاشف نے جان بوجھ کر اپنی جیب شیور لیٹ کار کے بالکل قریب لا کر کھڑی کر دی تھی۔ کار کا وہ باوردی شوگر آج بھی اُسی طرح کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اُس کی جیب سے اُترتے ہوئے جب مجھ پر نظر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک جھلک لہرائی۔ جلدی سے سلام کر کے بولا ”ارے صاحب..... لگتا ہے آپ بھی ہماری بیگم صاحبہ کی طرح ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں۔“ ”نہیں..... ہماری تو یہ دوسری ہی جمعرات ہے..... دراصل میرے دوست کو اس درگاہ کی زیارت کا بہت ارمان تھا۔ سو، اس ہفتے اُسے یہاں لے کر آیا ہوں۔“ کاشف میرا اشارہ سمجھ گیا اور گاڑی کے گرد گھوم پھر کر ڈرائیور سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ڈرائیور نے چونکہ آج ہمیں خود ایک بے حد قیمتی گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا اس لیے اُس کے روپے میں مرغوبیت کی ایک واضح جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں کاشف کو ڈرائیور سے معلومات لیتا چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں جا پہنچا۔ آج میں جوتے اتارنا نہیں بھولا تھا۔ صحن میں پچھلی جمعرات کی طرح لوگوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا اور بے حد بھیڑ تھی۔ مجھے عبد اللہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اُس ماہ رُخ کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ دونوں ماں بیٹی مجھے درگاہ کی مرکزی عمارت کے برآمدے میں بنی پتھر کی جالی کے قریب بیٹھی ہوئی دکھائی دیں اور پھر میرے ساتھ وہی ہوا جو پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ یکایک آس پاس کی ساری بھیڑ، سب لوگوں کا جھوم اور اُن کا کبھی شور یک دم موقوف سا ہو گیا۔ فضا جیسے ساکت سی ہو گئی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے اس وسیع و عریض سنگ مرمر کے دُھلے صحن میں صرف میں اور وہ ہی موجود ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تنہائی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، حتیٰ کہ آس پاس چلتی ہوئی پروائی بھی گونگی سی ہو کر صرف جسموں کو چھو کر گزر رہی ہے۔ اچانک کوئی سوالی مجھ سے زور سے نکرایا اور ایک جھٹکے سے

ایک دم حواس باختہ ہو کر یوں باہر کی جانب لپکا جیسے کوئی مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھین کر لے بھاگا ہو۔ لیکن جب تک میں زائرین کی بھیڑ سے الجھتا، راستہ بناتا ہوا باہر سیڑھیوں تک پہنچا وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ ڈرائیور نے کاشف سے ہاتھ ملایا اور میں نے ڈور ہی سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملے۔ اس وقت مجھے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔ قدرت نے آج خود مجھے اتنا بہترین موقع دیا تھا، میں کم از کم اُس کی ماں کی دعا کا جواب تو دے سکتا تھا، اُن لوگوں کی سیڑھیوں سے اُترنے میں مدد تو کر سکتا تھا، لیکن میں تو بس کسی معذور انسان کی طرح کھڑا ہی رہ گیا۔ بوھل دل کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُتر اتو کاشف میری جانب لپکا ”کیوں شہزادے..... کچھ بات بنی۔“ میں نے کاشف کو اپنی بے بسی کا احوال سنایا تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ ”کیا ہو گیا ہے یار.....؟ اتنا بہترین موقع ضائع کر دیا..... آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے.....؟“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اگر مسئلہ ہی سمجھ میں آ جاتا تو پھر رونا کس بات کا تھا.....؟“ کاشف نے اپنا سر جھٹکا۔ ”بہر حال..... میں نے ڈرائیور سے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ گاڑی کے مالک کا نام حاجی مقبول احمد ہے۔ ملک کے بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ آباد اجداد یوپی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اُدھیڑ عورت اُن کی بیوی اور لڑکی اُن کی بیٹی ہے۔ ایک معتدل اسلامی گھرانہ ہے اور حاجی صاحب خود بھی درگاہوں اور زیارتوں پر چڑھاوے چڑھانے جاتے رہتے ہیں۔ بھارت میں حاجی علی کی درگاہ کا سالانہ عرس وہ کبھی مس نہیں کرتے۔ اُن کی بیٹی پڑھی لکھی ہے اور حال ہی میں اُس نے یونیورسٹی سے اپنا ماسٹرز مکمل کیا ہے۔ وہ پہلے کبھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ان زیارتوں اور درگاہوں پر نہیں جاتی تھی، لیکن بقول ڈرائیور پتا نہیں، اُس کی بی بی جی کو گزشتہ دو سال سے کیا ہو گیا ہے کہ ہر جمعرات کو اس درگاہ کا پھیرا انہوں نے خود پر لازم کر لیا ہے اور ہاں..... لڑکی ماں باپ کی اکھوتی اولاد ہے.....“

میں نے ستائشی نظروں سے کاشف کو داد دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرائیور سے زیادہ تر باتیں اُگلو لے گا، لیکن اُس نے میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور وہ بھی اتنے کم وقت میں۔ ”تمہاری اس اعلیٰ کوشش پر میں تمہیں انعام کا حق دار ٹھہراتا ہوں۔“ کاشف نے سعادت مندی سے سر جھٹکایا۔ ”آپ کی ذرہ نوازی ہے عالی جاہ..... لیکن غلام کی

میرے حواس واپس آ گئے۔ میں وہیں صحن میں کھڑا تھا۔ جانے دو پل گزرے تھے، یاد دو صدیاں.....؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی اب بھی اسی جذب کے عالم میں دوزانوں بیٹھی جالی کی طرف منہ کیے، گڑگڑاتے ہوئے کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ میں سحرزدہ سا اُسے دیکھتا رہا..... کالی چادر نے اُس کا دمکتا نور اور بھی واضح کر دیا تھا۔ اور اگر میں شاعر ہوتا تو شاید، اسی لمحے اُس کے ہاتھوں کی گلابی مخروطی انگلیوں اور لرزتی پلکوں پر پورا دیوان لکھ ڈالتا۔ رفتہ رفتہ لڑکی کا جسم ہچکیوں سے باقاعدہ لرزنے لگا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اُس کی ماں نے گھبرا کر اُسے تھاما۔ آج اُن کے ساتھ شاید اُن کی کوئی خادمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں نے سراسیمگی کے عالم میں اُسے پانی کی بوتل دینے کا کہا۔ خادمہ ہڑبواتی ہوئی سی اُٹھ کر باہر کی جانب بھاگی، شاید وہ گاڑی سے پانی لینے کے لیے گئی تھی۔ کبھی کبھی لمحے کے کسی ہزارویں حصے میں انسان کا دماغ اُسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کچھ ایسا ہی اُس وقت میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے قدم خود ہی یک بیک صحن میں درختوں کے نیچے پڑے پانی کے گھروں کی جانب بڑھ گئے اور میں کسی سحرزدہ روح کی طرح پانی کا گلاس لیے اُس لڑکی کی ماں کے پاس جا پہنچا۔ ماں نے جلدی سے بنا دیکھے گلاس پکڑ کر بیٹی کے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر اُس پری کی حالت کچھ سنبھلی لیکن اُس کا رنگ اب بھی سرسوں کے کسی تازہ پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ ماں نے گلاس واپس کرتے ہوئے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا ”شکریہ بیٹا.....“

میں گلاس لیے چند قدم دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان چند لمحوں میں نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے میرے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہیں۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے زبان اور لفظوں کی اہمیت اور قوت گویائی سے محروم بد نصیبوں کی بے بسی کا بہت شدت سے اندازہ ہوا۔ اتنے میں اُن کی خادمہ بھی دوڑے ہوئے ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے واپس پہنچ چکی تھی۔ ماں نے چند گھونٹ پانی بوتل سے بھی لڑکی کو پلائے، خادمہ کی مدد سے لڑکی کو کھڑا کیا اور واپسی کے لیے چل پڑیں۔ ماں نے جاتے جاتے ایک بار پھر میری جانب محبت بھری نگاہ ڈالی اور زیر لب شاید کوئی دعا بھی دی، لیکن میں یونہی بنا پلکیں جھپکائے ساکت کھڑا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں درگاہ کا صحن پار کر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل چکی تھیں۔ میں

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس مخبری کا آخری حصہ سن کر آپ یقیناً اپنی پوری سلطنت میرے حوالے کر دیں گے..... میں نے لڑکی کا نام بھی ڈرائیور کی زبان سے اُگلا لیا ہے.....“ کاشف نے مجھے تنگ کرنے کے لیے ایک لمبا وقفہ لیا۔ میں دم بخود کھڑا اُس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ ہی دیر میں اُس لڑکی کا نام نہیں، بلکہ مجھے میری زندگی، یا موت میں سے کسی ایک پروانے کی تحریر پڑھ کر سنانے والا ہو۔ شاید میری پوری زندگی میں، میری تمام سماعتوں نے مل کر بھی کبھی کسی ایک لفظ کو سننے کی اتنی شدید تمنا نہیں کی ہوگی، جتنی اس ایک لمحے میں مجھے کاشف کی زبان سے وہ نام سننے کی آرزو تھی..... ”زہرا..... زہرا نام ہے اُس لڑکی کا.....“ میں نے دھیرے سے زیر لب دہرایا..... ”زہرا.....“ اس ماہ کامل کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دن ہی میں بہت سے چاند اکٹھے نکل آئے ہوں۔ کاشف غور سے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر جیب کا دروازہ کھولا۔ ”اگر میں گزشتہ پانچ برسوں میں اُن پچاسوں لڑکیوں کے نام اور پتے نہ جانتا ہوتا، جو تمہاری زندگی میں ہفتے، دس دن، یا مہینے کے لیے آکر جا چکی ہیں، تو اس وقت تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یہ یقین کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ تم اُس لڑکی کے شدید عشق میں مبتلا ہو چکے ہو۔ لیکن تمہارے گزشتہ ریکارڈ کی وجہ سے میں تمہیں فی الحال اس الزام سے بری قرار دیتا ہوں۔“ میں نے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جب تک ہم ساحل سے واپس شہر پہنچے تب تک شام ڈھل چکی تھی اور شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔

لیکن اُس دن کے بعد میرے اندر کی تمام روشنی جیسے دھیرے دھیرے گھٹنے لگی۔ رات تک مجھے تیز بخار نے آگھیرا۔ ماما اور پاپا دونوں ہی کسی کانفرنس کے سلسلے میں جینوا گئے ہوئے تھے۔ اُن کی واپسی اگلی شام تک متوقع تھی، لیکن میں اُن کی آمد سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ ماما تو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی بالکل بوکھلا سی گئیں۔ چند لمحوں ہی میں ہمارے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر یزدانی اپنے تمام ”لوازمات“ سمیت میری خواب گاہ میں موجود تھے۔ میں نے پاپا سے احتجاج کیا ”دیکھیں نانا پاپا..... یزدانی انکل پھر سے اپنی پوری لیبارٹری اٹھالائے ہیں۔“ ڈاکٹر یزدانی زور سے ہنسے۔ پاپا نے مسکرا کر کہا ”کیا کریں یار..... ان کے تیس سالہ کیریئر میں صرف ہم نے انہیں اپنا فیملی ڈاکٹر ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اب ان کے تجربے تو بھگتنا ہی

پڑیں گے۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا.....“ ممانے ہم دونوں کو غصے سے گھورا اور پاپا کو ٹوکا ”توصیف آپ بھی نا..... بچے کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔ اسے شدید بخار ہے۔ یہ بات مذاق میں ٹالنے والی نہیں ہے..... ڈاکٹر یزدانی آپ پر پُر چیک اپ کریں ساحر کا.....“ ماما کا موڈ دیکھ کر پاپا نے مجھے منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اُن کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ انتہائی غیر معمولی دباؤ میں بھی اُن کا رویہ انتہائی نارمل رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک والد سے کہیں زیادہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ ڈاکٹر یزدانی نے بہت تفصیل سے میرے بخار کی تمام علامات نوٹ کیں اور چند ٹیسٹ کروانے کی تاکید کی۔ لیکن ان تمام ٹیسٹوں کا نتیجہ اُن کے لیے مزید حیران کن تھا کیونکہ میرا ہر تجربہ معمول کے مطابق تھا۔ تو پھر یہ شدید بخار میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ماما پاپا کے پیچھے پڑ گئیں کہ مجھے فوراً باہر کے کسی بڑے ہسپتال میں مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے بھجوا دیا جائے۔ وہ تو خود بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر یزدانی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ماما کو سمجھائیں کہ اب ہمارے ملک ہی میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے، اور پھر یہ تو صرف ایک معمولی بخار تھا۔ لیکن میں ماما کی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اگر مزید کچھ دن میرا بخار نہ اُترتا تو پھر انہیں روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے بخار کو پانچواں روز تھا کہ اچانک ہی یعنی ساری چنڈال چوٹڑی کے ساتھ نازل ہو گئی۔ میرا گھر ”چڑیا گھر“ میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سب کچھ ٹکنٹ کر دیا۔ میرا کمر اچھہ ہی دیر میں کسی میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔ ممانے میرے سارے دوستوں کو لٹچ کر کے جانے کا کہا۔ کاشف نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ”آئی لٹچ کا وقت تو ہو ہی گیا ہے، آپ ڈنر کی تیاری بھی کر لیں کیونکہ اب ہم اس مریض کا مرض دُور کیے بنا یہاں سے نہیں نکلنے والے.....“ ماما ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ہیلیاٹھ فمٹر کا بیٹا جواد بولا ”لیکن تمہیں ہوا کیا ہے۔ ریس والے دن تو تم بھلے چنگے تھے.....؟“ کاشف نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا ”اسے روگ لگ گیا ہے..... کوئی چہرہ بھا گیا ہے اسے۔“ عینی زوری چوکی۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کاشف کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ عینی نے غور سے میری جانب دیکھا ”کیا مطلب..... میں کچھ سمجھی

طرح اپنی گاڑی نکالی اور سہ پہر ہونے سے بھی کافی قبل ساحلی درگاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج اندر بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی خاص ہستی وہاں آئی ہوئی ہو۔ زہرا کی گاڑی عصر کے قریب وہاں آتی تھی اور ابھی تو ظہر کی اذانیں بھی ٹھیک طرح سے شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے عبداللہ کی تلاش میں یہاں وہاں نظر دوڑائی اور پھر وہ مجھے صحن کے وسط میں کسی شخص کے گرد ہجوم میں ایک جانب کھڑا نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دُور سے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ میرا جسم بخار سے پھنک رہا تھا اور اس وقت مجھے کسی سائے کی تلاش تھی لیکن صحن کے وسط میں تو سورج عین ہم سب کے سروں کے اوپر آگ برسا رہا تھا۔ لیکن میں عبداللہ کے بلاوے پر انکار نہ کر سکا اور اُس کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

قریب جانے پر میں نے ایک باریش بزرگ کو لوگوں کے درمیان بیٹھے پایا۔ اس بوڑھے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا، جو انسان کو اُس کی جانب دوسری نظر ڈالنے سے روکتا تھا۔ آس پاس سبھی لوگ نہایت مودب بیٹھے ہوئے تھے۔ بزرگ کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جسے وہ آنکھیں بند کیے پڑھے جا رہا تھا۔ مجھے اس سنائے سے کچھ عجیب سی وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں نے اُنہیں آمیز انداز میں عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے آنکھیں میچ کر مجھے خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اچانک اس بزرگ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زور سے گرج کر بولا ”آگیا تو..... اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟“

نہیں..... اور ہاں..... کاشف بتا رہا تھا کہ تم دونوں اس جمہرات کو بھی درگاہ گئے تھے..... کہیں یہ روگ وہیں کا پالا ہوا تو نہیں ہے.....؟“ میں نے کھا جانے والی نظروں سے کاشف کو گھورا۔ کسی کے پول کا ڈھول پینٹا تو کوئی اس سے دیکھے۔ کاشف نے گھبرا کر کندھے اُچکائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔ ”تم بھی کس ایڈیٹ کی باتوں پر یقین کر بیٹھی ہو۔ ہم درگاہ گئے ضرور تھے لیکن ایک شان دار کار کے مالک کی کھوج میں.....“ لیکن عینی بھی بلا کی ذہین تھی۔ اُسے مطمئن کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور وہ دھیرے سے بولی۔ ”خدا کرے کہ یہ کھوج صرف ایک شان دار کار تک ہی محدود رہے۔“ بات آئی گئی تو ہو گئی لیکن پھر سارا دن عینی کا موڈ آف رہا۔ وہ لوگ شام تک میرے گھر میں دھما چوڑی مچاتے رہے۔ جاتے ہوئے ممانے اُن سب سے وعدہ لیا کہ وہ لوگ اب آتے رہا کریں گے۔ ”یعنی سب سے آخر میں گاڑی میں سوار ہوئی اور مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی باقی سب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ ماما میرے قریب ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ”نکس گرل ساحر..... ہے نا“ مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”آپ جیسا سوچ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے.....“ ”اگر دیا ہو بھی جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا مائی چائلڈ..... بس تم خوش رہا کرو.....“

ماما بھی مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئیں۔ لیکن ہم انسانوں کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی تھا کہ ہم کبھی بھی خوشی کا کوئی مستقل فارمولا ہی تلاش نہیں کر پائے تھے۔ دو انسانوں میں سے کوئی ایک بات جو پہلے کے لیے خوشی کا سامان کر سکتی ہے، وہی بات دوسرے کے لیے انتہائی معمول کی خبر ثابت ہوتی ہے۔ شاید خوشی کا تعلق ہمارے اندر کی ضروریات سے ہوتا ہے۔ کوئی سڑک پر گرا ایک روپے کا سکہ پا کر بھی خوشی سے نہال ہو جاتا ہے اور کسی کو بزنس میں کروڑوں کا فائدہ بھی ہمیز نہیں دے پاتا۔ ان دنوں میرے لیے بھی خوشی کے معنی یکسر بدل گئے تھے۔ گاڑیوں کی دوڑ اور ہیوی بانیکس کی ریس، جو چند دن پہلے تک میرا جنون تھا، اب اس شغل میں بھی میرا دل نہیں اٹک رہا تھا..... جیسے جیسے جمہرات کا دن قریب آتا جا رہا تھا، میرے اندر پھر سے ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی جا رہی تھی اور پھر جمہرات کا دن بھی آ گیا۔ ماما صبح پاپا کے ساتھ ہی نکل چکی تھیں لہذا مجھے روکنے والا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے معمول کی

کیا یہی صاحب تمہارے باس ہیں؟“ باس کا لفظ سن کر عبداللہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ ”ہاں میاں..... باس بھی کہہ سکتے ہو..... مجھے اور مجھ جیسے اور بہت سوں کو حاکم بابا کے ذریعے ہی احکامات ملتے ہیں۔ کس نے کہاں جانا ہے، کہاں رُکنا ہے؟ کس علاقے میں کس کارندے کی ضرورت ہے، کس طرح کے لوگوں میں تعلیم کس طرح بانٹنی ہے..... یہ سارے معاملات حاکم بابا ہی طے کرتے ہیں۔“ میں حیرت سے عبداللہ کی بات سنتا رہا۔ ”کارندے.....؟ کیا مطلب.....؟ کیا تمہاری طرح اور بھی خدمت گار ہیں اس درگاہ کے اندر.....؟ مطلب تم لوگوں کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ لیکن تم نے ابھی تعلیم کی بات کی تھی..... تم لوگ کیسی تعلیم دیتے ہو لوگوں کو..... اور کیا حاکم بابا کے اوپر بھی کوئی اور عہدے دار موجود ہے.....؟“ ”تعلیم سے مراد کوئی اسکول کی پڑھائی نہیں ہے..... بس لوگوں کی خدمت کرنا ہوتی ہے..... جیسے میں اس درگاہ میں آنے والے زائرین کی مدد کرتا ہوں..... انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، یا کسی قسم کی معلومات درکار ہوں تو وہ میں انہیں فراہم کرتا ہوں..... جب کہ حاکم بابا سے اوپر کے تمام انتظامات سلطان بابا سنبھالتے ہیں۔ البتہ ہمارا اُن سے رابطہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ دراصل سلطان بابا، حاکم بابا اور ان جیسے دوسروں کے بھی ’باس‘ ہیں..... ہم تو اُن کے ماتحتوں کے بھی ماتحت ہیں.....“

میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مطلب یہ کہ حاکم بابا جیسے بھی دیگر کئی حکام موجود تھے۔ پھر تو سلطان بابا واقعی کوئی ہستی ہوں گے، کیونکہ میری تو آدھی جان حاکم بابا کا جلال دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ جانے سلطان بابا کے رُعب اور جلال کا کیا عالم ہوگا؟ گویا ان لوگوں کی پوری ایک انتظامیہ تھی، جیسے اسسٹنٹ کمشنر کے اوپر ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے اوپر کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ کے اوپر کی چین آف کمانڈ بھی پوری طرح متحرک تھی۔ لیکن اس نفسا نفسی کے دور میں جب بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹنے پر تڑپا ہوا ہے، ایسے بے غرض اور لے لوٹ لوگ بھی موجود ہیں جو صرف دوسروں کی تکلیف اور درد کو دور کرنے کے لیے اپنا چین اور آرام تیاگ دیتے ہوں گے.....؟؟ مجھے اس بات پر اب بھی پوری طرح یقین نہیں آیا تھا..... اور پھر ان لوگوں کے اپنے اخراجات بھی تو ہوتے ہوں گے۔ یہ سارا خرچہ کون اٹھاتا ہوگا؟ کیا سلطان بابا سے اوپر بھی کوئی عہدے دار موجود ہوگا؟ جیسے کمشنر کے اوپر صوبے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا

میں نے گہرا کر اپنے پیچھے دیکھا، لیکن وہ بزرگ مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے دھیرے سے بزرگ کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے زور سے اپنے لمبے بال جھٹکے اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالی۔ ”جانتا ہوں میں..... اس ساحر کو بھی اور اس کے سحر کو بھی..... اس سے پوچھو کہ یہ یہاں کس پر اپنا سحر پھونکنے آیا ہے..... یہاں اس کی دال نہیں گٹکی.....“ پھر یکایک نہ جانے اُس بوڑھے کو کیا ہوا۔ ”سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا..... جب لاڈ چلے گا بخارا.....“ پھر وہ بزرگ ایک دم ہی یوں مراقبے میں چلا گیا جیسے اُسے ہم سب سے کوئی غرض ہی نہ رہی ہو۔ عبداللہ نے اشارے سے بھیڑ کو چھٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ خاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر دُور ہٹ گئے۔ عبداللہ بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے درختوں کے سائے کی طرف چلا آیا، جہاں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دفعۃً عبداللہ کو احساس ہوا کہ میرا ہاتھ تپ رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے میرے ہاتھ کو چھوا۔ ”اوہ..... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ عبداللہ نے جلدی سے گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر مجھے پیش کیا۔ پانی پیتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح تک میں اس کی تاثیر اُترتی چلی گئی ہو۔ میرا دل چاہا کہ میں عبداللہ سے پانی کا ایک اور گلاس مانگ لوں، لیکن جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا۔ عبداللہ نے تشویش سے میری جانب دیکھا ”یہ حالت کب سے ہے تمہاری.....؟“ ”پچھلی جمعرات سے..... جب میں درگاہ سے واپس گھر پہنچا تھا، تب سے اسی طرح اس بخار میں پھنک رہا ہوں.....“ میری بات سن کر عبداللہ نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا ”اچھا میری بات چھوڑو..... یہ بتاؤ یہ بڑے میاں کون ہیں..... اور اتنے جلال میں کیوں ہیں.....؟“ عبداللہ میری بات سن کر چونکا اور جب اُسے میرا اشارہ سمجھ میں آیا تو ایک گہری مسکراہٹ اُس کے چہرے سے چھٹک پڑی۔ ”اوہ..... وہ..... بھئی وہ بڑے میاں تو ہمارے بھی بڑے ہیں..... ہم انہیں حاکم بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔“ ”کیا مطلب.....“

گئی۔ اُس کے پیچھے آئی اُس کی ماں اور خادمہ کو بھی رکتا پڑا۔ میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا لیکن خود میرے طلق میں شدید پیاس کے مارے کانٹوں کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا۔ زہرا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ پھر شاید اُس کی ماں نے مجھے پہچان لیا کہ میں وہی ہوں جس نے پچھلی مرتبہ بھی زہرا کے لیے پانی پیش کیا تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں اور زہرا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ”لے لو بیٹا..... پانی کا انکار نہیں کرتے.....“

زہرا نے چپ چاپ میرے ہاتھوں سے گلاس لے کر اپنے نازک لبوں سے لگا لیا اور چند گھونٹ پی کر واپس میری جانب بڑھا دیا۔ میں اُسے اس محویت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہے۔ مجبوراً اُسے ہلکا سا کھٹکنا پڑا اور میں چونک سا گیا۔ میں نے جلدی سے شرمندگی کے عالم میں گلاس واپس لے لیا اور نام لہجے میں کہا، ”معاف کیجیے گا..... میرا دھیان کسی اور جانب تھا۔“ اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چادر درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ زہرا کی ماں نے گزرتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔ ”جیتے رہو بیٹا..... کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو..... خدا تمہاری آرزو پورے کرے۔“ پتا نہیں اچانک ہی میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ ”کیا یہاں آکر مانگنے سے خدا ہر آرزو پورا کر دیتا ہے.....؟“ خاتون نے لمبی سی سانس لی اور دھیرے سے کہا۔ ”ہاں بیٹا..... جس کا نصیب ہو اُسے ملتے زیادہ دیر نہیں لگتی..... پر ہماری آزمائش شاید کچھ طویل ہے..... سدا خوش رہو.....“ وہ مجھے دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر، پیچھے دیکھا تو زہرا پہلے ہی سیڑھیاں اتر کر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور اب اُس کی ماں اور خادمہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر جا رہی تھیں۔ آج پہلی بار میں نے زہرا اور اُس کی ماں کے لباس پر غور کیا۔ وہ دونوں ہی یو پی کے مخصوص اور روایتی لباس میں ملبوس تھیں۔ زہرا نے جدید وضع کا کرتا پاجامہ، جب کہ ماں نے بھاری کام دار سفید شرارہ پہنا ہوا تھا۔ اُن کے لہجے کی کھلک اور الفاظ کا چناؤ بھی خالص اُردو تہذیب یافتہ گھرانوں والا تھا۔ لیکن اُس گل رخ کے مرمریں لب تو میری کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکے۔ کاش وہ ایک ”شکرینے“ کا لفظ ہی کہہ جاتی۔ آخر ایسا بھی کیا غرور، کیا گھمنڈ تھا اُسے..... لیکن پھر بعد میں، میں نے خود ہی اپنے

کا چیف سیکرٹری ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسے نہ جانے کتنے سوالات کلبلا رہے تھے۔ لیکن ایک دم ہی گھنیرا سایہ سا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے گرم تپتی دوپہر میں ٹھنڈے پانی سے بھری کوئی بدلی سورج کے عین سامنے آکر رک گئی ہو۔ وہ ماہ جبیں اپنے کول قدم درگاہ کے صحن میں دھر چکی تھی اور حسب معمول اُس کی ماں اور خادمہ بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ جانے موسم کی تمام شدت اور دھوپ کی ساری حدت ایک ہی پل میں کہاں غائب ہو گئی۔ مجھے یوں لگا کہ دُور سمندر کی طرف سے چلنے والی پروائی نے ساری درگاہ کے گرد اپنا گھیرا باندھ دیا ہو۔ کسی ایک شخصیت کی موجودگی ہمارے ارد گرد کے موسم پر اس قدر شدت اور تیزی سے کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے؟..... مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ کیا باہر کے سبھی موسم جھوٹے ہوتے ہیں اور اُن کا تعلق صرف ہمارے اندر کے موسم ہی سے ہوتا ہے۔ وہ پری رخ اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی، جیسے پانیوں پر قدم رکھتی ہوئی حاکم بابا کے بالکل سامنے جا بیٹھی تھی۔ حاکم بابا نے اُس کے سلام کے جواب میں دعا دی اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مطلب یہ کہ وہ پہلے بھی حاکم بابا سے مل چکی تھی۔ حاکم بابا نے زہرا کی ماں سے کچھ پوچھا اور قریب کھڑے خادم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اُس پر کچھ پڑھا اور پھونک کر زہرا کو پینے کے لیے دے دیا۔ میں اُس ماہ و ش کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے عبد اللہ کے اٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آج یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے زہرا سے ہم کلام ہونے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اُس سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آخر وہ کون سی منت ہے جو اُسے یہاں اس ویرانے میں اتنی دُور تک کھینچ لائی ہے؟ وہ تو خود کسی منت کی طرح ہے، جس کی قبولیت کے لیے ایک عالم تا عمر سجدے میں پڑا رہ جائے..... روپ کی ایسی دولت، دنیا میں کچھ کم ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو خود ایک دعا تھی..... پھر وہ اپنا وقت دعاؤں میں کیوں ضائع کر رہی تھی۔

میں جانے کتنی دیر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے گم صم سا بیٹھا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں جلدی سے پانی کا بھرا گلاس لے کر درگاہ کے داغلی دروازے کے قریب بیٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جب وہ تینوں میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں نے جلدی سے پانی کا گلاس زہرا کے سامنے کر دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رک

خیال کی نفی کر دی۔ ”نہیں..... شکریہ جیسے تکلفات میں تو وہ لوگ پڑتے ہیں، جن کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے اور اس ماہِ رُوک کی تو حالت صاف چنٹی کھا رہی تھی کہ وہ کسی اور پرستان کی شہزادی ہے۔ اُسے اپنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ ایسے ظاہری آداب کا خیال رکھ پاتی۔ زہرا کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اُبھری اور میں ہاتھ میں پکڑا گلاس ساتھ کھڑے زائر کے ہاتھ میں پکڑا کر نیچے کی جانب لپکا۔ پھر ایک ساتھ تین تین سیزھیاں پھلانگتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور گاڑی کو دُور ریت اڑائی، شہر کی طرف جاتی، زہرا کی گاڑی کے پیچھے ڈال دیا۔

جانے یہ زہرا کا گھر دیکھنے کی خواہش تھی، یا پھر ایک مرتبہ اُس کا روپ اپنی آنکھوں میں بھر لینے کی..... لیکن میں لگا تار اُن کی گاڑی کا پیچھا کرتا رہا، حتیٰ کہ شہر کا وہ بیش قیمت مضافاتی حصہ شروع ہو گیا جہاں پرانی وضع، لیکن انتہائی متمول طبقے کی حویلیاں موجود تھیں۔ یہ تمام حویلیاں کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھیں اور زنانے، مردانے اور پائیں باغ کا جو تصور اب ہمارے بڑے گھروں میں تقریباً مفقود ہی ہو چکا تھا، وہاں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ زہرا کی گاڑی بھی ایک ایسی ہی عظیم الشان حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اپنی گاڑی پھاٹک کے قریب لا کر روک دی۔ اندر ایک طویل سی رنگین پتھروں کی روش سے ہوتی ہوئی زہرا کی گاڑی پورچ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے اور زہرا اسی شان سے گاڑی سے اُتری جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میں کافی دیر اسی سحر میں حویلی کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھا رہا اور پھر شام ڈھلے وہاں سے لوٹ آیا۔

گھر میں ماما اور پاپا پریشانی کے عالم میں لان ہی میں ٹپکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میری گاڑی کی آواز سننے ہی مامی تیزی سے میری جانب لپکیں۔ ”ساحر..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کتنا پریشان تھے میں اور تمہارے پاپا..... کیوں ستاتے ہو ہمیں اتنا.....؟“ ماما اور وہاںسی ہی ہو گئیں، لیکن میں انہیں منانا خوب جانتا تھا۔ ایک عجیب بات اس دوران یہ ہوئی تھی کہ میرا بخار نہ جانے دن کے کسی پہر میں بالکل ہی غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ماما کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر انہیں یقین دلایا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا خدا کر کے ماما کی ناراضی ختم ہوئی اور ہم تینوں نے بہت عرصے بعد اکٹھے بیٹھ کر ڈنر کیا۔ ماما کی تسلی تو ہو گئی تھی لیکن پاپا کی نگاہوں میں

ب بھی بہت سے سوال چل رہے تھے۔ آخر ڈنر کے بعد جب ہم سب لان میں بیٹھے تھے تو پاپا نے ماما سے خاص اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی کی فرمائش کی اور وہ اُٹھ کر کافی بنانے چلی گئیں تو پاپا کو موقع مل گیا۔ انہوں نے ماما کے اندر جاتے ہی جلدی سے کہا ”ہاں بھائی“۔ ”ان..... کوئی سگریٹ وغیرہ ہے تو نکالو..... ابھی تمہاری ماما واپس آ جائیں گی تو اُن کے سامنے دھواں نکلنا، اگنا مشکل ہو جائے گا.....“ میرا اور پاپا کا ایک ہی برائڈ تھا۔ میں نے نہیں جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کی۔ ایسے موقعوں پر ہم باپ بیٹا نہیں، بلکہ صرف بہت چھ دوستوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن آج میرا سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پاپا نے سگریٹ سلا کر ہونٹوں سے لگائی اور میری جانب غور سے دیکھا۔ ”تم نہیں پیو گے آج.....“ ”نہیں..... پاپا جی نہیں چاہ رہا.....“ ”میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ہر چیز سے کچھ اُکتائے اُکتائے سے رہنے لگے ہو..... کوئی خاص وجہ.....؟ اور پھر یہ بخار.....؟.....“

”میں نے شہر نہیں کرو گے.....؟“ میں نے ایک لمبی سی سانس لی اور ماما کے آنے سے پہلے مختصراً ہرا اور اُس درگاہ کے بارے میں ہر بات بتا دی۔ ماما کافی لے کر آئیں تو ہماری گفتگو میں کچھ دیر کا وقفہ آیا۔ کافی پینے کے بعد ماما کی یواہیں اے سے ایک ضروری فون کال آگئی اور مجھے اور پاپا کو پھر سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”کہیں تمہیں اس لڑکی سے محبت تو نہیں ہو گئی.....“

”محبت..... نووے پاپا..... اُس نے آج تک کبھی مجھے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مارے درمیان کبھی گفتگو تو کیا ایک آدھ نظر تبادلہ بھی نہیں ہوا..... پھر مجھے اُس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟“ ”محبت کا تعلق لفظوں اور گفتگو سے بھلا کب ہوتا ہے؟ میں تو اسے نظر سے نظر کا شہتہ سمجھتا ہوں..... ہاں البتہ تمہارے کیس میں نظر کے اس ٹکراؤ کی بھی کمی ہے..... بہر حال ایک بات یاد رکھنا..... محبت میں جتنا ہونے کے لیے کسی خاص اور لگے بندھے اصول کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی..... یہ کسی بھی لمحے بہتی ہوا کی طرح آپ کے خون کے غلیوں میں شامل ہو کر نسوں میں بہنا شروع کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لمحے تم اس جذبے کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہو، لیکن جب کبھی تمہیں محسوس ہوا کہ یہ محبت ہی ہے تو ہمیں اطلاع کر دینا، ہم سب ہی دن تمہارا رشتہ لے کر اُس لڑکی کے در پر سوالی بنے کھڑے ہوں گے..... جسٹ فیک

محبت سی ہو گئی ہے

یورٹائم۔“ پاپا میرا گال تھپتھا کر وہاں سے اٹھ گئے۔ لیکن مجھے ایک نئے عذاب میں ڈال گئے۔ وقت ہی تو نہیں تھا میرے پاس۔ نہ جانے کیوں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل رہا ہو، جیسے کوئی انہوا ہونے والی ہو۔

مجھ سے یونیورسٹی اور سب دوست تقریباً چھوٹ ہی چکے تھے۔ یہ انہی کی ہمت تھی کہ کم نہ کسی طرح مجھے کہیں سے ڈھونڈ لیتے تھے۔ ورنہ میرے صبح و شام کہاں بسر ہو رہے تھے، اس کا خبر خود مجھے بھی نہیں تھی۔ جب کبھی ہوش آتا تو خود کو زہرا کے گھر کے باہر، یا پھر درگاہ کے صحن میں بیٹھا ہوا پاتا تھا۔ ایک ایسی ہی گرم دوپہر، جب میں درگاہ کے صحن میں پہلا قدم ہی رکھ رہا تھا کہ حاکم بابا کی کڑکتی ہوئی آواز نے میرے قدم وہیں جما دیئے۔ ”جا..... نکل جا یہاں سے..... اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس آستانے پر کوئی جگہ نہیں ہے۔“ میرے گھبرا کر نظریں اٹھائیں تو حاکم بابا کو عین اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ پھر زور سے چلائے ”آخر کب تک لڑے گا..... میں کہتا ہوں ہتھیار ڈال دے.....“ اتنے میں اُن کے پیچھے ایک ملائم سی آواز ابھری۔ ”حاکم..... بچے کو تنگ مت کر..... اسے اندر آنے دے.....“ حاکم بابا سامنے سے ہٹے تو اُن کے پیچھے ایک عجیب نورانی چہرے والے سرخ و سپید رنگت والا بزرگ کھڑے نظر آئے۔ ”آؤ بچے..... اندر آ جاؤ..... میرا نام سلطان ہے..... یہ سب مجھے سلطان بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔“

جانے سلطان بابا کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی۔ اُن سے نظر ملتے ہی مجھے زور کا چا آیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہوش کی وادیوں سے دُور چکر اکر زمین پر گر چکا تھا۔ آخری آواز جو میرے کانوں میں ابھری وہ کسی زائر کی تھی ”ارے کوئی اسے پکڑو..... لڑکا بے ہوش ہو گیا۔“

جب مجھے ہوش آیا تو میں شہر کے مہنگے ترین ہسپتال کے بستر پر تھا۔ پاپا، ماما اور میرے سب ہی دوست پریشان سے میرے سر ہانے کھڑے تھے۔ کاشف نے بتایا کہ انہیں ہسپتال ہی سے کسی نے فون کر کے یہاں بلایا تھا اور اُن کے مطابق مجھے درگاہ سے عبداللہ نامی کوئی لڑکا میری ہی گاڑی میں ڈال کر کسی ڈرائیور کے ہمراہ یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے ماما، پاپا کے آنے تک وہیں انتظار کیا اور پھر گاڑی کی چابی اُن کے حوالے کر کے چل دیا۔ تب تک ڈاکٹر ز میرے تمام ٹیسٹ وغیرہ کروا چکے تھے اور انہوں نے عبداللہ کی موجودگی ہی میں بتایا تھا کہ ”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہو سکتا ہے دھوپ کی زیادتی کی وجہ سے چکر آ گیا ہو۔“ پاپا نے ہی میرے دوستوں کو اطلاع کروائی تھی۔ وہ سب ہی مجھ سے کوئی نہ کوئی بات کر رہے تھے، سوائے عینی کے..... وہ بالکل ہی خاموش اور چپ چاپ سی ایک جانب کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں نرس نے انہیں میرے آرام کی خاطر جانے کو کہا تو وہ سب ایک ایک کر کے مجھ سے رخصت ہو گئے۔ سب سے آخر میں عینی میرے بستر کے قریب آئی اور ہاتھ ملاتے ہوئے دھیرے سے بولی ”میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہاری درگاہ کی منت پوری کر دے۔“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی بھرائی ہوئی آنکھیں چھلکنے کو تیار ہی تھیں۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے کاشف نے سب کچھ بتا دیا ہے سار..... مجھے اپنی ہار سے زیادہ اُس لڑکی کی جیت پر خوشی ہے۔ چلو کوئی تو ہے اس دنیا میں ایسا جو پہلی ہی نظر میں تمہارے دل میں اترنے کا ہنر جانتا ہے..... میری مانو تو اب ویر نہ کرنا..... کبھی کبھی محبت میں اک ذرا سی دیر بھی صدیوں کی مسافت بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے..... چلتی ہوں..... اپنا بہت خیال رکھنا۔“ عینی پلٹ کر چل دی۔ میں اُسے پیچھے سے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ ماما جو اس وسیع عریض کمرے کی دوسری جانب ڈاکٹر سے میرے متعلق کسی بحث میں مشغول تھیں، انہوں نے غور سے عینی کو یوں پلٹ کر جاتے اور مجھے اُسے روکنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے دیکھا۔

بنا کر پالا تھا اور پھر میرے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی ایک سر قرار سا آگیا۔ ”زہرا میری ہو جائے گی۔“ یہ سوچ کر ہی میرے روئیں روئیں میں سکون اور اطمینان کی ایک عجیب سی لہر دوڑنے لگی تھی۔ تو گویا یہ محبت ہی تھی اور مجھے اس دیوی کے چرنوں میں اپنے سارے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے تھے، خواہ مخواہ میں نے اتنے دن تک خود کو اس دردناک عذاب سے دوچار رکھا۔ میں ساری رات زہرا کے خیالوں میں کھویا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہوئی اور کب نوکر نے آکر مجھے بیڈٹی دی۔

تیار ہو کر نیچے آیا تو ممانے بتایا کہ نہ صرف پایا نے حاجی مقبول صاحب کو فون کر کے اُن کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، بلکہ ہم لوگ آج سہ پہر کی چائے پر حاجی صاحب کے گھر مدعو ہیں۔ میرے اندر ایک دم ہی جیسے ستار کے بہت سے تار جھنجھنا اُٹھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب تک مجھے اس جذبے کا ادراک نہیں تھا، تب تک میں اس کی کک اور تڑپ سے بھی انجان تھا۔ اور اب، جب میں اس کا مسرور نشہ محسوس کر چکا تھا تو میرے لیے ایک ایک لمحہ کا ثنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ماما پاپا فوراً ہی مقبول صاحب کے گھر چلے جائیں اور آج ہی واپسی پر کسی طرح زہرا کو اپنے ساتھ لے کر ہی واپس آئیں۔ خدا خدا کر کے دن کا دوسرا پہر ڈھلا اور پاپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ میں بھی جلدی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اُترا، لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل اچانک ہی بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ماما نے میرے گال تھپتھپائے اور گاڑی میں پاپا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ پاپا نے میرے جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ”بیٹ آف لک پاپا.....!“

گاڑی زن سے نکل گئی اور مین وہیں لان میں اپنے بے قابو دل کی دھڑکنیں سنبھالنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت پھانسی کے اُس قیدی کی طرح تھی جسے یہ پتا ہو کہ چند گھنٹوں بعد اُسے تنبیہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ مجھے سادہ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اُتارنا مشکل ہو گیا۔ فوراً ہی ابکاکی سی آگئی۔ وقت اپنی جگہ جیسے جامد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ جانے کتنی صدیوں بعد شام ڈھلی اور مغرب کے وقت تک تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے آج میرا یہ جنون مجھے رُسا کر کے ہی چھوڑے گا۔ اچانک ہی گیٹ کے باہر پاپا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چوکیدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی اندر پورج

اتنے میں کاشف نے اندر جھانکا تو میں نے غصے سے اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس قریب آتے ہی اپنے کان پکڑ لیے اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہتا، وہ خود تیزی سے فر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”میں جانتا ہوں، تمہیں بہت بُرا لگا ہوگا، لیکن یقین کرو یا میر۔ پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تمہاری حالت کی وجہ سے اُسے پہلے دن ہی سے تم پر شک ہو گیا تھا اور پھر جس طرح سے تم یک دم غائب ہو گئے میرے پاس اُس کے سوالوں کا کو جواب نہیں رہ گیا تھا۔“ لیکن تم نے اُس سے یہ کیوں کہا کہ مجھے زہرا سے محبت ہو گئی ہے۔ ”میں نے اُس سے ایسا کچھ نہیں کہا یا..... لیکن تمہارے پاگل پن کی یہ جتنی علامات ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی بھی شخص یہی سمجھے گا کہ تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“ میں نے کاشف کو گھورا۔ اُس نے ڈر کر جلدی سے بات بدلی ”میرا مطلب ہے کہ محبت سی ہو گئی ہے.....“

ممانے دُور سے کاشف کو آواز دی تو وہ وہاں سے ٹل گیا۔ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبنے لگا۔ کاشف ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، یہ ساری علامات اسی ایک جان لیوا بیماری کی طرف ہی تو اشارہ کرتی تھیں، جسے عرف عام میں ”محبت“ کہا جاتا ہے اور بقول کاشف، اگر مجھ پر محبت تو کم از کم ”محبت سی“ ضرور ہو گئی تھی۔

اور جب رات کو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں گھر پہنچا تو یہی بحث مباحثہ میں چھڑ چکی تھی۔ پاپا میرے بے ہوش ہونے کا دباؤ برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں نے گھبرا کر ماما کو سب کچھ بتا دیا تھا اور اب ماما بعد تھیں کہ اگر یہ ساری کیفیات، اُس ایک لڑکی کی وجہ سے تھیں تو پھر مزید انتظار کرنا سراسر حماقت ہے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی دونوں نے جھڑک کر خاموش کر دیا اور طے یہ پایا کہ کل ہی ماما اور پاپا جا کر حاجی مقبول میرے لیے زہرا کا ہاتھ مانگ لیں گے۔ شاید میرے والدین دنیا کے سب سے الگ، سہ سے منفرد اور سب سے زیادہ پیار کرنے والے والدین تھے۔ حاجی مقبول صاحب کا معاشرے میں بڑا نام تھا۔ جانے ملک کے کتنے فلاحی ادارے اُن کے تعاون سے چل رہے تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زہرا اگر کسی جھوپڑی میں بھی رہ رہی ہوتی تو تب بھی ماما اور اُسے جھٹ اسی طرح اپنی بہو بنانے پر تیار ہو جاتے، صرف میری خوشی کے لیے۔ اُس مجھے اپنے لڑتے جھگڑتے والدین پر بے حد پیار آیا۔ انہوں نے ساری زندگی مجھے ہاتھ کا چم

رشتہ ٹھکرایا بھی جاسکتا ہے۔ میرے ذہن میں آنندھیوں کے جھکڑے چل رہے تھے۔

پاپا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے لان میں بھیجی کرسیوں کی طرف آگئے اور دھیرے دھیرے سارا ماجرا گوش گزار کر دیا کہ حاجی مقبول اور اُن کے تمام گھروالے بہت وضع دار لوگ ہیں۔ ماما اور پاپا کا استقبال دیا ہی کیا گیا جیسا کہ اُن کے شایان شان ہو سکتا تھا لیکن لڑکی کی ماں پہلے ہی سے کچھ بچھی بچھی سی تھی۔ شاید وہ ماما، پاپا کے آنے سے پہلے ہی اُن کی آمد کا مقصد جان چکی تھی، لہذا جب پاپا نے زہرا کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُن کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حاجی مقبول نے پاپا سے کہا کہ ”وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں، لہذا وہ اُس کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ البتہ انہوں نے ماما اور پاپا کا اس بات پر بے حد شکریہ ادا کیا کہ اتنے بڑے خاندان نے اُن کی بیٹی کو اتنی عزت دی۔ پاپا نے پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اگر حاجی صاحب چاہیں تو اسی وقت اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کر دیا سکتے ہیں۔ ماما میری تصویر لے کر گئی تھیں، انہوں نے وہ تصویر حاجی مقبول صاحب کی بیگم کے حوالے کی اور دم سادھے نتیجے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ لیکن شاید زہرا کی ماں کو نتیجے کا پہلے ہی سے علم تھا، تب ہی وہ کچھ ہی لمحوں میں واپس آگئیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ ضروری تو نہیں کہ یہ رشتہ پہلا ہو، جو اس غزالہ کی چوکھٹ تک گیا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی شاید یہ عمل دہرایا جا چکا ہو۔ بلکہ ایک بار نہیں، کئی بار یہ عذاب زہرا کے ماں باپ پر وارد ہو چکا ہو، تب ہی انہیں بیٹی کے انکار کا اس قدر کامل یقین تھا۔ زہرا کے انکار کے بعد ماما اور پاپا کا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا، لیکن پھر بھی ماما نے ایک آخری کوشش کے طور پر زہرا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زہرا کی ماں نے ماما کو ساتھ لیا اور اُس کے کمرے تک جا پہنچیں اور پھر ماما کو دروازے تک چھوڑ کر، خود وہیں سے واپس پلٹ گئیں، شاید ماما کو زہرا سے کھل کر بات کرنے کا موقع دینے کے لیے۔ ماما نے زہرا کو دیکھا تو بقول اُن کے وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اُس کا حسن ہی ایسا دل موہ لینے والا تھا، لیکن وہ دل رُبا اُس وقت بھی غم و یاس کی مکمل تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے ماما کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر اُن سے معافی مانگ لی کہ اگر اُس کے انکار سے ماما کا دل دکھا ہے تو وہ تہ دل سے اُن سے معذرت چاہتی ہے، لیکن اس مدعا کو مزید نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہوگا، کیونکہ اُس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس نے ماما کے ہاتھ تھام کر

میں آکر زک مگنی اور ماما اور پاپا نے قدم باہر رکھے، میں تقریباً دوڑتا ہوا، اُن دونوں کے پاس جا پہنچا۔ ”کہاں رہ گئے تھے آپ دونوں.....؟ آخر اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟“ میں نے اُن کے اُترتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ماما نہ جانے کیوں مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں تھیں۔ میں پاپا کی جانب لپکا ”آپ ہی کچھ بتائیے نا پاپا..... کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ پاپا نے ایک گہری سی سانس لی اور میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ ”ساحر بیٹا..... اُس لڑکی نے تمہارا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے..... آئی ایم سوری..... ہم دونوں مل کر بھی انہیں قائل نہیں کر سکے.....“ مجھے لگا، جیسے کچھ لمحوں کے لیے میری تمام سماعتیں مردہ ہو گئی ہوں، شاید میں پاپا کی بات ٹھیک سے سن ہی نہیں پایا تھا۔ بے یقینی سے انہیں پھر سے زور سے جھنجھوڑا، انہوں نے مجھے زور سے بھیج کر گلے لگا لیا۔ ایسا وہ بچپن میں بھی تب کیا کرتے تھے جب مجھے سائیکل سے گر کر، یا کھیلتے ہوئے کوئی زوردار چوٹ لگ جاتی تھی۔ چند لمحوں کے بعد مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ پھر رفتہ رفتہ جب اُن کی بات کا مفہوم واضح ہونے لگا تو چوٹ کا درد بھی دھیرے دھیرے رگوں کو کاٹنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی زور سے چیخوں کہ اندر کا سارا شور ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔ ماما وہاں رُک نہیں پائیں اور آنکھیں پونچھتی ہوئی تیزی سے اندر چلی گئیں۔

لیکن کیوں.....؟ زہرا نے انکار کیوں کر دیا تھا۔ میرا چند لمحوں کا ساتھ پانے کے لیے نہ جانے کتنی نازنینوں کا دل مچلتا تھا، لیکن وہ جسے میں نے عمر بھر کا ساتھ دینے کی پیش کش کی تھی، اُس نے ایک ہی لمحے میں میرا سارا غرور، سارا بھرم چکنا چور کر دیا..... کیوں..... کیا وہ مجھے بھی انہی ہزاروں عام لوگوں کی فہرست میں رکھتی تھی جو اُس کی ایک جھٹک کے طلب گار ہوں گے.....؟ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹھکرائے جانے کے اذیت ناک درد کا احساس ہوا..... اس سے پہلے تو میں نے صرف جیتنا اور فتح کرنا سیکھا تھا اور میری فتوحات کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اب تو مجھے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے تھے۔ آج سے پہلے شاید یہ بات کسی نے میرے لیے ہی کہی تھی کہ ”وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔“ لیکن آج کوئی مجھے دیکھتا تو صرف اتنا کہتا ”وہ آیا، اُس نے دیکھا..... اور ہار گیا۔“ کون سوچ سکتا تھا کہ بین الاقوامی تاجر، ملک کے مشہور انڈسٹریسٹ، فیڈرل چیئرمین آف کامرس کے صدر، توصیف احمد کے بیٹے کا

اُن سے یہ بھی کہا کہ جو لڑکی بھی اُن کی بہو بنے گی، وہ دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ خود کو اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتی، لہذا اُسے اُس کی بد نصیبی کا مزید احساس نہ دلا کر ماما اُس پر احسان کریں گی۔ ظاہر ہے اس بات کے بعد ماما مزید کیا کہہ سکتی تھیں۔ وہ زہرا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور شگون کے طور پر سونے کے جوڑاؤ نکٹن ساتھ لے کر گئی تھیں، وہ زہرا کے سر ہانے چھوڑ کر چلی آئیں۔

پاپا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا، جس سے ہمارے، یا زہرا کے خاندان کے نام پر کوئی حرف آئے۔ میں پاپا کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ اُٹھ کر کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اب یہ قصہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ مجھے اُسے جیتنا تھا، یا پھر اپنی ہار کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ البتہ میں نے پاپا کی بات کا اتنا مان ضرور رکھا کہ میں نے براہ راست زہرا کے گھر جانے سے احتراز کیا۔ ورنہ میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں بنا کہیں رُکے، اُس کے گھر کا دروازہ کھولوں اور سیدھے جا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ جمعرات آنے میں ابھی دو دن باقی تھے اور یہ دو دن میں نے کس طرح کاٹے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔

تیسرے دن میں نے گاڑی نکالی اور ماما کی آوازوں کی پروا کیے بنا تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا ساحل کی جانب نکل پڑا۔ عبداللہ مجھے درگاہ کی سیڑھیوں پر ہی مل گیا۔ شاید وہ قریبی بستی سے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے درگاہ سے باہر نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اُس دن بے ہوش ہونے کے بعد میں نے بے مروتی کی انتہا ہی تو کر دی تھی۔ مجھے کم از کم عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تو ایک بار یہاں آنا چاہیے تھا، لیکن عبداللہ نے اپنے رویے سے ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم اتنے دن بعد مل رہے ہیں۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔ وہ اوپر درگاہ میں میرا انتظار کرے، میں وہیں آکر اُس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔ عبداللہ سر ہلا کر اوپر چلا گیا اور میں نے وہیں پتھریلی سیڑھیوں کے پہلے پائیدان پر ڈیرہ جما لیا۔ لوگ سیڑھیاں اُترتے، چڑھتے رہے اور میں اُن کے قدموں سے الجھتا رہا، لیکن آج میں نے وہاں سے نہ اٹھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جانے مجھے یونہی لوگوں کی ٹھوکروں میں بیٹھے کتنی دیر

گزری تھی کہ اچانک ہی دُور سے مجھے زہرا کی گاڑی ریت اُڑاتی درگاہ کی جانب آتی دکھائی دی۔ مجھے یوں لگا کہ ایک ہی لمحے میں میرے جسم کا سارا خون میری کن پٹیوں کی جانب دوڑنے لگا ہو۔ میں بھجانی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب آکر رُک چکی تھی اور اس میں سے حسب معمول وہی پرانی خادمہ، زہرا کی ماں اور خود زہرا اتر رہی تھیں۔ سب سے آگے زہرا کی ماں، پھر زہرا اور پھر سب سے پیچھے زہرا کی خادمہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درگاہ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے اُن میں سے کسی کی نظر اب تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جیسے ہی زہرا کی والدہ نے مجھے کراس کیا، میں ایک دم زہرا کے بالکل اور عین سامنے آکر کسی چٹان کی طرح جم گیا۔ زہرا جو اپنی ہی دُھن میں سر جھکائے آگے بڑھ رہی تھی، ایک دم ٹھٹھک کر رُک گئی اور غصے میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس کے لفظ اُس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔

میں سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نظر کی التجا

اُس وقت شاید خود زہرا کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں یوں ایک دم اچانک اور سراہ اُس کا راستہ روک لوں گا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اُس کے ماتھے پر غصے، جھنجھلاہٹ کے مارے چند شکلیں ابھریں اور پسینے کی چند شبنمی بوندیں پھسل کر ستارہ پلکوں کو بھگو گئیں۔ زہرا کی والدہ چونکہ پہلے ہی سڑھیاں چڑھ چکی تھیں، لہذا انہیں اپنے پیچھے ہوئی اس واردات کی فی الحال خبر نہ تھی۔ ویسے بھی وہاں اُس وقت زائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ کوئی زائر یہ بھی محسوس نہیں کر پایا کہ میں دن دھاڑے کسی عفت مآب کا راستہ روکے کھڑا ہوں۔ زہرا نے دوبارہ نگاہیں اُوپر نہیں اٹھائیں اور اسی طرح جھکے سر کے ساتھ لیکن لہجے میں شدید سختی لیے مجھ سے کہا ”راستہ چھوڑیں میرا..... آپ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا.....“ میں اپنی جگہ پر جما رہا۔ ”جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گی تب تک میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اُس کی خادمہ سرا سیمہ سی پیچھے کھڑی سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بھی ضرور کھلبلی مچا رہا ہوگا کہ اُس کی بڑی مالکن اُوپر درگاہ میں محن میں کھڑی پریشان ہو رہی ہوں گی کہ یہ دونوں پیچھے کہاں رہ گئیں؟ زہرا زچ ہو کر بولی ”آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے جس کے لیے آپ یوں.....“ میں نے درمیان ہی میں اُس کی بات کاٹ دی ”آپ نے رشتے سے انکار کیوں کیا.....؟ آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے، جو آپ کو کھٹکتی ہے.....؟“ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ میں کوئی کمی نہیں ہے..... لیکن مجھے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں۔“ اُس کی بات نامکمل رہ گئی اور اتنے میں بھیڑ کا ایک تیز ریلا آیا اور مجھے اپنی جگہ سے دھکیل گیا۔ زہرا کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ خادمہ بھی اُس کے پیچھے لپکی۔ میں نے پیچھے سے چلا کر کہا، ”ٹھیک ہے، بات اگر زندگی کے فیصلے اور اس پر قائم رہنے کی ضد کی ہے تو پھر میں بھی آپ کو ہر جمعرات اسی درگاہ کی چوکھٹ پر پڑا ملوں گا۔ دیکھتے ہیں آپ کی خاموشی پہلے ٹوٹی ہے، یا پھر

میری سانسوں کی ڈور.....“ زہرا بنا پیچھے دیکھے اور بنا جواب دیے تیزی سے درگاہ کی سڑھیاں چڑھ گئی۔ اُس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ میں اُس دن کو رو رہا تھا جب پہلی بار میرے قدم اس درگاہ کی جانب اٹھے تھے۔ نہ میں یہاں آتا، نہ میری زہرا پہ نگاہ پڑتی اور نہ ہی آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں تو بھکاریوں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ انہیں تو پھر بھی مانگنے پر کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا، پر مجھے تو ڈھنگ سے مانگنا بھی نہیں آتا تھا۔ اسی جھنجھلاہٹ میں اور خود کو کوتا ہوا میں جانے کب درگاہ کے احاطے میں پہنچ گیا۔

زہرا اپنی ماں کے ساتھ حسب معمول دعاؤں میں مشغول تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل پھر سے ڈوبا لیکن میں دُور گھڑوں کے پاس سائے میں بیٹھے عبداللہ کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کے سامنے بہت سی چھوٹی سیپیوں اور موتیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا، جن میں سے ایک ایک دانہ اٹھا کر وہ تسبیح بن رہا تھا۔ اُس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ”آؤ ساحر میاں آؤ..... دیکھو میں نے تمہارے لیے یہ تسبیح بنی ہے.....“ عبداللہ نے ایک چھوٹی سی مگر بے حد خوب صورت تسبیح اٹھا کر مجھے دی۔ میں اپنے اندر کی تلخی کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ ”لیکن میں اس کا کیا کروں گا.....؟ میں نے تو آج تک کبھی تسبیح پڑھی ہی نہیں.....“ ”ارے تو کیا ہوا..... آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں..... کبھی نہ کبھی تو دل چاہے گا نا.....؟“ تب تسبیح تمہارے کام آئے گی۔“ شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے..... اور پھر اگر کبھی میرا دل تسبیح پڑھنے کو چاہا بھی تو میں یوں دانوں پر گن گن کر نہیں پڑھوں گا، خدا کی یاد میں یہ مول تول کیسا.....؟ اُس کی شان میں تسبیح پڑھتی ہو تو پھر یہ کتنی کیسی.....؟“ عبداللہ نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر کچھ دیر تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”بہت بڑی بات کہہ دی تم نے..... ہاں..... معاملہ جب اُس کی یاد کا ہو تو پھر یہ کتنی کیسی..... لیکن مجھ جیسے عام بندے تو اُس کی یاد میں بھی اس گنتی کا ڈھکوسلا شامل کر ہی دیتے ہیں..... اور پھر یہ تسبیحاں بننا تو ویسے بھی میری مجبوری ہے کیوں کہ میرے روزگار کا فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔“ ”کیا مطلب؟ کیا تم تسبیح کی یہ مالائیں فروخت بھی کرتے ہو.....؟“ عبداللہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ ”جی ساحر میاں..... آخر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو پانا ہوتا ہے۔“ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ”تمہاری بیوی اور بچہ..... کیا تم شادی شدہ ہو.....؟“ ”کیوں..... اس میں حیرت کی کیا

ہنچ جاتے ہو۔ اُس دن اُسے پانی پلاتے وقت بھی تمہاری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔“ میں نے چونک کر عبداللہ کی جانب دیکھا، گویا سارے زمانے کو میری حالت کی خبر تھی، صرف میں ہی خود اپنے آپ سے بے خبر تھا۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اس لڑکی کی ایک بھلک پانے کے لیے ہی آج تک اس درگاہ کے چکر کاٹا رہا ہوں لیکن آج بھی میں اس سے اتنا ہی دُور ہوں، جتنا پہلے دن تھا۔“ عبداللہ ہلکے سے مسکرایا۔ ”محبت کرتے ہو اُس لڑکی سے.....؟“ میں نے گہری سی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ”جانے کیا ہے..... محبت، یا کچھ اور..... اب سے بھی سوا ہے..... کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ صرف اور صرف درد اور بے چینی کا رشتہ ہے..... میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی اذیت آج تک کبھی محسوس نہیں کی..... جانے یہ کیسی محبت ہے.....؟ اور اگر یہی وہ جذبہ ہے جس کے اظہار کے لیے شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ مارے ہیں تو ایسے تمام دیوان، تمام کتب خانوں کو آگ لگا دینی چاہیے جو اس جذبے کی خوب صورتی اور حمایت بیان کرتے ہیں۔“ عبداللہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ ”ارے..... ابھی سے گھبرا گئے..... شاید تم نے غالب کو زیادہ نہیں پڑھا..... چچا غالب نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جاتا ہے

ویسے کچھ جگہوں پر تیر کر جانا بھی درج ہے.....“

میں نے غور سے عبداللہ کو دیکھا ”تم نے آج تک کبھی کھل کر نہیں بتایا کہ تم کتنا پڑھے ہو..... میرا مطلب ہے کوئی ڈگری وغیرہ.....؟“ ”کیا کوئی سند ہی انسان کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے.....؟ بہر حال تم نے تیسری مرتبہ یہ سوال پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں..... میں نے اُردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔“ یہ ایک اور جھٹکا تھا جو اُس دن میں نے سہا۔ ویسے عبداللہ کے معاملے میں تو اب تک مجھے ان سربراہوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں پھر بھی چونکنے سے باز نہیں آتا تھا۔

اُس جمعرات کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر جمعرات خصوصی طور پر زہرا کو دیکھنے اور اُس کی راہ میں بیٹھ کر اپنا سوال پھر سے دہرانے کے لیے درگاہ کے دروازے پر اُس وقت تک کھڑا رہتا جب تک وہ وہاں سے اندر داخل نہ ہوتی..... البتہ اب میں نے اُس کا راستہ

بات ہے..... کیا میں شادی شدہ نہیں ہو سکتا.....“ میں گڑبڑا سا گیا..... ”نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا..... دراصل ایسی درگاہوں اور ان میں بسنے والوں کو دیکھ کر ہمیشہ ساری دنیا تیاگ دینے والی کسی مخلوق کا خیال آتا ہے، شاید اسی لیے مجھے حیرت ہو رہی ہے.....“ ”جانے مجھ جیسے ہر مجاور، یا درگاہ کے متولی کو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ پہ کیسے باور کر لیتے ہیں کہ ہم ساری دنیا تیاگ کر یہاں آ بیٹھے ہوں گے جب کہ ہمارے مذہب میں واضح طور پر رہبانیت سے منع کیا گیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ درگاہ میرے سفر کا بس ایک پڑاؤ ہی تو ہے۔“ ”اور تمہارے بیوی بچے.....؟ وہ کہاں رہتے ہیں..... شادی کب ہوئی تمہاری.....“ ”تین سال ہو گئے ہیں میری شادی کو..... ایک بیٹا ہے میرا..... احمد نام ہے اُس کا..... پچھلے ہفتے ہی ماشاء اللہ پورے دو سال کا ہوا ہے..... میری بیوی اور بچہ یہاں سے تقریباً ایک سو بیس کلومیٹر دُور میرے چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں ہر پندرہواڑے پر اُن سے ملنے جاتا ہوں..... حاکم بابا مجھ پر خاص مہربان ہیں اس لیے عید، شبِ برأت اور دیگر چھٹیاں بھی انہیں کے ساتھ اپنے گھر میں مناتا ہوں۔“ عبداللہ بولتا جا رہا تھا اور میں حیرت میں ڈوبا بن رہا تھا۔ یہ شخص ہر کروٹ پر میرے لیے اپنے اندر سے تحیر اور تجسس کی ایک پوٹی لیے برآمد ہوتا تھا۔ میں عبداللہ کی باتوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے زہرا اور اُس کی ماں کے اٹھنے کا پتا ہی نہیں چلا..... میں اُس وقت چونکا جب اُس عشوہ طراز کے نازک قدم میرے سامنے سے گزرے، میں نے چونک کر جلدی سے نظر اٹھائی اور پل بھر ہی میں یہ کیا غضب ہو گیا، اُس راج ہنسی کی ترجیحی نظر بے خیالی میں میری جانب اٹھی اور لمحے کے ہزاروں حصے میں میری رُوح کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ اُس نے عبداللہ کی جانب نظر بدل کر عبداللہ کو دھیرے سے سلام کیا اور آگے بڑھ گئی اور میرے دل کو جو چند لمحوں کا قرار میسر آیا تھا، وہ سب جھین، قرار اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گئی۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لوں اور تب تک نہ جانے دوں، جب تک وہ تھک کر ہتھیار نہ ڈال دے لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا اور وہ درگاہ کے احاطے سے نکل گئی۔ عبداللہ غور سے میرے چہرے پر آتی جاتی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کھٹک کر میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ”میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ تم جب بھی اس لڑکی کو دیکھتے ہو، کسی اور ہی دنیا میں

شخص کے خاکے کو پہچان ہی نہیں پائیں، جو میرے سر پر کھڑا شعر پڑھ رہا تھا۔
 - تیرا چہرہ ہے جب سے آنکھوں میں
 میری آنکھوں سے لوگ جلتے ہیں

اور جب اُس شخص کا چہرہ واضح ہوا تو میں حیرت سے اُٹھل ہی تو پڑا، وہ حاکم بابا تھا۔
 آج اُن کی آنکھوں سے اس روایتی جلال کی جگہ ایک عجیب سی نرمی چھلک رہی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے حسب معمول اُن کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ”تو اندر کیوں نہیں آتا لڑکے..... یہاں باہر کیا بازار سجا رکھا ہے.....؟ کسے بھسم کرنا چاہتا تھا.....؟ وہ تو خود جل کر پہلے ہی راکھ ہو چکی ہے۔“ میں نے چونک کر نظر اٹھائی..... گویا انہیں بھی میرے فسانے کا علم تھا۔ پتا نہیں اور کتنے لوگ ہوں گے جو میری اس وحشت سے واقف ہوں گے۔ صرف اُسی کو اب تک خبر نہ ہو سکی تھی جس کے لیے میرا یہ سارا جنون تھا۔ میں نے دھیرے سے سر جھکا کر انہیں جواب دیا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا اندر آنے کو..... اور پھر اُس دن آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس درگاہ کے احاطے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔“ حاکم بابا مسکرائے ”گلتا ہے تو نے ہماری بات دل پہ لے لی ہے..... چل آج سے ہم خود تجھے اجازت دیتے ہیں، جب کبھی دل چاہے تو اوپر آ جانا..... پر یاد رکھ..... دل کسی کا دوست نہیں ہوتا..... اس کی نہ دوستی بھلی اور نہ ہی دشمنی اچھی.....“ حاکم بابا کا یہ روپ میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی نرمی، حلاوت تو کبھی نہ تھی اُن کے لہجے میں۔ وہ یونہی مسکراتے ہوئے اپنے چند مریدوں کے ساتھ اُدھر درگاہ کی جانب بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اُدھر سے ایک زائر ہاتھ میں ایک رتھ اور چند کھجوریں لے کر نیچے اُترا اور دونوں چیزوں کو میرے حوالے کر کے واپس لوٹ گیا۔ میں نے خط کھولا تو عبداللہ کی تحریر تھی ”کہو ساحر میاں.....؟ آخر ہمارے حاکم بابا پر بھی اپنا سحر پھونک ہی ڈالا؟ یہ چند کھجوریں خود انہوں نے تمہارے لیے بھجوائی ہیں..... کہتے ہیں اُس دل جلے کے لیے بھجوادو، جو نیچے دھوپ میں بیٹھا سورج کے ساتھ اپنے مقدر کی جنگ لڑ رہا ہے..... بھئی واہ..... ایسی مہربانی تو آج تک حاکم بابا نے ہم میں سے کسی پر بھی نہیں کی..... جیتے رہو.....“

روکنے، یا اُس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کا عمل ترک کر دیا تھا۔ زہرا کی ماں کو بھی اب اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ میں خاص زہرا کے لیے ہی ہر جمعرات درگاہ کی سنگی سیڑھیوں پر ڈیرہ جماتا ہوں اور خاموشی سے اُس وقت تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں جب تک وہ نلیم پری درگاہ سے واپس لوٹ نہیں جاتی۔ پہلی مرتبہ تو زہرا کی والدہ مجھے وہاں اس اجڑی حالت میں بیٹھا دیکھ کر بالکل گھبرا سی گئیں، میری شیو بہت بڑھ چکی تھی اور جینز اور شرٹ بھی بالکل ملجی ہو رہی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا اور بہت دیر تک گم سم کھڑی رہیں۔ میں اُن سے نظر نہیں ملا پایا اور وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ لیکن اگر میں زہرا کی ماں سے نظر نہیں ملا پایا تھا تو دوسری جانب زہرا بھی میری طرف دیکھنے سے احتراز کرتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔ رفتہ رفتہ میری نظر کی اس التجا اور زہرا کی نظر کے اس بے رحم احتراز کا یہ کھیل ہمارا معمول ہی بن گیا۔ ایک جمعرات کے بعد دوسری جمعرات آتی گئی اور میں اپنی ہر التجا، اپنی ہر بے بسی اور اپنی ہر طاقت اپنی اس ایک نظر میں سوتا گیا جو درگاہ کی ان سیڑھیوں پر بیٹھے ہر جمعرات میں اس سنگ دل کے قدموں میں نچھاور کرتا تھا لیکن اس سنگ مرمر کی صورت کو پکھلنا تھا، نہ وہ پلگی۔ لیکن میں نے بھی نظر کی اس خاموش جنگ کو اس کے منطقی انجام تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری پڑھائی، دوست اور رنگا رنگ زندگی کی ہر خوشی، مصروفیت مجھ سے چھن چکی تھی۔ ماما اور پاپا دن رات میری حالت دیکھ کر کڑھتے اور جلتے رہتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بھی میری ضد اور جنون نے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے ماما کے دن رات بہتے ہوئے آنسو بھی مجھے میری دیوانگی کی راہ سے نہیں ہٹا سکے۔

پھر ایک جمعرات اک عجیب سی بات ہوئی۔ اب میں نے درگاہ کے اندر جانا تقریباً موقوف ہی کر دیا تھا اور زہرا کے آنے سے پہلے درگاہ کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ جب زہرا آ کر اُدھر درگاہ میں چلی جاتی، تب بھی اُس وقت تک باہر ہی بیٹھا رہتا اور زہرا کی واپسی کا انتظار کرتا۔ وہ پلٹ کر واپس چلی جاتی تو میں اپنے گھر کی راہ لیتا۔

ایک ایسے ہی دن، میں تپتی دھوپ میں بیٹھا زہرا کی راہ تک رہا تھا اور جانے کن خیالوں میں کھویا ریت پر آڑی ترجمی لکیریں کھینچ رہا تھا..... کہ اچانک ایک کڑک دار آواز سن کر چونک کر نظریں اٹھائیں۔ کچھ دیر تک تو سورج کی کرنوں سے چندھیائی ہوئی میری نظریں اُس

تمہارا دوست..... عبداللہ

رقیب

اتنی صدیوں کے بعد اُس نازک ادا کے نازک لب پہلے بھی تو ایک شکوے کے لیے.....
غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پلکیں لرز رہی تھیں۔ میری نظر چند لمحوں کے لیے اُس کی
نظر سے ٹکرائی تو اُس نے جھجک کر اپنی پلکیں جھکا لیں۔ ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ مجھ جیسا
سربراہ بیٹھا دیوانہ بھی کبھی کسی کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے.....؟ اور پھر آپ کو بدنام کرنا ہی
میرا مقصد ہوتا تو میں یہاں اس درگاہ کے باہر بیٹھنے کے بجائے آپ کے گھر کے باہر اپنا ڈیرا
جما تا..... یہاں تو آس پاس مجھ جیسے جانے اور کتنے مقدر جلے اپنی اپنی قسمت کی دھوپ
سینک رہے ہیں..... پھر آپ کو مجھی سے شکوہ کیوں ہے.....؟“

وہ غصے سے بولی ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے یہ شکایت کیوں ہے۔ آپ کی
اس ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے امی اتنی پریشان ہو گئی ہیں کہ انہوں نے بستر پکڑ لیا ہے۔ وہ
اتنی بیمار ہیں کہ آج میرے ساتھ درگاہ تک آنے کی طاقت نہیں تھی اُن میں..... آپ کیا سمجھتے
ہیں کہ یہاں آس پاس بسنے والے سبھی لوگ بہرے، گونگے، یا اندھے ہیں، جنہیں کچھ نظر نہیں
آتا.....؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ایک غلط مقصد کے لیے اس درگاہ جیسی پاک
جگہ کا انتخاب کیا ہے..... شاید آپ مجھے زُسوا کر کے اپنی اس ہزیمت کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں جو
آپ کی ناقص رائے میں میرے انکار کی وجہ سے آپ کو اٹھانا پڑی ہے۔“ اُس کے لفظوں کی
کئی آریاں میرے دل پر چل گئیں۔ گویا میری ساری تپیا کو ایک گھٹیا انتقام کا نام دیا جا رہا
تھا۔ وہ ایسا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ میں اپنے جذبے کی تذلیل پر ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ
بھول گیا اور ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل ہی باہر اُلٹ
دیا۔ ”مجھے آپ کی والدہ کی پریشانی اور بیماری کا سن کر نہایت افسوس ہوا ہے۔ کاش میں بھی
آپ کی طرح اپنی اس ساری بربادی کا الزام آپ پر ڈال سکتا۔ لیکن افسوس میں تو اتنا مجبور
ہوں کہ آپ کو مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر خود میرا اختیار نہیں

عبداللہ کی تحریر نے چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی، میرے ہونٹوں کو ایک ہلکی سی
مسکراہٹ ضرور بخش دی تھی۔ اُس نوجوان کو گفتگو کا نایاب فن آتا تھا اور سب سے زیادہ آسانی
اور سہولت سے ہم اگر کسی دوسرے کو کوئی خوشی دے سکتے ہیں تو وہ ہماری باتیں ہی تو ہیں۔ سچ
ہے کہ یہ صرف لفظ ہی ہیں، جو سب کچھ بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں ابھی
عبداللہ کی تحریر کے تانے بانے ہی میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ہی مجھے اُسی تیزی سے پروائی کے
چلنے کا احساس ہوا جو ہمیشہ مجھے زہرا کی آمد کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چونک کر سر
اٹھایا تو اُس زہرا جیہیں کی گاڑی آ کر رُک چکی تھی اور وہ اپنی خادمہ کے ساتھ گاڑی سے اتر کر
سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن آج زہرا کی ماں اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ نہ جانے
کیوں.....؟ میں حسب معمول اور حسب توقع اس انتظار میں اُس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ کب
وہ ہمیشہ کی طرح میری نظر سے بچتی ہوئی اور بنا میری طرف دیکھے، درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتی
ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر تو میرے جسم سے جیسے ساری جان ہی نکل گئی کہ اُس کا رخ سیدھا میری
ہی جانب تھا۔ وہ غصے میں تننائی ہوئی میری جانب بڑھی چلی آئی اور عین سامنے آ کر کھڑی ہو
گئی اور پھر اُس کے یا تو قی لب پہلے..... ”آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں.....؟“ اس
طرح مجھے بدنام کر کے آپ کو کیا مل جائے گا.....؟“

کا فسانہ سناتی تھی کہ ہونہ ہو، معاملہ یہاں بھی کچھ دل کا ہی ہے۔ لیکن آج اُس کی زبانی اس کھلے اقرار نے جیسے میرے وجود کے اندر آگ سی بھردی تھی۔ اس اُن دیکھے رقیب کی رقابت در رشک کے ملے جلے جذبات نے میرے دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ کیا کوئی اس دنیا میں اتنا خوش نصیب بھی ہو سکتا ہے، جس کے لیے زہرا جیسی پری، خود منت مانگنے کے لیے س درگاہ تک چل کر آتی ہے.....؟ وہ گل رُخ تو خود کسی منت کی طرح تھی تو وہ کیسا ہوگا جس کے لیے یہ منت خود اپنے گھٹنے ٹیکے اس درگاہ کی سنگ مرمر کی جالی سے جبین زخمی کرنے ہر ہفتے بلی آتی ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے جس کا پتھر دل اس موم کی لڑکی کی پگھلاتی حالت دیکھ کر بھی نہیں پگھلتا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اوپر سے ایک زائر نے آکر عبداللہ کا پیغام دیا کہ اوپر سلطان بابا آئے ہوئے ہیں اور میرا پوچھ رہے ہیں۔ لہذا میں بھی دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ دھوپ ڈھلنے والی تھی اور درگاہ کے صحن میں سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک سائے میں سلطان بابا، عبداللہ اور حاکم بابا مریدوں کے ہمرٹھ میں بیٹھے نظر آئے۔ زہرا بھی خواتین والی بھیڑ میں سائے بیٹھی نظر آئی۔ سبھی عورتوں نے سخت پردے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عبداللہ نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا اور میں بھی مریدوں کے گروہ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان بابا کوئی درس دے رہے تھے اور اُن کی باز عیب آواز سارے صحن میں گونج رہی تھی۔ ”گویا سارا جھگڑا ہی اس بات کا ہے کہ انسان پہلے وجود میں آیا تھا، یا مذہب.....؟ ڈارون کی تھیوری کہتی ہے کہ انسان کا ارتقا پہلے ہوا اور وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد..... اور جب انسان کی موجودہ ہیئت میں اس کی کرسیدگی ہوئی اور ہاتھوں اور پیروں نے اپنی موجودہ ساخت اختیار کی تو پھر دھیرے دھیرے مذہب کا ارتقا شروع ہوا..... ہم مسلمان حضرت آدم و حوا کی صورت میں اس عقیدے کے قائل ہیں کہ انسان کا وجود ہی مذہب کی وجہ سے ہے اور وہ مذہب کے لیے اس کائنات میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ گویا مذہب انسان کی آمد سے قبل بھی کائنات میں رائج تھا اور جن اور فرشتے اپنی عبادت کے ذریعے اس مذہب کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے۔

۔ درو دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کز و بیاں“

ہے۔ مجھے کون سا جذبہ کھینچ کر یہاں لا بٹھاتا ہے، میں خود اس سے اب تک اُن جان ہوں کاش میرا اپنے آپ پر کوئی اختیار ہوتا تو میں کبھی خود کو یوں سر بازار رُسوانہ ہونے دیتا۔“ مزید زچ ہو گئی۔ ”لیکن یہ تو زبردستی ہے۔ آپ کا جذبہ کسی دھونس دھمکی کی طرح میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ بات اگر اختیار کی ہے تو میں خود بھی بے اختیار ہوں اور آپ میرا بے خودی کے راستے میں زبردستی آکھڑے ہوئے ہیں۔“ مجھے اُس کم گو سے اتنی بات کی اُمید بھی نہ تھی لیکن خلاف توقع اُس کے پاس لفظوں کا ذخیرہ وسیع تھا۔ ”آپ میرے سوال جواب دے دیں، میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گا۔“ لیکن اُس نے بھی جیسے میری ضد سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے اپنی شرط منوانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ”ٹھیک ہے لیکن آپ کو مجھ ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے جواب کے بعد آپ کوئی دوسرا سوال نہیں کریں گے اور آئندہ میری راہ میں اپنے کسی جذبے کی دیوار نہیں کھڑی کریں گے۔“ میں جانتا تھا کہ وہ کسی ہم جواب سے پہلے میرے ارد گرد اپنے بھرم کا آہنی قلعہ ضرور تعمیر کرے گی لیکن اُس کی بات مار لینے کے علاوہ اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے..... میں وعدہ کرتا ہوں۔“ ہمارے ارد گرد زائرین کا ہجوم سیڑھیاں چڑھ اور اتر رہا تھا اور آس پاس عصر وقت درگاہ پر دی جانے والی ایک مخصوص جڑی بوٹی کا دھواں پھیلنا ہوا تھا۔ ہم اتنی دیر وہیں درگاہ کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے لیکن وہاں کسی کو ہم پر توجہ دینے کی فرصت کہاں تھی۔ زہرا نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال کر اُسے پوری طرح ڈھک لیا۔ ”میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے رشتے سے انکار کی وجہ آپ کی ذات میں کوئی کمی، یا خرابی نہیں ہے۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں اور کسی بھی لڑکی کی خوش بختی ہوگی کہ وہ آپ کے گھر کی بہو بن سکے لیکن میری قسمت میں کاتب تقدیر نے یہ سکھ نہیں لکھا میری نظر میں کوئی اور سا چکا ہے اور دل کے سودوں میں زبردستی نہیں چلتی ساحر صاحب اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا اور اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ میرے دل پہ جیسے ایک ہی لمحے میں کئی قیامتیں آکر گزر گئیں۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہا اور وہ جانے کب کی سیڑھیاں چڑھ کر آگے بڑھ چکی تھی، حالانکہ میں گزشتہ کئی ہفتوں سے اُن یہاں اپنی کسی منت کے سلسلے میں آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اُس کی حالت ابتر، خود اُ

بہت ضروری ہے، یاد رہے کہ کسی کو پالینا کبھی کبھی اُس کو کھودینے سے بڑا غم ہوتا ہے..... دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ وصل، خدائی سے بڑا المیہ ہے۔“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ کتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی انہوں نے اور کہیں اُن کا اشارہ میری جانب ہی تو نہیں تھا۔ اسی لمحے سلطان بابا نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ وہ مجھ سے بولے ”ساحرمیاں.....! شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ تو گویا میرا نام بھی انہیں زبانی یاد تھا۔ میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے حسب معمول گریز کیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ انہیں میرے اندر کی بات کا علم کیسے ہو گیا۔ ”جی..... یونہی..... اچانک دل میں کچھ خیال آ گیا تھا، آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں؟“ سلطان بابا نے سر ہلایا۔ ”بسم اللہ.....!“ میں نے دُور بیٹھی زہرا کی جانب دیکھا، وہ سر پر چادر ڈالے جھکے سر بیٹھی تھی۔ میں نے سینے کا غبار باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کلام کسی اور کا تھا لیکن معنی میرے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
اک شخص کو دیکھا تھا
تاروں کی طرح ہم نے
اک شخص کو چاہا تھا
اپنوں کی طرح ہم نے
اک شخص کو سمجھا تھا
پھولوں کی طرح ہم نے
کچھ تم سے ملتا تھا
باتوں میں، شبابت میں
ہاں تم سا ہی لگتا تھا
شونی میں، شرارت میں
دکھتا بھی تمہی سا تھا
دستور محبت میں

میں بہت غور سے سلطان بابا کی باتیں سنتا رہا، جس خوب صورتی سے انہوں نے ڈارو کے نظریے اور مذہب کی آمد کے بارے میں دلائل دیئے تھے، وہ اُن کے وسیع مطالعے کا بڑا مظہر تھی۔ میں جب سے اس درگاہ میں آ جا رہا تھا، عبد اللہ اور سلطان بابا جیسے نہ جانے کون سے ”پُر اسرار بندوں“ سے اب تک میرا سامنا ہو چکا تھا جو بظاہر سیدھے سادے لیکن اندر سے کم سمندر سے بھی زیادہ عمیق اور گہرے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا بھیڑ میں سے ایک ماڈرن وضع کا لیکن بہت جوشیلا نوجوان اُٹھا اور اُس نے پہلا سوال دا دیا۔ ”حضرت آپ کی باتیں اپنی جگہ بجا لیکن ہمارے مذہب میں تو شرک کو گناہ عظیم سے بڑا عظیم تر گردانا گیا ہے تو پھر کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان درگاہوں پر آ کر منتیں مانگنا اور چادریں چڑھانا بھی اُسی شرک کے زمرے میں آتا ہے؟“ ”ٹھیک کہا تم نے..... جو لوگ یہاں اس نیت سے آتے ہیں کہ یہاں قبر میں سویا بزرگ ہی اُن کا مشکل کشا ہے اور وہی اُن کا دادرسی کرے گا تو وہ واقعی اس گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جسے ”شرک“ کہا جاتا ہے خدا انہیں اس گناہ کبیرہ سے بچنے کی توفیق عطا کرے۔ ہاں البتہ جو لوگ اس آس پر یہاں آ کر گڑگڑاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ایک عاجز بندے کے آستانے پر اس اُمید پر آئے ہیں کہ اللہ یہ نیک بندہ، جو اس قبر میں آنکھیں بند کیے پڑا ہے، شاید اسی کے وسیلے اور سفارش سے اللہ کی بھی سن لے گا اور اُن کی حاجت روا ہوگی تو ایسی حاضری میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں کہ بہر حال میرا، تمہارا، اس درگاہ میں دفن اس نیک بندے کا اور ہم سب کا مالک ایک ہی۔ میرا اللہ.....“

نوجوان کے تپتے ہوئے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس کی آنکھوں میں سختی کا ایک سلطان بابا کے لیے عقیدت میں بدل گئی۔ پھر کچھ اور معمول کے سوال کیے گئے اور اس سے پہلے کہ سلطان بابا دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے، عورتوں کی بھیڑ میں سے زہرا کی خان نے ہلکے سے سلطان بابا کے خاص مرید کے کان میں کچھ کہا۔ مرید نے اُٹھ کر سلطان بابا کے عرض کی۔ ”اللہ کی ایک بندی آپ سے اپنے لیے خاص دعا کی منتی ہے۔“ سلطان بابا کے چہرے پر بھر سے ایک مبہم سی مسکراہٹ اُبھری اور انہوں نے غور سے خادمہ کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”میری دعاؤں میں اثر ہوا تو ضرور قبول ہوں گی۔ بہر حال ایک بات ابھی سے جان!

اچانک پیچھے سے ایک آواز اُبھری۔

۔ کھلتا کسی پہ کیوں، میرے دل کا معاملہ

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

میں چونک کر مڑا۔ درگاہ کے صحن کے عین وسط میں سلطان بابا اپنی وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے کھڑے تھے۔ ”ساحرمیاں.....! واپس چل دیئے.....؟ تم سے ایک ضروری کام تھا مجھے۔“ سلطان بابا کو بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا.....؟ میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے خدشے اُبھرے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میری جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر ہی جیسے جم سا گیا۔

وہ شخص، ہمیں اک دن
غیروں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ
ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چوکنے ہو
کب ذکر تمہارا ہے؟
کب تم سے تقاضا ہے؟
کب تم سے شکایت ہے؟
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

میں ایک جذب کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہتا گیا۔ جب ہوش آیا تو ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ زہرا اسی طرح سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور باقی سارے مرید بھی خاموش تھے۔ پھر سلطان بابا کی ہلکی سی کھنکار نے ہی اس سکوت کو توڑا اور انہوں نے دھیرے سے زیر لب ”سبحان اللہ“ بھی کہا اور پھر محفل برخواست ہوتے سے پہلے حتمی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ باقی لوگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور مختصر سی دعا کے بعد سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ وہ خوش ادا بھی اپنی تمام تر نزاکت کے ساتھ سلطان بابا سے دعائیں لیتی ہوئی قدم بڑھا گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل جیسے کٹ سا گیا۔ من میں آیا کہ حوڑ کر ایک بار پھر سے اُس کی راہ کی ڈھول بن جاؤں اور اُس سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے انہی نازک قدموں تلے روند کر برباد کر ڈالے لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے خود ہی اُس سے اپنے جنوں کے سامنے بند باندھنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں درگاہ کا صحن تقریباً خالی ہو گیا۔ میں بھی ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اٹھا اور عبداللہ سے اجازت لے کر واپسی کے لیے پلٹ کر چل دیا۔

پہلی کھوج کا خضر

میں ابھی تک اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر ایسی کون سی ضروری بات ہو سکتی ہے اور پھر میں بھلا سلطان بابا کے کس کام آ سکتا تھا۔ سلطان بابا نے غالباً میرا چہرہ پڑھ لیا..... ”تم سوچتے بہت ہو ساحر میاں..... لیکن شاید تمہیں ابھی تک سپردگی کی طمانیت کا اندازہ نہیں ہے.....“ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ”سپردگی کی طمانیت.....؟“ ”ہاں میاں..... جو سکون اور اطمینان خود کو دوسرے کے فیصلے کے سپرد کر دینے میں ہے..... وہ بھلا اپنی جدوجہد اور کوشش میں کہاں..... بہتر یہی ہے کہ کسی کو اپنا راہبر مان لو اور پھر اُسی خضر کی راہ پکڑ لو.....“ ”کاش میں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوتا، جنہیں ایسے راہبر میسر آتے ہیں، یہاں تو میری منزل ہی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی تو میں اپنی راہ بھی نہیں ڈھونڈ پایا، راہ خضر تو بہت دُور کی بات ہے۔“ سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے میری آنکھوں میں جھانکا ”تمہارے اندر بڑی کھوج ہے اور تمہاری یہ کھوج تمہیں تمہاری اصل راہ سے زیادہ دیر تک دُور نہیں رکھ پائے گی..... میرا ایک کام کرو گے.....“ ”جی حکم کیجیے.....“ ”اگلی جمعرات کو ایک دن کے لیے میں عبداللہ کو اپنے ساتھ کسی خدمت پر لے جانا چاہتا ہوں کیا تم اگلی جمعرات یہاں درگاہ پر چند گھنٹے کی ڈیوٹی دے پاؤ گے..... کام کچھ زیادہ سخت نہیں ہے..... کچھ مستقل حاجت مند ہیں جو ہر ہفتے درگاہ میں حاضری دیتے ہیں، اُن تک کچھ خاص ہدایات پہنچانی ہوں گی۔ کچھ نذر نیاز جو جمعرات کو یہاں جمع ہوتی ہے اُسے مستحق لوگوں میں بانٹنا ہوگا اور کچھ اور اسی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینا ہوں گے۔ اگر تمہاری اگلی جمعرات کو کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو.....“ ”جی ضرور میں اگلی جمعرات کو صبح سویرے حاضر ہو جاؤں گا۔“ سلطان بابا خوش ہو گئے۔ ”شاباش..... لیکن جمعرات سے پہلے کسی ایک دن اگر عبداللہ سے ساری ہدایات اچھی طرح سمجھ لینا۔“ سلطان بابا مجھے دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سیڑھیوں سے نیچے اپنی کار کے قریب یعنی کوکھڑا

دیکھ کر شپٹا سا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور ہمارا سنگم درگاہ کی سیڑھیوں کے وسط میں ہوا۔ یعنی کچھ دیر تک چپ چاپ میری اتر حالت، بڑھی ہوئی شینو اور شکنوں بھر الہا س دیکھتی رہی۔ ”میں جانتی تھی تم مجھے یہیں ملو گے۔“ میں نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے مسکرا کر اُسے چھیڑا، ”اور میں جانتا تھا کہ تم مجھے ضرور ڈھونڈ لو گی.....“ لیکن یعنی کے چہرے کرب کم نہیں ہوا۔ ”ڈھونڈ ہی تو نہیں پائی تمہیں..... بس ہر لمحہ کھوتی ہی گئی..... اور آخر کار تمہیں مکمل کھو ہی دیا.....“ ”لیکن میں تمہیں ان لوگوں میں نہیں سمجھتا عینی..... جو محبت کو بھی صرف سود و زیاں ہی کا سودا سمجھتے ہیں..... کبھی کبھی تو یہ درد بھی بن مانگے نہیں ملتا..... کبھی فرصت ملے تو بیٹھ کر سوچنا کہ ہماری دوستی میں تم نے کیا صرف کھویا ہی ہے.....؟“ ”یعنی نے ایک لڑ سا سانس لیا۔“ اُدھوری خوشی کبھی کبھی مکمل غم سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے ساحر..... بہر حال تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر اچھا لگا..... شاید یہ بھی اُس ہستی کی دین ہے..... میں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مر رہی ہوں، ضرور وہ کوئی پری زاد ہوگی جس کے لیے تم جیسے شخص نے بھی زمانے سے جوگ لے لیا ہے..... مجھے کب ملو اؤ گے اُس سے.....؟“ ”ضرور ملو اؤں گا..... پہلے وہ مجھے تو شرف قبولیت بخش دے۔“ ”لیکن شاید تب تک بہت دُور ہو جائے ساحر..... میں نے کینیڈا کا اسکا لرشپ حاصل کر لیا ہے۔ اگلے ہفتے میری روادا گئی ہے۔ میں اس ماحول، ان یادوں اور خود اپنے آپ سے کچھ عرصے کے لیے فرار چاہتی ہوں۔“ ”یعنی بولتے بولتے سسک پڑی۔ مجھ سے بھی کچھ نہ بولا گیا۔ یہ محبت بھی کتنا عجیب جذبہ ہو ہے لوگ خوشی پانے کے لیے اس جذبے پر اپنے دل کے دردا کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی روتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی پھر وہاں زیادہ دیر تک نہیں پائی اور مجھ سے رخصت ہو کر پلٹ گئی۔ میں اُس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں ساحل پر بیٹھ کر سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا۔ یہ سورج کتنا خوش تھا۔ ہر روز ڈوبنے کے بعد اگلی صبح اُسے نئی زندگی مل جاتی تھی لیکن میری قسمت کا تارا تو کچھ ایسا ڈوبا تھا کہ اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں رات دیر گئے گھر پہنچا تو ڈاکٹر یزدانی کی گاڑی کو باہر نکلتے دیکھ کر ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔ ماما کو سخت بخار تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ میری وجہ سے جس شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھیں، اس کا نتیجہ کچھ تو نکلتا ہی تھا۔ اُس رات میں اور پایا سونے تک اُن کے سر ہانے ہی

بیٹھنے نہیں دوں گا..... اتنا بھروسا ضرور رکھیے گا مجھ پر.....“ انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”میں جانتا ہوں..... اور مجھے تم پر پورا اعتبار ہے.....“ ہم تقدیر کو کتنی آسانی سے اپنی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کا الزام دیتے رہتے ہیں لیکن کبھی تقدیر سے ان نعمتوں کی وجہ سے پیار نہیں کرتے جو اس نے ہماری زندگی میں قدم قدم پر فراہم کر رکھی ہوتی ہیں۔ میرے ماں باپ بھی تو قدرت کی ایک ایسی ہی نعمت تھے، جن کے بدلے قدرت کا ہر قسم گوارا تھا۔ مجھے اگر میرے ماں باپ کا اتنا پیار، اتنا حوصلہ نہ ملا ہوتا تو زہرا کی بے رخی شاید بہت پہلے مجھے توڑ چکی ہوتی۔

اگلے دن میں نے درگاہ جا کر عبداللہ کو سلطان بابا کی دی ہوئی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا اور اُس سے جمعرات کے معمولات کی تفصیل بھی معلوم کی۔ مجھے صبح سویرے درگاہ پہنچنا تھا اور معمول کے چند کام مثلاً درگاہ کے زائرین کے لیے پانی بھرنا، پودوں کو پانی اور پرندوں کو دانہ وغیرہ ڈالنا، جمعرات کے لنگر کے باورچیوں سے اپنی نگرانی میں کھانا بخانا وغیرہ وغیرہ اور ایسے بہت سے دیگر چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دینا تھے۔ لیکن عبداللہ نے سب سے اہم ذمہ داری کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔ عصر کی نماز کے بعد درگاہ پر آنے والے زائرین کے نذرانے عبداللہ اپنے حجرے میں وصول کرتا تھا۔ مرد دروازے سے اندر آ کر اور عورتیں لکڑی کی جالی والی کھڑی کے پیچھے سے اپنے نذرانے جمع کرواتی تھیں، جنہیں اُسی وقت مستحقین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس جمعرات کی شام مجھے یہ تمام نذرانے وصول کرنے تھے۔ نقدی کی فہرست بنانا تھی اور باقی تحائف کو الگ کر کے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے مطابق تقسیم کرنا تھا۔ کچھ مستحقین تو خود اپنا حصہ وصول کرنے درگاہ کے احاطے میں جمع ہو جاتے تھے اور کچھ لوگوں کو بذریعہ ڈاک اُن کا حصہ بھیجا ہوتا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ اس فہرست میں چند لوگوں کی تنخواہ کا ذکر بھی تھا۔ یا میرے خدا..... یہ کیسا نظام تھا۔ یہ کون لوگ تھے جن کی تنخواہ ایک اجنبی ہاتھ اور ایک انجانے منتظم کے تحت بنتی تھی۔ دولت کی تقسیم کا یہ کیسا نظام تھا.....؟

آخر کار جمعرات کا دن بھی آپہنچا۔ میں صبح سویرے ہی بنا کسی کو بتائے اپنی گاڑی میں درگاہ آ گیا تھا۔ عبداللہ اور سلطان بابا مجھ سے بھی پہلے اپنے سفر پر نکل چکے تھے۔ جاتے جاتے

بیٹھے رہے اور مجھے ماما سے بہت سے جھوٹے وعدے بھی کرنے پڑے۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ اُن کے جگر کا ٹکڑا اُن کا دل بہلانے کے لیے اُن کی ہر بات پر ”ہاں“ کہتا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی اُس کی ہر ”ہاں“ پر اُن کا دل، اُن کے چہرے کی طرح کھلا جاتا ہے۔

ماما کے سونے کے بعد پاپا میرے ساتھ ہی ٹیڑس پر چلے آئے۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے دل و دماغ میں اُس وقت کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی، لیکن حسب معمول اُن کے چہرے پر وہی مہربان سا سکوت طاری تھا، جیسے کوئی گہرا سمندر، جو اپنی تہ میں جانے کتنے طوفان اور کتنے بھنور چھپائے ہوئے ہوتا ہے لیکن اپنی سطح پر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتا آخر وقت تک نہیں چلنے دیتا۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ ”ہاں یگ مین..... تمہاری جنگ کیسی جا رہی ہے؟ اُس پتھر دل پر کچھ اثر ہوا کہ نہیں.....؟“ میں بھی اُن کا سوال سن کر مسکرا دیا۔ ”کچھ جنگیں دنوں میں نہیں..... جنموں میں جیتی جاتی ہیں پاپا..... لیکن اس بات کا اطمینان ضرور رکھیے کہ آخری جیت آپ کے سپوت ہی کی ہوگی.....“ ”میں جانتا ہوں..... میرے بیٹے نے ہارنا نہیں سیکھا..... لیکن جانے کیوں اس بار مجھے شکست سے بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے.....“ میں نے چونک کر پاپا کی جانب دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں کسی اُن دیکھے خوف کی پرچھائیاں سرزاں تھیں۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں پاپا..... شاید میں آپ کے خوابوں کی تعبیر ثابت نہیں ہو سکا..... آپ کے کسی کام نہیں آ سکا..... آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ.....“

پاپا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ”نہیں..... بالکل نہیں..... میں، یا تمہاری ماما ایسا کچھ بھی نہیں سوچتے..... اولاد ہمیشہ ماں باپ کے خوابوں کی بھیمنٹ چڑھنے کے لیے ہی تو نہیں ہوتی..... ہم تو بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے تمہاری خوشی کہیں بھی ہو.....“ بولتے بولتے پاپا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس لمحے مجھے اُن پر بے حد پیار آیا اور میں نے بڑھ کر انہیں زور سے گلے لگا لیا۔ خود میری آواز بھی بھرا سی گئی۔ ”پاپا..... میں کیا کروں..... مجھے اُس کے علاوہ اب اور کچھ سوچنا ہی نہیں..... کوئی اور لہجہ ہی نہیں..... میں اتنا بے بس تو کبھی بھی نہیں تھا..... لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوں گا، جو اس راہ پر ناکامی کے بعد بھٹک کر کہیں کھو جاتی ہے..... میں ان اندھیروں میں اپنی روح کو کبھی

جائے..... کچھ دیر تو میں بالکل خالی الذہن سا کھڑا حجرے کی دیواروں کو تکتا رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک جانب ایک نیچی سی لکڑی کی کھڑکی بنی ہوئی تھی، جو باہر برآمدے کی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بانس کے موٹے ٹکٹوں والی چک پڑی ہوئی تھی۔ غالباً یہ وہی کھڑکی تھی جو خواتین کی نذر کے لیے مخصوص تھی، تبھی پردے کا ایسا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اور ایک جانب چند دینی اور کچھ معلوماتی کتب لکڑی کے ایک شیلف پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کی صراحی اور چھت سے لگے ہوئے مورچھل (ہاتھ سے چلنے والے پٹکے) کے علاوہ حجرے میں مزید کوئی سامان نہ تھا۔ کمرہ ٹکانے کے لیے زمینی دری کے اوپر دیوار کے قریب ایک تکیہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کو نکالا اور ایک بار پھر غور سے تمام ہدایات کو دہرایا۔

کچھ ہی دیر میں زائرین کی آمد شروع ہو گئی اور میں اُن کے دیئے ہوئے نذرانوں کی فہرست بنانے میں مشغول ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں اچھی خاصی رقم بھی جمع ہو گئی تھی۔ پھر مردوں کا بھوم چھنا تو کھڑکی کے قریب سے عورتوں کی بھانت بھانت کی بولیوں شروع ہو گئیں۔ کسی کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا تو کوئی ناخلف اولاد سے متشکر تھی، کسی کو بیٹے کی شادی کی جلدی تھی تو کوئی ارمانوں سے لائی گئی بہو کے ہاتھوں نالاں تھی۔ کوئی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی تو کوئی پریشانی کی وجہ سے۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق لکڑی کی چک کی چلن کی دوسری جانب سے انہیں صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا جا رہا تھا اور غالباً عورتیں اب تک مجھے عبداللہ ہی سمجھ رہی تھیں۔ عورت اپنا نام بتاتی، اپنی نذر کھڑکی سے اندر بڑھاتی اور میں عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے حساب سے اُس عورت کا نام پڑھ کر اُسے ہدایت، یاد دعا کرنے کی تدبیر بتاتا جاتا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ بظاہر اوپر سے ہنسی کھیلتی اور خوش حال دنیا تو اندر سے بے حد زخمی اور بہت دکھی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سبھی کے ڈکھ تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ میں خواتین کو ہدایات جاری کرتے ہوئے ہی کچھ چھپتی ہوئی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ یکا یک کھڑکی کے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری ”آداب.....“ دفعۃً وہی ٹھنڈی سی پروائی چلی اور میرا سانس میرے سینے میں انک سا گیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی اور میرے سارے لفظ ایک لمحے میں ہی کہیں کھو گئے۔ وہ دھیرے سے دوبارہ کھنکھاری۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

بھی عبداللہ میرے لیے پورا ہدایت نامہ لکھ گیا تھا۔ میں نے معمول کے تمام کام سہ پہر ہونے سے پہلے ہی پڑا دیئے۔ میں کئی ہفتوں سے اس درگاہ میں آ رہا تھا لیکن آج تک میں نے کبھی عبداللہ کا حجرہ اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ چھوٹا سا حجرہ درگاہ کے مرکزی صحن سے بہت ہٹ کر تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ عبداللہ سے میری ملاقات عموماً باہر ہی ہو جاتی تھی۔ لیکن آج چونکہ مجھے عصر کے وقت سے اسی حجرے میں نذر اور نیاز وصول کرنی تھی لہذا میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے ہی درگاہ کے برآمدے میں بنی لکڑی کی جالیوں سے پرے اس حجرے کو ایک نظر دیکھ ہی آؤں اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی جیسے ہی میں برآمدے میں بنی جالیوں کو پار کر کے حجرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو یکا یک میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور اچانک ہی یہ اجنبی ماحول مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہونے لگا اور پھر جیسے ہی میں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو لمحے کے ہزاروں حصے سے بھی شاید کچھ پہلے مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے میں اس حجرے میں پہلے بھی کبھی آ چکا ہوں، پھر تو ذہن میں جلتی بجھتی روشنیاں کچھ اتنی تیزی سے لپکتی لگیں کہ چند لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ سب مجھے یاد آنے لگا کہ میری ایسی حالت تو اُس دن بھی ہوئی تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تھا۔ جب میری پہلی نظر عبداللہ پر پڑی تھی اور جب پہلی مرتبہ سلطان بابا نے مجھے درگاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا..... ہر دفعہ مجھے کچھ یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے میرے ساتھ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آ چکا ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے ذہن کو جھٹک کر خود کو یہ تسلی دے دی تھی کہ ایسا تو کم و بیش ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب اُسے کوئی واقعہ، کوئی بات اور کوئی جگہ، یا کوئی شخصیت پہلی مرتبہ ملنے، یاد دیکھنے کے باوجود جانی پہچانی لگتی ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ہمارے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کے منہ سے نکلنے والی بات بھی چند لمحے پہلے جان لیتے ہیں۔ مجھے تو یہ تحت الشعور اور لا شعور کا کوئی معمول کا کھیل لگتا ہے، لہذا میں نے حسب معمول ان باتوں پر دھیان دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے حجرے میں داخل ہوتے ہی وہ انجانا احساس اس شدت سے مجھ پر حملہ آور ہوا کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے حواس ہی میں نہ رہ سکا۔ لیکن جتنی تیزی اور شدت سے مجھ پر اس کیفیت کا غلبہ ہوا تھا، اتنی ہی جلدی وہ جھماکا ختم بھی ہو گیا، جیسے بارود کا کوئی ڈھیر جو ایک ہی چنگاری سے لمحوں میں بھسم ہو

میں کوئی اور نہیں بلکہ خود عبداللہ ہی بسا ہوا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا، ایسا عظیم فریب تو کسی جانی دشمن نے بھی نہ دیا ہوگا کسی کو..... پھر عبداللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟؟؟

زہرا جانے کب اُٹھ کر جا چکی تھی۔ حسد، جلن اور کرب کے طوفان نے میری آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چلاؤں کہ یہ ساری کائنات ہی پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس لفافے پر نظر ڈالی جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا نے مجھے تھمایا تھا۔ بہت سے بڑے کرنسی نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پرچی لفافے سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں پرچی باہر نکالی اور اپنی سلتگی ہوئی نظریں اس ستم گر کی شستہ تحریر پر گاڑ ڈیں۔ پرچی پر صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

میرے جسم کو سیدہ میں ڈرا جو جان باقی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا کوئی امکان باقی ہے

وہ چاہے زانستہ بدلے، چاہے رابطہ بدلے
اُسے مجھ سے محبت ہے، میرا ایمان باقی ہے

مجھے یوں لگا جیسے وہ لفظ نہیں، چھوٹے چھوٹے سے سنبولے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پرچی واپس پھینک دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔

پڑنے لگے۔ ہاں..... یہ تو وہی تھی۔ میں نے جلدی سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست پر نظر ڈالا لیکن اُس میں مجھے زہرا کا نام، یا اُس کے لیے کوئی بھی ہدایت لکھی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میر نے چلمن سے ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ ہاں..... وہی تو تھی صرف ایک دیوار کے فاصلے پر مجھ سے اتنا قریب کہ میں اُس کی سانس لینے کی مہم آواز بھی سن سکتا تھا۔ ایک لمحے کو میرا جہا کہیں وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن میرے قدموں نے تو میرے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا، بھاگ کر کہاں جاتا؟ زہرا بھی دوسری عورتوں کی طرح یہی سچ رہی تھی کہ کھڑکی کے پار عبداللہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چند لمحوں تک جواب کا انتظار کرتی رہی اور پھر دھیرے سے اپنی جھرنوں جیسی سنگتاتی آواز میں بولی۔ ”ہماری نیاز قبول فرمائیں۔“ میں نے چونک کر دیکھا تو اُس کا مخروطی ہاتھ چلمن سے اندر جھانک رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اُس کے ہاتھ میں پکڑا خط کے لفافے جیسا چھوٹا سا لفافہ لے لیا۔ شاید لفافے میں کرنسی نوٹ تھے میری زبان سے صرف ایک لفظ ہی نکل پایا ”شکریہ.....“ دوسری جانب سے اُس کی دل میں سیدھا اتر جانے والی آواز اُبھری۔ ”میں آج بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں.....“ یا خدا..... یہ کس سوال کی بات کر رہی تھی.....؟ اب میں اُسے کیا جواب دوں..... عبداللہ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی۔ باقی سب کے بارے میں تو اُس نے اتنی تفصیل سے مجھے بتا دیا تھا، پھر زہرا کے بارے میں بتانا کیسے بھول گیا وہ.....؟ مجھے اور تو کیا سوچھا نہیں بس بلکہ سے کھانس کر میں نے اپنے ہمہ تن گوش ہونے کا پیغام اُس تک پہنچا۔ کی کوشش کی۔ اس بار مجھے زہرا کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی محسوس ہوئی، جیسے وہ بے حد کرب میں بول رہی ہو۔ ”میں جانتی ہوں..... آپ کے پاس میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں..... میں آج بھی ہمیشہ کی طرح یہاں سے ناکام اور نامراد ہی واپس پلٹوں گی.....“ آپ کی چپ ہی میرا مقدر ہے تو مجھے یہ خاموشی بھی قبول ہے..... لیکن ایک بات تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں..... میں عمر بھر آپ کی اس چوکھٹ پر اپنا سر پختی رہوں گی لیکن کسی کے خیال کو اپنے من کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گی۔ آپ سے محبت کی اگر یہی سزا ہے میں اسے بھی اپنے لیے جزا ہی سمجھوں گی.....“ میرے دل و دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے اور سارا کرا بلکہ ساری دنیا ہی مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تو گویا اس زہرا جیوں کے

دورِ جنوں

دن مجبوراً مجھے پاپا کو اعتماد میں لینا پڑا کہ میرا اگلے دن یعنی جمعرات کی شام کو درگاہ جانا بے حد ضروری ہے لیکن پپا نے بھی اس مرتبہ ماما کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ آخر کار خوب بحث و مباحثے کے بعد وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ ماما سے مجھے درگاہ جانے کی اجازت دلوانے کی کوشش کریں گے لیکن صرف اور صرف اس شرط پر کہ وہ بھی میرے ساتھ جائیں گے، کیوں کہ اب وہ مجھے وہاں اکیلے بھیجنے کا رسک لینے پر تیار نہیں تھے۔ میرے پاس اُن کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب ماما کو ہم دونوں باپ بیٹے کے ارادوں کا پتا چلا تو انہوں نے تو آسمان ہی سر پر اٹھا لیا۔ وہ پپا پر بہت ناراض ہوئیں کہ انہوں نے ہی مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے جنگ بندی کا اعلان ہوا لیکن تب تک یہ طے پا چکا تھا کہ پپا کے ساتھ اب ماما بھی درگاہ کے لیے ہماری ہم رکاب ہوں گی، کیوں کہ اب وہ کسی صورت بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ہم تینوں کو پپا کے ڈرائیور نے درگاہ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور ڈور بھيڑ سے پرے مجھے زہرا کی گاڑی بھی کھڑی نظر آگئی۔ میں نے یہاں آنے کے لیے جمعرات کے دن تک کا یہ انتظار صرف اسی لیے کیا تھا، کیوں کہ میرا ارادہ زہرا کے سامنے عبداللہ سے بات کرنے کا تھا تا کہ اُسے مزید کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر زائرین کی بھیڑ میں گھرے سلطان بابا پر پڑی۔ میں نے ماما اور پپا کو انہیں سلام کرنے کی غرض سے اُس طرف بھیج دیا اور خود عبداللہ کے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ زہرا بھی حجرے کی بچھلی جانب لکڑی کی جالیوں والی چلمن کے برآمدے ہی میں موجود ہوگی۔ میرا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا تھا۔ میں یہ ساری لا حاصل کوشش کیوں کر رہا تھا؟ جب وہ خود میرے نصیب ہی میں نہ تھی تو پھر وہ چاہے کسی کا بھی مقدر ہو۔ اس بات سے میری کالی قسمت کا لکھا ڈھل تو نہیں سکتا تھا۔ جیسے جیسے حجرے کا دروازے قریب آتا گیا، میرے قدم بالکل ہی بے جان ہوتے گئے۔ آج اس جانب مرد حاجت مندوں کی بھیڑ بالکل ہی مفقود تھی۔ شاید میں بہت جلدی آ گیا تھا، یا پھر مجھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر خیالات کی یلغار روکی اور جیسے ہی حجرے کے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا، عبداللہ کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ دوسری جانب کھڑکی

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے ہی گھر میں بستر پر پسینے میں شرابور پڑا تھا۔ ماما، پپا اور ڈاکٹر یزدانی سمیت چند ڈاکٹروں کی ٹیم میرے سر ہانے کھڑی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو ماما نے جلدی سے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر زبردستی واپس لٹا دیا۔ ”لینے رہو میری جان..... پورے چھتیس گھنٹے کے بعد تمہیں مکمل ہوش آیا ہے۔ اب اگر تم نے بستر چھوڑا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔“ ۳۶ گھنٹے..... یا میرے خدا..... ابھی چند لمحے پہلے ہی تو میں درگاہ سے اپنی بیگی اور جلتی ہوئی آنکھیں لے کر دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا۔ میرا ارادہ زہرا کو روکنے کا تھا لیکن اُس کی گاڑی میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اپنی گاڑی اشارت کی تھی اور میں کب اور کیسے اپنے گھر کے پورچ تک پہنچا تھا۔ بعد میں ماما نے بتایا کہ میں گاڑی سے نکلے ہی لہرا کر وہیں پورچ میں ہی گر پڑا تھا اور تب سے لے کر اب تک میرے بے ہوشی کے وقفے گہرے ہی ہوتے گئے تھے۔ گویا آج ہفتے کا دن تھا اور میں جمعرات کو درگاہ سے نکلا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی سے وقت کے قیمتی لمحے کچھ اس طرح سے بھی چوری ہو جاتے ہیں کہ وہ بس شیشا تا ہی رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ تھا اور پھر اگلے تین چار دن تک ماما نے میری کچھ ایسی سختی سے نگرانی کی کہ میں واقعی بستر سے قدم تک نیچے نہ دھر سکا۔ لیکن میری رگوں میں جو انگارے بھر چکے تھے، میں اُن کا کیا کرتا؟ مجھے ہر حال میں عبداللہ سے ملنے جانا تھا۔ میں اُس دھوکے باز انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر زہرا خود اُس کی محبت میں مبتلا تھی تو پھر اُس نے آخر میرے ساتھ ہی چوہے ملی کا کھیل کیوں کھیلایا؟ میری پُر خلوص دوستی کا مذاق کیوں اڑایا؟ اگر وہ پہلے دن مجھے یہ بات بتا دیتا تو میں زہرا کی دیوانگی میں اتنا آگے تو نہ بڑھتا۔ یہ اور اس جیسے جانے کتنے سوالات تھے، جن سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن اس بارم اور پاپا کا پہرہ اتنا کڑا تھا کہ اُن کے علم میں لانے بنا میرا پلک جھپکنا بھی محال تھا۔ لہذا چوتھے

سکوت توڑا۔ ”سچ کہوں تو پہلے مجھے زہرا کی محبت کا راز جان کر بہت برا لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہو، میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہو۔“ عبداللہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ”اور اب..... اب تمہارے خیالات کیا ہیں، اس بارے میں۔“ ”اب مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے تم بھی مجبور ہو، میری طرح، بے حد مجبور۔ میں زہرا کی محبت میں مبتلا ہوں، زہرا تمہارے عشق میں گرفتار ہے۔ تم کسی اور کی چاہت کے حصار میں ہو۔ شاید کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ لیکن تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اس میں کیا بعید ہے۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پایا۔“ عبداللہ نے ایک گہری سی سانس لی۔ ”سب سے پہلے طے ہوتا ہے ہماری مرضی کہاں چلتی ہے۔ تمہارا اس درگاہ میں آنا، زہرا سے ملنا، محبت کے اس کانٹوں بھرے جنگل سے گزرنا، یہ سب کچھ طے ہی تو تھا، رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔“

عبداللہ نے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی اور زہرا کی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی کہانی سنا دی تھی۔ عبداللہ جس یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کر رہا تھا، زہرا بھی اسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ لیکن اس کا داخلہ چونکہ کچھ دیر سے ہوا تھا لہذا اس کے استاد نے اس کی کلاس کے ایک لڑکے یعنی عبداللہ کو اس کی مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے علم اور اس کے شائستہ اطوار نے زہرا کے دل میں کمی اور ہی جذبے کو ہوا دے دی اور وہ تنہا ہی بہت جلدی گئی۔ پھر شاید زہرا نے روایتی حجاب، یا پھر اپنے حسن کے بھرم میں اقرار کرنے میں کچھ دیر لگا دی۔ عبداللہ کو اپنے والد کی موت کی اطلاع ملتے ہی جلدی میں اپنی ڈگری کے نتیجے کا انتظار چھوڑ کر آبائی گاؤں جانا پڑا، جہاں مقدر نے اس کی راہ میں شادی کے رشتے کی بیڑیاں گاڑ رکھی تھیں۔ پھر ٹرین سے شہر واپس آتے ہوئے ایک اسٹیشن پر اس کی سلطان بابا سے ملاقات ہو گئی اور عبداللہ کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ عبداللہ گھر سے اپنی ایم اے کی ڈگری لے کر اٹلی ہی یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی وہ نوکری قبول کرنے کے لیے نکلا تھا جس کا انٹرویو کوئی ماہ پہلے بڑی تک و دو کے بعد اس نے پاس کیا تھا۔ لیکن قدرت نے اس کے لیے درگاہ کی یہ نوکری شاید بہت پہلے ہی سے ڈھونڈ رکھی تھی۔ قسمت کا لکھا دیکھے کہ زہرا کے خوابوں کی کیند بھی کسی درگاہ پر اکٹوئی تھی۔ وہ پہلے ہی عبداللہ کے یوں بننا بتائے غائب ہو جانے سے بے حال تھی۔ کسی سبیل نے مشورہ دیا کہ اس درگاہ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے کہ یہاں مانگی

کے پار کسی سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ سی تھی۔ ”عورت..... عورت..... یہ کچھ الگ معاملہ ہے۔ آخر آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ اختیار کا معاملہ ہے۔“ دوسری جانب سے وہ آواز ابھری، جسے میں دنیا کی کروڑوں آوازوں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ زہرا ہی تھی۔ ”بات اگر اختیار کی ہے تو پھر میں بے اختیار ہوں۔ خود پر اختیار ہوتا تو میں بار بار یہاں کیوں آتی۔ اگر آپ میرے راسخے پر نہیں چل سکتے تو نہ سہی، میں تو آپ کے راسخے کی دھول بن سکتی ہوں نا.....“

عبداللہ نے گہرا سانس لیا۔ ”میں شادی شدہ ہوں اور دوسری شادی کر کے میں انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں اپنی بیوی اور بچے سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا لیکن اپنی تقدیر میں یہ کاشے آپ نے خود بونے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، آپ سنبھل جائیں۔“ زہرا سکی۔ ”کاش یہ مشورہ آپ چار سال پہلے اس وقت مجھے دیتے جب میں نے کلاس میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تب تو آپ شادی شدہ بھی نہیں تھے، نہ ہی میں آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی تھی۔ لیکن میرا تو سب کچھ جس جس نے کر دیا آپ کی اس پہلی نظر نے۔ آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ نے اپنی پہلی نظر کو واکا کیوں نہیں؟“ عبداللہ نے لمبی سی سانس لی۔ ”کسی کے مقدر میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ پہلی نظر ضرور لکھی ہوتی ہے۔ پھر یہ اگلے کا نصیب ہے کہ وہ نظر اسے گل و گلزار کر دے، یا پھر جلا کر خاکستر۔ افسوس آپ کی قسمت میں اس نظر کی شبنم کے بجائے یہ پڑکاری لکھی تھی۔ لیکن اب بھی یہ آگ شبنم میں بدل سکتی ہے۔ اپنے مقدر پر قناعت کر لینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ اپنی عبادت کو یوں برباد نہ کریں۔ میں آپ کا نصیب نہیں ہوں۔“ مجھے آہٹ سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عبداللہ نے کھڑکی سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا ہو، تبھی زہرا کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں آپ سے اپنا نصیب بدل دیے جانے کی دعا کی امید تو کر سکتی ہوں، کیا آپ میرے لیے اتنی سی دعا بھی نہیں کرتیں گے.....؟“ ”میری ہر دعا میں آپ ہمیشہ شامل رہیں گی۔ فی امان اللہ۔“ شاید زہرا کھڑکی سے ہٹ چکی تھی۔ میں پورا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ عبداللہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ آؤ ساحر میاں، اللہ آ جاؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

ہم دونوں کو اس حجرے میں خاموش بیٹھے کافی دیر بیت چکی تھی۔ آخر کار میں نے ہی

بدل ہو..... انسان بڑا جلد باز ہے..... اسے صبر کی عادت نہیں ہے..... جو ملا وہی اس کے لیے ٹھیک ہے..... جو نہیں ملا، اسی میں اس کی بہتری ہے۔“ میں چڑسا گیا۔ ”یہ سب دل بہلانے کے بہانے ہیں۔ میں یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ جو مجھے نہیں ملا، مجھے اُس سے ملا دے اور اُسی میں میری بھلائی کا سامان بھی پیدا کر دے..... اگر مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو مجھے زندگی بھی تو میری اپنی مرضی کی ملنی چاہیے۔ میں نے خود تو اس دنیا میں آنے کی خواہش نہیں کی تھی..... جب اُس نے بھیجا ہے تو اُسے میری چاہتوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا، مجھے اگلے جہاں کے صلوں سے کیا واسطہ۔ جو یہاں دے گا..... وہ وہاں بھی نوازے گا۔“ میں جوش جنوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ ممانے گھبرا کر مجھے ٹوکا۔ ”ساحر..... ہوش کرو..... یہ تم سے بڑے ہیں.....“ سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر ماما کو خاموش کر دیا اور میری طرف پلٹے۔ ”اگر صرف دنیا کو قابو کرنا ہے، تب بھی راستہ جنوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے..... تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا کی چاہتیں اتنی آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بولو..... ہمت ہے خود کو جلا کر بھسم کرنے کی؟“ ”میں ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔“ ”سوچ لو..... دنیا پانے کے لیے بھی کبھی کبھی سارے عیش و آرام ترک کرنا پڑتے ہیں۔ کہیں راستے میں تھک کر پلٹ تو نہیں جاؤ گے؟“ میں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ سلطان بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”آزمائش شرط ہے۔“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”ٹھیک ہے..... آزمائے لیتے ہیں..... ہم نے عبداللہ کا تبادلہ کسی اور قصبے میں کر دیا ہے۔ تمہارے جنوں کی پہلی آزمائش یہی ہے کہ جلد از جلد اپنا گھریا اور یہ عیش و عشرت چھوڑ دو اور اس درگاہ میں بسیرا کر لو۔ تمہیں یہاں لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے گزربسر کے لیے بھی کوئی مزدوری کرنا ہوگی۔ جیسے عبداللہ کرتا تھا۔ دو دن کے بعد میں اور عبداللہ یہاں سے اپنے سفر پر کوچ کر جائیں گے، تب تک کوئی فیصلہ کر لو۔ لیکن یاد رہے..... تمہارے والدین ماشاء اللہ حیات ہیں..... لہذا جو بھی قدم اٹھاؤ، اس میں اُن کی رضامندی بہت ضروری ہے۔ اُن کی ناراضی کبھی مول نہ لینا.....“ سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے بڑھنے لگے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر دوبارہ پلٹے اور میری جانب دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔ ”اب بھی وقت ہے، مگر جا کر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر غور کرو۔ دنیا خود ملے تو ملے ورنہ اسے پانا چاہو تو یہ انسان سے بھائی ہے۔ اس کا حصول بھی بڑا جو کھم ہے۔ کیوں خود کو اس

جانے والی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ لیکن زہرا کیا جانتی تھی کہ وہ جس منت کی تلاش میں درگاہ کے پتے صحن میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہے وہ منت خود سر جھکائے کسی اور دعا کے لیے وہاں سجدے میں پڑی ملے گی۔ عبداللہ اور زہرا کی نظریں ملیں اور زہرا کا سب کچھ ایک بار پھر ہمیشہ کے لیے لٹ گیا۔ عبداللہ کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ چہرے پر کلین شیو کی جگہ گھنی ڈاڑھی۔ لے لی تھی اور جدید تراش کے لباس کے بدلے اب وہ سادہ سے سفید کرتے، شلوار میں لمبوار تھا۔ ابھی زہرا اپنی پہلی حیرت کے صدمے ہی سے باہر نہیں نکلی تھی کہ اُس کے سر پر دوسرا قیامت بھی ٹوٹ پڑی۔ عبداللہ کی شادی کا سن کر تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی اور بس، وہ دن او آج کا دن، اُس نے پھر پلٹ کر زندگی کی طرف نہیں دیکھا۔ اُس کی حیات کا محور تب سے یک درگاہ اور یہی ایک منت رہ گئی تھی۔

میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ جس کے لیے ایک پری خود زندگی بھر کے لیے اس کڑکتی اور جھلساتی دھوپ میں اپنا کول وجود اور مومی پُر پکھلا۔ کو تیار بیٹھی تھی۔ میں عبداللہ کے فسانے میں اس قدر رکن ہوا کہ مجھے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے والدین بھی آج میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ سلطان نے کسی زائر کے ہاتھ پیغام بھیجا تو میں چونکا۔ ورنہ شاید خود میرے لیے اس لمحے وقت اور رفتار کو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ ماما اور پاپا سلطان بابا کے ساتھ ایک گھنگٹو میں مشغول تھے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں میرے طویل انتظار سے آچکے ہوں گے۔ خاص طور پر ماما کو تو ایسی جگہوں سے شدید دھشت ہوتی تھی۔ آج بھی صرف میری وجہ سے یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر سلطان بابا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری..... ”تو تم نے اپنے والدین کو بھی خوب پریشان کیے رکھا۔ زندگی سے ضد کرنا چھوڑ مایاں..... کچھ صلے اس جہاں کے لیے نہیں ہوتے۔ کبھی خواہشیں اس دنیا میں پوری ہو۔ لگیں تو پھر اگلے جہاں کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟“ میں نے آج تک کبھی سلطان بابا جواب نہیں دیا تھا، پر اُس وقت میری ذہنی حالت زہرا کے غم کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ میں کو روک نہیں پایا..... ”لیکن کچھ خواہشیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں کہ جن کے بدلے دونوں جہاں گروئی رکھے جاسکتے ہیں۔“ سلطان بابا چونکے..... نہیں..... ایسی کوئی خواہش نہیں، جو وہاں

[illegible]

تعییناتی

سلطان بابا نے زہرا کو پانے کے لیے جس کڑے امتحان سے گزرنے کا چیلنج دیا تھا میں اُسے صدقِ دل سے قبول کر چکا تھا۔ لیکن انہوں نے اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے میرے والدین کی رضامندی کی جو ذیلی شرط لگائی تھی وہ میرے لیے اس آزمائش سے بھی بڑا امتحان تھا۔ اُس روز درگاہ سے واپسی پر ما اور بابا دونوں ہی بالکل خاموش، خیالوں میں گم صم سے تھے۔ شاید اُن دونوں کے ذہن میں بھی یہ سوال کہیں نہ کہیں گردش کر رہا ہو گا کہ اُن کا اس قدر نازوں پلا بیٹا اُن جانے میں سلطان بابا سے بہت بڑی شرط تو لگا آیا ہے لیکن جس کی ساری زندگی محض پرکھی ہو، کیا وہ کبھی ناٹ برداشت کر سکتا ہے اور پھر میں تو اکلوتی اولاد کے علاوہ مزاجا بھی کافی نازک مزاج تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف، یا مشقت جھیلنا تو دور۔ اُس کا بڑے نام سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ میری ماں کے بقول ”میرا تو رنگ بھی چند لکھوں کی دھوپ سے کھلا سا جاتا تھا۔“ تو پھر اس وقت اُن کے ذہن میں اُسٹے سوال بھی تو بجایا تھے، لیکن میں حتیٰ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

گھر کے پورچ میں گاڑی رکتے ہی میں بنا کسی سے کوئی بات کیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد کاشف کا فون آ گیا۔ ”ساحر تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے..... میں یہ کیساں رہا ہوں.....“ میں جانتا تھا کہ ما گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی کال کاشف ہی کو کریں گی۔ میری ضد کے سامنے جب کبھی ما پیٹا ہارنے لگتے تھے تو ایسے میں کاشف ہی اُن کا آخری سہارا ہوا کرتا تھا۔ ”بولو نا.....“ چپ کیوں ہو.....؟..... لیکن یاد رکھنا، ہم سب تمہیں اس پاگل پن کی اجازت ہر گز نہیں دیں گے۔ غضب خدا کا..... شہر کا سب سے بڑا کیسہ ونوا (Casonova) ساحر رضا ایک درگاہ کا مجاور بننے چلا ہے..... خبردار! جو تم نے اس حماقت کے بارے میں مزید کچھ سوچا بھی تو.....؟“

کاشف اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتا چلا گیا۔ میں چپ چاپ اُس کا لیکچر ختم ہونے کا

”دیوانوں کی سی نہ بات کرے..... تو اور کرے دیوانہ کیا؟“ کاشف ہنس پڑا۔ ”تم کبھی نہیں سدھرو گے ساحر..... بہر حال میری تشویش کافی حد تک دور ہو گئی ہے۔ لیکن فی الحال مجھے آنٹی کی تشویش دور کرنی ہے، وہ اور اٹکل تمہارے اس نئے ایڈ وچر کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔“ میں نے کاشف کو جھاڑا۔ ”زیادہ چچہ گیری کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکے تو ماما پاپا کو بھی میرا نقطہ نظر اسی طرح سمجھانے کی کوشش کرنا، جیسے میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے اور خبردار، جو اپنی طرف سے ذرا سی بھی کوئی افلاطونی جھاڑنے کی کوشش کی تو!“ کاشف نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔ میں نے کاشف کو تو کسی نہ کسی طور سمجھا دیا تھا، لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے والدین کو سمجھانا کس قدر مشکل مرحلہ ہوگا۔

اُس رات نہ جانے کیوں مجھے یعنی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ وہ بھی تو میرے لیے اسی آگ میں جلتی رہی تھی، جس میں آج میں زہرا کے جل رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کینیڈا کا اسکالر شپ لینے سے پہلے وہ درگاہ کی سیڑھیوں پر مجھ سے آخری بار ملی تھی تو کس قدر کرچی کرچی تھی وہ..... میں اُس وقت اُس کے جذبے کی کاٹ کو محسوس نہیں کر پایا تھا، لیکن آج جب خود میرے اُوپر یہ قیامت گزر رہی تھی تو مجھے اُس کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی مجھے بددعا نہیں دے سکتی تھی، لیکن شاید کبھی کبھی خدا جذبوں کو بھی دعا، یا بددعا دینے کا اختیار دے دیتا ہے اور شاید آج میری اس حالت کے پیچھے بھی یعنی کے کسی ایسے ہی جذبے کی بددعا کا عمل دخل تھا۔ کوئی ایسا جذبہ جس کے آگینے کو میری لاپرواہی سے غصیس لگی ہوگی۔ اگلی صبح بے حد بو جمل تھی۔ ناشتے کی میز پر ماما کی آنکھیں صاف چٹکی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سوئی۔ پاپا بھی چپ چپ سے تھے اور پھر بالآخر انہوں نے ہی یہ خاموشی توڑی۔ ”ساحر بیٹا، تمہاری ماما تمہارے اس فیصلے سے بے حد ڈسٹرب ہیں۔ میں تو کہتا ہوں بیٹا اُس بزرگ کی بات کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ابھی ہمت نہیں ہاری ہے۔ ہم ایک بار پھر زہرا کا رشتہ لے کر جائیں گے اور مجھے اُمید ہے کہ جلد، یا بدیر ہم انہیں مناعی لیں گے اور اس کے لیے تمہیں کسی بھی شرط وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میری توقع کے مطابق کاشف نے بہت تفصیل سے ماما پاپا سے بات کی تھی۔ ”کیوں پاپا..... کہیں آپ دونوں کو یہ ڈر تو نہیں کہ اس درگاہ میں رہتے رہتے کہیں میرا من بھی مذہب کی

انتظار کرتا رہا۔ اُس کی فینچی کی طرح چلتی زبان رُکی تو میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”جوشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا.....؟“ ”فارگا ڈ سیک ساحر..... یہ ساری باتیں صرف کتابوں میں اچھی لگتی ہیں اور پھر تمہارا واحد مقصد تو صرف اور صرف زہرا کو پانا ہی ہے نا.....؟ تو اُس کے حصول کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، تمہیں اس کے لیے یہ جوگ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ مجھے کاشف کے ناصحانہ انداز پہ ہنسی آ گئی۔ ”اچھا..... بھلا وہ کون سے طریقے ہیں..... ذرا میں بھی تو سنوں۔“ ”میری بات مذاق میں مت اڑاؤ ساحر..... تم نے اپنی چند دن کی بے ہوشی کے دوران ہریان میں بہت سے راز افشا کر دیئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی وہاں صرف اُس درگاہ کے متولی عبداللہ کے لیے آتی تھی۔ آج مجھے آنٹی سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ سلطان بابا عبداللہ کو لے کر کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ عبداللہ کی صورت میں تمہارا رقیب زہرا کی نظروں کے سامنے نہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تب تمہاری محبت کا وار ایک نہ ایک دن کارگر ضرور ثابت ہوگا۔ زہرا تمہارے پاگل پن کے سامنے زیادہ دن تک مزاحمت نہیں کر پائے گی۔ تم صرف انتظار کرو ساحر..... جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھانا میری جان..... ہم سب تم سے بے حد پیار کرتے ہیں.....“ بولتے بولتے کاشف کی آواز کچھ بھرا سی گئی۔ وہ ایسا ہی تھا جذباتی سا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے بات بدلی۔ ”خدا کے لیے یہ رونے دھونے کا فریضہ تم ماما کے لیے ہی چھوڑ دو..... خبردار جو تم نے میری دوسری ماں بننے کی کوشش کی..... ارے یار تم لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... مجھے سلطان بابا نے ایک چیلنج دیا ہے اور میں صرف اس کو ٹی پر پورا اُترنا چاہتا ہوں اور شاید تم بھول رہے ہو، ایسے چیلنج ہم روزانہ ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے۔ یاد ہے تمہیں، پچھلے سال ہی ہم نے چولستان کے صحرا میں پندرہ دن بنا کسی گائیڈ کے رہنے کی شرط لگائی تھی اور آخری میں ہم دونوں ہی وہ شرط جیتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی شرط ہے، جس کے تحت مجھے چند دن درگاہ میں رہنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں باقاعدہ مجاور بننے کے لیے درگاہ جا رہا ہوں.....؟“ ”دوسری جانب سے کاشف کی مشکوک سی آواز سنائی دی۔ ”میں کیسے مان لوں کہ یہ سارا معاملہ صرف ایک شرط، یا چیلنج کی حد تک ہی رہے گا۔ مجھے تمہارے دیوانے پن سے ڈر لگتا ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار ایک دوسرا مصرعہ نکل گیا۔

آپ یہی سمجھئے گا کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے باہر ہوں..... بلکہ وہاں سے تو ویک اینڈ اور عید وغیرہ پر گھر آنا بھی ناممکن تھا، جب کہ یہاں سے میں آسانی سے آپ سے ملنے آ سکتا ہوں۔ آپ کو میری دُوری محسوس بھی نہیں ہوگی۔ ”کم آن ساحر“ اب پپا کی باری تھی۔ ”انگلینڈ سے ماسٹرز کرنے اور ایک درگاہ کا متولی بن کر رہنے میں بہت فرق ہے۔ ہم تمہیں مولوی نہیں، ایم لی اے بنانا چاہتے ہیں۔“ گھر میں بھی یہی بحث جاری رہی۔ ”دنیا کے سبھی والدین یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اُن کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ ہی بنے؟ میں وہاں مولوی بننے نہیں جا رہا، کیونکہ شاید لغت میں یہ لفظ جن کے لیے موجود ہے، وہ بہت با علم اور بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی عرض کے لیے یہ راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنی مرضی سے اپنے کسی ایک بچے کو بھی دین کی راہ پر کیوں نہیں ڈالتے۔ آپ کے ذہن میں مولوی کا جو تاثر ہے، وہ بھی کسی ایسے انسان کی کا ہے، جو زندگی میں اور کچھ نہیں کر پاتا تو اس نے یہی کام بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر ہمیں گلہ کس بات کا ہے؟ جب ہم اپنی اولاد ہی کو اس راستے پر چلنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر جو اس خدمت میں مشغول ہیں، اُن کی کم علمی پر پتھر اُچھالنے کا بھی بھلا ہمیں کیا حق ہے؟“ پپا سچ ہو گئے۔ ”لیکن ہماری سوسائٹی اسے قبول نہیں کر پائے گی۔“ ”سوسائٹی کے قانون ہم خود ناتے ہیں پپا..... آپ نے ساری عمر میں اتنا کمالیہ لیا ہے کہ اگر آپ کی اگلی سات نسلیں بھی بیٹھ کر کھاتی رہیں تو یہ دولت ختم نہیں ہوگی، لیکن مجھے اپنے آپ کو پانے کا موقع شاید یہ زندگی دوبارہ کبھی نہ دے..... مجھے اس رام پر چلنے دیں..... اگر یہی میرا مقدر ہے تو مجھے اسے جھیلنے کیلئے..... آپ جانتے ہیں کہ اگر میں اس گھر میں قید رہا تو میری رُوح ہمیشہ کے لیے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ مجھے اپنے دل اور دماغ کی یہ جنگ لڑ لینے دیں۔ جیت دل کی ہو، یا بے دماغ کی..... اصل فاتح آپ کا بیٹا ہی ہوگا۔“

میں ماما پپا کو شیش وینچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ساری رات ماما اور پپا کے درزور سے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری حالت کے پیش نظر پپا خراک ماما کو منائی لیں گے اور پھر یہی ہوا، صبح جب میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماما کی آنکھیں دھجی ہوئی تھیں، شاید وہ رات بھر روتی رہی تھیں۔ میں نے اُن کا دل بہلانے کے لیے بات

طرف متوجہ نہ ہو جائے اور فرض کریں، اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ مجھے تو یہ سودا دونوں طرف سے فائدے کا ہی لگتا ہے۔ آخر ہم سب مذہب سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ یہ کیسا آسیب ہے جس کا ڈر ساری زندگی ہمارے ارد گرد بھٹکتا رہتا ہے اور ہم تمام عمر اس سے بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں ایک بار ڈک کر پلٹ کر اس چیز کا سامنا نہیں کر لیتے۔ آخر مذہب ہم سے ہمارا کیا چھین لے گا؟“ ماما اور پپا نے آج تک کبھی میرے منہ سے اس قسم کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ دونوں ہی حیرت زدہ سے بیٹھے تھے۔ پپا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ”ہاں..... شاید ہم خوف زدہ ہیں، ہر اس چیز سے جو تمہیں ہم سے دُور لے جلا سکتی ہو۔ پھر چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو اور اکلوتی اولاد کے ماں باپ ہونے کے ناتے، یہ خوف ہمارا حق ہے اور یہ حق ہم سے ہمارا مذہب بھی نہیں چھینتا، شاید اسی لیے اُس بزرگ نے تمہیں بھی یہ حق یاد دلایا تھا۔“ ماما بولیں تو اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی۔ ”اور پھر بیٹا..... یہ تو پاگل پن ہے کہ صرف ایک لڑکی کے حصول کے لیے تم دنیا کے باقی سبھی رشتوں کو بھلا دو..... کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟“ ”آپ دونوں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہو، لیکن میری رُوح کے دھاگے قدرت نے اُس لڑکی سے باندھ دیے ہیں ماما..... میرا دم اُس کے بغیر گھٹتا ہے۔ اگر یہ نا انصافی ہے تو یقین کریں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور اُس جذبے کا ہے، اُس جذبے کی شدت کا ہے، جس نے میری رُوح کو اُس کا قیدی بنا دیا ہے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“

وہ دونوں ہی چپ چاپ اور لا جواب سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں ڈاکٹر پزدانی کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے بات کر کے اپنے کلینک آنے کا کہا۔ شاید کچھ مزید ٹیسٹ وغیرہ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا، پھر ماما اور پپا کا موڈ دیکھ کر ہامی بھری۔ پپا نے ڈرائیور کو گاڑی ٹکانے کا کہا اور ہم سبھی ڈاکٹر کے کلینک چل پڑے، جہاں سے کافی دیر بعد ہماری واپسی ہوئی۔ واپسی پر سارے راستے ماما پپا سے میری بحث جاری رہی۔ وہ دونوں کسی صورت مجھے اجازت دینے پر راضی نہیں تھے۔ ماما تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔ ”ساحر..... تم ہوش میں تو ہو..... اتنا پڑھ لکھ کر تم اس درگاہ کی نوکری پر لگ جاؤ گے..... لوگ کیا کہیں گے؟“ ”آپ کو لوگوں کی فکر ہے، یا اپنے بیٹے کی۔ اور پھر مجھے ویسے بھی تو ماسٹرز کے لیے انگلینڈ جانا ہی تھا۔“

لیے۔ ”کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہاں آنے سے پہلے تمہارا کچھ اور نام تھا.....؟ کیا نام تھا تمہارا.....“ ”عدنان..... عامر عدنان نام تھا، پہلے میرا..... اچھا اب چلوں..... سلطان بابا بہت دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں..... مٹی جگہ پر پہنچ کر خط لکھوں گا..... اپنا خیال رکھنا..... فی امان اللہ۔“

عبداللہ مجھے گلے لگا کر آگے بڑھ گیا اور میں جانے کتنی دیر حیرت میں ڈوبا، کم صم وہاں کھڑا رہا..... ڈھلتے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں ڈور نیچے ساحل کے آخری کنارے پر میں نے عبداللہ اور سلطان بابا کے ہیولے کو آخری بار ادھل جھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تب ہی اچانک مجھے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی اُس پرچی کا خیال آیا، جو جاتے وقت عبداللہ مجھے دے گیا تھا۔ کچھ عجب سی کیفیت میں لرزتے ہاتھوں سے وہ پرچی کھولی۔ پرچی پر لکھا ہوا نام میری ہتھیلی کے پسینے سے بھیگ کر پھیلنے لگا تھا، میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ ہی کئی جھکڑ سے چلنے لگے۔ پرچی پر اپنا نیا نام دیکھ کر میرے قدم لڑکھڑاسے گئے، میرا نیا نام تھا..... ”عبداللہ“

شروع کی ”آپ جانتی ہیں کہ اگر آپ یونہی روتی رہیں تو میں جان نہیں پاؤں گا..... سلطان بابا کی لگائی ہوئی شرط کا فائدہ اٹھا رہی ہیں کیا؟“ اُن کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”بہت ضدی ہو ساسر..... لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ ہر بیٹے گھر آؤ گے اور ہمارا بھی جب کبھی دل چاہے گا، ہم تم سے ملنے وہاں آ سکیں گے..... خدا کرے تمہارا یہ جنون جلدی ختم ہو..... مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔“ اور پھر مہمیا کی ایسی بہت فکروں اور اُن دونوں کی بھیگی پلکوں کے سائے میں، میں گھر سے رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں مجھے درگاہ تک چھوڑنے کے لیے آنا چاہتے تھے، لیکن میں نے بڑی مشکل سے انہیں گھر ہی میں روک دیا۔ میں جانتا تھا کہ مہمیا کا دل بہت نازک ہے اور وہ زیادہ دیر اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پائیں گی۔ سلطان بابا کی شرما کے مطابق میں گھر سے خالی ہاتھ ہی نکلا تھا۔ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تو سلطان بابا اور عبداللہ کو سفر کے لیے تیار پایا۔ سلطان بابا نے غور سے مجھے دیکھا..... ”ہاں میاں..... اپنے والدین کی اجازت سے آئے ہو نا.....“ ”جی ہاں..... بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے، لیکن آ گیا ہوں.....“ عبداللہ مسکرایا۔ ”میں جانتا تھا..... تم ضرور آؤ گے..... آؤ میں تمہیں کچھ ضروری باتیں سمجھا دوں۔“ عبداللہ نے کچھ ہی دیر میں مجھے تمام معمولات سے آگاہ کر دیا اور پھر اسے میں اُن کے جانے کا وقت بھی ہو گیا۔ سلطان بابا جاتے جاتے رُکے اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”پہلا پڑاؤ تو تم نے کامیابی سے طے کر لیا۔ ثابت قدم رہے تو اپنی مراد بھی لو گے ایک دن..... جیتے رہو.....“ عبداللہ نے جاتے جاتے مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا ”سچ تو یہ ہے کہ میں اندر سے اب تک دو حصوں میں بٹا ہوا ہوں دعا کرنا کہ میں یہ ذمہ داری ٹھیک طرح سے سرانجام دوں، کہیں میرے قدم نہ لڑکھ جائیں.....“ عبداللہ نے میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور مسکرا کر بولا ”گرتے ہیں شہسوار میدان جنگ میں۔“ پھر آگے بڑھتے بڑھتے اُسے جیسے کوئی ضروری بات یاد آگئی۔ اُس جلدی سے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پرچی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں ایک ضروری بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ سلطان بابا نے تمہارا اپنا نام رکھ دیا ہے۔ ویسے جیسے میرا رکھا گیا تھا، جب میں یہاں پر آیا تھا۔ اس پرچی پر لکھا ہے، ہمارے جانے کے دیکھ لینا۔ لوگ اب تمہیں اسی نام سے پکاریں گے یہاں.....“ یہ اک نئی حیرت تھی میرے

کرنے کا حکم دیتی رہتی تھیں، پاپا جلدی سے شطرنج کی بازی جھالیتے تھے اور ان کی ہمیشہ کوشش رہتی کہ وہ مجھ سے جیتنے کے بجائے ہارتے جائیں۔ نہ جانے انہیں مجھ سے ہارنے میں اتنا لطف کیوں آتا تھا؟ میں اپنی ساری دنیا تیاگ کر، اس اندھیری رات میں یہاں اس ویران درگاہ میں کیا کر رہا تھا.....؟ یہ میں نے کیا سودا کر لیا تھا؟ یہ سب کچھ سوچ کر دل جیسے کٹنے سا لگا۔ جتنی تنہائی اور اداسی میں نے درگاہ کی اس پہلی رات میں اپنی رُوح کے اندر اُترتی محسوس کی، ویسی تو کبھی زندگی بھر نہیں جھیلی تھی۔ کہتے ہیں، رات کافسوں ہر چیز کی حقیقت کو اُس کی اصل شدت سے کہیں زیادہ ابھار کر پیش کرتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ڈھلتی رات کا جادو وہی کھیل، کھیل رہا تھا۔ میں بہت دیر تک درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دُور شور چاتے ساحل کو دیکھتا رہا۔ کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک بحری جہاز میری طرح تنہا سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ دُور سے جب اس کی ٹمٹاتی بتیاں لمحہ بھر کو چمکتیں تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے وہ بھی حیرت سے میری جانب دیکھ رہی ہیں کہ یہ ”بنجارہ“ اس ویرانے میں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالات کی یلغار میں رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے دھیرے سے میرا کاندھا جھوا ہو۔ میں نے جھٹکے سے چلیں کھلیں تو صبح ہونے کو تھی۔ کوئی شخص میرے قریب بیٹھا میرا کاندھا ہلا رہا تھا۔ ”اٹھ جاؤ بھائی..... نماز کا وقت ہونے والا ہے۔“ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے گہرا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اپنے حلیے سے مقامی پھیرا لگتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا ”نماز کھڑی ہونے والی ہے..... اٹھ جاؤ.....“ میں نے اُس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی تو درگاہ کے بالکل سامنے والی چٹان پر پتھر کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا کے احکامات میں سے ایک حکم پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا بھی تھا، لیکن مجھے تو نماز پڑھے جانے کتنے سال گزر چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت فجر کی نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بہر حال میں نے جلدی سے اٹھ کر منہ پہ پانی کے چند چھینٹے مارے۔ بھلا ہوا ان چند نمازیوں کا جو مسجد کے باہر بنے چھوٹے سے حوض کے کنارے وضو کر رہے تھے، تو میں نے بھی انہی میں سے ایک کے قاعدے کو پوری طرح نقل کیا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ دو نمازی اور بھی مسجد میں داخل ہوئے تھے اور دونوں ہی نے

عبداللہ

میں جانے کتنی دیر سے اپنے نام کی پرچی ہاتھ میں لیے، اپنے آس پاس چلی غیر مرئی کی اندھیوں کے شور میں وہیں درگاہ کے محن میں کھڑا تھا۔ سلطان بابا اور عبداللہ کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی اور اب رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے درگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سلطان بابا نے آج سے میری ایک نئی شناخت تجویز کر دی تھی۔ اب میں ساحر نہیں عبداللہ تھا۔ مجھے پہلے یہاں کوئی اور عبداللہ تعینات تھا۔ گویا حاکم بابا اور سلطان بابا بھی اصل میں حاکم اور سلطان نہیں تھے، اُن کے اصل نام بھی کبھی کچھ اور ہوں گے اور پھر وہ بھی کوئی نبی عبداللہ کے عہدے سے ترقی کر کے پہلے حاکم اور پھر سلطان بنے ہوں گے.....؟ عہدوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہوگا.....؟ میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر الجھتا چلا گیا۔ لیکن میں تو یہاں چار دن کے لیے عارضی طور پر آیا تھا اور میرا مقصد صرف اور صرف زہرا کا حصول تھا۔ مجھے تو زہرا کو پاتے ہی اپنی اصل دنیا کی جانب لوٹ جانا تھا، تو پھر سلطان بابا نے اس عارضی مقصد کا پانے کے لیے میری باقاعدہ ”عبداللہ“ کے عہدے پر تعیناتی کیوں کر دی تھی.....؟ کیا اگر دکھاوے کا مقصد بھی کہیں اُس سنگ مرمر کی مورت کو پھلانا تو نہیں تھا؟

رات اب باقاعدہ اور پوری طرح سے تمام ساحل پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ درگاہ میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق درگاہ میں رکھے ہوئے چند مٹی کے چراغ روشن کر دیے۔ انہی ہدایات میں یہ بات بھی کہیں درج تھی کہ مٹی کے چراغ دیوں کے لیے تیل خریدنے کا اہتمام بھی مجھے اپنی مزدوری کے پیسوں ہی سے کرنا تھا۔ ذرا الحال، کچھ تیل ان چراغوں میں باقی تھا۔ دفعۃً تنہائی اور اداسی کی ایک بھرپور لہر نے میرے پورے وجود کو جیسے لرز سا دیا۔ مجھے اپنے والدین، دوست، رقیبن زندگی کی رومانی شامیں اور مدہوش سی راتیں بُری طرح یاد آنے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت اگر کبھی میں خوش قسمتی گھر میں موجود ہوتا تھا تو ماما کیسے بھاگ بھاگ کر بچن میں لگ کر میرے لیے مختلف ڈشز تیا

جلدی سے شاید سنتوں کی نیت باندھ لی۔ میں نے بھی انہی کی تقلید کی اور اُن کے ساتھ سلام پھیر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مولانا صاحب بھی تشریف لے آئے اور جماعت کھڑی ہو انہوں نے جب پہلی رکعت شروع کی تو مجھے دھیرے دھیرے بچپن میں اپنے اسلامیات ٹیچر کی حفظ کروائی ہوئی نماز اور سورتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم مذہب کو چا کتنا بھی بھلا دیں..... مذہب نہیں بھلاتا۔ وہ کسی میٹھی یاد کی طرح ہمارے دل کے خانوں میں کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے اور جیسے ہی ہم کبھی کسی مجبوری میں اُسے آواز دیتے، وہ پھم سے گود کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جب تک مولانا صاحب نے سلام پھیرا، میر ذہن اور دل کے تمام در پتے وا ہو چکے تھے۔ مجھے بہت کچھ یاد آ چکا تھا۔

نماز کے بعد وہ نورانی چہرے والے امام ہماری طرف پلٹے اور کھکار کر کہنے لگے۔ ”بھئی ساتھیو..... تو کل ہم نے درس کہاں ختم کیا تھا۔“ مقتدیوں میں سے ایک نے جلدی لقمہ دیا ”مولانا صاحب..... آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے تک پہنچے تھے۔“ امام نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور غور سے ہم سب کی طرف دیکھا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوا تھا، کبھی درباری مَدوب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نہایت گھبراہٹا ہوا سا اُن کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں وہ آتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے قدموں میں گر گیا کہ اُس نے ابھی ابھی حضرت عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے باہر دیکھا اور اُسے یقین ہے کہ وہ اُسی کی رُوح قبض کرنے کے لیے آج یہاں آئے ہیں، لہذا اُس گزارش ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہواؤں کو حکم دیں کہ فوراً اُسے اپنی طاقت سے اُڑا دینا کے دوسرے کونے میں پہنچا آئیں۔ ساتھیو، آپ تو جانتے ہیں کہ خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بڑی طاقت عطا کی تھی۔ تمام جنات، ہوائیں، سب چرند پرند، حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فریادی کی فریاد قبول کر لی اور ہوا کو حکم کہ اس شخص کو پل بھر میں دنیا کے آخری سرے تک پہنچا آئے۔ ہوائے حکم کی تعمیل کی اور اُ دربار لگا ہی ہوا تھا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی کسی بھیس میں اُس دربار میں آ پہنچے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور مزاح اُن سے پوچھا کہ ”کیوں حضرت..... آج تک“

جائیں قبض کی ہیں، کبھی کچھ مشکل بھی پیش آئی.....؟“ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا ”ہاں آج ایک عجیب واقعہ ہوا، جس نے کچھ دیر کے لیے تو مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ہوا یہ کہ آج مجھے دنیا کے دوسرے سرے پر ایک شخص کی رُوح قبض کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن ابھی چند لمحے پہلے میں نے جب اُسی شخص کو آپ کے دربار کے باہر دیکھا تو میں خود بھی متزلزل ہو گیا کہ یہ شخص تو یہاں موجود ہے، جب کہ میری فہرست کے مطابق مجھے یہاں سے ہزاروں میل دُور اُسے بے جان کرنا تھا۔ لیکن ایک لمحہ پہلے جب میں اُس مقام پہ پہنچا، جہاں اُس شخص کا آخری سانس لکھا تھا تو وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھا..... سچ ہے..... خدا کے کام..... خدا ہی جانے.....“ مولانا صاحب نے قصہ ختم کر کے تمام نمازیوں کی طرف دیکھا، جو کبھی دم سادھے مَدوب بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب سے سوال کیا۔ ”ہاں تو ساتھیو..... اس واقعے سے آپ کو کیا سبق ملا.....؟ یہی نہ کہ موت سے کسی کو رخصت نہیں۔ ہر ذی نفس کو اس کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ چاہے انسان کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کر لے، تقدیر پھر بھی اٹل ہے اور یہ بھی طے ہے کہ جس کی موت جہاں آئی ہے، قدرت اُسے خود وہاں پہنچا دیتی ہے اور تب تک موت خود زندگی کی حفاظت کرتی رہتی ہے.....“ کبھی نمازیوں نے زور سے سر ہلا کر مولانا صاحب کی باتوں کی تائید کی۔ یہ آس پاس کی بستیوں کے چند مجھیرے تھے جو روز صبح سویرے سمندر کی طرف نکلنے سے پہلے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔ مولانا صاحب نے درس ختم کرتے ہوئے اختتامی کلمات کہے ”اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے جب جس سے، جہاں، جو کام لینا ہوتا ہے..... اُسے کسی نہ کسی بہانے وہاں کھینچ لے جایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا..... جب جب، جو جو ہونا ہے، تب تب، سو سو ہوتا ہے.....“ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا..... بالکل ایسی ہی بات عبداللہ نے تب کہی تھی جب میں زہرا کی تلاش میں دوسری مرتبہ درگاہ آیا تھا۔ کبھی نمازی ایک ایک کر کے پیش امام صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے مسجد سے نکلتے گئے۔ میں نے بھی اسی روایت کی تقلید میں انہیں سلام کیا اور واپسی کے لیے قدم مسجد کے دروازے کی جانب بڑھائے ہی تھے کہ دفعۃً پیچھے سے پیش امام صاحب کی آواز اُبھری ”عبداللہ بیٹا..... تم ذرا رُکو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے.....“ میں نے اُن جانے میں فوراً پلٹ کر اُن کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا کہ جیسے وہ ”عبداللہ“ ہی سے

ناشتا ہے۔۔۔۔۔ آج تم بھی گزراہ کرلو۔ کل سے اپنی پسند کا بلینا۔۔۔۔۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”آپ اپنا ناشتا خود ہی بناتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“ ”ہاں میاں۔۔۔۔۔ چھرا بندہ اپنا سامان خود تیار نہ کرے تو کیا کرے۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولے ”اکیلا رہتا ہوں۔۔۔۔۔ شادی وغیرہ کے جھیلے میں نہیں پڑا۔ ماں باپ عرصہ ہوا، اللہ کو پیارے ہو چکے۔۔۔۔۔ اب تو خود اپنا بھی چل چلاؤ ہے۔۔۔۔۔“ ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم چاہو تو آج ہی سے اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ ابھی کچھ دیر میں نیچے ساحل پر سیپوں اور گھوگھوں کا بازار لگے گا، تم پچاس روپے کی چھوٹی ناکارہ سپیاں خرید لینا اور پھر قریبی بستی کے اتوار بازار میں بیچ آنا۔ اس روز وہاں زائرین کا بھی خاصا ریلہ ہوتا ہے۔ تمہیں ضرور بیس پچیس روپے کا فائدہ ہو جائے گا اور اتنے پیسے تمہاری روزانہ کی گزر بسر اور درگاہ کے چراغوں کے تیل کے لیے کافی ہیں۔“

میں غور سے مولوی صاحب کی بات سنتا رہا، لیکن بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس سپیاں خریدنے کے لیے پچاس روپے بھی نہیں تھے، کیوں کہ مجھے سلطان بابا کی شرط کے مطابق گھر سے بالکل خالی ہاتھ درگاہ آنا تھا۔ غالباً مولوی خضر میرے اندر کی ہچکچاہٹ محسوس کر گئے۔ ”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ لگتا ہے، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بھئی یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کرو تم مجھ سے اُدھار لے لو۔۔۔۔۔ پر یاد رہے۔۔۔۔۔ جیسے ہی تمہاری پہلی کمائی ہو۔۔۔۔۔ یہ اُدھار لوٹانا ہوگا۔۔۔۔۔ بولو منظور ہے۔۔۔۔۔“ میں کچھ ہچکچایا۔ ”لیکن اگر مجھے اس سودے میں نقصان ہو گیا تو۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، آپ رہنے دیں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا۔“ حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے پاس پیسوں کا بندوبست کرنے کا اور کوئی بھی ذریعہ موجود نہیں، لیکن نہ جانے کیوں مولوی خضر کی محنت کی کمائی کو داؤ پر لگاتے ہوئے مجھے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے زبردستی پچاس کا نوٹ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولے ”ارے بھی اُدھار کے نام سے تذبذب میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا چلو۔ قرض حسنہ ہی سمجھ کر رکھ لو۔۔۔۔۔ اگر نقصان ہو گیا تو قرضہ معاف۔۔۔۔۔ دیے ان پچاس روپوں میں بڑی برکت ہے۔ دیکھ لینا تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔ اچھا چلو، آج میں بھی تمہارے ساتھ ہی ساحل تک چلتا ہوں۔ تمہارا پہلا دن ہے۔۔۔۔۔ کہیں خراب مال ہی نہ اٹھا

مخاطب ہوں، لیکن میری حیرت اُس وقت دوچند ہو گئی جب مجھے یہ پتا چلا کہ اُن کا مخاطب ”میں“ ہوں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے پکارا تھا، لہذا میرا چونکا تو فطری تھا، لیکن انہیں کیسے علم ہوا کہ میرا نام عبداللہ ہے۔ وہ میری حیرت کو بھانپ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ”تمہاری حیرت بجا ہے۔ دراصل پچھلے عبداللہ نے جاتے ہوئے خود مجھے بتایا تھا کہ اُس کا کوئی دوست اُس کی جگہ لینے آ رہا ہے اور سلطان بابا نے اُس کا نام بھی ”عبداللہ“ ہی تجویز کیا ہے۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔“

میں ایک حیرت آمیز الجھن لیے، اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے مجھ سے تو کبھی اُن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر یہ صاحب میرے بارے میں اس قدر تفصیل سے کیسے جانتے تھے۔ میرے دل میں کئی سوال مچلے، لیکن میں احتراماً چپ رہا۔ پھر انہوں نے خود ہی باتوں کا سلسلہ جوڑا۔ ”میرا نام مولوی خضر الدین ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس مسجد کی امامت کر رہا ہوں۔ تم سناؤ۔۔۔۔۔ کیسی گزر رہی ہے۔۔۔۔۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟“ ”نہیں۔۔۔۔۔ ایسی کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ ایک آدھ دن میں عادی ہو جاؤں گا، اس ماحول کا۔۔۔۔۔“ ”ہاں میاں۔۔۔۔۔ عادت پڑ ہی جاتی ہے۔۔۔۔۔ بات بس خود کو ڈھالنے کی ہے۔۔۔۔۔ تم نے اپنے گزر بسر کے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔۔۔ درگاہ میں کچھ کھانے پینے کو بھی موجود ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔؟“ ”مطلب یہ کہ عبداللہ نے انہیں کافی تفصیل سے میرے بارے میں بتا رکھا تھا۔“ ”جی۔۔۔۔۔ کچھ سامان عبداللہ چھوڑ گیا ہے۔۔۔۔۔ ایک آدھ دن گزراہ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ پھر سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ ”نہیں میاں۔۔۔۔۔ آج کا کام کل پر کیوں چھوڑتے ہو۔۔۔۔۔ میری مانو تو آج ہی سے کام پر لگ جاؤ۔۔۔۔۔“ مولانا صاحب مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ بار اُنھ کر مسجد کے اندر ہی بنے اپنے حجرے میں بھی گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں مسجد کے چھوٹے سے کمرے میں چائے کی سوندھی خوشبو پھیلنے لگی۔ اُن کے حجرے کا ایک دروازہ مسجد کے اندرونی کمرے میں بھی کھلتا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں ایک چائے دانی، دو کپ اور شاید رات کی بچی ہوئی روٹی کے کچھ ٹکڑے لیے چلے آئے۔ میں اُن کے اس اچانک تکلف پر کچھ ایسا بوکھلایا کہ جلدی میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور بس ”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔“ ہی کرتا رہ گیا۔ مولوی خضر ہلکے سے مسکائے ”بھئی تمہیں تو شاید پسند نہ آئے۔۔۔۔۔ پر ہمارا تو روز کا یہی

تھی اور میں اس سے پہلے بھی ایسی کئی شرطیں جیت چکا تھا، لیکن یہ میری زندگی کی شاید سب سے مشکل کسوٹی تھی۔ اگر میرے دوست، یا والدین مجھے اس روز وہ سادہ سے دال چاول کھاتے دیکھ لیتے تو شاید حیرت اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتے، البتہ اپنی استقامت پر تو خود مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس آسانی سے اس ماحول میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

دن ڈھلا اور پھر سے وہی تنہا اور اُداس شام درگاہ کی دیواروں پر اُتر آئی۔ ایک ہی دن میں میری زندگی کس قدر بدل چکی تھی۔ عام حالات میں، میں اس وقت سوکر اُٹھتا تھا اور نیم گرم پانی کا شاور لینے کے بعد تیار ہو کر کلب، ہوٹل، یا کسی دوست کی پارٹی میں محفل جیتی تھی، جس کا خاتمہ عموماً آدھی رات کے بعد ہی ہوتا تھا اور ہم اُس وقت اپنے گھروں کو سونے کے لیے لوٹتے تھے، جب باقی لوگ جاگ کر اپنے کام کاج پر نکل رہے ہوتے تھے۔ اچانک سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں کچھ شور اور ہلے گلے کی مدھم سی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں نے چونک کر دُور نیچے ساحل پر نظر ڈالی، کچھ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا ایک گروپ ساحل پر رات گزارنے کے لیے کیمپ فائر کر رہا تھا۔ ساحل پر آگ جلا کر اور بڑے بڑے اسپیکرز پر موسیقی کی دُھن پر رقص جاری تھا۔ خوشی تھی، ہنسی تھی، قہقہے تھے اور مستی تھی۔ میں بہت دیر تک دُور نیچے ساحل پر اس گروپ کو دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی دوستوں کا گروپ ہو۔ ہم بھی تو ایسے ہی راتوں کو موج مستی کرنے نکل جاتے تھے۔ اچانک میوزک کی بیٹ بدل گئی اور ہوا میں نئے نئے آواز گونجی۔ لڑکے، لڑکیاں خوشی سے چلائے ”پرانی چیز اور گٹار.....“ لڑکیاں، لڑکے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔

لڑکپن کا..... وہ پہلا پیار.....

وہ لکھنا ہاتھوں پہ..... اے پلس آر (A+R)

وہ دینا تحفے میں..... سونے کی بالیاں

وہ لینا دوستوں سے پیسے اُدھار.....

دفعتہً مجھے اپنے گالوں پر کچھ نمی کا سا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر ہاتھ پھیرا تو میری اُٹھکیوں کی پوریں، خود میرے اپنے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے ”بس یادیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی تو رہ جاتی ہیں“ اور یادوں کے

لو.....“ مولوی خضر نے برتن سیٹے اور میرے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ممنونیت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ”آپ کیوں میرے لیے اتنی تکلیف اُٹھاتے ہیں..... میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ لیکن وہ بھی اپنی دُھن کے پکے نکلے۔ فافٹ تیار ہو کر سر پر امامہ باندھے، مجھے ساتھ لیے، نیچے ساحل پر بیٹھے پچھڑوں کے ٹولے کے قریب پہنچ گئے، جو ذرا ذرا سے فاصلے پر اپنے سامنے تازہ سپیوں اور گھونکھوں کا انبار سجائے بیٹھے تھے۔ مولوی خضر نے نہایت انہماک اور کافی بھاؤ تاؤ کے بعد سپیاں خرید لیں۔ ساتھ ہی وہ مجھے اچھی سپیوں کی خصوصیات اور پہچان بھی بتاتے رہے، تاکہ آئندہ ایسے کسی سودے میں مجھے کوئی نقصان نہ ہو۔ عجیب کمال شخص تھے مولوی خضر الدین..... کچھ ہی دیر میں مجھ سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ نہ صرف ساحل پر، بلکہ علاقے کے تقریباً سبھی لوگ اُن کا بے حد احترام کرتے تھے اور اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کر دیتے تو لوگ بنا کسی مول تول ہی کے، سارا کا سارا بازار اُن کے قدموں میں لا ڈالتے، لیکن انہوں نے پکے کاروباریوں کی طرح ایک ایک پیپی پر لمبی بحث کی اور مال خرید کر میرے حوالے کر دیا۔ واپسی پر انہوں نے تفصیل سے مجھے مالائیں بنانے کا ہنر بھی سکھا دیا کہ کس طرح پیپی کو ایک خاص زاویے سے دھاگے میں پرونا ہے۔ ہم دونوں جب اپنی ”خریداری“ کے بعد اُپر درگاہ تک پہنچے، ظہر کی نماز کا وقت قریب آ چکا تھا، جب کہ مجھے ابھی اپنے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ عبداللہ نے اپنے حجرے کے چھوٹے سے باورچی خانے میں ضرورت کے چار برتن اور کچھ راشن میرے لیے چھوڑ دیا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو ٹھیک سے انڈا اُبالنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی مولوی خضر ہی میرے کام آئے اور انہوں نے خود میرے کمرے میں آکر تھوڑی سی دال کے ساتھ کچھ چاول اُبال کر میرے ”لنچ“ اور ”ڈنر“ کا انتظام کر دیا۔

ابھی چوبیس گھنٹے پہلے ہی کی بات تھی، جب میں دوپہر کے ٹھیک اسی لمحے اپنے سارے دوستوں کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل میں اُن کی طرف سے دیا گیا الوداعی ظہرانہ تناول کر رہا تھا۔ یہ لنچ دراصل کاشف کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ اور اُن سب نے مجھے گلے لگا کر اس دعا کے ساتھ رخصت کیا تھا کہ میں ایک آدھ ہفتے میں سلطان بابا سے اپنی ”شرط“ جیت کر واپس انہیں جو اُن کر لوں گا۔ ہم سب کے لیے یہ ”درگاہ یا ترا“ صرف ایک شرط ہی تو

اسی کڑوے دھوئیں نے میرے حلق میں کانٹوں کا وہ جنگل اُگایا کہ پھر میرے آنسو روکے
 رُکے۔ مجھے یاد آیا کہ یہ گانا عینی کو بھی بہت پسند تھا اور ہم کالج کینٹین میں گھنٹوں میز پر بجا
 کر یہ گانا گایا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی چھری یونہی رواں تھی کہ اچانک!
 اپنے کاندھے پر کسی نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

خضر راہ

میں چونک کر پلٹا تو مولوی خضر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں
 پونچھ ڈالیں، لیکن شاید وہ اس اندھیرے میں بھی میری بھیگی پلکوں کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ ”لگتا
 ہے کچھ یاد آگیا تمہیں.....؟“ میں نے جلدی سے بات بنائی ”نہیں..... وہ نیچے کچھ نوجوان
 پارٹی کر رہے ہیں..... شاید اُن کے بار بی کیو کے دھوئیں سے آنکھیں جلنے لگی تھیں.....“
 مولوی خضر دھیرے سے مسکائے ”ہاں میاں..... دھواں لکڑی کا ہو، یا پھر یادوں کا..... دونوں
 صورتوں میں آنکھ تو جلتی ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ جہاں دیدہ
 شخص تھے، بات بدل کر بولے ”کل صبح ساحل کے بازار اکٹھے چلیں گے، مجھے بھی کچھ راشن
 خریدنا ہے۔ ویسے تم نے آج کتنی سپیاں پڑھیں.....“ ”جی سات مالائیں ہی پرو پایا ہوں اب
 تک۔“ انہوں نے خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ ”شاباش..... تم واقعی ایک محنتی
 اور اپنی ذہن کے پکے لڑکے ہو..... مجھے یقین ہے، تم زندگی کے ہر میدان میں سرخرو ہو گے۔“
 میں زندگی میں کبھی کسی کے سامنے نہیں رویا، لیکن نہ جانے اُن کی اس دعا میں اور اس لمحے میں
 کیسا اثر تھا کہ میرا پہلے ہی سے بھرا دل چھٹک پڑا اور میری آنکھیں پھر سے بہہ نکلیں۔ مولوی
 خضر الدین نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور مجھے تسلی دے کر بولے۔ ”یہ آنسو بھی تمہارا سچ ظاہر
 کرتے ہیں، کیوں کہ جن کے دل میں کھوٹ ہوتا ہے، اُن کی آنکھوں کے کنویں سدا خشک ہی
 رہتے ہیں..... لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... یہ آنسو کسی کی بھی زندگی کا رُخ بدل
 سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہمیشہ اپنی طاقت بتائے رکھنا، کبھی اپنی کمزوری نہ بنانا..... کیوں کہ میں
 جانتا ہوں کہ تم کمزور نہیں ہو.....“ مولوی خضر میری ہمت بڑھا کر واپس پلٹ گئے۔

درگاہ میں میری دوسری رات بھی اسی بے چینی، بے کسی اور درد کی تڑپ میں گزر گئی۔
 اگلے دن پھر سے وہی سارا معمول جاری رہا اور مولوی خضر میری راہ کے خضر بنے، مجھے راستہ
 دکھاتے اور سہارا دیتے رہے۔ سچ ہے کہ اگر ان ابتدائی دنوں میں مجھے اُن کا ساتھ حاصل نہ

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش

Presented by Pakistan Virtula library

Visit for more beautiful books and novels

www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.org

انہوں نے آتے ہی میرے سلام کا جواب دیا اور جلدی سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے چہرے کو یوں ٹٹولا، جیسے وہ میرے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہوں۔ پھر بہت دیر بعد اُن کے ہونٹوں سے کچھ ٹوٹے لفظ ادا ہوئے۔ ”ساحر بیٹا..... تم..... یہاں..... میرا مطلب ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر اس طرح..... لیکن کیوں.....“ شاید انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں اس صدمے سے نکالنے کے لیے خود ہی بات جوڑنے کی کوشش کی۔ ”جی..... میں نے سوچا کہ کچھ دن زندگی کا یہ رُخ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے، اور ہاں..... لوگ مجھے یہاں ’عبداللہ‘ کے نام سے جانتے ہیں۔ ساحر اب میرا پرانا نام ہے.....“ اُن جانے میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو انہیں کچھ دیر سے پتا چلتی تو بہتر ہوتا۔ میرے منہ سے میرا نام سن کر تو وہ جیسے بالکل ہی ڈھسے گئیں اور وہیں درگاہ کے صحن کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے انہیں قریبی گھرے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر پیش کیا اور تسلی دی ”آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ راستہ میں نے خود اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے، بنا کسی جبر کے..... بس آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔“

میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے حجرے کی جانب چلا آیا، کیونکہ کچھ دیر ہی میں نذر و نیاز کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے درگاہ کے معمول کے مطابق پہلے مردانے والے برآمدے کی جانب بیٹھ کر نذرانے جمع کر کے اُن کی فہرست بنائی اور اُسی وقت جماعت کے دن خصوصی طور پر آئے ہوئے درگاہ کے چند خدمت گاروں کے ذریعے اُن کی تقسیم کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ پھر میں حجرے میں بنی اُس کھڑکی میں آ بیٹھا، جو درگاہ کے پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی اور جماعت کے دن خصوصی طور پر زرنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں خواتین کی آمد بھی شروع ہو گئی، جو اپنی نذر اور صدقہ وغیرہ اس چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بڑھا کر اپنے مختلف النوع و قسم کے مسائل کے حل کے لیے دعا کی درخواست کرتیں اور دعا کے بعد اُٹھ کر یوں مطمئن ہو کر چلی جاتیں، جیسے اس دعا کے بعد واقعی اُن کے سب مسائل ایک دم حل ہی تو ہو جائیں گے؟ اور پھر کچھ ہی دیر بعد اُسی مترنم آواز نے دھیرے سے سلام کیا۔ وہی آواز جسے میں دنیا کی اربوں آوازوں میں بھی، بنا ایک پل ضائع کیے، شناخت کر سکتا تھا۔ میری آواز گلے میں اگلنے سی لگی اور مجھ سے ٹھیک طرح سے جواب بھی نہیں دیا

ہوتا تو شاید میرے لیے درگاہ کی اس سادہ، مگر میرے لیے انتہائی سخت، زندگی کے معمول میں ڈھلنا اتنا آسان نہ ہوتا۔

اسی طرح تین دن بیت گئے اور جماعت کا دن بھی آپہنچا۔ جماعت کو تمام زائرین درگاہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل ہر آہٹ پر چونکنے اور ہر سرگوشی پر بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہی تو وہ دن تھا، جب وہ نسیم سحر، اس درگاہ کے فرش پر اپنے گلاب قدموں کا بوسہ دیتی تھی۔ سہ پہر تک تو میری گھبراہٹ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ جیسے میرا دل ابھی میرے سینے کا پتھر توڑ کر باہر آگرے گا اور پھر چار بجے کے قریب اچانک ہی وہ ٹھنڈی سی پروائی چلی، جو میری روح تک کو سرشار کر دیتی تھی۔ میں نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں تو وہ ماہِ رُخ اسی شان سے چلتی ہوئی درگاہ کے صحن میں داخل ہو رہی تھی، ساتھ ہی حسب معمول اُس کی ماں اور دو قدم پیچھے اُس کی خادمہ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آرہی تھیں۔ اُس نے درگاہ کے دروازے کے قریب صفائی کرتے زائر سے کچھ پوچھا، شاید عبداللہ کے بارے میں استفسار کیا ہو۔ زائر نے جواب میں میری طرف اُلٹ کر اشارہ کر دیا۔ میں اس وقت درگاہ کے مرکزی صحن میں دروازے سے بہت دُور بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب زہرا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اتنی دُور سے بھی اُس کی حیرت آمیز نگاہوں کی تپش سے مجھے اپنا پورا وجود پھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کی مجھ پر نظر پڑی اور یہ میری تقدیر کی وہ پہلی نظر تھی، جس کا وقفہ شاید سب سے لمبا تھا۔ زہرا نے زندگی میں پہلی بار اتنی دیر تک میری جانب دیکھا تھا۔ شاید وہ حیرت اور صدمے کی وجہ سے اپنی نظر مجھ سے ہٹا نہیں پائی تھی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کے ان چند لمحوں کو کچھ اسی طرح جیا کہ پھر کسی اور سانس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ کسی کے لیے فنا ہو جانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کے دل بر کی نگاہ اُس پر لگی ہو اور وہ اپنی جان اُس جان آفرین کے سپرد کر دے۔ کچھ دیر تک زہرا مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت گھنی اور کالی گھٹا کے سائے کے بعد اچانک ہی بے حد تیز اور جھپن والی دھوپ نکل آئی ہو۔ زہرا کی ماں کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور انہیں بھی اپنی بیٹی جیسا ہی شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف کھینچی چلی آئیں۔ زہرا اور خادمہ اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔

گیا۔ کچھ دیر دوسری جانب بھی خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ دھیرے سے بولی ”یہ آپ کیا رہے ہیں..... خدا کے لیے اپنی ضد چھوڑ دیں..... ایسے بھلا کون، کسی کے لیے اپنی زندگی بر کرتا ہے.....؟“ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی، جس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ لیکن یہ جوگ مجھے اتنا بڑا انعام نہ گا، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف اُس کی آواز سننے کے لیے ایسے جانے کتنے جنم، اس درگاہ پر تیاگنے کے لیے تیار تھا اور اُسے صرف میری اسی ایک حقیر زندگی فکر لگی ہوئی تھی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے پھر بے چین ہو کر اپنی بار دہرائی۔ ”آپ چپ کیوں ہیں..... بولتے کیوں نہیں.....؟“ میں اپنے خیالات کی رو چونکا۔ ”شاید کچھ لوگوں کے مقدر ہی میں بربادی ہوتی ہے۔ کچھ زندگیاں ملتی ہی صرف تباہ جانے کے لیے ہیں.....“ وہ بھڑک سی گئی۔ ”آپ صرف پتھروں سے سرنگرا رہے ہیں..... سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں حاصل کر پائیں گے آپ.....“ ”مجھے مرہم کی تمنا بھی نہیں ہے..... پتھروں سے سرنگرانے کا شوق ہی مجھے یہاں تک لے کر آیا ہے۔ لیکن کچھ پتھر شاید نہیں جانتے کہ جس جبین کو وہ یوں لہو لہان کر رہے ہیں، اُسی پیشانی سے چھلکتا خون، خود انہی بھی تو داغ دار کر دے گا۔“ زہرا کو میری بات سن کر غصہ آ گیا۔ ”بات اگر داغ دار ہونے ہے تو اپنا دامن بھی کون سا اُجلا ہے..... ایک داغ اور سہمی..... بہر حال..... میں پھر بھی آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ یہ پاگل پن چھوڑ دیں..... یہ راہ پہلے ہی کئی زندگیاں برباد چکی ہے..... میں نہیں چاہتی کہ ایک اور جیون اس کی بھیٹ چڑھے..... آگے آپ کی مرضی.....“ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ مجھے یاد نہیں، میں نے کس طرح اُس کی خادمہ اُس کا نذرانہ وصول کیا اور کس طرح باقی خواتین کے مسائل سنے۔ بس ایک خواب کی کیفیت میں سارا وقت گزر گیا۔ ہوش تب آیا، جب مولوی خضر کے بھیجے ہوئے ایک شخص نے اطلاع دی کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے اور مولوی صاحب مسجد میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سارا سامان اور نقد رقم وغیرہ درگاہ کے خصوصی زائر کے حوالے کی اور خود مسجد آیا۔ نماز کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو مولوی خضر مجھے اپنے ساتھ لیے چہل قدمی کرنے ساحل کی جانب چلے آئے۔ ساحل اس وقت بالکل سنسان پڑا تھا۔ مغرب کی جانب سے

ٹھنڈی پروائی میں شامل نمی نے کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کو بھگو دیا۔ انہوں نے شاید میری خاموشی کو محسوس کر لیا تھا، تبھی ہلکے سے کھنکار کر بولے ”کیوں میاں..... آج کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو..... سب خیر تو ہے نا.....“ ”جی..... کچھ خاص نہیں..... بس یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا.....“ ”اچھی بات ہے..... انسان کو سوچتے رہنا چاہیے..... ہماری دنیا میں آمد کا اصل مقصد بھی یہی سوچ اور یہی کھوج ہے..... اور اسی کھوج اور اسی جستجو کا ہمیں حکم بھی دیا گیا۔“ ”نہ جانے آپ کس کھوج کا ذکر کر رہے ہیں، لیکن میری سوچ تو کافی خود غرض سی ہے..... میں اپنے ہی ایک مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا..... جس کا فائدہ، یا نقصان صرف میری ذات تک محدود ہے.....“ مولوی خضر چلتے چلتے ٹک گئے اور انہوں نے اپنی اُننگی کے اشارے سے میری توجہ دُور سمندر میں کھڑے ایک بحری جہاز کی جانب مبذول کر دائی۔ ”جانتے ہو..... سمندر کے نیچوں بچ کھڑا یہ دیو ہیکل جہاز بھی کسی انسان کی ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے، جو ہو سکتا ہے کہ شروع میں اُسے بھی صرف اپنی ایک خود غرضانہ سوچ لگی ہو.....“ ”میں سمجھا نہیں..... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں.....“ مولوی صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا ”دنیا کی ہر ایجاد، تبدیلی اور ترقی کسی سوچ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے..... ہاں البتہ کوشش اور لگن کا جنون شرط آخر ہے..... انسان سوچتا ہے پھر کوشش کرتا ہے اور پھر اُپر والا چاہے تو اُس کی سوچ کو الہام بنا دیتا ہے۔ انسان کے ذہن میں وہ کلیہ ڈال دیتا ہے، جو آگے چل کر اُس کی، اس بحری جہاز جیسی ہی کسی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے..... لہذا سوچ کس قدر ضروری ہے..... اس کا اندازہ اب تم خود ہی لگا لو.....“ اُن کی باتیں سن کر میں چونک سا گیا۔ ”گو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بحری جہاز، یا پھر اس جیسی اور سبھی ایجادیں انسان کی اپنی کوشش کی نہیں..... بلکہ کسی الہام کی لہون منت ہیں.....؟“ وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔ ”کافی ذہین ہو..... میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھرپور کوشش اور شدید محنت کے بعد ملنے والی کامیابی بھی کسی ایسے شارے کے تابع ہوتی ہے، جو قدرت انسان کے ذہن میں ڈال دیتی ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی..... چلو عشاء کا وقت ہو رہا ہے..... ہم نماز کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے.....“

ہم دونوں واپس درگاہ کی جانب پلٹ گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی مسجد سے نکل گئے تو مولوی خضر میری جانب متوجہ ہوئے۔ ”ہاں تو میاں..... میرے کہنے کا مقصد

رائیگاں ہی گیا.....“ میں اپنی جگہ سن سا بیٹھا رہ گیا۔ میں جب سے درگاہ کی اس نئی دنیا میں آیا تھا، قدم قدم پر مجھے ایسی ایسی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ اب تک تو مجھے ان جھٹکوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مولوی خضر بھی ایک ایسے ہی صاحب کمال شخص نکلیں گے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر میرے ہونٹوں پر وہ سوال آ ہی گیا، جو نہ جانے کتنے دنوں سے میرے دل و دماغ میں مچل رہا تھا۔ ”آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ آپ سب کس مگرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے عبداللہ، پھر سلطان بابا اور اب آپ، ایسے اور کتنے لوگ موجود ہیں، میرے آس پاس۔ ان طلسمات کی کوئی حد بھی ہے، یا نہیں..... آخر یہ کون سی دنیا ہے.....؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب بھی اسی مگرے کے ہیں، جہاں تم بیٹے ہو۔ بس ہم نے راستہ ذرا مختلف اختیار کیا ہے۔ منزل ہماری بھی وہی ہے، جو باقی سب کی ہے۔“

”لیکن کوئی تو بات ہوگی، جو آپ سب اتنا پڑھنے کے بعد اپنی اپنی فیلڈز چھوڑ کر اس راستے پر نکل پڑے ہیں.....؟ کوئی تو کشش ہوگی اس دنیا کی؟“

”کشش صرف تحقیق اور جستجو کی ہے۔ آخر ہمیں دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد صرف روزگار کمانا اور بچے پیدا کرنا تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ ہم انہی جھیلوں میں پڑ کر اپنا سارا جیون ضائع کر دیتے ہیں۔ ہماری اس ظاہری دنیا کے آس پاس اور بھی ایسے کئی جہاں ہیں، جنہیں کھوجنے کی ضرورت ہے۔ ہم غیروں پر تکیہ کیے ہی کیوں بیٹھے ہیں، جب کہ یہ سارا علم تو مومن کی معراج ہے.....؟“

مولوی خضر رات گئے تک مجھے تحقیق اور جستجو کی افادیت پر لیکچر دیتے رہے۔ مجھے اُن کی سبھی باتیں سمجھ تو نہیں آئیں، لیکن ایک بات کا یقین پوری طرح ہو چکا تھا کہ ہمارے آس پاس ایک نظر نہ آنے والا غیر مرئی نظام بھی پوری طرح متحرک اور کار بند ہے جس کا دائرہ کار وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہمارا یہ ظاہری نظام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مادرائی دنیا سے میرا پورا تعارف ہونا ابھی باقی تھا۔ میں رات بہت دیر سے مولوی خضر کے حجرے سے نکل کر ”درگاہ“ لوٹا۔ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ میرا اپنے کمرے میں جا کر سونے کو مومن نہیں ہوا تو میں وہیں صحن میں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا، اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ ذرا سی لگی ہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے آس پاس وہی ٹھنڈی سی پروائی چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہاں..... وہی سکون

یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو کھوج کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے اور جو بھی اس سوچ و بچار اور کھوج پر محنت کرتا ہے، قدرت اُسے کامیابی کا پھل دیتی ہے۔ پھر چاہے وہ ایمان والا ہو پھر کوئی کافر..... اس سوچ و بچار اور تحقیق کے انعام میں قدرت نے کوئی تخصیص نہیں برتی۔ اور اس کی مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر ایجاد سامنے نہیں آئی، جب کہ غیر مسلم اس تحقیق اور ایجاد کے میدان میں ہم مسلمانوں کے کہیں زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ چاہے مسلم ہو، یا غیر مسلم شدید معذرت کے بعد کامیابی کا یہ فارمولا قدرت کسی الہام ہی سے اُن کے ذہنوں میں منتقل کرتی ہے، ہم کمزور انسان اپنی محنت کا ثمر جان کر فخر سے اتراتے پھرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک چھو سی مثال دیتا ہوں تمہیں۔ کیا نام تھا اُس سائنس دان کا..... ہاں..... نیوٹن..... کیا تم سمجھتے کہ اُسے خاص اُس لمحے، جب وہ سیب گرنے والا تھا، اُس درخت کے نیچے از خود پہنچ کر چاہیے تھا.....؟ اور کیا اُس کے ذہن میں یہ خیال خود اپنے طور پر ہی آ گیا ہوگا کہ یہ سیب زمین کی طرف کیوں آیا.....؟ اور پھر یہی خیال اُس کے آس پاس کے لوگوں، یا پھر اُس پہلے کسی اور کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اور اگر کبھی آیا بھی تھا تو اُس نے اس عمل کی کیوں نہیں کی؟ کیا یہ سب باتیں اسے نیوٹن کا الہام ثابت نہیں کرتیں..... اور پھر صرف کٹا ثقل ہی کی کیا بات ہے..... رائٹ برادران کے اُڑنے کے خواب سے لے کر نیل آسٹراٹک کے چاند پر قدم رکھنے تک کا ہر خواب بھی تو ایک الہام ہی تھا، جو کسی نہ کسی خواب سوچ کے ذریعے قدرت نے اُن کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔“

مولوی خضر بولتے چلے گئے میں حیرت کے عالم میں ساکت سا بیٹھا، اُن کی باتیں سنتا رہا۔ سائنس میں نے بھی پڑھی لیکن سائنس کے بارے میں اس قدر تازہ نظریہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔ وہ چپ ہو تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”آپ کا نام مولوی خضر الدین کے بجائے پروفیسر ہونا چاہیے تھا.....؟“

میرے اچانک ریمارکس سن کر وہ دھیرے سے ہنس پڑھے۔ ”مضد نہیں ہوتا کہ علم صرف کتابوں، یا یونیورسٹی ہی سے حاصل کیا جائے..... ایک سچے طالب کے لیے ساری دنیا ہی ایک درس گاہ ہے..... ویسے کہنے کو میں نے بھی برائے نام کچھ فزکس کی ڈگری لینے کے بعد پروفیسر شپ کی ہے، ایک بڑی یونیورسٹی میں..... لیکن۔“

من کی لگن

آ میری ٹھنڈک کا احساس، جو ہر مرتبہ میرے سر پہ کو اُس وقت گھیر لیتا تھا، جب کبھی میرا زہرا سے آتنا سامنا ہوتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس احساس نے چھوا..... میں نے گھبرا کر جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تو مجھ سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے، پھر ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میں نے چونک کر درگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کے پتوں بیچ زہر کھڑی تھی۔

ہاں..... وہ زہرا تھی۔ پہلے پہل تو مجھے بھی یہ لگا کہ میں دیوانگی کی اس سطح تک پہنچ گیا ہوں جہاں انسان جاگتی آنکھوں سے بھی سننے دیکھنے لگتا ہے، لیکن جب میں نے زہرا کے پیچھے اُس کی ماں اور ڈرائیور کو بھی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پہ یقین آ ہی گیا۔ لیکن وہ رات کے اس پہر، یہاں اس دیرانے میں کیا کر رہی تھی؟ اور رات بھی کہاں..... اب تو سحر قریب تھی۔ زہرا کی حالت کافی ابتر تھی۔ میں نے آج تک اُسے پورے، یا آدھے نقاب کے بغیر گھر سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن آج اُس کا مہتاب چہرہ بے نقاب تھا اور غزال آنکھوں تلے پڑے حلقے اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ کئی دنوں سے نہیں سوئی۔ پر اس وقت وہ اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی کہ میرے منہ سے گھبراہٹ میں صرف دو لفظ ہی نکل پائے۔ ”آپ..... یہاں.....؟“ زہرا سے پہلے اُس کی والدہ بول اٹھیں۔ ”معاف کرنا بیٹا..... ہمیں اس وقت اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن وہ کہتے ہیں نا..... اولاد ضرور ہو..... پر اکلوتی نہ ہو..... بس اسی اکلوتی اولاد کے پیار کی وجہ سے ہم بھی یوں درد بھٹک رہے ہیں.....“ مجھے اُن کی بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں نے اخلاقی فرض نبھایا۔ ”آپ حکم کریں..... میں کیا مدد کر سکتا ہوں.....“ اس بار بولنے میں زہرا نے پہل کی۔ اُس کی نظریں جھکی جھکی اور پلکیں لرز رہی تھیں..... ”میں نے انہیں آس پاس کی تمام درگاہوں میں بہت تلاش کیا ہے..... لیکن اُن کا کچھ پتا نہیں چلا..... کیا آپ مجھے اُن کا پتا دے سکتے ہیں..... میں..... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی.....“ زہرا نے بات ختم کر کے نگاہ اٹھائی۔ میں اُس کے کانپتے لب دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور میرے دل کا بچا کھچا تنکوں کا آشیانہ بھی ایک ہی پل میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ عموماً شعراءِ نظر سے نظر کے رشتے کو بہت موضوع گفتگو بناتے ہیں، لیکن ”نظر سے نظر کی التجا“ کو جس قدر تفصیل سے اس وقت میں بیان کر سکتا تھا، شاید کوئی اور نہیں۔ اسے تقدیر کا ستم نہ کہیں تو اور کیا کہ صدیوں کے بعد

معالے میں بھی کھوٹی ہے.....“ وہ کچھ دیر تک میرے چہرے پر لکھی نہ جانے ضبط کی کون سی تحریر پڑھتی رہیں، پھر بولیں ”میرا اپنی دعاؤں سے بھر دسا اٹھے عرصہ ہو گیا ہے..... لیکن پھر بھی اگر کوئی ایک آخری دعا قدرت نے قبولیت کے لیے باقی رکھ چھوڑی ہے تو میں اُسے تمہارے نام کرتی ہوں۔ کاش میرے نصیب میں تمہاری فرزندگی لکھی ہو..... جیتے رہو۔“

اُن کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر اُن سے رُکا نہیں گیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ زہرا ڈرائیور کے ساتھ پہلے ہی درگاہ سے نکل چکی تھی۔ میں اُسی طرح تنہا، بے کس اور لاچار سا درگاہ کے صحن میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے آس پاس ہزاروں آندھیوں کا شور محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے لوگ دیوانوں پر ترس کیوں کھاتے ہیں۔ پاگل پن تو ایک نعمت ہے۔ بدنصیب تو مجھ جیسے ہوش والے ہوتے ہیں، جوان اذیت ناک لمحوں کا عذاب جھیلنے کے لیے ہوش و حواس میں رہتے ہیں۔

جب فجر کی اذانیں ختم ہوئیں، تب بھی میں وہیں اُسی جگہ گم مسم سا کھڑا تھا۔ اتنے میں مولوی خضر کا پیغامبر بھی آ کر نماز کھڑی ہونے کی اطلاع دے کر جا چکا تھا۔ مولوی خضر نے میری ”تازہ تازہ“ نماز کی وجہ سے اپنا یہ معمول بنا رکھا تھا کہ روز صبح احتیاطاً جگانے کے لیے کسی نہ کسی نمازی کو درگاہ بھیج دیتے تھے۔ اس دن میرا دل نماز پڑھنے پر بھی مائل نہیں تھا، لیکن جب تیسری مرتبہ مسجد سے میرا بلاوا آیا تو بادل خواستہ مسجد کی جانب چل پڑا۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کی اور اپنا درس شروع کیا۔ ہاں تو ابھی کل میں بتا رہا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک نہایت ہی عمر رسیدہ بڑھیا دہائی دیتی ہوئی آچنچی۔ آپ علیہ السلام نے اُس سے ماجرا دریافت کیا تو بڑھیا نے فریاد کی کہ ”یا حضرت..... میرے بچوں کے حق میں دعا فرمائیے..... وہ ڈھائی، تین سو سال کی کچی عمر ہی میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی بیماری کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں..... آپ اُن کی جوانی اور درازی عمر کے لیے دعا کیجیے.....“ حضرت نوح علیہ السلام بڑھیا کی فریاد سن کر مسکرا دیئے اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے بڑھیا کے حق میں دعا فرمادی۔ بڑھیا کے جانے کے بعد محفل میں سے کسی نے عرض کیا۔ ”یا حضرت نوح علیہ السلام..... جب اس بڑھیا نے آپ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی تو آپ علیہ السلام مسکرائے کیوں.....؟“ حضرت نوح علیہ السلام نے پھر تبسم

محبوب در پر آیا بھی تو صرف رقیب کا پتا لینے..... سچ پوچھیں تو اُس وقت مجھے عبداللہ کی قسم پر بے حد رشک آیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اس نازنین کے کتنے قریب تھا اور میں اُس کی گھائل نگاہ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کس قدر اوجھل..... شاید وہ میری نظر کی شکایت اُ بھانپ گئی تھی، تبھی اُس نے پھر سے پلکوں کا پردہ گرادیا تھا۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اتفاق سے مجھے عبداللہ کا پہلا خط ملا تھا، جو اُس نے اپنی نئی منزل پر پہنچ کر مجھے لکھا تھا۔ عبداللہ اس وقت یہاں سے تقریباً تین سو کلومیٹر کی دوری پر کسی اور درگاہ میں تعینات تھا۔ کاش اس پر ی رُخ نہ مجھ سے میری جان مانگی ہوتی، پر مانگا بھی تو کیا.....؟ رقیب کا پتا..... بہر حال حکم کی تکمیل پر بھی میرا فرض ہی ٹھہرا۔ ”آپ یہیں رُکے.....“ میں جلدی سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کا خط نکال کر ایک طرف رکھا اور لفافہ لا کر زہرا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”کل مجھے اُس کا خط ملا..... لفافے کے پیچھے عبداللہ کا پتا موجود ہے.....“ زہرا کی بے چین آنکھوں سے کچھ ایسی تیزی سے لفافے کو ٹولا، جیسے شدید پیاس کے عالم میں مرتا ہوا کوئی شخص پانی کا آخری بچا ہوا گھونٹ پینے کے لیے پیالہ پکڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اُس کا بس چلتا تو شاید لفافے لکھے حروف کو بھی نظر سے پی جاتی۔ اب کی بار اُس نے نظریں اٹھائیں تو اُس کی نگاہ میں کچھ مرتبہ میرے لیے کچھ نرمی اور مومنیت سی تھی۔ ”میرے پاس الفاظ نہیں ہیں..... پھر بھی آپ بہت بہت شکریہ..... کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسان کا یہ قرض کسی بھی طور اُنا پاتی.....“ زہرا بات ختم کر کے چل دی اور..... میں اُس بھکاری کی طرح کھڑا رہ گیا، جس نے اُس کی دن بھر کی بھیک بھی کوئی لٹیرا چھین لے جائے۔ زہرا کی ماں نے واپسی کے لیے قد بڑھائے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر میری جانب پلٹ آئیں۔ اُن کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ”اگر زہرا کے ابا کسی کاروباری دورے پر ملک سے باہر نہ گئے ہوتے تو شاید اُنا بدنصیب بیٹی کی چاہت بھی مجھے یوں آدمی رات کو اپنی دلہیز پھلانگنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، بیٹا، وہ تو سوالی ہے..... اپنے دیوانے پن میں یہاں تک چلی آئی، تم نے اُسے پتا کیوں نہ دیا..... تم چھپا بھی تو سکتے تھے.....“ وہ کہتے کہتے چپ سی ہو گئیں، لیکن میں اُن کا اشارہ سمجھ نہ تھا۔ ”ایک سوالی کسی دوسرے سوالی کی التجا بھلا کب ٹال سکتا ہے۔ ہم دونوں کی اذیت مشترک ہے۔ ہاں! فرق بس اتنا ہے کہ انہیں کوئی پتا بتانے والا تو میسر ہے، جب کہ میری تقدیر

اُس کے سامنے کھڑا ہے..... پھر وہ کسے کھوجتی پھر رہی ہے.....؟“ ”وہ مجھے نہیں..... پرانے
عبداللہ کی کھوج میں یوں آدھی رات کو ننگے سر چلی آئی تھی۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ وہ
مجھے تلاش کرے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ نہایت تلخ ہو گیا۔ مولوی خضر مفتی خیز انداز میں
بولے ”لیکن آئی تو تمہارے پاس ہی نا..... کل تک جو تمہارے سائے سے بھی کتراتے تھے آج
اُسے مقدر نے اس قدر مجبور کر دیا کہ یوں آدھی رات کو تمہارے پاس دوڑی چلی آئی۔“ میں
نے چونک کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ واقعی اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جاتا تو بات تو
اُن کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ خدا خدا کر کے میرا نام تو آیا، چاہے برسر الزام ہی
کیوں نہ آیا۔ گویا سلطان بابا کا وعدہ پورا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے..... ہاں البتہ
اس ایقائے عہد کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ یا پھر میرا بے چین دل ہی نہایت بے صبر تھا۔ پھر
اچانک مجھے احساس ہوا کہ آج تک مولوی خضر نے یوں کھل کر تو کبھی مجھ سے زہرا کا ذکر نہیں
کیا تھا، لیکن اُن کی معلومات سے لگتا تھا کہ انہیں سارے قصے کی بخوبی خبر ہے۔ مجھے اپنی چند
لحوظ پہلے والی بے خودی پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ ”تو گویا آپ نے بھی جانتے ہیں کہ میں
صرف زہرا کے حصول کے لیے اس درگاہ تک آیا ہوں، لیکن آپ نے کبھی مجھ پر یہ جتایا کیوں
نہیں.....“ میری سوچ کے دوران وہ حسب معمول اپنے ہاتھ کی مرے داری چائے بنا چکے
تھے۔ میرے سوال پر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ”میاں..... سب کچھ جتایا تو نہیں جاتا نا.....
اور پھر دیئے بھی یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا۔ میں نے سوچا، تم سے کچھ پوچھوں گا تو تم بھی دل میں
سوچو گے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔“ مجھے اُن کی بات پر ہنسی آگئی۔ ”آپ مجھے ایسا سمجھتے
ہیں.....؟“ آپ سے ایک بات پوچھوں..... آپ بُرا تو نہیں منائیں گے.....؟“ ”نہیں
نہیں..... ضرور پوچھو..... تم مجھے بہت عزیز ہو.....“ میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آپ
نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“

میرا سوال سن کر اُن کے چہرے پر بچوں کی طرح حیا کا ایک گلابی رنگ آ کر گزر گیا اور
وہ ہنس پڑے۔ ”کیا میاں.....؟ کبھی کچھ اُگلا لو گے کیا.....؟“ ”ہائیں نا..... آپ نے
کبھی کسی کو چاہا ہے..... اور خدا کے لیے جواب میں یہ نہ کہیے گا کہ ہاں کی ہے، پھولوں سے،
موسم سے، سمندر سے اور ان سب کو بنانے والے سے..... آپ جانتے ہیں، میں کس سے محبت

فرمایا اور ارشاد فرمایا۔“ یہ بڑھیا اپنے بچوں کی تین سو سال زندگی کو دراز کرنے کی دعا کی متنی
تھی اور میں یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ اگر میں اُسے یہ بتا دیتا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جب
انسان پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں پیدا ہو کر نہ صرف بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور پھر
بڑھاپے کی منزلیں پار کر کے طبعی موت مر بھی جائے گا تو کیا یہ اپنے بچوں کی عمر پر خداوند کریم
کے آگے سجدہ شکر نہ بجالاتی.....؟“

ساری محفل انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی نے پوچھا۔ ”یا حضرت، کیا واقعی کوئی ایسا زمانہ بھی
آئے گا، جب انسان اتنی مختصر عمر میں پیدائش کے بعد بوڑھا ہو کر مر جائے گا۔“ حضرت نوح
علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”ہاں..... قرب قیامت کے آس پاس ایک ایسا وقت بھی آئے گا،
جب انسان پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں پیدائش سے لے کر بڑھاپے اور پھر موت
کے تمام مراحل طے کر لے گا۔“ ساری محفل بیک زبان ہو کر بولی۔ ”بھئی اگر ایسا کبھی ہمارے
زمانے میں ہوتا تو ہم تو پتے پاندھ کر ہی گزارہ کر لیتے اور سجدہ سے سر نہ اٹھاتے کہ اتنے کم
وقت میں گھربار، کاروبار اور دیگر کام کاج کی طرف کسی کا دھیان ہی کب جاتا.....؟“

حضرت نوح علیہ السلام پھر مسکرائے اور انہوں نے محفل کو تنبیہ کی۔ ”ہاں..... لیکن کتنی
عبرت کی بات ہے کہ اُسی دور کے انسان اپنی رہائش کے لیے سب سے بکے محل تعمیر کریں
گئے.....“ سب نمازیوں نے اپنے اپنے کانوں کو جلدی سے یوں ہاتھ لگائے، جیسے وہ سب ابھی
تک حضرت نوح علیہ السلام کے دور ہی میں بیٹھے ہوں۔ مولوی خضر نے اپنا درس ختم کیا۔ ”تو
ساتھیو..... ہمیشہ یاد رہے کہ یہ دنیا بڑی عارضی جگہ ہے۔ اس کے لیے بس اتنی ہی محنت کرو
جتنا یہاں رہنا ہے۔“ سب نمازی درس کے خاتمے پر حسب معمول مولوی صاحب سے مصافحہ
کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ مولوی خضر نے سب کے جانے کے بعد غور سے میری جانب
دیکھا۔ میں ابھی تک سب سے الگ تھلگ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انہوں نے
شاید میری بے زاری محسوس کر لی۔ ”کیوں میاں..... آج من کہیں اور لگا ہوا ہے کیا..... رات
میں تہجد کے لیے اُٹھا تو نیچے ساحل پر بڑی سی موٹر گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ لگتا ہے تمہارے
مہمان آئے تھے۔“ اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان ابھر آئی۔ تو گویا انہیں زہرا کی آمد کا پتا
تھا۔ ”ہاں..... وہ مجھ سے عبداللہ کا پتا مانگنے آئی تھی.....“ ”ارے..... تو کہہ دینا تھا کہ عبداللہ

جب بھی اُسے دیکھا، بس اُس کے چہرے کے نور میں کھوتا چلا گیا اور پھر جسم، یا روح کا حصول تو بہت دُور کی بات تھی، وہ تو میرے بارے میں سوچتی تک نہ تھی۔ میں ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالوں میں بھنور میں پھنسا غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر میرے ساتھ وہی عجیب سا واقعہ ہوا جو پہلے بھی درگاہ میں عبد اللہ کے حجرے میں پہلی مرتبہ داخل ہوتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میں کافی دیر سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا تسبیح کی مالائیں پرورہا تھا اور اپنی محبت کی حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں باہر سے کسی مجھیرے کی آواز سنائی دی۔ ”عبد اللہ بھائی!..... تسبیحاں بن گئی ہوں تو دے دو..... میں نیچے بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ دُکان پر چھوڑنا جاؤں گا۔“ یہ کریم بلوچ کی آواز تھی۔ مولوی خضر نے اُسے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی کہ جب بھی وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے بازار جانے لگے تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرے، تاکہ میرا وقت بچ جائے۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”آیا کریم بھائی!.....“ اور اُسی لمحے ایک دم میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ کریم پہلے بھی اسی طرح مجھ سے تسبیح کی مالائیں لینے کے لیے یونہی درگاہ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگا چکا ہے اور میں نے ٹھیک اسی جگہ بیٹھے، اُسے یہی جواب دیا ہے اور اب جب میں اُسے یہ مالائیں دینے کے لیے باہر نکلوں گا تو وہ مجھے داہنی جانب مسکراتا ہوا کھڑا ملے گا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میں ابھی اسی روشنی کے جھماکے کے اثر میں تھا اور جیسے ہی میں بے اختیار ہو کر اٹھا اور باہر نکلا تو کریم وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ تمام احساس لمحے بھر کا تھا اور اگلے ہی لمحے میں پھر سے ”زمانہ حال“ میں واپس پہنچ گیا، لیکن اس بار میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر بھی اٹھی تھی۔ میں نے کریم کو تو جیسے تیسے فارغ کر دیا، لیکن پھر خود مجھ سے بہت دیر تک وہاں سے اٹھا نہیں گیا۔ عام طور پر ایسا ہم سب ہی کے ساتھ زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں کسی واقعے، بات، یا منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ایک وقتی سا احساس ہوتا ہے کہ ہم یہ بات پہلے بھی سن چکے ہیں، یا اس سوال کا جواب مخاطب کی زبان سے کیا نکلے گا، یا پھر پہلی مرتبہ کا دیکھا ہوا منظر بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے ہم پہلے بھی اس مقام سے گزر چکے ہوں۔ لیکن میرے ساتھ اس درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک صرف ایک مہینے میں تیسری، یا چوتھی مرتبہ یہ واقعہ اس تواتر کے ساتھ پیش آ رہا تھا

کی بات کر رہا ہوں.....“ میرے ضدی انداز پر وہ باقاعدہ زور سے ہنس دیے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں یوں ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کیوں اس لمحے مولوی خضر مجھے بہت اچھے لگے۔ ”ہاں بھئی کی ہے..... اپنے زمانے میں ہم نے بھی کی ہے، محبت..... لیکن ہماری محبت میں اور آج کل کی اس طوفانی محبت میں بہت فرق ہے۔ مجھے جس سے محبت ہوئی، اُسے میں نے پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ پہلی بار ایک کتابوں کی دُکان پر، جہاں وہ سائیکل رکشنے میں اپنی والدہ کے ہمراہ تشریف لائی تھیں اور دوسری مرتبہ ایک لائبریری میں، جہاں ہم نے کسی طور بڑی ہی مشکل سے انہیں آنے کا کہا تھا۔ وہ بس دومنٹ کے لیے آئیں اور جتنی دیر میں لائبریرین کے ہاتھ سے کتاب اُن کے ہاتھ میں منتقل ہوئی، بس اتنی ہی دیر ٹھہریں۔ یہ اتنی سی ہی ہے، ہماری محبت کی کہانی۔“ میرا تجسس بڑھ گیا۔ ”تو پھر آپ نے اُن خاتون کے ہاں رشتہ کیوں نہیں سمجھا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے بات آگے کیوں نہیں بڑھائی!.....؟“ ”بات بڑھتی تو بڑھاتے نا..... لمبی کہانی ہے، میاں۔ پھر کبھی سنائیں گے..... فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ محبت کے ہزار سے بھی زیادہ روپ ہوتے ہیں، لیکن محبت ہمیشہ اس خوشبو کی طرح لا حاصل ہی رہتی ہے جو پرفیوم کرتے سے آس پاس فضا میں بکھر جاتی ہے۔ بس ایک کسک ہی اس عشق مجازی کا حاصل ہے.....“ ”لیکن لوگ محبت میں ایک دوسرے کو اب بھی تو لیتے ہیں..... اس وصل محبت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے..... کچھ لوگوں کو اُن کا محبت مل بھی تو جاتی ہے۔“ ”محبت کہاں مل پاتی ہے میاں..... بس جسم مل جاتے ہیں..... جانے کس بے وقوف نے اس وصل کو محبت کے وصل کا نام دے دیا ہے۔ محبت ہمیشہ سے ایک لا حاصل جذبہ ہے۔“ میں حیرت سے اس وجہ بزرگ کو دیکھتا رہا۔ ضرور اُن کا ماضی کسی شدید محبت کی داستان سے گندھا ہوا تھا۔ ورنہ محبت کے بارے میں اتنا منفرد اور انوکھا نظریہ کسی عام شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن مولوی خضر سے مل کے درگاہ واپسی کے بعد بھی میں بہت دیر تک اُن کے قلعہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہے تھے تو پھر میری زہرا سے محبت کا مقام کیا تھا.....؟ کیا حقیقت تھی میری محبت کی؟ کیا میری محبت بھی صرف جسم کے حصول کے لیے تھی؟ لیکن میں نے تو آج تک کبھی زہرا کا جسم پانے کی خواہش تک نہیں کی تھی۔ میں نے

تربیت

میں مولوی خضر کے منہ سے تربیت کا لفظ سن کر مزید الجھن میں پڑ گیا۔ وہ میری تربیت کا ذکر کر رہے تھے؟ کیا زہرا کو پانے کے لیے اب مجھے باقاعدہ کسی تربیت سے بھی گزرنا پڑے گا..... سوالوں کا ایک طوفان تھا، جو میرے اندر سب کچھ اُٹھل پھٹل کر رہا تھا لیکن میں بنا کچھ کہے، دم سادھے اُن کے سامنے بیٹھا رہا۔ آخر کار انہوں نے ہی اپنی خاموشی کا قفل توڑا۔ ”سب سے پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے خیال میں اس دنیا کا سب سے بڑا عہدہ مقام و مرتبہ کون سا ہو سکتا ہے۔ یاد رہے، ماضی اور حال دونوں زمانوں کا پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”شاید کسی سپر پاور کے سربراہ کا عہدہ۔“ ”نہیں..... نبوت دنیا کا سب سے بڑا عہدہ مقام و مرتبہ ہے۔ حالانکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا لیکن اب تک اور آنے والے تمام زمانوں کا سب سے بڑا عہدہ نبوت ہی ہے۔ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا۔“ ”جی بہتر..... لیکن میں اب بھی آپ کے اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا؟“ انہوں نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ ”دراصل جو میں اب کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق میرے سوال سے ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری دنیا اس کائنات کی لاتعداد دنیاؤں کے مقابلے میں صرف ریت کے ایک ذرے جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے بالکل قریب، ایک اور مخلوق جسے ہم جنات کے نام سے جانتے ہیں، اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ پھر جانے کتنی کہکشاں، کتنے سیارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری اپنی دنیا کے اندرونی رابطے کے بہت سے ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، موبائل وغیرہ جن سے ہم تمام دنیا میں پلک جھپکنے میں مطلوبہ شخص تک رسائی کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک رابطہ ہمہ وقت اپنے خدا سے بھی تو رہتا ہے۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس غیر مرئی رابطے کے لیے اب تک کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے، نہ ہی کبھی ہوگا۔ اس رابطے کا نظام خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ عموماً یہ رابطہ براہ راست نہیں ہوتا اور

کہ خود میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر یہ کیسا اسرار ہے۔ عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی مجھ نمازیوں سے خالی ہوئی، میں نے تمام واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مولوی خضر کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ خلاف معمول مولوی خضر نے میرے تمام سوالات کے جواب میں بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ”رہنے دو میاں..... بڑی تفصیل طلب باتیں ہیں..... وقت آنے پر تمہیں سب پتا چل جائے گا.....“ میں نے صرار کیا۔ ”آخر ایسا بھی کیا راز ہے..... پہلے میں نے عبد اللہ سے بھی جب اس بات کا ذکر کرتا تھا، تب اُس نے بھی کچھ ایسا ہی گول مول سا جواب دیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری یہ الجھن دور کر دیں..... چاہے اس راز کے افشا ہونے سے میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو.....“ انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ”بہت جلد ہو..... بہتر ہوتا کہ مناسب وقت کا انتظار کرتے.....“ لیکن میں اپنی ضد پراڑا رہا ”کل کر..... سو آج..... آج کرے سو ابھی.....“

مولوی خضر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”ٹھیک ہے..... یوں لگتا ہے جیسے تمہارے تربیت کا وقت آ گیا۔“

ہمارے قلب و نظر کے گرد اس طرح پہرہ بن کر پردے گرا دیتی ہے کہ ہم الہام تو دُور، سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ پاتے۔“ مولوی خضر نے پھر سے ایک وقفہ لیا۔ شاید وہ مجھے اس بات کا موقع دینا چاہتے تھے کہ میں اُن کی نقل باتیں ہضم کر سکوں۔ وہ پھر گویا ہوئے ”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشف اور الہام کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے.....؟ مطلب یہ کہ یہ نعمت بھی تو سبھی میں یکساں بنی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بھی باقاعدہ درجے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ آج کل سیٹلائٹ کا دور ہے۔ خلا میں بہتی لہروں کے ذریعے خلائی سنگل بھیجے جاتے ہیں اور ان لہروں کو پکڑنے کے لیے کسی ایٹینٹا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس ایٹینٹا کی اونچائی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ لہریں وہ پکڑ پاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم سب انسانوں کے سر پر بھی ایک ایسا ہی اُن دیکھا ایٹینٹا موجود ہے۔ جو جتنا بڑا کشف، یا الہامی ہوگا، اُس کا ایٹینٹا دوسروں سے اتنا ہی اونچا ہوگا اور اس غیر مرئی ایٹینٹا کی لمبائی، یا اونچائی کا براہ راست تعلق خود انسان کی انی محنت، عبادت، ریاضت اور پاکیزگی سے بھی ہے۔ جو جتنی کوشش اور ریاضت کرے گا اُس کی پہنچ عالم غیب میں اتنی ہی زیادہ ہوتی جائے گی۔ یعنی اُس کا ایٹینٹا سر سے اتنا ہی بلند ہوتا جائے گا۔ آج کل ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ کا بڑا چرچا ہے۔ سائنس ان علوم تک بہت دیر میں پہنچی ہے جب کہ ”روحانیت“ نے تو عرصہ قبل یہ سنگ میل عبور کر لیے تھے۔ چین میں ابھی تک باقاعدہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جو ننگے پاؤں پانی کی سطح پر یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے خشکی پر چل پھر رہے ہوں۔ کوئی ندی، دریا، یا سمندر انہیں ڈبو نہیں سکتا۔ یہ سب صرف اور صرف خود پر قابو پانے کی طاقت ہے، جو انہیں روحانیت سے عطا ہوتی ہے۔ ایک غیر مسلم جب اپنی توجہ اس قدر مرکوز کر سکتا ہے کہ وہ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے پیر کے ٹکڑوں کے پٹھے کنٹرول کرتے ہوئے اُن کی ساخت عارضی طور پر پانی پر چلنے کے موافق کر لیتا ہے تو پھر سوچو کہ اگر مومن اپنی توجہ مرکوز کرنے پر قدرت حاصل کر لے تو کیا نہیں کر سکتا.....؟؟؟ اب رہی بات تمہارے سوال کی کہ تمہیں بار بار چند لمحے آگے کی بات کیوں نظر آتی ہے تو میری ناقص اور ذاتی رائے یہی ہے کہ اس کا تعلق بھی اُسی کشف اور الہام سے ہے، جس کا میں نے ابھی اتنی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تمہارا ایٹینٹا کچھ پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن شاید ابھی ہم سب عام انسانوں کی طرح صرف سر کی سطح ہی پر ہے۔ میری دعا

بالواسطہ ہم سبھی ایک پوشیدہ نظام کے تحت اس رابطے سے جڑے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کے اپنے بندے سے براہ راست رابطے کے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ میں صرف تین بڑے ذرائع کا ذکر کروں گا۔ وحی، کشف اور الہام۔“ مولوی خضر نے پانی پینے کے لیے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بولا۔ اُن کی اس لمبی تمہید نے میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھر دی تھی۔ خدا خدا کر کے انہوں نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ”ہاں تو میں نے فی الحال صرف تین براہ راست رابطوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلا ذریعہ یعنی وحی شرعی کا سلسلہ آخری پیغمبر کے ساتھ ہی موقوف ہو گیا ہے۔ باقی رہ گئے دو ذرائع۔ ان میں سے پہلا ہے کشف، جس کا تعلق حیات سے ہے۔ جس میں کسی شخص کو باقاعدہ علم غیب، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس واقعے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ ایسے انسان کو کاشف کہتے ہیں اور اس کا یہ کمال کشف کہلاتا ہے۔ جب کہ تیسرے ذریعے کو ”الہام“ کہا جاتا ہے۔ الہام کا تعلق وجدانیت سے ہوتا ہے۔ وجدان یعنی انسان کو باقاعدہ کچھ نظر تو نہ آئے، پر خدا کی طرف سے اُس کے دل میں ایک خیال ڈال دیا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ کچھ یوں ہوا ہوگا، یا فلاں شخص کس حال میں ہوگا، یا فلاں دور راستوں میں سے ایک راستہ اُسے اُس کی کامیابی کے راستے پر لے کر جائے گا۔ لیکن یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کن خاص بندوں کو الہام، یا کشف کے مرتبے کے لیے چنتا ہے۔“ مولوی خضر نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے پھر سے سلسلہ جوڑا۔ ”لیکن ایک بات تو طے ہے کہ ایسا کمال ہر ایک کو تو عطا نہیں کیا جاتا، ضرور اُس بندے میں کوئی خاص بات تو ہوتی ہو گی۔ میرے نزدیک وہ خاص وصف خالص پن ہے جسے انگریزی میں Purity کہتے ہیں۔ ہم انسان عالم ارواح میں انتہائی معصوم ہوتے ہیں۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے گناہوں کی آلودگی ہمیں داغ دار کر دیتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کسی بچے کے شفاف پیچھڑے کے مقابلے میں کسی لگا تار سگریٹ، یا تمباکو نوشی کرنے والے کے پیچھڑے جو بہت زیادہ کاربن کی وجہ سے ایکسرے میں بھی باقاعدہ کالے نظر آتے ہیں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ خدا اُن کم از کم الہام کا تحفہ ہر انسان کے لیے طے کر رکھا ہے۔ لیکن ہمارے اندر کی آلودگی

کے لیے جا چکے تھے۔ میں تنہا ہی ساحل کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرائی تو کچھ ٹھنک کا احساس کم ہوا۔ میں نہ جانے کتنی دیر یونہی اپنی ذہن میں ساحل کے کنارے کنارے چلا گیا۔ اچانک دُور ساحل پر چند روشنیاں تیزی سے مجھے اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد ساحل سر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ چھ سات ہیوی بانیکس ساحل پر دوڑتی ہوئی میری جانب آرہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اس چنگھاڑتے شور میں ان موٹر سائیکل سواروں نے مجھے کراس کیا۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ٹولہ تھا جو شاید شہر سے دُور اس ویران ساحل پر ریس لگانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہر موٹر سائیکل پر ایک لڑکے لڑکی کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سبھی چیخ چلا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک دھبی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کچھ ”میٹھی یادوں“ نے میری رگوں میں بہتی کزادہٹ کو کافی کم کر دیا۔ مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ لگائی گئی ایسی کئی ریسوں اور ہنگاموں کا دور یاد آ گیا۔ ہمارے گروپ میں کاشف سب سے اچھا بانیک رائڈ تھا لیکن میں اُسے بھی بہت دفعہ ریس میں ہرا چکا تھا۔ میں اپنی یادوں کی جھونک میں بہت آگے چلا آیا تھا۔ ساحلی بستی کی روشنیاں تقریباً غائب ہو چکی تھیں۔ لہذا میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں درگاہ سے کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ مجھے وہی موٹر سائیکل سوار گروپ ساحل کے کنارے کھڑا نظر آیا۔ وہ سب کے سب ایک موٹر سائیکل کے گرد جمع تھے۔ شاید اُس بانیک میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ میں اُن کے قریب پہنچا تو وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اُن میں سے ایک شوخ سے لڑکے نے زور سے کہا۔ ”سلام مولانا جی..... یہاں آس پاس کوئی گیراج ہے تو پلیر بتائیے۔“ اُس کے مولانا کہنے پر پہلے تو مجھے یہ گمان ہی نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جب اُس نے دوبارہ زور سے کھکا کر مجھے متوجہ کیا تو میں رُک گیا۔ میرے علاوہ وہاں اور تھا ہی کون جسے وہ پکارتا۔ پھر میرا ہاتھ بے اختیار میری دو ہفتوں سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی شیو کی جانب چلا گیا۔ میں اس وقت کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر سفید ٹوپی اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی لیے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ایسے میں اُن کا مجھے ”مولانا“ سمجھنا اور پکارنا بالکل جائز تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ نہ جانے میں خود اس سے پہلے کتنے ایسے ظاہری حلیے والوں کو باقاعدہ مولوی سمجھتا رہا تھا۔ ہم انسان بھی کسی قدر ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ لباس اور حلیے کی بنیاد ہی پر درجہ بندیاں کرتے

ہے کہ خدا تمہیں مکمل وجدان عطا کرے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے ہوئے مولوی خضر کی ساری تمہید سن رہا تھا۔ وہ کہاں کی بات کو کہاں لے جا کر جوڑ بیٹھے تھے۔ بھلا میں کہاں اور رُوحانیت کہاں.....؟ ابھی ایک ہفتہ پہلے تک تو مجھے ٹھیک سے نماز بھی پڑھنا نہیں آتی تھی اب بھی جو کچے کچے سجدے کر رہا تھا۔ مجھے اگر زہرا کو پانے کی ذرا سی بھی ناامیدی ہوئی؟ میں ایک پل بھی مزید اس درگاہ میں نہ ٹھہرتا، جب کہ یہ حضرت تو نہ جانے کہاں کے قلعے کہاں ملا رہے تھے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور آپ میرے ماضی سے کچھ بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی.....“ انہوں نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ”میں نے اسی لیے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ کچھ فیصلے قدرت اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ کس کو اس کام کے لیے چننا ہے اور کسے نہیں..... یہ فیصلہ بھی تقدیر خود ہی کرتی ہے اور اس فیصلے کے آگے ہم انسانوں کے سبھی جواز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔“

مولوی خضر اپنی بات مکمل کر کے مغرب کی نماز کی تیاری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن میری ذات کو ادھورا بھٹکتے چھوڑ گئے۔ پتا نہیں اُن کی باتیں سننے کے بعد مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی اُن دیکھا شکوہ میرے وجود کے گرد کستا جا رہا ہے۔ یہ سلطان با مجھے کس گورکھ دھندے میں الجھا گئے تھے۔ میں تو اپنی پہلی اور ظاہری دنیا ہی سے بے زار تھا۔ یہ دوسری دنیا کے عذاب بھلا اب کون جھیلے گا.....؟ میں نے وہیں مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کہ مجھے مزید کسی امتحان میں نہ ڈالنے کا میں بہت ہی عام اور کمزور سا بندہ ہوں۔ مجھ میں اب مزید کوئی عذاب سہنے کی ہرگز سکت نہیں ہے۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب میں اپنی اس التجا میں اتنا غرق ہوا اور کب میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے دھلنے لگا۔ لیکن اُس روز اُس سنانے میں میری ہچکیاں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ دنیا میں مجھ جیسا کون ہوگا جس نے اپنی محبت پانے کے لیے اپنی سانسیں تک گردی رکھ دی ہوں۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا تھا؟

عشاء کی نماز کے بعد میرا دل جب بہت گھبرانے لگا، تو میں نے ساحل کی چہل قدمی ارادہ کر لیا۔ مولوی خضر نماز کے فوراً بعد ہی نیچے ساحلی بستی میں نہ جانے کس نمازی کی تیماردار

نعمان..... اب یہ ناکہ دینا کہ یہ تمہارا دوسرا جنم ہے۔“ میں نادانستہ طور پر اُن کی باتوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک دوسرا لڑکا بولا ”یار لوگ اس مرآتی تصویر (Mirror Image Theory) پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ نوی کا مسئلہ بھی بس اتنا ہی ہے۔“ اُن کی یہ ساری گفتگو زیادہ انگریزی میں ہو رہی تھی۔ دوسری جانب سے جینز میں لباس ایک لڑکی چلائی ”خدا کے لیے کوئی مجھے بھی اس شخصے کی عکس نما تصویر کے بارے میں بتائے گا۔“ پہلا لڑکا تفصیل سے بتانے لگا ”بھئی یونانی فلسفے کے مطابق ہماری یہ دنیا دراصل ہو ہو ایک ایسی ہی دنیا کا عکس ہے جو بالکل ہمارے سامنے ہی بستی ہے۔ لیکن ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی جو کچھ وہاں ہو رہا ہے ٹھیک وہ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا ڈپلی کیٹ اُس دنیا میں موجود ہے۔ اور یہ جو گڑ بڑ نوی کے ساتھ ہو رہی ہے ویسا تب ہوتا ہے، جب ہماری دنیا اور اُس دنیا کے عکس کے چند فریم آگے پیچھے ہو جائیں۔ تب ہم لمحہ بھر کے لیے مستقبل میں جھانک آتے ہیں۔ یار، وہ تم لوگوں نے ہم زاد کا ذکر نہیں سنا..... ہمارا ہم زاد وہی تو ہے۔ اسی جیسی دنیا میں بستا ہمارا ڈپلی کیٹ۔ ہماری کاربن کاپی۔“ میرے ذہن میں اُن لوگوں کی باتیں سن کر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ یہ تو وہی بات کر رہے تھے جس کی ایک روحانی توجیہ آج شام ہی کو مولوی خضر نے میرے سامنے پیش کی تھی۔ جب کہ یہ تو بالکل ہی کسی نئی تصویر کا ذکر کر رہے تھے۔ قدرت میرے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں نعمان نے زور دے کر کہا۔ ”میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ وقت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ باہر کے سائنس دانوں نے حال ہی میں کچھ ایسی آوازیں ریکارڈ کر لی ہیں جن کی زبان عبرانی ہے اور جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی آوازیں ہیں۔ بلکہ وہ تو اُس واقعے تک بھی پہنچ گئے ہیں کہ وہاں بات کسی گدھے کے مرنے کے قصے کے بارے میں ہو رہی ہے۔“ تیز طرار لڑکی نے ناک سیکڑی ”تو اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“ نعمان نے اصرار جاری رکھا ”یار جب آواز کے فریم خلا میں زندہ رہ سکتے ہیں اور صدیوں بعد بھی پکڑے جاسکتے ہیں تو پھر ہماری تصویریں بھی فضا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ میں ضرور باقی رہتی ہوں گی۔ تم دیکھنا جلد ہی ایک ایسی مشین بھی وجود میں آ جائے گی جو ہمیں ہمارے مستقبل نہیں تو کم از کم ماضی میں ضرور پہنچا دے گی، جہاں ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنا بچپن، اپنے والدین

پھرتے ہیں۔ دل کے حال پر کبھی نہیں جاتے۔ میں نے جواب دیا۔ ”جی فرمائیے۔“ سارا گروپ مجھے نہایت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُن میں سے شریر آنکھوں والی ایک لڑکی بولی ”جناب کسی قریبی ورکشاپ کا پتا بتا دیں۔ ہماری بایک خراب ہو گئی ہے۔“ میں نے خراب موٹر سائیکل پر زور ہی سے نظر ڈالی۔ جرمنی کی 700 سی سی سپر ٹرانف (Super-tranf) تھی۔ کسی زمانے میں یہ میری بھی پسندیدہ سواری رہ چکی تھی۔ ”آپ کہیں تو میں دیکھ لوں.....؟“ میں نے اُن سے اجازت طلب کی۔

میری بات سن کر وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ ایک دوسری چیونٹ چباتی لڑکی ہنس کر بولی۔ ”مولوی جی..... یہ سپر ہیوی بایک ہے۔ کوئی سائیکل نہیں، جو پچھر ہو گئی اور آپ اسے ٹھیک کر دیں گے۔“ لڑکی کی بات سن کر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ”تو سائیکل ہی نا..... بس ساتھ میں موٹر جڑ گئی ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر سیلف چیک کیا۔ موٹر سائیکل لک سے نہیں، بلکہ سیلف سے اشارت ہوتی تھی۔ سیلف ٹھیک تھا۔ میں نے ڈسک بریک دیکھی۔ اور ایئر لیور کو دو تین بار پکڑ کر چھوڑا۔ سارا گروپ حیرت سے میری ”کارروائی“ دیکھ رہا تھا۔ میں نے حتمی نتیجے پر پہنچ کر سر اٹھایا۔ ”بریک کی ڈسک (Discs) ایک دوسرے میں بھنس گئی ہیں۔ شاید بریک لگاتے وقت کچھ کو ٹھیک طرح سے ٹیڈ دیا گیا۔ آپ میں سے کسی کے پاس کٹ بیک ہے؟“ سبھی گروپ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کھنکارنے کی باری میری تھی۔ پھر جیسے میری کھنکار سن کر سبھی کو ہوش آ گیا اور ایک لڑا جلدی سے کٹ بیک لے کر میری طرف بھاگا۔ باقی سب بھی بیک وقت بولنے لگے۔ ”وا (wow) یار..... کمال ہے..... اس امیزنگ..... آپ کو تو پوری بایک کی انجینئرنگ کا..... ہے..... کیا آپ مکینک ہیں.....؟“ ”بس مکینک ہی سمجھ لیں..... بس دس منٹ میں آپ کو بایک تیار ہو جائے گی۔“ میں پوری طرح موٹر سائیکل کی خرابی درست کرنے میں جٹ گیا۔ گروپ کی نظروں میں اب میرے لیے طنز کے بجائے سائنس تھی۔ وہ سب پھر سے اپنی اپنی پرانی بحث میں مصروف ہو گئے جو شاید میرے آنے سے پہلے اُن کے درمیان جاری تھی۔ جم لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تھا، وہ بولا ”تم لوگ مانو نہ مانو..... مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پچ بھی یہاں آ چکا ہوں اور تب بھی وہ شپ ایسی جگہ ایسکر ڈ تھا۔ شرارتی لڑکی بولی ”تم آ

دروازے پر پڑی۔ کچھ دیر تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی.....
 جھکی تھی..... ٹھہرا سی..... اپنے آپ اور اس سارے زمانے سے بے زار۔ میں نے لوگوں
 سے نظر بچا کر دوبارہ اپنی آنکھیں مل کر دیکھا لیکن وہ زہرا ہی تھی۔ آج صرف اُس کی خادمہ ہی
 اُس کے ساتھ تھی۔ وہ عورتوں والے حصے کی طرف بڑھ گئی اور لالعلقی سی ہو کر ایک دیوار کے
 ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نوکرانی جلدی جلدی اُسے پکھا جھلنے لگی۔ زہرا کی حالت بہت
 اتر تھی۔ شاید وہ کسی لمبے سفر کی تھکان کے زیر اثر تھی، یا پھر کسی اندرونی کش مکش نے اُس کو اتنا
 بڑھال کر رکھا تھا۔ میرے دل میں شدید یہ خواہش ابھری کہ میں کسی طرح اُس سے معلوم
 کروں کہ اُس کی عبداللہ سے ملاقات ہوئی، یا نہیں۔ لیکن میری یہ حسرت دل میں ہی دبی رہ
 گئی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا اور نذر و نیاز اور مسائل کے حل کا مرحلہ
 شروع ہو گیا۔ مردانے سے فارغ ہو کر میں عورتوں والی کھڑکی کی جانب آیا تو حسب معمول
 میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کی رُوح میں اُتر جانے والی
 آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آج اُس کی آواز میں بھی تھکن کا غلبہ تھا۔ ”اگر میں آپ سے
 کچھ مانگوں..... تو کیا آپ دیں گے؟“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ شہنشاہ خود سوالی سے
 سوال کر رہا تھا۔ ”میرے پاس میری اس لا حاصل زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی
 آپ کہیں.....“ کچھ دیر دوسری جانب خاموشی رہی جیسے وہ کسی شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا
 ہو۔ پھر اُس کی آواز ابھری ”آپ..... میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ درگاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے
 جائیں.....“

۳

اور دیگر حالات دیکھ سکیں گے۔“ شرارتی لڑکی خاموشی سے چلائی ”واؤ..... دیش گریٹ..... یو
 مین ٹائم مشین..... کاش اُس وقت ہم سب بھی زندہ ہوں اور اپنے ماضی میں جھانک سکیں.....“
 اتنے میں، میں بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں نے نعمان کو سیلف مارنے کا کہا۔ اُس
 نے سیلف مارا اور موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اشارت ہو گئی۔ سب نے خوشی کے مارے سیٹیاں
 بجائیں اور نعرے لگائے اور اپنی اپنی جوڑی کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے مجھ
 سے ہاتھ ملایا اور اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دینے چاہے۔ میں نے مسکرا کر نوٹ واپس
 اُس کی شرٹ کی جیب میں رکھ دیئے اور اوپر درگاہ کی جانب اشارہ کر کے کہا ”میں وہاں رہتا
 ہوں..... کبھی وقت ملے تو وہاں آئیے گا۔ میں آپ کو اس بائیک کے بارے میں کچھ ایسی
 ہدایات دوں گا کہ پھر یہ آپ کو مہینوں تک نہیں کرے گی۔“ نعمان نے گرم جوشی سے بائیک پر
 بیٹھے بیٹھے ہی آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور کہا ”اوہ شیور..... Sure میں ضرور آؤں گا۔“
 شرارتی لڑکی نے بھی جاتے جاتے جلدی میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور وہ سب ہی میرا شکریہ ادا
 کرتے اور شور مچاتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جانے میں ساحل پر چہل قدمی کے لیے
 کیوں اُترا.....؟ جانے یہ گروپ وہاں کیوں آیا اور اُن تک میری رسائی کیوں ہو پائی.....؟
 شاید یہ سارا کھیل ہی مجھے اس نئی تھیوری تک پہنچانے کے لیے تھا.....؟ میں نے دل میں ارادہ
 کیا کہ کل صبح موقع ملے ہی سب سے پہلے مولوی خضر سے اس یونانی فلسفے کے بارے میں
 بات کروں گا۔ کیا واقعی ہمارا کوئی ہم زاد بھی ہوتا ہے۔ بالکل ہمارے جیسا؟ ہمارا نام، ہم پیشا
 لیکن اگلا دن جمعرات کا تھا اور حسب معمول فجر کے بعد ہی سے دھیرے دھیرے درگاہ پہ
 حاضری دینے والوں کا جھوم بڑھتا گیا۔ اُس روز ویسے بھی نہ جانے کیوں اس قدر بھیڑ تھی کہ
 مجھے سر اٹھانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی اور یونہی دیکھتے دیکھتے عصر کا وقت بھی ہو گیا۔
 آج میرا دل بالکل ہی بجا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ زہرا کو اب یہاں
 آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اُسے اپنے عبداللہ کا پتا مل چکا تھا اور شاید اب وہ ہر جمعرات
 کو سیکڑوں میل کا سفر کر کے اُس درگاہ کی زیارت کو جایا کرے گی، جہاں اُسے اُس کے من کو
 مراد مل سکتی تھی۔ اور پھر وہ درگاہ کی زیارت کو یہاں آتی ہی کب تھی.....؟ وہ تو صرف عبداللہ کی
 زیارت کے لیے آتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر صحن کے پا

کھڑے ہو کر ڈوبنے سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ موت بھی منظور ہے۔ میری دعا پھر بھی یہی ہوگی کہ خدا آپ کی کشتی پار لگا دے۔ لیکن میں یہاں کچھ شرائط کے تحت اور کچھ معزز لوگوں کے وعدوں اور ضمانت پر آیا ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دیجیے تاکہ میں یہاں سے جانے کا کوئی مناسب موقع اور بہانہ ڈھونڈ سکوں۔ مجھے یہاں سے جانے کے بعد اپنا سامنا بھی کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ مجھے خود اپنے سامنے ذلیل ہونے پر مجبور نہیں کریں گی۔“ ”نہیں نہیں..... خدا خواستہ..... ساحر میں جانتی ہوں، میں آپ کو کتنی مشکل میں ڈال رہی ہوں..... لیکن آپ نہیں جانتے..... بس آپ نہیں جانتے۔“

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی اور وہ تیزی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ پھر بنا بیٹھا رہا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام ”ساحر“ پکارا تھا۔ یہ چار حرف اُس کی زبان سے نکل کر کس قدر محترم، کتنے بلند ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بے معنی سے نام کو اُس کی زبان نے معنی دے دیئے تھے۔ ساحر..... پہلے تو کبھی مجھے میرا نام اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ جاتے جاتے بھی مجھے ایک امتحان میں ڈال گئی تھی۔ جانے سلطان بابا اور عبداللہ کو میں یہ بات کیسے سمجھا پاؤں گا کہ جس کے لیے میں اس امتحان گاہ میں آکر بیٹھا تھا، وہی نہیں چاہتی کہ میں سارے پرچے حل کر کے سرخرو ہو سکوں۔ جب امتحان نے امتحان سے پہلے ہی نتیجہ سنا دیا تھا کہ کامیابی میرا مقدر نہیں تو پھر اس آزمائش کا تکلف بھی کیوں؟

شام کو مغرب کے بعد جب فراغت ملی تو میں نے سب سے پہلے مولوی خضر کو کل رات ساحل پر موٹر سائیکل گروپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس ”عکس آئینہ“ تھوڑی کے بارے میں بتایا کہ میں اُن کی بات سن کر کافی الجھ سا گیا ہوں۔ خاص طور پر ہم زاد والی بات سن کر تو خود مجھے بھی ایک لمحے کو ایسا لگا تھا کہ کہیں واقعی میرا ہم زاد ہی تو میرے ساتھ ساتھ نہیں چلا۔ جو مجھ سے پہلے ہی ہر مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ مولوی خضر نے غور سے میری بات سنی۔ ”وہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا تھا میاں..... ایسا ایک نظریہ بھی موجود ہے، جو اس دنیا کو پہلے سے ہونے والے واقعات کا تسلسل بتاتا ہے۔ سائنس میں اس کے علاوہ بھی دنیا کے وجود میں آنے کی کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً بگ بینک کا

پہلی جیت

پہلے پہل تو میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ میں نے وضاحت چاہی ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتی ہیں۔“ ”کہیں بھی..... آہ کہیں بھی چلے جائیں..... بس یہ درگاہ چھوڑ دیں۔ آپ دھیرے دھیرے میرے راستے رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے عبداللہ کو یہاں سے کہیں اور جانا پڑا۔ اور جر میں وہاں اُن تک پہنچی تو انہوں نے مجھے اس درگاہ کی حاضری کا حکم دے دیا۔ میں اُن کا حکم نال نہیں سکتی، لیکن آپ سے درخواست تو کر سکتی ہوں کہ آپ ہی میرے حال پر رحم کھائیے براہ مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے جانے کے بعد وہ دوبارہ سیکھ جائیں۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور میرے دل پر نہ جانے کتنی چھریاں چل رہی تھیں۔ تو گویا اُ کی آج کی حاضری کا مقصد بھی اُسی رقیب کی مدح سرائی تھا، جو پہلے ہی میری محبت پر ڈال ڈال چکا تھا۔ مجھے زہرا کی سنگ دلی کا اس شدت سے احساس ہوا کہ روح کے نازک دھماکے اُدھرنے لگے۔ کیا اُسے میری حالت کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ میں یہاں صرف اور صرف اُسی کے لیے تو بیٹھا ہوا تھا۔ کیا میری محبت اتنی ہی حقیر اور فضول تھی کہ آج تک اُس پھر ایک دراڑ بھی نہ ڈال پائی تھی۔ میری طرف سے گہری خاموشی پا کر اُس جلاو نے مجھے پھر میر موت یاد دلائی۔ ”میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔“

زندگی میں پہلی مرتبہ میرے اندر کی کڑواہٹ باہر نکل آئی۔ ”آپ جواب کہاں چاہیں۔ آپ کو تو بس حکم سنانا آتا ہے۔ سو، آپ نے سنا دیا۔ اب یوں کہیں کہ آپ تعمیل کی تہ ہیں۔“ اُسے شاید اپنے لہجے کی سختی کا کچھ احساس ہوا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو ڈکھ ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ میری اہتر حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اُس دن ڈوب رہی ہوں جب کنارہ بس سامنے نظر آ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کریں، پلیز۔“ جلا دسر قلم کر سے پہلے سزائے موت کے مجرم سے رحم اپیل کر رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ میرے

نظریہ، ڈارون کی تھیوری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور دل چسپ نظریہ موجود ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کی اور اس دنیا کی پوری فلم پہلے ہی سے بنا کر کیسٹ میں بند کر دی گئی ہے۔ بنانے والے مالک نے پہلے ہی سے پوری فلم دیکھی ہوئی ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک سب کچھ فلما یا چکا ہے۔ آگے جو ہونا ہے، وہ بھی کیسٹ موجود ہے اور یہ الہام، یا کشف، یا مستقبل بینی اُن کے حصے میں آئی ہے، جو فلم کے اگلے حصے کے چند مناظر اپنی کسی خاص روحانی طاقت کی وجہ سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اسی تصور پر کام کرتے ہوئے بیرونی ملکوں کے سائنس دان ٹائم مشین کی تخلیق کی کوششوں میں جانے کب سے لگے ہوئے ہیں، کیونکہ اُن کے خیال میں ابد تک فلم موجود ہے تو مستقبل میں بھی سفر کیا جاسکتا ہے۔ اور باقاعدہ مستقبل، یا ماضی میں جا کر حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ میں نے کہا نا میاں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، حضرت انسان کی کھوج کا یہ سفر اسے ایسے نظریات اور مفروضوں تک لے جاتا رہے گا اور حقائق سامنے آتے رہیں گے۔ البتہ ایک مسلمان کا عقیدہ اٹل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانی حیات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور اب قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر اٹل ہے اور صرف دعا تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمارا قسمت کا فلسفہ بھی تو کسی نہ کسی طرح سب پہلے سے طے شدہ ہونے، یا پھر بقول مغربی محقق ”سارے عمل کی مکمل فلم بندی، ہونے کو سہارا دیتا ہے نا۔ بس بنیادی فرق عقیدے کا ہی رہ جاتا ہے ورنہ مغربی سائنس دان بہت سی باتوں میں خود اسلام کی ترویج کر رہے ہوتے ہیں۔ چاہے انجانے میں ہی سہی.....“

میں حیرت سے مولوی خضر کی باتیں سن کر رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد کتنے اسرار، راز بکھرے پڑے ہیں اور ہم نہ جانے کن چیزوں میں اپنا دھیان کھپاتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو چھوڑیے، خود میں کہاں ان اسرار و رموز کی حقیقت جاننے کے لیے یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد بھی تو صرف اور صرف زہرا ہی تھی اور اب تو شاید اس کہانی کا خاتمہ بھی قریب آچکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک آدھ دن میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر خود مولوی خضر سے اپنی زہرا سے ہونے والی اس آخری بات چیت کا احوال بیان کر کے درخواست کروں گا کہ کسی طور پر عبد اللہ یا سلطان بابا کو میرے واپسی کے ارادے سے مطلع کر دیں۔ میں درمیان میں صرف ایک

مرتبہ، ایک دن کے لیے گھر ہو کے آیا تھا۔ جب کہ ماما، پاپا سمیت تمام دوستوں کو سختی سے پہلے مہینے میں درگاہ ملنے آنے سے منع کر رکھا تھا، کیوں کہ میں کسی بھی حوالے سے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ البتہ حسب وعدہ والدین سے ملنے کے لیے ہر دو ہفتے میں ایک رات تو اپنے گھر پر گزارنی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تھا، تب ماما اور پاپا دونوں ہی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے اور شام ہونے سے پہلے میرے دوستوں کا بھی جم گھٹا سا لگ چکا تھا۔ وہ سب مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے میں جانے کتنی صدیوں بعد اُن سے ملا ہوں۔ باقاعدہ جشن کا سماں تھا۔ میں درگاہ میں پندرہ دن گزار کر پہلی مرتبہ گھر گیا تھا اور اُن پچھلے پندرہ دنوں میں میری ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ پہلی وجہ تو سلطان بابا کی شرط تھی اور دوسری مولوی خضر کا ہمہ وقت ساتھ۔ وہ ہر نماز کے وقت سے پہلے ہی پیغام بھیج بھیج کر، مسجد پہنچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر مولوی صاحب نہ ہوتے تو مذہب سے میرا یہ تعارف اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر مجھے تو ویسے بھی نماز بہت مشکل اور پابند کر دینے والا عمل لگتا تھا۔ کچھ ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ نماز وغیرہ کی پابندی شاذ و نادر ہی کی جاتی تھی۔ ماما کو سال میں کبھی ایک آدھ بار جوش چڑھتا تو کوئی محفل میلاد وغیرہ منعقد کروا لیتی تھیں۔ لیکن مجھے تو وہ بھی میلاد کی محفل سے زیادہ ”فیشن پرید“ لگتی تھی۔ رہ گئے پاپا تو کبھی کبھار ہمارے ڈرائیور کی دیکھا دیکھی جمعہ، یا عید کی نماز پڑھنے کے لیے اپنی مرسدیز بینز میں قریبی جامع مسجد تک چلے تو جاتے تھے لیکن زندگی میں کبھی بھی مجھے اپنے ساتھ نماز کے لیے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ مذہب ہمارے گھر میں ایک فالتو بلکہ کسی حد تک ممنوع شے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب میں سکول میں اپنے دوستوں کو رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا تھا تو گھر آکر میں بھی ماما پاپا سے روزہ رکھنے کی ضد کرتا تھا، لیکن نہ تو انہوں نے خود کبھی رمضان کی پابندی کی تھی اور نہ کبھی مجھے روزہ رکھنے دیا۔ ماما کو ہمیشہ اپنے لاڈلے بیٹے کی صحت کرنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ البتہ وہ خود کبھی کبھار ستائیسویں، یا تیسویں کا روزہ رکھ لیتی تھیں۔ رہ گئے پاپا تو اُن کا تو سارا سال ہی بیرون ملک دوروں اور سفر کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہذا ایسے میں روزہ رکھنے کی بھلا کسے فرصت.....؟ پتا نہیں میرے گھر والے مذہب سے اتنا خوف زدہ کیوں تھے؟ درگاہ میں پہلے دن نماز پڑھتے ہوئے خود مجھے مذہب سے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ مولوی

میں مولوی جیسا محترم لفظ کیوں اور کب کیسے ایک الزام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہمارا مذہب سے تعلق صرف بچے کے کان میں اذان دلوانے سے لے کر نماز جنازہ پڑھوانے تک ہی رہ گیا تھا۔ درمیان کا مذہب نہ جانے کہاں کھو گیا۔ سو، میں بھی اپنے گھر میں، یا اپنے دوستوں کی محفل میں ایک نماز بھی ادا نہیں کر سکا۔ البتہ واپس آ کر میں نے مولوی خضر سے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو انہوں نے دھیرے سے مسکرا بس اتنا کہا۔ ”چلو جو ہوا سو ہوا، تم یوں کرو کہ ان سب نمازوں کی قضا پڑھ لو۔ مذہب کا کام راستہ دینا ہے، راستہ روکنا نہیں۔“ اب میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ سے تو میری پوری زندگی ہی ”قضا“ ہونے کو ہے۔ زہرا کے حصول کی لگن بھی ایک طرح کی اُمید ہی تھی۔ لیکن جب سے اُس نے مجھے اپنا یہ جنون ترک کرنے کی درخواست کی تھی، تب سے مجھے واقعی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ”وہ ایک سجدہ“ جس میں اسے مانگنا تھا، وہی مجھ سے قضا ہو چکا ہے۔

میں نے آخر کار حتمی فیصلہ کر ہی لیا اور ایک طویل خط میں عبداللہ کو زہرا کی درخواست کے بارے میں ساری تفصیل لکھ ڈالی۔ عبداللہ کو یہ بھی بتا دیا کہ اب میرا اس درگاہ پر مزید ڈیرہ اُلے رہنے کا کوئی مقصد ہے نہ فائدہ۔ لہذا وہ سلطان بابا کو بتا دے کہ میں شرط ہارنے کا اعلان کر رہا ہوں اور اس جمعرات کے بعد درگاہ چھوڑ جاؤں گا۔ ہو سکے تو وہ کسی اور خدمت گار کا بندوبست کر لیں، یا پھر عارضی طور پر عبداللہ ہی واپس یہاں آ جائے۔ خط لکھتے ہوئے بھی یہ ات میرے دل میں آئی تھی کہ زہرا بھی تو یہی چاہتی تھی کہ خود عبداللہ اس درگاہ کا انتظام پھر سے سنبھال لے۔ شاید اسی طرح میں اُس محبوب کے کچھ کام آ جاؤں؟ ابھی میں خط لکھ کر نارغ ہوا تھا کہ باہر سے کریم کا نعرہ گونجا۔ ”عبداللہ بھائی..... کدھر ہو، آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ میں حیرت کے عالم میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سامنے اُس رات والے موٹر سائیکل گروپ کے نعمان اور اُسی شریسی چیونگم چبائی لڑکی کو کھڑے پایا، جو اُس رات بھی نعمان ہی کی بانیک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے اُن دونوں کو دیکھ کر مجھے ایک انجانی سی خوشی کا حساس کیوں ہوا۔ میں نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ لڑکی کا تعارف نعمان نے ٹینا کہہ کر کر دیا۔ ٹینا درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔ میں نے نعمان کو اشارہ کیا تو وہ ٹینا کا ہاتھ پکڑے درگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہم صحن ہی میں ایک جانب

خضر کی صحبت میں علم ہوا کہ مذہب تو بہت ہی آسان اور دوست نما کوئی چیز ہوتی ہے۔ جسے ٹھیک طرح سے اپنایا جائے تو اُلٹا وہ ہمارے اندر کے خوف اور دوسوسوں کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بہر حال میرے گھر میں مذہب ”شناختی کارڈ“ کے خانے میں لکھا جانے والا ایک لفظ ”مسلم“ تھا۔ ہاں البتہ ایک بہت عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بھی موت چند دن کے لیے ہمارے گھر میں بھی مذہب کو یوں پھیلا دیتی تھی، جیسے ہم لوگوں سے زیادہ کٹر مذہبی اور کوئی نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا جب یکے بعد دیگرے پہلے دادا ابو اور پھر دادی جان چند مہینوں کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب ہر موت کے اگلے چند دنوں تک ہمارے گھر میں صرف اور صرف مذہب کا راج تھا۔ جزدانوں میں برسوں سے پڑے قرآن اور سپارے اُتار کر اُن کی دھول جھاڑی گئی اور ہفتوں گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ ایک مولوی صاحب روزانہ صبح سے شام تک گھر کے وسیع لان میں لگائے گئے شامیانے میں دعا کرنے کے لیے بیٹھے رہتے اور ہمارے گھر کے دالان میں ظہر، عصر اور مغرب کی تین نمازیں باقاعدہ جماعت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، جن میں پاپا سمیت وہ تمام ملاقاتی بھی شامل ہوتے، جو تعزیت کے لیے آتے تھے۔ ماما بھی سر پر سفید چادر ڈالے اور ہاتھ میں تسبیح لیے عورتوں کے جم کھٹے میں ورد کرتی نظر آتیں۔ اور میں نے زندگی بھر میں صرف اُن ہی دنوں میں اُن کے ہاتھ میں قرآن دیکھا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف موت ہی ہمارا مذہب ہے واحد ذریعہ ملاقات تھا اور چونکہ دادا اور دادی کے بعد گھر میں کسی خونی رشتے کی موت نہیں ہوئی تھی لہذا تب سے مذہب کے لیے بھی گھر کے دروازے ہمیشہ کی طرح بند تھے۔

جس دن میں درگاہ سے ایک رات گزارنے کے لیے گھر گیا تھا، اُس دن میں نے بھی کوئی نماز نہیں پڑھی تھی، حالانکہ اس شور اور ہنگامے میں بھی مجھے تمام نمازوں کے اوقات نہ صرف یاد رہے بلکہ ہر نماز کے وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت بھی ابھری۔ جیسے مجھ سے کوئی اہم چیز چھوٹ رہی ہو۔ مجھے کھودینے کا عجیب سا احساس بھی ہوا لیکن پتا نہیں کیوں، میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے سامنے نماز پڑھنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ ایک عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں کوئی جرم کرنے چلا ہوں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ لوگ کیا کہیں گے کہ ”ساحر تو پکا مولوی بن گیا ہے۔ درگاہ جا کر.....“ پتا نہیں، ہمارے گھرانوں

درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ٹینا نے آس پاس حیرت سے دیکھا۔ ”آپ یہاں رہے ہیں.....؟ بور نہیں ہو جاتے۔“ مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ ”بہت بور ہوتا ہوں، کبھی کم تو اتنا بور ہوتا ہوں کہ خود بوریت بھی مجھ سے بور ہو کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔“ وہ دونوں میری بات سن کر ہنس پڑے۔ نعمان نے بتایا کہ وہ حسب وعدہ مجھ سے اپنی بایک کے بارے میں معلومات لینے آیا ہے۔ میری طرح وہ بھی ہیوی بانکس کا دیوانہ لگتا تھا۔ میں نے بہت تفصیل سے اُسے تمام معلومات سے آگاہ کیا اور ہر پرزے کی الگ الگ خصوصیات بھی بتائیں۔ نعمان اور ٹینا دونوں ہی بہت غور اور دل چسپی سے میری باتیں سنتے رہے۔ نعمان نے مجھے بتایا کہ اُس نے حال ہی میں شپ کے ذریعے یہ بایک جرمنی سے منگوائی ہے۔ اس لیے اُسے شہر شروع میں اسے سنبھالنے میں بہت دشواری پیش آ رہی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران ایک مولوی خضر بھی کسی کام سے درگاہ آئے اور انہوں نے نعمان اور ٹینا کو دعا بھی دی۔ شام ڈھ وہ دونوں رخصت ہوئے تو بہت خوش تھے۔ ٹینا نے تو باقاعدہ درگاہ کی زندگی پر ایک انگریز اخبار میں فچر لکھنے کا پروگرام بھی بنالیا تھا اور نعمان نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی مجھ ملنے دوبارہ آئے گا۔ جانے کیوں میں اُسے یہ نہیں بتا سکا کہ اب جب وہ یہاں آئے گا تو شام مجھ سے اُس کی ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ دو دن کے بعد ہی تو جمعرات تھی۔ میری اس درگاہ آخری جمعرات۔

لیکن اگلے دو دن میرے لیے بہت ہی کٹھن ثابت ہوئے۔ اُس رات مولوی خضر شدید بخار نے آگھیرا اور اُن کی تیمارداری اور دیگر امور کو نمٹانے میں وقت کچھ یوں گزرا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کریم بھی اپنی کشتی لے کر چار دن کے لیے کھلے سمندر میں جال ڈالنے لیے جا چکا تھا، لہذا مجھے اپنی مالاؤں کے ساتھ ساتھ مولوی خضر کی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں بیچنے کے لیے جمعرات کو خود بازار جانا پڑا۔ ہمارا طریقہ کار بھی وہی ہوتا تھا جو باقی مجھیرے بازار سجانے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ یعنی ساحل پر کسی چادر، یا لکڑی کے تختے وغیرہ پر لگا کر گاہک کا انتظار کرنا، لیکن جانے اُس دن ایسی کیا بات تھی کہ کوئی خریدار میری طرف ہی نہیں کر رہا تھا۔ اوپر سے جمعرات کی وجہ سے درگاہ میں زائرین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ سیرھیوں سے کچھ فاصلے ہی پر اپنی مالاؤں اور مولوی خضر کی ٹوپیاں سجائے بیٹھا درگاہ

سیرھیوں سے اوپر جاتے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے اوپر صحن میں موجود دو خدمت گار ٹھیک سے اپنا کام کر رہے ہوں گے، یا نہیں۔ مجھے زیادہ فکر یہ تھی کہ عصر سے پہلے اگر میں اپنی چیزیں بیچ نہیں سکا تو نذر و نیاز کا معاملہ کون بھگتائے گا۔ عبد اللہ نے جاتے وقت سختی سے مجھے اس معاملے کو ذاتی طور پر نمٹانے کا کہا تھا، کیوں کہ یہ اچھی خاصی رقم کا معاملہ تھا اور لوگوں کی بہت سی امانتیں ہمارے سپرد ہوتی تھیں، ایسے میں کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی راہ گیر کی ٹھوکر لگی اور میری ساری مالاؤں زمین پر بکھر گئیں۔ چند ایک کے دانے بھی لڑی سے علیحدہ ہو کر ریت پر ڈور تک بکھر گئے۔ نقصان بھی میرا ہوا تھا، لیکن اس پر بھی وہ صاحب جو غالباً اپنی بیگم کو درگاہ کی زیادت کے لیے لے کر آئے تھے، مجھ ہی پر بگڑنے لگے۔ ”غضب خدا کا۔ سارا راستہ ان لوگوں نے بند کر رکھا ہے۔ زیارتوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی انہوں نے کاروبار کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ بیگم ہم تو کہتے ہیں کہ ان ہی لوگوں کے بھیس میں وہ چور اُچکے بھی چھپے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک نے پچھلے ہفتے آپ کا پرس چھین لیا تھا۔“ وہ جانے کیا اول فول کہے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی مالاؤں جتنے ہوئے اُن سے دھیرے سے بس یہ کہا ”آپ جائیں یہاں سے، میں معافی چاہتا ہوں۔“ لیکن اُن کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ اب آس پاس کے لوگ بھی تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے۔ ”نہیں چلے کیسے جائیں۔ ہم تو یہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے مل کر ہی جائیں گے۔ یوں راستہ بند کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ کیسی کھلی بد معاشی کا بازار گرم کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ آج میں اس کا بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔“ میں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ کیوں کہ میں اس وقت عبد اللہ تھا۔ اگر عبد اللہ کی جگہ ساحر ہوتا تو نہ جانے اب تک کیا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اگر ساحر ہوتا تو وہ بھلا یوں بازار میں عام مزدوروں کی طرح مزدوری کرنے کیوں بیٹھا ہوتا؟ وہ صاحب یوں ہی مگر جتے برستے رہے۔ اب اُن کی بیگم اور باقی بھیڑ نے انہیں ٹوکنا شروع کر دیا تھا کہ چلیں جو ہوا سو ہوا۔ اب جانے دیں۔ بھیڑ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں بنا کچھ کہے، سر جھکائے اُن صاحب کی تمام صلواتیں سن رہا ہوں۔ اب ہجوم میں سے ایک آدھ شخص نے باقاعدہ اُن صاحب کو جھاکر کہا کہ لڑکا خاموش کھڑا کب سے آپ کی گالیاں سن رہا ہے۔ لہذا شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ اب

الوداع

میں حیرت سے گنگ بیٹھا رہا، نہ جانے وہ کون سی جیت کی بات کر رہی تھی۔ میں تو اپنی آخری بازی بھی ہار چکا تھا۔ میں نے شکوہ کیا۔ ”طعنہ دے رہی ہیں.....؟“ ”نہیں نہیں“ وہ جلدی سے بولی۔ ”طعنہ نہیں ہے، اعتراف ہے، میں نے آج تک صرف اپنی لگن کو دنیا کی سب سے سچی لگن مانا ہے اور دنیا کا ہر جنوں، مجھے اپنے جذبے کے سامنے بیچ اور کم تر لگتا تھا، لیکن آج میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ آپ کا جذبہ اور آپ کی لگن شاید اس دنیا ہی سے ماورا ہے.....“ میری حالت اس وقت اُس سپہ سالار سی تھی، جو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر چکا ہو، سانس دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہوں، مگر سانسوں سے اڑتی خاک کے پس منظر میں، مرنے سے کچھ لمحے پہلے اپنی فوج کو قلعے پر فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو۔ زہرا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آج وہ ستم گر بھی میرے جنوں کی داد دے رہا تھا، جس نے مجھے دیوانگی کی اس حد تک پہنچایا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا، لیکن میرے لفظ جیسے کہیں کھو سے گئے۔ ”آپ، یہ کیا..... دیکھیں، آپ کے آنسو..... پلیز.....“ میں اُسے کیا کہتا خود میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں، جیسے سارے بند آج ہی ٹوٹے ہوں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم دونوں کا درد جدا بھی تھا اور مشترک بھی..... اور ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بے وفائی کا الزام بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اتنے میں زہرا کی ماں اور ہڑ بڑائی ہوئی کی خامہ بھی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے شاید معاملہ کچھ بھانپ لیا کہ میری حالت زار نے اُن کی پتھر دل بیٹی کے سینے پر بھی ”پہلی چوٹ“ مار دی ہے۔ انہوں نے جب میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھوں کی لرزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ بولیں تو لہجہ کانپتا سا، بھرایا ہوا تھا۔ ”مخلوں کا ایک شہزادہ کیوں اپنی جوانی اس خاک میں رول رہا ہے، کچھ بھکاریوں کی قسمت میں بھیک بھی نہیں ہوتی بیٹا..... جاؤ اپنی سلطنت کو لوٹ جاؤ..... مجھے اُس ماں کی آہ سے ڈر لگنے لگا ہے، جس کی پھول سی اولاد کو ہم نے یوں در بدر کر دیا۔ ہمیں معاف

آپ بھی یہاں سے آگے بڑھ جائیں۔ لہذا خدا خدا کر بادل غواستہ اُن صاحب نے قدم آگے بڑھائے اور میں نے لمبا سانس لے کر اپنی نظریں اٹھائیں اور پھر میری نظر کسی کی نظر سے ٹکرا کر جم سی گئی۔ جب وہ صاحب دل کھول کر میری بے عزتی کر رہے تھے اور میں سر جھکائے کھڑا تھا تب نہ جانے کس وقت زہرا اپنی ماں اور خادمہ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے شاید بھیڑ کو دیکھ کر ہنسی تھی۔ یہ سارا تماشا درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب اُسی راستے پر ہو رہا تھا، جو اُس ماہ رُخ کی راہ گزرتھی۔ مطلب یہ کہ اُس نے میری رسوائی کا یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ زہرا کی والدہ تو زیادہ میری نظر کا سامنا نہیں کر پائیں اور منہ میں چادر کا پلو دبائے سکتی ہوئی وہاں سے خادمہ سمیت آگے بڑھ گئیں، لیکن سنگ مرمر کی وہ صورت وہیں جمی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ چند گھڑیوں ہی میں جانے کتنے طوفان گزر گئے۔ پتا نہیں، یہ میرے اندر کی شدید بے بسی کا احساس تھا، اپنی رسوائی کا غم تھا، یا پھر اُس بے رحم کی ناقداری کا شکوہ۔ لیکن جانے کیوں پل بھر میں ہی میری آنکھوں سے بیک وقت دو آنسو نکلے اور شاید نیچے ریتی زمین کے بجائے اُس نازنین کے دل پر ٹپکے۔ میری زبان نے تو آج تک کبھی اُس سے شکوہ نہیں کیا تھا، پر میری آنکھوں نے شاید اُس بل اپنی ساری کہانی کہہ ڈالی۔ پھر زہرا سے بھی وہاں رُکا نہیں گیا اور وہ اپنی پلکیں بھیگنے سے پہلے ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اوپر درگاہ چلا آیا۔ میرے اندر چند لمحوں میں اتنی زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی کہ اب میرا دل کسی کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لہذا میں نے تمام کام مولوی خضر کے اُس شاگرد کے حوالے کر دیئے جو جمعرات کے روز خصوصی طور پر میری مدد کے لیے درگاہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ عصر کے بعد نذر اکٹھی کرنے کے لیے بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ شام ڈھل رہی تھی اور میں نڈھال سا آنکھیں موندے درگاہ کے صحن کے ایک پوشیدہ گوشے میں دیوار کے ساتھ ٹپک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دفعۃً کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرا جسم شل سا ہو گیا۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ ”آپ مجھ سے جیت گئے.....“

مما اور پاپا نے یوں اچانک مجھے گھر میں دیکھا تو اُن پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ماما تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں مستقل گھر واپس آ گیا ہوں۔ پاپا بھی بہانے بہانے سے تعذیب کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کسی طرح سمجھایا کہ اس وقت شدید تھکا ہوا ہوں اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اگلی صبح میری آنکھ شور، ہنگامے سے کھلی۔ حسب توقع ممانے میرے سارے دوستوں کو خبر کر دی تھی اور وہ سب نیچے لاؤنج میں جمع ہو کر چلا چلا کے مجھے نیچے بلا رہے تھے۔ اُن کو میرے شرط ہار جانے کا یقین ہی نہیں تھا، کیوں کہ اس سے پہلے میں ایسی کئی شرطیں جیت کر اور سرخرو ہو کر واپس لوٹا تھا۔ بہر حال اُن کے لیے یہی کافی تھا کہ میں واپس لوٹ کر اُن کے درمیان پہنچ چکا تھا، لیکن کیا میں واقعی واپس آ گیا تھا.....؟

دن گزر رہے تھے، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں۔ گھر میں، دوستوں کی محفل، کلب، پارٹی میں، ہر جگہ جسمانی طور پر پہنچ تو جاتا لیکن گھٹنوں گم صم بیٹھا رہتا۔ یار دوست میری خاموشی سے تنگ آ کر لڑتے جھگڑتے اور میں یوں ہی اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا، لیکن نہ جانے کیوں اُن لمحات میں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اپنی رُوح کہیں دُور چھوڑ آیا ہوں۔ سب سے زیادہ مسئلہ مجھے نماز کے اوقات میں ہوتا۔ ایک عجب سی بے چینی اور کسک مجھے گھیر لیتی تھی۔ تب میرے لیے گھر، یا باہر کسی بھی محفل میں بیٹھنا دھند بھر ہو جاتا اور مسئلہ یہ تھا کہ کلب، یا گھر کا ماحول میری اس مشکل کو ختم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیتا۔ ایسے میں، میں گھر، یا محفل چھوڑ کر کہیں باہر نکل جاتا۔ کسی پُر سکون گوشے کی تلاش میں۔ ایک ایسی ہی سہ پہر جب میرے اندر کی بے چینی آخری حدود کو چھو رہی تھی، میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پتا نہیں کب سینٹرل لائبریری کا بورڈ دیکھ کر شہر کی سب سے بڑی لائبریری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی۔ ہال میں مختلف شیلیف ہر موضوع کی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً میری نظر ”تصوف“ والے سیکشن میں رکھی کتابوں پر پڑی اور میں یونہی ورق گردانی کے لیے ایک کتاب لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ صفحے پلٹے تو میری بے چین رُوح کو جیسے کچھ مرہم ملا۔ ہاں ٹھیک ہی تو تھا، جانے کب سے میری رُوح گھائل تھی، پیار تھی۔ اور حیرت ہے کہ ہم اپنی جسمانی بیماری کے لیے تو ڈاکٹر کے پاس

کر دو، ہماری خطا بخش دو.....“ وہ جانے کیا کچھ کہتی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہیں۔ زہرا کی آنکھیں تو پہلے ہی برس رہی تھیں۔ ”اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں ہے..... میرا مقصد مجھے یہاں کھینچ لایا ہے اور تقدیر کی مار مجھے تب تک جھیلنی ہی ہوگی، جب تک میرے نصیب میں لکھی ہے۔ بعض سلطنتیں خاک ہو جانے کے لیے ہی ملتی ہیں۔“ اس کے بعد وہ وہاں رُک کر نہیں پائیں اور زہرا کو لے کر درگاہ سے نکل گئیں۔

شام کو میں نے مولوی خضر کو بھی اپنی روانگی کے قصد سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ بے حد ادا سا ہو گئے۔ ”کیا کہوں میاں، مجھے تو تمہیں روکنے کا اختیار بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں، چند ہی دنوں میں تم سے کیسا عجیب سا قلبی تعلق بن گیا ہے۔ بہر حال جہاں رہو، غور رہو.....“ میں نے انہیں بتایا کہ خود میرا دل بھی یہاں سے جاتے ہوئے بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ انجان سے رشتے بھی کسی سرطان کی طرح تیزی سے خون میں شامل ہو رہے ہیں۔ میں بھی یہاں سے ایسے ہی رشتے اور درگاہ سے کچھ ایسا ہی تعلق بنا کر واپس لوٹ رہا تھا۔ کتنے بندھن بندھ گئے تھے میرے اس درگاہ سے۔ کتنے انمول رشتوں کی ٹوکری بھرا لے جا رہا تھا میں اپنے ساتھ۔ اور پھر وہ ناز آفرین..... کیا ہوا، جو وہ مجھے مل نہیں پائی۔ اُس محبت کا سدا رہنے والا احساس تو تھا میرے ساتھ، کیا آئندہ زندگی کاٹنے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔ میں نے اُس رات بیٹھ کر عبد اللہ اور سلطان بابا کے نام الگ الگ لفافوں میں دو خط لکھ کر رکھ دیئے۔ اُن سے بنا ملے چلے جانے پر معذرت کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ جب میں اپنے اندر کی شرمندگی پر قابو پاؤں گا تو اُن سب سے ملنے ضرور آؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے دونوں خط مولوی خضر کے حوالے کر دیئے۔ وہ بہت دیر تک مجھے گلے لگا کر تھکتے رہے۔ میں نے اُن سے آخری الوداع چاہا تو مسکرا کر بولے ”کیوں میاں، واپس اپنی دنیا کر ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟ اور کچھ یاد آئے نہ آئے، لیکن مولوی خضر الدین کے ہاتھ کی صبح کی چائے تو تمہیں ضرور یاد آئے گی، ہے نا.....؟“ اُن کی بات سن کر بل بھر ہی میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹنے لگے۔ جانے خدا نے ہم انسانوں کا دل اتنا کمزور بنا دیا ہے۔ ہم جابجا خود کو اذیت دینے والے رشتے کیوں پال لیتے ہیں؟

لابریری سے گھر پہنچتے پہنچتے شام ڈھل چکی تھی اور جیسے ہی میری گاڑی گھر کے قریب پہنچی، میں نے گھر کے گیٹ سے زہرا کی سیاہ شورلیٹ نکلتے دیکھی۔ ہاں..... وہ اُسی کی گاڑی تھی۔ لیکن ہمارے گھر، کیوں.....؟ اگلے ہی لمحے مجھے اس گاڑی نے کراس کیا تو میں نے آگے ڈرائیور اور پچھلی سیٹ پر صرف زہرا کی امی کو بیٹھنے دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس ماہِ رُخ کی گاڑی اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر شاید خوشی کے مارے میرا دم ہی نکل جاتا، لیکن اس وقت میں ایک اُلجھن آمیز سی حیرت لیے گھر میں داخل ہوا۔ ماما اور پاپا پورچ ہی میں کھڑے تھے شاید زہرا کی امی کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوں..... مجھے گاڑی سے اُترتا دیکھ کر ماما والہانہ انداز میں میری جانب بڑھیں اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”ساحر بیٹا، ابھی زہرا کی امی آئیں تھیں۔ زہرا نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے۔“ پل بھر کے لیے تو مجھے لگا کہ ساری زمین گھوم رہی ہے اور یہ آسمان بھی کچھ ہی پل میں میرے سر پر گر جائے گا۔ میرے ماں باپ مجھے گلے لگا کر، چوم کر مبارک باد دے رہے تھے، لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں روؤں، یا منسوں..... خوشی سے چلاؤں، یا ڈکھ اور اذیت سے چیخ چیخ کر آسمان کو ریزہ ریزہ کر دوں۔ اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ بات سنتے ہی سجدے میں گر جانا چاہیے تھا۔ صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد منزلِ بانے والے کو بھلا اور کیا کرنا چاہیے؟ لیکن میں اپنی جگہ گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ذہن میں اس وقت سوالوں کا جو طوفان اُٹھ رہا تھا، اُس کا کنارہ صرف عبداللہ کی ذات تھی۔ اگلی صبح میری گاڑی ساحل کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ میں عبداللہ کی نئی درگاہ کی طرف بانے سے پہلے احتیاطاً اسے شہر والی ساحلی درگاہ پر دیکھتے ہوئے جانا چاہتا تھا اور پھر درگاہ کے نزدیک کار پارک کرتے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کریم مجھے سیڑھیوں کے قریب ہی مل گیا۔ جس نے بتایا کہ سلطان بابا اور عبداللہ دونوں آئے ہوئے ہیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چلا گئے ہوئے درگاہ کے احاطے تک پہنچا تو دُور ہی سے عبداللہ مجھے کسی شخص کو رخصت کرتے دے دکھائی دیا۔ وہ شخص پلٹا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا میرا منتظر تھا۔ یہ تو وہی صاحب تھے، جنہوں نے اُس دن بازار میں بنا کسی غلطی کے مجھے سرعام اس قدر بے عزت کیا تھا کہ درد کے رے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ عبداللہ اور وہ صاحب بیک وقت مجھے دیکھ کر ٹھٹکے اور پھر

دُرجنوں چکر لگا آتے ہیں لیکن رُوح کی بیماری ختم کرنے کے لیے کبھی کوئی کتاب تک اُٹھا نہیں پاتے۔ پہلے چند صفحات ہی میں مجھ پہ یہ حقیقت آشکار ہونے لگی کہ تصوف کی دنیا، ہماری ظاہر دنیا سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس دنیا کے باسی ہیں۔ جو ہر غرض، لا سے بے پروا ہو کر انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں ہمارے آس پاس پھر عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگ بھی شامل ہیں۔ تصوف دراصل رُوحِ دنیا کا دوسرا نام تھا اور میں اس رُوحانی دنیا کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ یہ ایسے لوگوں کی دنیا تھی جو کسی عہدے، مرتبے کی فکر کیے بغیر ہم جیسے بھٹکے ہوئے انسانوں کو اُن کی اصل راہ پر لانا کے لیے شاید ابد تک مصروف رہنے والے تھے۔ جیسے جیسے میں کتاب کے صفحے پلٹتا گیا مجھے صفحے پر اپنے ایک نئے سوال کا جواب ملتا چلا گیا۔ مجھے پتا چلا کہ مذہب صرف پانچ نمازیں پالینے، یا روزے رکھ لینے کا نام نہیں، یہ صرف بنیادی فرائض ہیں۔ جنہیں ادا کرنے کے بعد مذہب کا اصل سلیقہ اور اصل نظام شروع ہوتا ہے۔ مذہب تو بانٹنے کا نام ہے، چاہے وہ مذہب تعلیمات ہوں، یا کوئی دنیاوی شے..... مذہب ہر نعمت، علم اور سلیقے کو دوسروں تک پھیلاتا نام ہے اور یہی کام عبداللہ، سلطان بابا اور مولوی خضر اس درگاہ کی چھوٹی سی دنیا کے ذریعے رہے تھے اور یہ سلسلہ لامحدود تھا۔ گھروں میں، مسجدوں، درگاہوں، وفتروں میں، سمندر و پہاڑوں، ساحلوں پر اور نہ جانے کہاں کہاں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے اور نہ جانے کس کس جگہ میں مذہب سے دُور اور مجھ جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ ہمارے اوصحابکار نے، مذاق اُڑانے اور شک کرنے کے باوجود، یہ دُھن کے پکے اپنا فرض سر انجام دے رہے تھے اور میں کس قدر بد نصیب تھا کہ اس نظام کا ایک حصہ بننے بننے رہ گیا۔ چند گھنٹے کے بعد جب میں بوجھل دل لے کر لابریری سے اُٹھا تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہیں یہ ”لابریری یا ترا“ بھی کسی کی دعاؤں کا اثر تھی؟ مولوی خضر سے جب میں بہت زیادہ سنا کیا کرتا تو میری ساری تکرار کے بدلے میں اُن کا جواب صرف اتنا ہی ہوتا تھا۔ ”ٹھیک رہا“ کا انتظار کرو میاں..... وقت آنے پر قدرت تمہیں ہر سوال کے جواب تک خود پہنچا دی گی.....“ افسوس کہ قدرت نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب تو دیے..... پر بہت سے، یا پھر شاید میں خود ہی کچھ جلد باز نکلا.....

گایا اور گال تھپتھپائے۔ میں نے شرمندگی سے معذرت پیش کی۔ ”جب کھلاڑی ہار جائے تو اُسے میدان میں کھڑے رہ کر کسی اشارے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہی میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی لیے آپ کا سامنا کیے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔“ وہ خوش دلی سے ہنسے۔ ”ارے نہیں میاں، ناراضی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے۔ تم نے وہی کیا جو تمہارے دل نے کہا۔ اور بھی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم ہار گئے ہو۔ تمہاری فتح کی خبر بھی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ آخری جیت تو تمہاری ہی ہوئی نا۔ تم نے جو چاہا، آخر کار اُسے پایا۔ جیتے رہو۔“ سلطان بابا میرا کاندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے۔ گویا زہرا کے اقرار کی انہیں بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں عبداللہ کا مخصوص جملہ گونجا۔ ”جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سوسو ہوتا ہے۔“ لیکن میری رُوح کو قرار کیوں نہیں مل رہا تھا؟ میرے اندر کی بے چینی لمحہ لمحہ بڑھتی کیوں جا رہی تھی؟ اور پھر جب عبداللہ نے مجھے یہ بتایا کہ وہ اور سلطان بابا ایک اہم مشن پر بہت جلد کسی دور دراز سفر پر نکل رہے ہیں، تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تو پھر پیچھے درگاہ کا خیال کون رکھے گا؟“ ”نل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ۔ سنا ہے سلطان بابا نے کسی نئے عبداللہ کا انتخاب کر لیا ہے۔“ عبداللہ اپنی دُھن میں مگن مجھے بتاتا رہا۔ لیکن میرا دل تو یہ سن کر ہی ڈوب گیا کہ اب کوئی اور درگاہ کی رکھوالی کرے گا۔ نہ جانے اہنایت کا یہ کیسا احساس تھا کہ میں درگاہ پر کسی نئے عبداللہ کی آمد کا سن کر کچھ ایسے ہی بے چین ہو گیا، جیسے میری کوئی ذاتی جاگیر لوٹ کر لے جا رہا ہو۔

میں ٹوٹے ہوئے دل سے عبداللہ سے پھر ملنے وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ لیکن پھر میرا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ پایا۔ گھر پہنچا تو ایک خبر میری منتظر تھی۔ زہرا نے اپنی والدہ کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ باقاعدہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ملنا تو مجھے بھی اُس سے تھا، کیوں کہ ہمارے رشتے پر چھائی ہوئی دُھند چھٹنے کے بجائے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے ملاقات کے لیے وہی جگہ تجویز کی جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور اگلے دن شام ڈھلے ہم دونوں درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ زہرا کی امی ڈرامیور سمیت اوپر درگاہ کی حاضری کو جا چکی تھی۔ آج وہ ناز آفرین

عبداللہ کی ازلی ملائم سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”آؤ ساحر میاں۔۔۔۔۔ خوش آمدید۔“ اچانک ہی وہ صاحب تیزی سے میری جانب لپکے۔ غصے سے میرا چہرہ تھمتھا سا گیا۔ لیکن یہ کیا؟ انہوں نے آتے ہی میرے ہاتھ پکڑ لیے اور نہایت لجاجت سے بولے۔ ”معاف کرنا بیٹا، اُس روز تمہارا بہت دل دکھایا۔ سچ کہو تو گناہ عظیم کیا۔ پر کیا کرتا، بندے کو یہی حکم ملا تھا۔۔۔۔۔ لیکن آفرین ہے تمہارے حوصلے اور صبر پر، میری ہر گالی، ہر چر کے کو دل پر سہا، لیکن اُن نہ کی۔ میں تم ہی سے معافی مانگنے یہاں آیا تھا۔ اُمید ہے دل میں کوئی میل نہیں رکھو گے۔“ وہ صاحب نہ جانے کیا کچھ کہتے جا رہے تھے اور میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ سارا ڈراما صرف میرے اور زہرا کے لیے رچایا گیا تھا۔ وہ صاحب رخصت ہو گئے تو میں نے عبداللہ کی طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں جانتا تھا زہرا کی صورت میں تم مجھے بھیک ضرور دو گے۔ لیکن اگر مجھے بھکاری ہی بنانا تھا تو پھر اتنے کڑے امتحان میں کیوں ڈالا۔ پہلے ہی دن زہرا کو کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ میری طرف پلٹ جائے؟“ ”نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔ سلطان بابا نے صرف تمہارا امتحان لینے کے لیے اُس شخص کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ پہلے دن آنے والے جلد باز اور غصیلے ساحر اور درگاہ پر چند ہفتے جینے والے عبداللہ میں کتنا فرق ہے۔ زہرا کا وہاں پہنچ جانا صرف ایک اتفاق اور تمہاری قسمت کی بدولت تھا۔“ اگر مجھے یہ پتا نہ ہوتا کہ عبداللہ جھوٹ نہیں بولتا تو شاید میں اس وقت اُس کی اس اتفاق والی بات پر کبھی یقین نہ کرتا۔ ”بہر حال، چاہے وہ اتفاق ہی سے وہاں آ پہنچی تھی، لیکن سچ یہی ہے کہ اُس کا دل نرم کرنے میں اتفاق نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ اُس کی ہار کے پیچھے مزید کوئی اتفاق چھپا ہوا نہیں ہے۔“ عبداللہ مسکرا دیا۔ ”اگر تم اُس روز بھڑک کر اُس شخص کو پلٹ کر جواب دے دیتے تو یہ اتفاق تمہارے خلاف بھی جاسکتا تھا۔ تمہیں جو بھی ملا تمہارے صبر کے اجر میں ملا ہے اور بجائے خوش ہونے کے تم شکوک و شبہات میں پڑ کر اُپا جیت کا مزہ بھی کر کر رہے ہو۔ میرا یقین کرو، میری اُس لڑکی سے ملاقات تو کیا، بات کب نہیں ہوتی۔“ میرا دل بیک وقت عبداللہ کی بات پر یقین کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اتنے دن سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ”کہاں چلے گئے تھے میاں ہمارا انتظار تو کیا ہوتا۔۔۔۔۔“ ”جو تک کر پلٹا تو وہ سامنے ہی ہاتھ میں تیغ لیے کھڑے تھے۔ گرم جوشی سے مجھے اپنے سینے

مسکراہٹ ابھرتی دیکھی، دنیا کی سب سے حسین مسکراہٹ۔ وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ”میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں.....“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا، لیکن پھر وہ وہاں رُک نہیں پائی اور سلام کر کے چل دی۔ اپنی تقدیر پر جتنا پیار مجھے اس لمحے آیا، شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

گھر واپسی پر جب میں نے ماما اور پاپا کو اپنا اور زہرا کا فیصلہ سنایا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ دونوں ہی جیسے دنگ رہ گئے۔ پھر پہلے پاپا نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا۔ ”ہمیں تم پر فخر ہے ساحر بیٹا اور ہم جانتے ہیں کہ تم ایک نہ ایک دن اُس کی رُوح کو بھی فتح کر لو گے۔ گاڈ بلیس یو۔“ ہاں..... شاید میں کبھی زہرا کی رُوح کو بھی جیت ہی لوں گا۔ لیکن ان دنوں خود میری اپنی رُوح جس عذاب سے گزر رہی تھی، میں اس کا بھلا کیا درماں کرتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی آدھی رُوح کہیں اور چھوڑ آیا ہوں۔ آخر کار، اُس رات میرے ضبط کے سارے پیمانے چھٹک پڑے اور میں آدھی رات کو کمرے ہی میں سجدے میں گر کر بلک اُٹھا۔ ”پاپا میرے رب مجھے اس اُنجھن سے نکال دے۔ اگر میرا مقدر دنیا ہے تو مجھے مکمل دنیا کا کردے اور اگر میرا مقدر تیری نوکری ہے تو پھر مجھے پورا قبول کر لے..... یوں میری رُوح کے کوئل ریشٹوں کو تقسیم نہ کر۔ میں تیرا بہت نازک، بہت کمزور بندہ ہوں۔ مجھ پر اس دوراے کا اتنا وزن نہ ڈال۔ میری مشکل آسان کر دے.....“ نہ جانے کتنی دیر تک میں بچکیاں لے لے کر روتا رہا اور پھر مجھے کب نیند آئی، مجھے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن اُس رات میرے ماں باپ سو نہ سکے۔ جانے رات کے کس پہر، پاپا کی آنکھ کھلی اور میری بچکیوں کی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ پھر کب وہ ماما کو بھی جگا کر میرے کمرے سے باہر آکھڑے ہوئے۔ البتہ انہوں نے اُس وقت میرے اور میرے خدا کے رابطے کے درمیان مغل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح جب میں ناشتے کی میز پر آیا تو اُن دنوں کے چہرے بھی آنسوؤں سے دھلے ہوئے محسوس ہوئے۔ آخر کار، ممانے میرا ماما چوم کر میری ہر کش مکش کا فیصلہ کر دیا۔ مجھے رخصت کرتے وقت انہوں نے صرف ایک جملہ کہا۔ ”ساحر! کاش میرے کئی بیٹے ہوتے اور سب تمہارے جیسے ہوتے۔ اب ہم بھی تمہارے اس کج کے سفر میں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں کہیں مستقل ٹھکانہ بناؤ ہمیں بھی بتا دینا۔ ہم بھی وہیں آ بیٹھیں گے.....“ میری زبان سے بے اختیار نکلا ”ہاں، لیکن زہرا کو اپنے ساتھ لے کر

اپنی جبین پر کوئی شکن لیے بغیر، نظریں جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ کیا اب مجھے اپنی تقدیر سے کوئی گلہ باقی رہ جانا چاہیے تھا؟ پل بھر ہی میں میری نظروں کے سامنے اُس پری کی ناراضی، دھتکار اور اُس سے ہوئی آدھی ادھوری ملاقاتوں کے تمام مناظر گھوم گئے، لیکن آج میرے سامنے اُس بادشاہ کی طرح کھڑی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کے بعد دوسرے شہنشاہ سے کہتا ہے کہ اُس سے وہی سلوک کیا جائے، جو بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ میں نے اُس کی لرزتی پلکوں پر نظر ڈالی۔ ”میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے اس فیصلے پر کسی ترحم آمیز جذبے کی ملاوٹ نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن میرا ماضی بھی آپ کے سامنے پوری طرح عیاں ہے، لہذا اب فیصلہ آپ کا ہوگا۔ کیا آپ مجھے میرے ماضی سمیٹ قبول کر پائیں گے۔ میرا پچھلا جنوں کبھی طعنہ بن کر آپ کے لبوں پر تو نہیں آ جائے گا؟ اپنے ظرف کے پیمانے کی وسعت جانچ کر ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں آپ کے رائے سے اتفاق ہوگا.....“ اُس نے ایک ہی پل میں ساری باتیں کر ڈالیں۔ اب میں اُسے بتایا کہ میرے ظرف کا امتحان تو قدرت نے اُسی دن سے لینا شروع کر دیا تھا، جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا۔ ”ظرف کا پیمانہ وسیع نہ ہوتا تو شاید ہم دونوں آج یوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بدشگونی صرف تن پر حکمرانی تک رہے گا، یا پھر مجھے رُوح کا غلبہ بھی حاصل ہوگا.....؟“ میری بات نہ کر وہ چونکی اور نظریں اُٹھا کر مجھے یوں دیکھا، جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اُس کی وہ پہلی نظر تھی، جو صرف میرے لیے تھی، صرف ساحر کے لیے۔ اُس کے لب ہلے۔ ”رُوح پر قبضہ پانے میں تو کبھی کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں ساحر.....“ ”تو پھر میں مزید کئی صدیاں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ میرے انتظار کی منزل تک میرا انتظار کر پائیں گی.....؟“ میری بات سن کر اُس کا گلابی چہرہ کچھ اس طرح کھل گیا، جیسے سوچ اور تفکرات کے سبھی بارے ایک دم ہی چھٹ گئے ہوں۔ ”سوچ لیں، میرے پاس انتظار کے لیے زندگی پڑی ہے۔ لیکن کیا آپ رُوح سے رُوح کے رشتے کے لیے اتنا بڑا جوا کھیل پائیں گے۔ نتیجہ کچھ بھی ہوگا ہے؟“ ”نتیجہ جو بھی ہو، ہوگا تو آپ کی رُوح کا ہی..... اور میں اس دربار میں اپنا سر تسلیم انداز ہی سے خم کر چکا ہوں۔“ اُس کے پتھڑی سے لبوں پر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک

وجہ سورج کی سنہری روشنی میں دُور ساحل پر کھڑے ہو کر درگاہ کی جانب پلٹ کر دیکھا۔
 یہ نیا ”عبداللہ“ درگاہ کی منڈیر پر کھڑا ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ
 ڈھایا اور میرے دل نے کہا ”الوداع۔“

آئیے گا.....“ وہ دونوں ہنس پڑے۔ اس بار ما اور پاپا خود اپنی گاڑی میں مجھے درگاہ چھوڑنے
 کے لیے آئے اور پھر بہت دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگا کر کھڑے رہے۔
 جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ہم
 کسی جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی لمبے سفر کی تیاری ہو۔ میں نے قریب سے گزرنے
 ایک زائر سے احوال پوچھا تو اُس کا جواب سن کر مجھے اپنی ڈوٹی نیا ڈوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔
 ”سلطان بابا درگاہ کا انتظام کسی نئے خدمت گار کے سپرد کر کے خود کسی لمبے سفر پر جا رہے
 ہیں۔“ عبداللہ نے بتایا تھا کہ نئے عبداللہ کی تقرری کے بعد وہ لوگ نکل جائیں گے اور زائر کی
 اطلاع کے مطابق نئے عبداللہ کی تقرری ہو چکی تھی۔ میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم
 اٹھائے ہی تھے کہ اچانک ایک آواز نے میرا راستہ روک لیا۔ ”کہاں چل دیے میاں، ابھی
 ٹھیک طرح سے آئے بھی نہیں۔“ میں پلٹا، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ عبداللہ بھی اُن کے پیچھے کھڑے
 مسکرا رہا تھا۔ ”شاید مجھے دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو آپ کا خادم مل گیا ہے۔“ سلطان بابا نے
 میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میاں جن کی ترقی ہو گئی ہو، انہیں ہم دوبارہ درگاہ کی خدمت
 نہیں لگاتے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“ خوشی اور حیرت کے مارے میری تو آواز ہی م
 ہو گئی۔ ”لیکن میں، میری ترقی، میرا مطلب ہے کہ یہ عبداللہ۔“ میری حالت پر سبھی مسکرا
 دیے۔ ”عبداللہ میاں اب ہمارے ساتھ نہیں جا رہے۔ انہیں ہم نے کسی اور جگہ کی خدمت
 کے لیے بھیجا ہے۔“ ساحر تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ بولو کیا ارادہ ہے۔“ ”نہ
 نصیب..... لیکن درگاہ کی خدمت کے لیے بھی تو کسی کو یہاں رہنا تھا، وہ کہاں ہے؟“ دفعہ
 عبداللہ کے پیچھے سے نعمان کا چہرہ ابھرا۔ ہاں وہی کھلنڈرا سا موٹر سائیکل سوار نعمان۔ وہ تینوں
 سے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ ”میں یہاں رہوں گا، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“ سلطان بابا
 نے کاغذ کی ایک چٹ میرے ہاتھ میں تھمائی اور پلٹ کر جاتے ہوئے بولے۔ ”اس نوجوان کو
 اس کے نئے نام سے آگاہ کر کے چلے آؤ، ہمیں شام ڈھلنے سے پہلے بہت لمبا سفر طے کرنا
 ہے۔“ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا..... کاغذ پر نیا نام جگمگا رہا تھا۔ ”عبداللہ“
 میں نعمان سے مل کر اور اُسے ساری تفصیل سمجھا کر سلطان بابا کے پیچھے چل پڑا۔ میری زندگی کا
 نیا سفر شروع ہو چکا تھا اور ہماری منزل کہاں تھی، یہ صرف سلطان بابا ہی جانتے تھے۔ میں نے

کالا پانی

والہانہ انداز میں کچھ اس طرح سلطان بابا کی جانب بڑھا جیسے اُس کی، اُن سے برسوں سے جان پہچان ہو۔ سلطان بابا نے میرا تعارف ”عبداللہ“ کے نام سے کروایا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد میں قریباً درجن بھر نمازی جمع ہو گئے اور سلطان بابا ہی کی معیت میں جماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مؤذن کے سوا تمام نمازی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ مؤذن کا نام رشید تھا۔

جس نے نمازیوں کے جانے کے بعد جلدی سے ہم دونوں کو گرم گرم قبوہ پیش کیا۔ میں نے ابھی قبوہ کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ سلطان بابا کا سوال سن کر میرے ہاتھ سے پیالہ قریباً چھوٹ ہی گیا ”پھانسی کب ہے؟“ وہ رشید سے مخاطب تھے۔ رشید نے اسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔ ”پرسوں صبح..... ساڑھے چار بجے۔“ سلطان بابا نے لمبا سے ہنکارا بھرا ”ہوں..... گویا ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے سے بھی کم ہیں..... چلو خیر، جو اللہ کو منظور۔“ میں حیرت سے سلطان بابا اور رشید کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کس پھانسی کا ذکر ہو رہا تھا اور اڑتالیس گھنٹوں میں ایسا کیا ہونے والا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کوئی سوال کرنے سے روکا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد کے باہر ایک سرکاری جیب آکر رُکی اور پھر اندھیرے میں اس کی چمکتی لائٹس کی روشنی میں پانی سے شراور، کچھڑ میں چھپ چھپ کرتے بڑی بڑی خاکی برساتیوں میں ملبوس چند سرکاری اہل کار اترے۔ اُن میں سے ایک بازو عیب اور عمر رسیدہ شخص، جوان سب کا آفیسر تھا، چھتری کے سائے تلے تیزی سے چلتا ہوا مسجد کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سر پر چھتری تانے ہوئے ایک اہل کار تقریباً دوڑتا ہوا، اپنے افسر کو پانی کے ریلوں سے بچانے کے لیے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ رشید نے جلدی سے اُٹھ کر افسر کا استقبال کیا۔ ”آئیے آئیے جیلر صاحب..... سلطان بابا آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔“ آنے والے کا نام اقبال تھا اور پتا یہ چلا کہ وہ اس قصبے کی مرکزی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ وہ سلطان بابا سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا، لیکن اُس کے انداز و اطوار میں بھی پرانے شناساؤں جیسا احترام تھا، البتہ اُس کے چہرے سے بڑبڑائی کے آثار جھلک رہے تھے۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد جب رشید نے جیلر اقبال کو بھی قصبے کا پیالہ پیش کر دیا تو سلطان بابا نے حتی سوال کر ڈالا۔ ”ہاں بھی جیلر صاحب..... ہم تو حاضر ہو گئے آپ کے بلاوے پر..... اب فرمائیے کیا حکم ہے؟“ میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، تو گویا تین دن کے اس لمبے سفر کا مقصد اس جیلر کا بلاوا تھا۔ اقبال نے

ہمیں سفر کرتے تین دن ہو چکے تھے۔ جانے یہ کیسا سفر تھا، جس کے راہبر نے کچھ کا نہ پیر و کار ہی نے کچھ پوچھنے کی جسارت کی۔ میں سلطان بابا کے نقش قدم پر چلتا، اُن کے پیچھے پیچھے روانہ تھا۔ ساحلی پٹی ختم ہوئی تو سلطان بابا نے مرکزی شاہراہ سے پہلی بس لے لی۔ دوسرے دن بس نے ہمیں ایک ویران ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔ جہاں سے رات کی واحد پونے ٹرین پکڑ کر ہم پہاڑوں سے گھری ایک وادی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اگلی رات تک آ پہنچے۔ رات سلطان بابا نے وہیں اسٹیشن ہی پر بسر کی اور پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی ہم دوبار پیدل ہی قریبی قصبے کو جاتی مرکزی سڑک پر چل پڑے۔ اس وقت سورج ٹھیک ہمارے سرور پر تیز کونوں کی برچھیاں چھو رہا تھا۔ میں نے پورے سفر میں سلطان بابا کو بلا ضرورت بولے نہیں دیکھا تھا۔ پورا رستہ وہ چپ ہی سادھے رہے، لیکن اُن کی خاموشی میں بھی ایک طرح کا گفتگو تھی۔ جب کبھی مجھے تھکن کا احساس ہوتا، یا میرے من میں کوئی سوال اُبھرتا، اُسی لمحے پلٹ کر مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھ لیتے اور میرے ہر سوال کو جیسے ایک جواب سال جاتا اور تھکن جانے کہاں اُڑ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بولتی ہے کہ کچھ لوگ بول کر بھی گونگے رہتے ہیں۔

شام تک آسمان کو کالی گھٹاؤں نے پوری طرح ڈھک لیا اور پھر مغرب سے ذرا پہلے شدید اور موسلا دھار شروع ہو گئی۔ ان پہاڑی علاقوں کی بارش کے بارے میں سنا تو بہت کہ بل بھر ہی میں سب جل تھل کر دیتی ہے، لیکن تجربہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے اور قصبے کی پہلی سڑک پر مڑتے ہی ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر بنی ہوئی ایک خستہ حال مسجد کے گنبد نظر آنے لگے۔ میں سلطان بابا پوری طرح بھیگ چکے تھے اور جب ہم مسجد کے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے صحن میں داخل ہوئے تو مؤذن مغرب کی اذان کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اذان ختم کرتے ہی

پناب دی جائے گی۔ لیکن شوخی قسمت، ڈپٹی کے داماد اور بیٹی کا ساہیوال میں ایک خطرناک ایکسڈنٹ ہو گیا اور ڈپٹی کو چار دن پہلے ہی انتہائی غلت میں چھٹی لے کر جانا پڑ گیا اور فی الحال اگلے پندرہ دن تک اُس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جیلر کی دوسری اُمید جیل کا سرکاری ڈاکٹر تھا، جسے اس پھانسی کے تمام عمل میں اور تمام تیاریوں اور انتظامات میں جیلر کی معاونت بھی کرنی تھی۔ لیکن جیلر کے یہ سن کر تو ہوش اُڑ گئے کہ ڈاکٹر نے ابھی دو سال پہلے اپنا ہاؤس جاب مکمل کیا ہے اور کسی بھی جیل میں یہ اُس کی پہلی تعیناتی ہے۔ ڈاکٹر کے تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کہ ایک زندہ انسان کو اُس کی نظروں کے سامنے چلا کر لایا جائے گا اور پھر اُس کی سانسیں سلب کر لی جائیں گی۔ بقول نوجوان ڈاکٹر ”کسی مریض کو اپنے سامنے دم توڑنا دیکھنے میں اور ایک انسان کو پھانسی پر لٹکتا دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بھی اقبال کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ اُس کی پریشانی بھی اپنی جگہ بجا تھی، کیوں کہ ملک کی سب سے بڑی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناطے اُس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور اگر اس سارے پھانسی کے عمل میں کوئی بھی قانونی، یا اخلاقی سقم باقی رہ جاتا تو اُس کی تمام تر جواب دہی اُسی کو کرنا تھی۔ سلطان بابا نے بہت غور سے جیلر کی بات سنی اور پھر ہلکے سے کھٹکار کر گویا ہوئے ”واقعی یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ تو پھر آپ نے اس مشکل کا کیا حل نکالا۔ ویسے آپ تو خود کافی تجربہ کار ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جیل کا جلا دایسے موقعوں پر کافی کارآمد ثابت ہوتا ہے..... کیا آپ نے جلا دے کوئی مدد نہیں لی..... کبھی کبھی اُن پڑھتے ہوئے بھی وہ بہت سی ایسی باریک کنٹیکٹی تفصیلات جانتا ہے، جو کسی بھی بڑے افسر کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔“ اقبال نے بے چینی سے ہاتھ ملے ”اب آپ کو کیا بتاؤں..... جلا د کی پوسٹ پچھلے آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ پُرانا جلا د ریٹائر ہوا تو حسب معمول جلا د کی تعیناتی کے لیے حکام بالا سے اجازت لے کر اخبارات میں اشتہار دے دیا گیا کہ جیل میں جلا د کی جگہ خالی ہے، لیکن کسی نے بھرتی کے لیے درخواست ہی جمع نہیں کروائی۔ حتیٰ کہ پرانے جلا د کے بیٹے کو تو ہم نے پیش کش بھی کی تھی کہ اگر وہ اپنے باپ کی جگہ بھرتی ہونا چاہے تو ہم محکمے سے خصوصی اجازت لے کر بنا کی ٹیسٹ، یا انٹرویو کے اُسے براہ راست بھرتی کر لیں، لیکن وہ دس جماعت پڑھ چکا ہے اور

عاجز انہ انداز میں جواب دیا۔“ آپ اتنی دُور سے صرف میرے بلاوے پر یہاں تک آئے۔ یقین جانیے، یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ دراصل پریشانی ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو تکلیف دینی پڑی۔ آپ کو رشید نے بتا تو دیا ہوگا کہ پرسوں صبح میری جیل میں ایک پھانسی کی تیاری ہے۔ ایک ایسے جیلر کی حیثیت سے، جو تقریباً ۲۵ سال کی سروس مکمل کر چکا ہو، یہ پھانسی ایک معمول کی بات ہونی چاہیے، لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میری کسی بھی بڑی سینئرل جیل میں یہ دوسری تعیناتی ہے۔ اس سے پہلے تقریباً دو سال تک سندھ کی ایک بڑی جیل میں رہ چکا ہوں، لیکن آپ اسے قدرت کی مہربانی کہیں، یا مقدر کا ستم کہ میں نے اپنی پوری سروس میں کبھی کوئی پھانسی نہیں بھگائی۔ اور پرسوں دی جانے والی پھانسی نہ صرف میری سروس، بلکہ میری زندگی کی بھی پہلی پھانسی ہے.....“

ہم تینوں نے چونک کر جیلر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے اپنی زندگی کی شاید سب سے بڑی اُلجھن بیان کر رہا تھا۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ رحیم پور کے جس قصبے میں اس وقت ہم سب موجود تھے وہیں ملک کی سب سے بڑی اور شاید سب سے پرانی مرکزی جیل بھی واقع تھی، جس میں ملک بھر سے سنگین ترین جرائم کے قیدی بھیجے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر سزائے موت ہی کے قیدی ہوتے۔ اس جیل کے پہاڑوں میں گھرے محل وقوع اور شدید سخت اور کڑے پہرے کی وجہ سے اُسے دوسرے ”کالے پانی“ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ انگریز کے زمانے سے لے کر اب تک یہاں سے صرف دو مرتبہ قیدیوں نے نقتب لگا کر بھاگنے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ ہی تین اور پانچ کے دو قیدی گروہ، جیل کی فصیل تک پہنچنے سے پہلے ہی اونچی بُرجی پر کھڑے جیل کے محافظوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مارے گئے۔ اُس کے بعد آج تک کسی قیدی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس کالے پانی کی قید سے فرار کا سوچ بھی سکے۔ اقبال جیلر کی سروس کا یہ آخری سال تھا اور رحیم پور کی جیل میں اُس کی تعیناتی کو ابھی بمشکل ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا، لیکن حاضری کے فوراً بعد اُسے جس سرکاری حکم کا پہلا پروانہ موصول ہوا، وہ اُسی سکندر نامی قیدی کی پھانسی تھا۔ بقول جیلر، اُسی دن سے اُس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ پہلے پہل تو اُس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی تھی کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بھی سینئر اور تجربہ کار افسر ہے، لہذا اُس کی موجودگی میں پھانسی کسی نہ کسی طریقاً

اصطلاح میں) زندہ رہتا تھا اور اس کی مکمل ”دماغی موت“ کے لیے یہ آٹھ منٹ کا وقفہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران قیدی کی تڑپ اور بے چینی جاری رہتی تھی اور اس کا کلیہ بھی اسی کتاب میں درج تھا کہ جب تک پھانسی کا رسہ خفیف سی حرکت، یا جھول کھاتا رہے، تب تک یہ سمجھا جائے کہ قیدی میں زندگی کی چمکی بھر رقی باقی ہے۔ لیور کھینچنے، تختہ کھلنے اور قیدی کے جسم کے مکمل بوجھ کے رسے سے لنک کر جھولنے کے اڈلین لمحے سے لے کر رسے کے مکمل سکوت میں آنے تک کے آخری لمحے کا درمیانی وقت آٹھ منٹ سے لے کر دس منٹ تک محیط ہو سکتا تھا اور اسی درمیانی وقت کو قیدی کے لیے کم سے کم اذیت ناک بنانے کے لیے جیل حکام کا فرض بننا تھا کہ وہ قیدی کے لیے ایک ”بہترین پھانسی“ کا انتظام کریں اور اس تیاری اور نظام کی جزئیات کچھ اس طرح تھیں کہ قیدی کے وزن کے حساب سے رسہ تیار کیا جائے۔ اس میں بنایا گیا پھندا، رسے کی لمبائی اور رسے کی ساخت کا تناسب بہترین ہونا چاہیے۔ رسہ ہمیشہ قیدی کے اُس وزن کے مطابق تیار کیا جاتا تھا، جو پھانسی سے ایک دن قبل آخری میڈیکل چیک آپ کے وقت قیدی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جلاد کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ایک دن پہلے تختہ دار کے قبضے وغیرہ جانچ لے کہ تختہ کھلنے میں کسی قسم کی دشواری تو نہیں؟ لیور کا ہینڈل ٹھیک کام کر رہا ہے کہ نہیں؟ عین وقت پر لیور، یا تختہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے جواب تو نہیں دے جائیں گے؟ تختہ کے دونوں پٹ ایک جھکے سے اور ایک ساتھ کھل رہے ہیں، یا نہیں؟ تختہ کے قبضوں کو گزشتہ ایک ہفتے کے دوران ٹھیک طرح سے تیل پلایا گیا ہے، یا نہیں۔ کہیں رسے کی رگڑ، یا لکڑی، لوہے کے ستون کی کوئی ناہموار سطح رسہ کاٹنے، یا ٹوٹنے کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے درجنوں سوال تھے، جن کا جواب جلاد اور جیل کے عملے کو مل کر ڈھونڈنا ہوتا تھا، تب ہی کہیں جا کر کوئی پھانسی ”بہترین پھانسی“ کہلائی جاتی تھی۔ اور ان سب باتوں کی براہ راست نگرانی اور ذمہ داری جیل سپرنٹنڈنٹ کی ہوتی، اسی لیے اقبال ہمارے سامنے پریشان سی صورت لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

اُس کے پاس بمشکل چالیں، یا بیالیس گھنٹے ہی بچے تھے اور شاید وہ ابھی تک پوری طرح پھانسی گھاٹ ہی تیار نہیں کروا پایا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم انسان بیک وقت کتنے نرم خور کتنے سبک دل ہو سکتے ہیں۔ معاشرے کو چلانے کے لیے ہمیں کیسے کیسے دُہرے

اُس کے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اب غیر مسلم بھی اس کام سے کترانے لگے ہیں۔ پہلے تو زیادہ تر جیلوں کے جلاد غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے، لیکن اب اس بے روزگاری کے باوجود بھی کوئی اس پیشے سے منسلک ہونا پسند نہیں کرتا۔ دراصل موت کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے ہوتا ہے جناب..... صبح ہونے سے پہلے کارات کا سناٹا بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اور اس سناٹے میں لیور کی چرچاہٹ اور تختہ کھلنے کا کھڑاک بہت سے کمزور دل حضرات کا پتا پانی کر سکتا ہے..... اور پھر ان سب سے بڑھ کر قیدی کی گردن کا منکا علیحدہ ہو کر ٹوٹنے کی وہ بے رحم چختی ہوئی آواز.....“ جیلر کی بات سن کر مؤذن رشید کو جمر جھری سی آگئی۔ اقبال بظاہر ہمیں پھانسی کی تفصیلات بتا رہا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بار اُس لمحے کا ذکر کر کے دراصل اپنے لاشعور میں چھپے کسی خوف کو دُور کرنا چاہتا ہے، جو اندر ہی اندر جانے کب سے اُسے ڈسے جا رہا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کالج پاس کرنے کے بعد میرے بہت سے دوست، جو پری میڈیکل گروپ سے وابستہ تھے، انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں اور کاشف بہت عرصے تک اپنے پرانے کلاس فیوز سے ملنے کے لیے اُن کے ہاسٹلز جاتے رہے تھے۔ غالباً تیسرے سال میں طب کی پڑھائی میں ایک مضمون انہیں پڑھایا جاتا تھا، جس کا نام جیور سپروڈنس (Jurisprudence) تھا۔ میں نے ہاسٹل کی اُن ملاقاتوں کے فارغ لمحات میں اس کتاب کے بہت سے باب یونہی پڑھ ڈالے تھے۔ یہ مضمون طب کے مختلف کینسر سے متعلق تھا اور اس میں جرم اور سزا کے باب میں پھانسی کا بھی تفصیلاً ذکر موجود تھا۔ مجھے وہ کتاب پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ایک عجیب سا احساس بھی ہوا کرتا کہ پھانسی جیسا عمل، جس کے متعلق سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، سزا کی اصطلاح میں وہ بھی ایک بے حد میکا کی ساعمل ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اُن ہی طب کے رسالوں میں کہیں ”بہترین پھانسی“ کی اصطلاح بھی پڑھی تھی۔ طب کے میدان میں اور سزا کی دنیا میں بہترین پھانسی کا تصور یہ تھا کہ قیدی کی گردن کا منکا پہلے ہی جھکے میں یوں ٹوٹ جائے کہ اُسے زیادہ ”تکلیف“ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ اس ایک جھکے میں بھی سانس کی دُور ٹوٹنے کے باوجود قیدی کم از کم آٹھ سے دس منٹ تک سولی پر لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جاتا تھا، کیونکہ اس دوران بھی وہ دماغی طور پر (طب کی

”واقعی صورت حال تو کافی گنبد ہے، لیکن جلاد کی عدم موجودگی میں یہ فریضہ اب کون سرانجام دے گا۔“ اقبال نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ویسے تو میں نے دو ہفتے پہلے ہی حکام کو جلاد کی عدم دستیابی کا پروانہ لکھ دیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے قریبی ضلع کی سینٹرل جیل کے جلاد کو بذریعہ آرڈر پابند بھی کر دیا ہے کہ وہ میری جیل میں حاضر ہو کر مجھے ۴۸ گھنٹے پہلے رپورٹ کرے اور اس پھانسی کو تکمیل تک پہنچائے۔ لیکن ابھی تک تو وہ پہنچا نہیں، شاید صبح والی گاڑی سے پہنچ جائے۔ دراصل اس شدید طوفان اور موسلا دھار بارش نے چند گھنٹوں ہی میں بڑی باہی مچا دی ہے۔ ابھی جب ہم آپ کی طرف آرہے تھے تو مجھے وائرلیس سیٹ پر اطلاع ملی کہ نیبے کو بیرونی دنیا سے جوڑنے والی سڑک کا واحد پل بھی پانی سے بہہ گیا ہے اور ریلوے ٹریک بھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد قابل استعمال نہیں رہے گا، کیوں کہ ابھی سے قریباً دو میل پٹری کا لکڑا گھنٹوں گھنٹوں پانی میں ڈوب چکا ہے۔“

آسمان پر بادل زور سے گرجے اور دُور کسی ویرانے میں بجلی کا کوندا اس زور سے لپکا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سبھی نیلی روشنی میں نہا سے گئے۔ میں نے اس لمحاتی روشنی میں جیلر کے تھے پر بارش کی بوندوں کے ساتھ پسینے کی چند بوندیں بھی ٹپکتی دیکھیں اور پھر اگلے ہی لمحے پھر سے وہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے ”جیلر صاحب لگتا ہے قدرت می آپ کی اس زمینی عدالت کے فیصلے کو ماننے پر تیار نہیں ہے۔ ارے ہاں! آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آخر ہمیں یہاں بلانے کا کیا مقصد تھا۔ کیوں کہ آپ کی تمام بیان کردہ مجبوریوں اپنی لہ، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے سرکاری کام ہیں اور ان میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔“ بال کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سلطان بابا کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ”جی بالکل..... آپ نے فرمایا۔ دراصل آپ کو زحمت دینے کی وجہ بھی وہی قیدی سکندر ہی ہے۔ اُس کی آخری اہش ہے کہ مرنے سے پہلے اُس کی آپ سے ملاقات کروا دی جائے۔“ میں نے اور سلطان بابا نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

معیار اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ گھر میں پالے ہوئے اپنے کسی پالتو جانور کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والے انسانوں کو بھی کبھی اس بات کے لیے سر جوڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے جیسے جیتے جاگتے انسان کی جان لینے کا کون سا طریقہ اختیار کریں۔ بظاہر اقبال کی پریشانی بے جا ہی تو تھی۔ جب ایک انسان کی سانس کی ڈور کا کٹنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر اس میں اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ عملہ پورا تھا، یا نہیں، انتظامات میں کمی بیشی ہوئی بھی تو کیا؟ جان لینے کے لوازمات معیار کے مطابق تھے، یا غیر معیاری۔ بھلا ان باتوں سے اس سیاہ نصیب قیدی کی قسمت پر کیا فرق پڑنے والا تھا۔ مقصد تو اس کی جان لینا تھا، پھر بھلا وہ تلواریں سے سر قلم کر کے لی جائے، یا گولی، یا پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر..... کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اقبال کی ساری باتیں، وہ طوفانی بارش میں بھیکتا سیاہ سناٹا اور بوندوں سے بھیگتے ہمارے وجود..... سبھی کچھ ”ایک بہت بڑا جھوٹ“ لگنے لگا تھا۔ جیسے ہم سب اس نظام کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈھکوسلا کر رہے ہوں۔ اور کچھ ہی دیر بعد ہم سب اطمینان سے یہ کہتے ہوئے کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ہم نے اپنے طور پر تو پوری کوشش کر دیکھی، لیکن کیا کریں پورا سسٹم ہی خراب ہے تو اس میں اب ہمارا کیا قصور؟ لیکن بے چارہ جیلر اپنے اندر کے اُس فرض شناس افسر کے ہاتھوں مجبور تھا، جو اُسے اس برستے موسم میں بھی اس بھاگ دوڑ پر مجبور کر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے قیدی کی جان لینے سے پہلے تمام قواعد و ضوابط تو پورے کرنے ہی ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کے اندر سے بھی کبھی نہ کبھی یہ آواز اٹھی ہوگی کہ ”کس جھنجھٹ میں پڑ رہے ہو میاں..... چڑھا دو سولی۔ یہاں اس ویرانے میں کس نے آکر یہ قواعد و ضوابط دیکھنے ہیں۔ ختم کرو یہ مننا۔“ لیکن افسوس..... فطرت ہمیں اُس گناہ سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جو صرف ہمارے اندر ہی جنم لیتا ہے اور اندر ہی کہیں فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی وفا، کبھی بھرم اور کبھی فرض شناسی جیسے ”در انداز جذبے“ ہمارے اس معصوم گناہ کا مزہ بھی کر کرنا کرنے کے لیے جانے کہاں کہاں سے جنم لینے لگتے ہیں۔ جیلر بھی اس وقت ایسے ہی ایک معصوم گناہ اور ایک بے رحم ثواب کے بیچ چلتی جنگ کے درمیان پس رہا تھا اور وقت اُس کی بندھن سے ریت کی طرح پھسلتا جا رہا تھا۔

سلطان بابا نے کچھ دیر تک ساری صورت حال پر غور کیا اور پھر جیلر سے مخاطب ہوئے

نے اُسے بلا ضرورت کبھی بولتے دیکھا ہو۔ شروع شروع میں جب اُسے اس جیل میں لایا گیا تھا تب ہی آئی ڈی (CID) والے روزانہ اُس سے تفتیش کے لیے جیل آتے تھے۔ سنا ہے اُس کا تعلق ایک بہت خطرناک ملک دشمن تنظیم سے تھا اور اس قیدی کے سینے میں بھی بہت سے ایسے راز دفن تھے جو اگر صحیح وقت پر افشا ہو جاتے تو بہت بڑی تباہی سے بچا جاسکتا تھا، لیکن سکندر کی زبان کھلنا تھی، نہ کھلی۔ اُس پر ملک کے ایک نوجوان اور اُبھرتے ہوئے سائنس دان کے قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا اور اسی جرم کی پاداش میں وہ آنے والی موت کے انتظار میں اس کال کوٹھڑی میں پڑا، ایک ایک گھڑی گن رہا تھا۔ جیلر ابھی ہمیں یہ ساری تفصیلات بتا ہی رہا تھا کہ دُور جیل کے گھنٹنہ گھر سے گیارہ مرتبہ ٹن، ٹن، ٹن..... کی سی آواز سنائی دی۔ جیل میں قیدیوں اور دیگر عملے کو وقت سے مطلع رہنے اور ہوشیار رکھنے کے لیے ایک بہت بڑی سی پیتل کی گھنٹی کو ہر گھنٹے کے بعد اتنی ہی مرتبہ لوہے کی ایک بہت بڑی راڈ کے ذریعے بجایا جاتا تھا۔ جتنی مرتبہ گھنٹی بجتی، وہی دن، یا رات کا وقت ہوتا۔ مطلب یہ کہ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اب ساڑھے گیارہ بجے یعنی آدھے گھنٹے کے بعد صرف ایک ”ٹن“ کی آواز یہ ظاہر کرے گی کہ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بھی ہمیں جیلر کی زبانی ہی بتا چلی۔ جیلر نے اپنے پاس کھڑے جیل کے حوالدار سے کہا ”جا کر پتا کرو، دارالحکومت سے جس افسر نے آنا تھا، اُس کی کوئی خیر خبر پہنچی، یا نہیں..... میری جیب کے وائرلیس ہی سے قصبے کے باہر والی چوکی کو بھی مطلع کرو کہ اگر وہ لوگ پل کی دوسری جانب پہنچ گئے ہیں تو محکمہ انہار والوں سے کہہ کر کشتی کا انتظام کروائیں اور نندی پار کروا کر جیل کے ریست ہاؤس میں پہنچا دیں۔ میں کچھ دیر میں جیل پہنچتا ہوں.....“ حوالدار کچھ ہچکچایا۔ ”لیکن جناب..... ریست ہاؤس میں تو صرف ایک ہی کمرہ کچھ استعمال کے قابل تھا اور اس میں مقتول کی بیوہ، اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ شام ہی سے آپ کے حکم کے مطابق ٹھہرائی گئی ہے..... پھر بھی اگر آپ کہیں تو.....“ جیلر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر یوں سر جھٹکا، جیسے اُسے خود اپنے بھٹکدہ پن پر غصہ آ رہا ہو۔ ”اوہ ہاں..... یاد آیا..... اچھا ٹھیک ہے، اُن کے لیے میرے گھر کا مہمان خانہ تیار کروا دو..... بیوہ کو وہیں ریست ہاؤس میں رہنے دو..... اب اس برسی رات میں وہ بے چاری کہاں کمرے تبدیل کرتی پھرے گی.....“ حوالدار سر ہلا کر جلدی سے مسجد کے باہر کھڑی

آخری انتظار

آسمان پر بجلی زور سے چمکی، تیز طوفانی ہوائ نے کچھ پل کے لیے برسات کی بوچھاڑ کا رُخ ہماری جانب کر دیا اور ہم سب، جو پہلے ہی مسجد کے برآمدے میں تقریباً دیوار سے لگے بیٹھے تھے، ایک دفعہ پھر بھیگ کر مزید دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ سلطان بابا نے حیرت سے جیلر کی جانب دیکھا۔ ”آپ کے قیدی کی آخری خواہش یہ ہے کہ اُس سے میری ملاقات کروا دی جائے..... لیکن ان آخری لمحات میں تو ہر قیدی اپنے خاندان، اپنے پیاروں سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے، پھر اُس نے ایک اجنبی سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی؟“ اقبال نے اپنی برساتی پر جمع ہوئی بوندوں کو جھاڑا ”قیدی کا اس دنیا میں اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا..... کم از کم اُس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ اُس کے لیے اجنبی ہیں تو پھر یہ سوال البتہ اب بھی باقی ہے، ہو سکتا ہے آپ سے ملاقات کے بعد اس راز سے بھی پردہ اٹھ جائے۔“ جیلر نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنی پوری ملازمت میں موت کا ایسا عجیب قیدی نہیں دیکھا، جو اپنی زندگی بچانے کی اپیل کے حق میں بھی نہیں۔ نہ ہی اُس نے گزشتہ آٹھ مہینے میں، جب سے اُسے اس جیل میں لا کر موت کی کال کوٹھڑی میں ڈالا گیا ہے، کسی بھی قسم کی کوئی فرمائش، با شکایت کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ خود ایک ایک دن گن کر اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا موت نہ ہوئی، اُس کی ”محبوبہ“ ہوگئی۔ جیل کے گزشتہ ریکارڈ سے اقبال کو یہ بھی پتا چلا کہ سکندر نامی اس قیدی نے معمول کے لیے کی جانے والی رحم کی کسی اپیل پر بھی دستخط نہیں کیے تھے، ورنہ کم از کم صدر مملکت کو کی جانے والی اپیل کے فیصلے تک اُس کی سانسیں بڑھ سکتی تھیں اور اُس کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ شاید اُس کی سزائے موت دم کھا کر ”عمر قید“ میں بدل دی جاتی۔ وہ سارا دن چپ چاپ رہتا تھا اور شام سے قبل، جب کال کوٹھڑیوں کے قیدیوں کو آدھے گھنٹے کے لیے زندان سے باہر ”ٹہلائی“ کے لیے نکالا جاتا تھا اس دوران بھی وہ خاموشی سے ایک جانب بیٹھا رہتا۔ شاید ہی کسی قیدی، یا جیل کے عملے

جیب کی جانب بڑھ گیا۔

ہمارے کسی سوال سے پہلے ہی اقبال نے خود ہمیں بتا دیا کہ حکام بالاک خصوصی اجازت سے ایک تفتیشی افسر کو ایک آخری کوشش کے طور پر آج شام اس قصبے میں پہنچنا تھا، لیکن شاید خراب موسم کی وجہ سے اُسے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ پولیس کے اعلیٰ تفتیشی حکام اب بھی ایک آخری امید رکھے ہوئے تھے کہ شاید اپنی موت سے ایک رات پہلے ہی سکندر کا دل پکھل جائے اور وہ جاتے جاتے کچھ ایسا بتا دے جو اُن کی تفتیش میں کارآمد ثابت ہو سکے اور سکندر کے اصل گروہ کی گرفتاری میں اُن کی مدد کر سکے۔ دوسری جانب چونکہ یہ قتل قصاص و دیت کی مد میں درج کیا گیا تھا، لہذا مقتول کی بیوہ کو اس کے پہلے وارث کے طور پر پھانسی دیکھنے کے لیے جیل بلایا گیا تھا۔ قصاص و دیت کے قتل کے کیسز میں مقتول کے سب سے قریبی درثناء میں سے کسی کو قاتل کی پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے جیل مدعو کیا جاتا تھا اور قاتل کو مقتول کے وارث کے سامنے ہی پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا۔ وارث کو پھانسی سے آخری لمحے قبل تک قاتل کی سانسیں بخش دینے کا اختیار بھی ہوتا تھا، چاہے وہ یہ سانسیں قصاص کی رقم کے عوض ہی کیوں نہ بخشے۔ لیکن اس سکندر نامی قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے مقتول جاوید نامی شخص کی بیوہ نائلہ اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بیرون ملک سے اس پس ماندہ قصبے تک پہنچی تھی، کیوں کہ اُس کے شوہر کے قتل کے بعد حفاظت کے نقطہ نظر سے اُس کے والدین نے اُسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ اقبال کے بقول، اُس کا خیال یہ تھا کہ اتنی دور سے مقتول کی بیوہ، اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے نہیں پہنچ پائے گی، لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب آج شام ہی بارش سے کچھ قبل نائلہ، اپنے اکلوتے بیٹے سمیت اس قصبے کے اسٹیشن پر صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ کھڑی جیل کی گاڑی کا انتظار کرتی ہوئی انہیں ملی۔ جیلر کے ایک سوال کے جواب میں کہ نائلہ نے ہزاروں میل کا یہ سفر کس لیے طے کیا، کیوں کہ پھانسی تو اُس کی غیر موجودگی میں بھی طے پا جاتی، نائلہ نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اس پھانسی کا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے اور اُسے تب تک سکون کی نیند نہیں آئے گی جب تک وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر جھولے ہوئے نہیں دیکھ لے گی۔ بقول اقبال، اُس نے آج تک اتنے آہنی اعصاب والی لڑکی نہیں

دیکھی تھی، کیوں کہ ابھی تک مقتول کی بیوہ کم عمر ہی تھی۔ نہ جانے، اُس بے چاری نے اس نوجوانی ہی میں یہ بیوگی کا داغ کیسے جھیلنا ہوگا؟ کچھ ہی دیر میں حوالدار نے آکر خبر دی کہ ”بڑے شہر“ سے افسر آگیا ہے، لیکن اُس نے آتے ہی جیل میں قیدی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے پاس وقت بہت کم ہے، لہذا وہ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا قیدی سے مل کر اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ جیلر یہ سنتے ہی جلدی سے کھڑا ہو گیا ”ٹھیک ہے..... ہم یہاں سے سیدھے جیل ہی جائیں گے اور ہاں..... اُس جلا د کا کیا بنا..... وہ پہنچا کر نہیں؟“ حوالدار نے اپنی ٹوپی سیدھی کی۔ ”نہیں جناب..... جلا د کا فی الحال کچھ اتنا پتا نہیں ہے۔ جیل کے دو سپاہی کشتی سمیت ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پوری رات جلا د کا انتظار کریں گے..... تاکہ رات کو کسی بھی پہر اگر وہ قصبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو ہمارا عملہ اُسے لے کر سیدھا جیل پہنچا دے.....“ ”ہوں“ جیلر نے لمبا سا ہنکارا بھرا اور سلطان بابا سے واپسی کے لیے اجازت چاہی۔ پتا نہیں، اس لمحے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سے سوال نے کہاں سے سر اُبھارا اور میں اپنی خواہش کو زبان پر آنے سے روک نہیں پایا۔ ”جیلر صاحب..... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے اس قیدی کو میں آج رات ہی دیکھ پاؤں..... کل تو اُس کی سانسوں کی میعاد بالکل ہی مختصر ہو گئی..... جانے اُس وقت وہ اپنے حواس میں بھی ہوگا، یا نہیں.....؟“ میرا فرمائش نما سوال سن کر اقبال شش و پنج میں پڑ گیا۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن جانے وہ تفتیشی افسر اس بات پر راضی ہو، یا نہیں..... کیوں کہ بہر حال سکندر ایک خطرناک قیدی ہے، جس کی آخری لمحے تک کڑی نگرانی کے احکامات ہمیں بہت پہلے موصول ہو چکے ہیں۔“ میں نے اقبال کی طرف دیکھا ”لیکن جیل میں اس قیدی کا ہر انتظام آپ کے ذمے ہے۔ اس سے کسے ملنے کی اجازت ہو سکتی ہے اور کسے نہیں، اس کا فیصلہ شاید صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، یا پھر وہ قیدی خود..... آپ پر اعلیٰ حکام کا دباؤ تو ضرور ہوگا، لیکن فرض کریں کہ کسی بھی وجہ سے اگر آپ اس تفتیشی افسر کو بھی اس قیدی سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیں تو کوئی لاکھ سرخے، لیکن قیدی کی کوٹھڑی تک نہیں پہنچ سکتا، لہذا آپ کا اختیار تو اپنی جگہ قائم ہے۔“ جیلر کچھ دیر تک میری جانب غور سے دیکھتا رہا، پھر جانے کیا سوچ کر اُس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں..... آپ بھی میرے ساتھ ہی چلیے.....“

میں نے سلطان بابا کی جانب اجازت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی تسبیح پر دل رہے تھے۔ ”جاؤ میاں..... تم بھی اُس بد نصیب کو دیکھ آؤ..... لیکن یاد رہے، جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے.....“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر کے پھر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

میں جیلر اقبال اور اُس کے حوالدار کے ساتھ بارش میں بھیگتا ہوا مسجد کے باہر کھڑی جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ جیپ کا ڈرائیور جو بارش کی خشکی سے بچنے کے لیے اپنی بیڑی سلگائے سکڑا سنا سا جیپ میں بیٹھا تھا، ہمیں دیکھ کر فوراً چاق و چوبند ہو گیا اور ہمارے بیٹھے ہی ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ قصبے کی واحد مرکزی سڑک اور اُس پاس کی گلیاں سب جل تھل تھیں۔ کچھ بھیکے اور سردی سے کپکپاتے آوارہ کتوں نے جیپ کی آواز سن کر چونک کر ہم اٹھایا اور پھر بھونک کر پیچھا کرنے کی سکت نہ پا کر صرف غرا کر ہی چپ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ نے قصبے کی آخری گلی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ گھپ اندھیرے میں دُور کہیں لپکتی نیلی بجلی کے جھماکے میں مجھے ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کی جھلک کسی نیلی روشنی میں نہائے ہوئے کی طرح دکھائی دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن میں بھی ایک جھماکا ہوا اور مجھے پھر وہی پرانا احساس بُری طرح ڈسنے لگا کہ میں نے پہلے بھی کبھی کہیں نہ کہیں یہ عمارت دیکھی ہے۔ میرے سر میں شدید درد کی ایک لہری اٹھی اور پھر چند لمحوں ہی میں حسب معمول سب کچھ پہلے کی طرح معمول پر آ گیا۔ جیپ جیل کی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئی۔ پرانے قلعے کی طرز پر وہ جیل اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید بجلی کا رابطہ منقطع تھا۔ برجیوں پر کھڑے محافظوں نے برق رفتاری سے اپنی بڑی بڑی مشعل نما ٹارچیں روشن کر کے پہلے اُوپر ہی سے اپنا اطمینان کیا اور پھر جلدی سے اندرونی دروازے کی دوسری جانب کسی کو بڑے جیلر کی آمد کو اطلاع دی۔ اندرونی سنتری نے اپنے اطمینان کے لیے جیل کے مرکزی دروازے میں نم لہجے کی چھوٹی سی دراز نما کھڑکی سے ایک بار ہمارا جائزہ لیا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

جیلر کا کمرہ مرکزی گیٹ کے ساتھ ہی واقع تھا جس کے بعد ایک اور بڑا سا آہنی گیٹ تھا، جس کے بعد جیل کی اصل عمارت شروع ہوتی تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے حوالدار کو مجھے اُسی برآمدے میں واقع ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بٹھانے کا کہا اور خود اپنے کمرے کو

جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ تفتیشی افسر سے پہلے ملاقات کر کے اُسے میرے بارے میں بتانا چاہتا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ سکندر نامی قیدی کو تفتیش کے لیے بنے خصوصی کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے اور بڑے جیلر صاحب میرا وہیں انتظار کر رہے ہیں۔ میں حوالدار کی سربراہی میں جیل کا اندرونی بڑا گیٹ پار کر کے جیل کی اندرونی دنیا میں داخل ہو گیا، جہاں سب سے پہلے نہایت احتیاط سے تین مرتبہ میری تلاشی لی گئی اور پھر ہم جیل کی راہ داریوں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جیل کی تمام عمارت ایک عجیب سے یاسیت زدہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے پوری عمارت پر کسی بھیانک آسیب کا سایہ ہو۔ دن بھر کے تھکے ہارے قیدی اپنی کوٹھڑیوں اور بیرکوں میں ایک دوسرے سے اُلجھے، پڑے سو رہے تھے۔ البتہ چھانسی گھاٹ کی جانب بنی کال کوٹھڑیوں سے زور زور سے قرآن اور تسبیح پر ”اللہ ہو“ کی آوازیں سنائے کو چرتی ہوئی آرہی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر سے موت اور مذہب کے اس عجیب سے تعلق نے الجھا سا دیا۔ آخر صرف موت، یا موت کا تصور ہی ہمیں مذہب کے قریب ہونے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ کیا صرف موت کے بعد ملنے والی سزا کا خوف ہی ہمیں مذہب کو اپنانے پر مجبور کرتا ہے؟ ہم خوشی میں اور اپنی مرضی سے کسی سزا کے خوف، یا کسی جزا کی لالچ کے بنا مذہب کو کیوں نہیں اپنا سکتے.....؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف اس خوف کا سامنا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، جو انسانی موت اور اُس کے بعد ملنے والی سزاؤں سے متعلق تھا؟ ہمیں اپنی خوشی سے بندگی کا اختیار کیوں نہیں دیا گیا؟

میں اسی سوچ میں مبتلا تھا کہ اچانک حوالدار نے ایک راہ داری کے آخر میں بنی ہوئی لوہے کی سڑھیوں کے قریب رُک کر مجھے اُوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے برآمدے ہی میں کاندھے سے اپنی بندوق اُتار کر مستعدی سے سپرہ دینے کے لیے ٹھہر گیا۔ میں لوہے کی بنی ہوئی سڑھی چڑھ کر جب اُوپر پہنچا تو خود کو ایک گول کمرے میں پایا۔ سڑھیاں بہت اُوچی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق مجھے اس وقت تیسری منزل کے برابر اُونچائی پر ہونا چاہیے تھا۔ یہ گول کمرہ دراصل نیچے سے آتی ہوئی دیوار ہی کا تسلسل تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں ایک بہت بڑے تور کے دھانے پر موجود تھا۔ جیلر اقبال بھی اُوپر موجود تھا اور نیچے کی منزل میں، جہاں اس تور کا پیندا تھا، وہاں نچلے گول کمرے میں ایک شخص کمرے میں پڑی دو کرسیوں میں

میں تو شاید اس ملک کو روشن دیکھنے کی حسرت ہی میں جان دے دیتا..... ویسے سنا ہے کہ ۲۰۰۹ء تک ملک سے لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی..... آپ کو مبارک ہو راجل صاحب۔“

راجل صاحب سمیت میں اور جیلر بھی سکندر کا یہ جملہ سن کر چونک گئے۔ راجل صاحب نے چار کا لبا ساکش لیا۔ ”گزشتہ پندرہ مہینوں سے جیل میں بند ہونے کے باوجود تمہاری معلومات کا ذخیرہ قابل ستائش ہے.....“ سکندر نے طنز سے راجل کی جانب دیکھا۔ ”جیل میں بند ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان اپنی آنکھیں بھی بند کر لے۔ ویسے آپ کا بھی قصور نہیں ہے، پولیس والوں کو عام طور پر آنکھیں بند کر لینے کی عادت ہوتی ہے۔“ راجل صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”بہت تلخی ہے، تمہارے لہجے میں..... لیکن یاد رکھو، سب پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ سکندر کے لبوں پر پھر سے مسکراہٹ آ گئی ”ٹھیک کہا آپ نے..... واقعی سب ایک سے نہیں ہوتے..... جو بھی ملا، پچھلے سے کچھ بدتر ہی نکلا۔ ویسے ہمیں تو آنکھیں کھلی رکھنی ہی پڑتی ہیں راجل صاحب..... ہم آپ جیسے بڑے افسر تو ہیں نہیں، کہ جنہیں ہر ماہ کے آخر میں گھر بیٹھے کچھ نہ کرنے کی بھی تنخواہ مل جائے..... جنہیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہوتی ہے، انہیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں.....“ راجل صاحب نے گارمنٹ سے نکالا ”کن حقوق کی جنگ کی بات کر رہے ہو تم.....؟ سچ تو یہ ہے کہ چند ملک دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہو تم لوگ..... جانے یہ کیسا برین واش ہے کہ خود اپنی موت کو گلے لگانے کو ترستے ہو..... یہ جانے بغیر کہ تمہاری اس قربانی کی کوئی وقعت نہیں ہے، تمہارے آقاؤں کی نظر میں.....“ سکندر نے لمبی سی جمائی لی۔ ”اچھا بول لیتے ہیں آپ۔ ضرور کالج اور یونیورسٹی میں تقریری مقابلوں میں اوّل آتے رہے ہوں گے.....“ راجل صاحب نے سکندر کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا ”اسکول اور کالج میں تو تم بھی انتہائی غیر معمولی طالب علم رہے ہو..... میٹرک میں ٹاپ کرنے پر تمہیں صدارتی وظیفہ بھی دیا گیا تھا..... کیا تم نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر ایک دہشت گرد بنو گے.....؟“

جانے اس ”دہشت گرد“ لفظ میں ایسا کیا تھا کہ سکندر تڑپ کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سی سے بندھے ہاتھ کمر کے پیچھے بل کھا کر رہ گئے۔ اُس نے تقریباً غراتے ہوئے کہا ”اپنے اپنے نظریے کی بات ہے جناب..... آپ کی نظر میں میں ایک

سے ایک پر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے ہاتھ کرسی کے پیچھے موٹی سی کے ذریعے بندھا ہوئے تھے۔ یہی نوجوان ”سکندر“ نامی وہ قیدی تھا جس کا ذکر میں شام سے سن رہا تھا۔ کمر کی دیواریں بالکل چکنی تھیں، اتنی کہ کوئی لاکھ کوشش بھی کرتا، پر اُس کا ان دیواروں سے چپک کر اوپر چڑھنا ناممکن تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ گول کمرہ، جیسے جیسے بلند ہوتا جاتا تھا، ویسے ہی چاروں طرف سے مزید تنگ ہوتے ہوتے چھت تک صرف ایک گول دھانہ سا رہ جاتا تھا۔ شاید یہ سارا انتظام قیدیوں کے ذہن میں اُٹھنے والے فرار کے کسی بھی خیال کو پوری طرح کچلنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں جیلر اقبال کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی اوپر گولائی میں بمشکل دو کرسیاں رکھنے کی ہی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دیر میں پینٹ اور کوٹ میں بلبلز ایک ۴۰، ۴۵ سالہ شخص اندر داخل ہوا۔ جیلر نے آہستہ سے مجھے بتایا۔ ”یہ راجل صاحب ہیں..... تفتیشی افسر..... ایس ایس پی راجل.....“ اس وقت نیچے گول کمرے میں بہت سی مہم بتیاں روشن تھیں، جن کے ٹلگے اُجالے میں، میں نے راجل صاحب کو بغور دیکھا۔ چہرے پر نظر کا سنہرا فریم، ہونٹوں میں سگار، بال سلیقے سے بنے ہوئے، مجھے وہ روایتی پولیس والوں سے کافی مختلف دکھائی دیے۔ اتنے میں اچانک جیل کی بجلی واپس آ گئی اور نیچے گول کمرہ روشن ہو گیا، جب کہ اوپر والے حصے کی بتیاں شاید جیلر نے پہلی ہی بجھا رکھی تھیں، اس لیے ہم دونوں مزید اندھیرے میں چلے گئے۔ اوپر سے لوہے کی جالیوں میں سے نیچے گول کمرے کا جھانکتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے روشن اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سینما کی اسکرین سامنے ہوتی ہے اور یہاں اسکرین دیکھنے کے لیے ہمیں نیچے کی جانب جھانکنا پڑتا تھا اور ہمارے درمیان لوہے کا وہ موٹی سی جالی نما کھڑکی بھی حائل تھی جس نے اس تنور کے دھانے کو ڈھک رکھا تھا۔ تفتیشی کمرے میں روشنی کے لیے ہزار وولٹ کا بجلی کا صرف ایک بلب کمرے کے وسط میں کچھ اُلے زاویے سے لٹکایا گیا تھا کہ اُس کی براہ راست روشنی صرف قیدی کے چہرے ہی پر پڑ رہی تھی۔ اچانک روشنی سے قیدی کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں اور راجل صاحب کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا ”چلیں شکر ہے، آپ کے آنے سے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی..... لیکن اُن بجھے چراغوں میں روشنی تو آئی.....“

آخری سجدہ

راحیل کا سوال سن کر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ”اوہ تو آخر کار دل کی بات زبان پر آئی گئی۔ یہ آپ جیسے سی ایس پی افسر، جو چند کتابوں کا رٹالگا کر مقابلے کا امتحان پاس کر لیتے ہیں، وہ آخر اپنے آپ کو عقل کل کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ میری موت سے ایک رات پہلے سگار کے کش لیتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے وہ سب جان لیں گے جس کی کھوج میں آپ کا پورا محکمہ جانے کتنے برسوں سے سرگرداں ہے۔ کاش آپ لوگوں کو سی ایس پی کے بعد عام فہم کی بھی کچھ ٹریننگ دے دی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“ راحیل صاحب نے بہت سکون سے سکندر کی ساری طعنہ زنی برداشت کی۔ ”تو گویا تمہیں ملک میں لیے جانے والے مقابلے کے امتحان کے طریقہ کار سے متعلق بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ جہاں تک میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ خود تم نے بھی بی اے کے بعد سی ایس پی کے لیے اپلائی کیا تھا، کہیں تمہاری اس نئی کی وجہ تمہاری اپنی ناکامی تو نہیں۔“ سکندر زور سے چلایا۔ ”نہیں، میں ناکام نہیں ہوا تھا۔ تحریری امتحان میں میرے بہت اچھے نمبر تھے لیکن زبانی امتحان لینے والوں کو شاید میری صورت پسند نہیں آئی، یا پھر اُن میں سے کوئی ایک صبح اپنی بیوی سے لڑکھائیوں لینے آیا تھا۔ تب ہی انہوں نے مجھ سے کچھ ایسے غیر متعلق اور اوٹ پٹانگ سوال پوچھے جن کا نہ سر تھا نہ چہر، یا پھر شاید جس ایک سیٹ پر مجھ میں اور ایک وزیر کے بیٹے میں مقابلہ تھا، اُسے مجھ سے چھیننے کے لیے انہیں مجھ سے افریقا کے جنگلوں میں پائے جانے والے ایک خاص جھینگے کی نسل بتانے جیسے سوالات ہی کرنے چاہیے تھے، جن کا میرے تحریری امتحان کے مضامین سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی ڈیڑھ سو کے قریب اُمیدواروں میں سے بھی کسی کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا، لیکن صرف اُس وزیر کے بیٹے کو نہ صرف جھینگے کی نسل معلوم تھی بلکہ اُس نے تو جھینگے کا شجرہ نسب بھی فر فر بیان کر دیا۔ نتیجتاً وہ اگلے مہینے اسٹنٹ کشنر تعینات ہو گیا اور میرا نام کامیاب اُمیدواروں کی فہرست سے خارج۔“ راحیل صاحب نے

دہشت گرد ہوں، جب کہ میری نظر میں آپ کا محکمہ راشی اور بے ایمان لوگوں کا گڑھ ہے مجھے قدرت نے زیادہ موقع نہیں دیا، ورنہ آپ کے محکمے کی اچھی خاصی صفائی کر جاتا۔“ ہم بار راحیل صاحب تملکا کر پلٹے۔ ”چند غلط لوگوں کا الزام سارے محکمے کے سر دھرتا سراسر۔“ وقوفی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر ٹھیک اور صحیح کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔۔۔۔۔ اس کے لیے ہر نظام موجود ہے۔“ سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکڑے ”ہونہ۔۔۔۔۔ کیا آپ کا محکمہ اور کیا اس نظام۔۔۔۔۔ مت بھولیے کہ اس وقت، جو آپ یہاں کھڑے میرا وقت برباد کر رہے ہیں، اس کی اجازت بھی آپ کو صرف اسی ”دہشت گرد“ کی مرضی سے ملی ہے۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے آپ ہی کے نون نے یہ اجازت دی ہے کہ میں اپنا یہ آخری وقت جیسے بھی چاہوں، صرف کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے سوچا کہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے پور ہوتا رہوں گا۔۔۔۔۔ چلو، کچھ تفریح ہی سہی۔۔۔۔۔ ورنہ میں نہ چاہوں تو آپ مزید ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔۔۔۔۔ تو ایک دہشت گرد کی آخر دین سمجھ کر اس قیمتی وقت کی قدر کیجیے۔۔۔۔۔ مجھے آپ کے لیکچرز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“ میں اور اقبال جیلر دم سادھے سکندر اور راحیل صاحب کی لفظوں کی یہ جنگ سن رہے تھے۔ راحیل صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر سکندر کے قریب آ گئے اور پھر اُس کی کرسی پر جھک کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ”ٹھیک کہا تم نے۔۔۔۔۔ مجھے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری تنظیم نے تمہاری پھانسی کے وقت ملک کے کس شہر میں اور کتنے بم دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔۔۔۔۔؟“

لیے پلے، سکندر نے اُن کے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ ”اگر آپ کی نظر میں، میں اتنا بڑا گناہ گار ہوں تو پھر یہ بھی جان لیجیے کہ ساری عمر کے گناہ کے داغوں کو یہ ایک آخری سجدہ بھی بھلا کیا دھو پائے گا۔ کم از کم ایسے مشورے دے کر میرے گناہ تو بے لذت نہ کیجیے۔ آپ جس میڈل کی تلاش میں مجھ تک پہنچے ہیں، کم از کم میں اپنے کاندھوں پر چڑھ کر آپ کو اس تمنے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔“ اتنے میں دوستری اندر آ گئے۔ راجیل صاحب گول کرے سے باہر نکل چکے تھے۔ ستر یوں نے سکندر کو کرسی سے کھولنے سے پہلے بیڑیوں اور جھکڑیوں میں جکڑ لیا۔ اقبال جیلر اور میں جب گول کرے کی چھت سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے، تب تک فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ نماز کے بعد سلطان بابا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئے اور میں اپنی جلتی آنکھیں لیے، کچھ دیر کے لیے کمرنگانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن بند آنکھوں تلے بھی میں سکندر ہی کا چہرہ دیکھتا رہا اور میرے کانوں میں اُس کے سگلتے جملے گونجتے رہے۔

ابھی سورج چڑھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ستری نے آ کر مجھے جگا دیا کہ سلطان بابا ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بمشکل چند گھونٹ چائے حلق سے نیچے اتاری۔ نہ جانے ایک عجیب سی بے چینی کیوں میری رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی، جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہو۔ ناشتے کے فوراً بعد سلطان بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”چلو عبداللہ میاں۔ ذرا پی پی تل آئیں۔“ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اسی لمحے جیلر اقبال کی گاڑی اُس احاطے کے باہر آ کر رکی، جس میں مجھے اور سلطان بابا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جیلر کچھ عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا ”میں نے بیوہ سے بات کر لی ہے۔ اگر آپ لوگ تیار ہیں تو ہم ابھی ریٹ ہاؤس کے لیے نکل سکتے ہیں۔“ تب مجھے سمجھ میں آیا کہ سلطان بابا کی مراد مقتول کی بیوہ سے تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ریٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح نماز کے وقت بارش کچھ تھم سی گئی تھی، لیکن اس وقت پھر سے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ ریٹ ہاؤس کے اینٹوں والے کچے صحن میں پانی کا ایک بہت بڑا سا جوڑ بن گیا تھا اور اس وقت برستی بوندوں کا ارتعاش اس ٹھہرے پانی میں کچھ ویسی ہی مل جل پیدا کر رہا تھا، جیسے اس وقت میرے دل و دماغ میں مچی ہوئی تھی۔ جیلر ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا تھا؟ ہمیں مقتول کی بیوہ سے ملوانے کا کیا مقصد تھا؟ میرا ذہن انہی سوالوں

پھر سے سگار کا لمبا سا کش لیا۔ ”جو سکتا ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، لیکن تم نے دوبار کوشش بھی تو نہیں کی۔ یقین کرو، میں خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور میں ہم اسی نظام کے تحت لیے جانے والے امتحان کے ذریعے پاس ہو کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا تمہاری شکایت اپنی جگہ۔“ سکندر نے اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ”میرا شکایت اب بھی اپنی جگہ ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ برسوں معزہ کرنے والے اور پروفیشنل کالجوں سے برسوں کی پڑھائی کے بعد نکلنے والے ڈاکٹر اور انجینئرا اس معاشرے میں معمولی کلرکوں کا درجہ پاتے ہیں، جب کہ ایک سادہ بی اے پاس لڑکا چڑھائیوں میں دو چار کتابیں رٹ کر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے اور اپنے رٹے کے بل پر کامیاب ہو کر قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے لگتا ہے۔ کبھی اُن افسر بن جانے والوں سے بعد میں کسی نے اس مضامین کے بارے میں پوچھنے کی زحمت بھی کی؟ لیکن اگر کوئی پوچھے تو اُسے پتا چلے گا کہ ایک لفظ بھی یاد نہیں ہوتا اُن ”افسران بالا“ کو۔ پھر یہ مقابلے کا امتحان صرف یادداشت اور رٹے مقابلہ ہی تو ہوتا، اور پھر ہم غریبوں کا حافظہ تو پہلے ہی فاقوں اور پریشانیوں کی وجہ سے کمزور اور خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ سو غریب کا بچہ کلرک پیدا ہوتا ہے اور کلرک ہی مر جاتا ہے۔“ ٹھیک ہے، مقابلے کے امتحان کے طریقہ کار میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں اور ان خامیوں دور کرنے کے لیے بذریعہ قلم جدوجہد بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا نوجوان نسل بندوق اٹھا کر سڑکوں پر آ جائے، معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے لگے۔“ سکندر نے زور سے سر جھٹکا۔ ”ہونہ، معصوم اور بے گناہ لوگ..... غلط فہمی۔ آپ کی، میری تنظیم نے آج تک صرف کرپٹ، راشی اور بے ایمان لوگوں کے خلاف ایکشن لیا ہے۔ ہم صرف اس غلیظ معاشرے کی صفائی کر رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور میرا ضمیر آج پھانسی سے ایک رات قبل بھی بالکل مطمئن ہے کہ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے اور بس..... راجیل صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ”کاش میں اس آخری وقت ہی میں تمہارا آنکھوں پر پڑا یہ پردہ اٹھا پاتا۔ بہر حال میں تمہیں آج رات کا وقت مزید دے رہا ہوں۔ ایک بار پھر سوچ لو، کل کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ جانے سے پہلے کفارہ ادا جاؤ گے تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا اور شاید تمہاری بخشش بھی۔“ راجیل صاحب واپسی۔

آئے ہیں۔ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“ نائلہ نے تیزی سے پلٹ کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ خود مجھے بھی سلطان بابا سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی، لیکن اُن کے لہجے میں اب بھی وہی پرانا ٹھہراؤ تھا۔ ”میں بھی کسی ظرف کے بھرم ہی میں تم تک پہنچا ہوں بیٹی، درگزر سب سے بڑا انتقام ہے۔“ وہ چلتے چلتے رُک گئی اور پلٹ کر تکیسی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ”میری جگہ اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہوتا تو کیا آپ اُسے بھی یہی مشورہ دیتے؟“ سلطان بابا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چار قدم بڑھا کر نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج اگر اس وقت تمہاری جگہ میری اپنی سگی بیٹی بھی کھڑی ہوتی تو میں اُس سے بھی یہی التجا کرتا، کیوں کہ تمہارا مجرم راہ سے بھٹکا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو اپنی دانست میں کچھ غلط نہیں کر بیٹھا۔ وہ تم پر کیے گئے ظلم کو بھی کسی کے حق کی دادرسی سمجھتا ہے، ہو سکتا ہے تمہاری معافی اُسے راہ راست پر لے آئے۔“ نائلہ نے بہت ضبط کی کوشش کی لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک ہی پڑے۔ ”تو گویا آپ بھی اُس مکار شخص کی باتوں میں آ گئے۔“ وہ آج تک پولیس اور باقی زمانے کو تو یہ جھانسا دیتا ہی رہا ہے کہ اُس کا ہر جرم ایک مقصد کو پانے اور کسی اور کو اُس کے گناہوں کی سزا دینے کی کوشش میں سرزد ہوا۔ اور شاید میں بھی اسی فلسفے سے متاثر ہو کر اُسے بخشش دینے کا فیصلہ کر ہی لیتی، اگر اُس کی اصلیت نہ جانتی۔ آپ بھی جس لمحے اُس شخص کے اصل مکروہ چہرے کو قریب سے دیکھیں گے تو مجھ سے پہلے خود چلا اُنھیں گے کہ اُس کا مقدر صرف اور صرف پھانسی کا پھندا ہی ہونا چاہیے۔“ نائلہ اب باقاعدہ بلک بلک کر رو رہی تھی، جب کہ ہم تینوں ابھی تک اسی حیرت اور شش و پنج کی سی کیفیت میں کھڑے تھے کہ آخر اس نازک سی لڑکی کو ایسا کون سا راز پتا ہے، جس نے اُس کے اندر انتقام اور نفرت کا ایک ایسا لاوا دہکا دیا ہے کہ جواب صرف سکندر کی موت ہی سے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ سلطان بابا نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے کافی دیر تسلی دیتے رہے۔

کچھ دیر بعد جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اندر کمرے سے ایک لفافہ اٹھالائی جسے اُس نے سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ ”اس میں میری زندگی کی وہ تحریر ہے جو آپ کو سارا سچ بتا دے گی، میں نے سوچا تھا کہ میں اُس ظالم کو یہ تب دکھاؤں گی جب اُسے مشکلیں کس کر بے لکی کی حالت میں تختہ دار پر لا کھڑا کیا جائے گا، لیکن آپ کی آنکھوں پر پڑا پردہ اٹھانے کی

میں اُلجھا ہوا تھا کہ اتنے میں اندر کمرے کی جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آنے والی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کالے لباس میں ملبوس چپ چاپ سلام کر کے ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیاہ لباس میں اُس کا سوگوار حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اس وقت وہ خود بھی آسمان پر چھائی گھٹا ہی کی طرح لگ رہی تھی، کچھ رُکی، کچھ برسی سی برکھا جیسے کچھ دیر تک ماحول پر عجیب سی گنبد خاموشی طاری رہی، پھر اُسی نازنین نے اپنے لب کھولے ”سپرٹنڈنٹ بتا رہے تھے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ”جیتی رہو بیٹی۔ ہاں میرا ہی نام سلطان ہے اور میں نے ہی تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور بہادروں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے اور اسی ظرف کی اُمید پر میں یہاں تک چل کر آیا ہوں۔“ اُس نے چونک کر سر اٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ ”آپ فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔“ بابا نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا۔ ”مجھے جیلر صاحب نے بتایا ہے کہ تم قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے ہزاروں میل دُور سے یہاں تک کا سفر طے کر کے آئی ہو لیکن اپنے دل کو ٹھول کر پوچھو، کیا کل صبح صادق سے پہلے جب یہ پھانسی سرانجام پا چکی ہوگی تو کیا تمہارا سفر ختم ہو جائے گا؟“ اُس نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا ”میں سمجھی نہیں، آپ کہا کہنا چاہتے ہیں۔“ ”میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال سے تم نے اپنے اس درد، اپنے اس رنج و الم کے سفر کی منزل اس ”پھانسی“ کو بنا رکھا تھا۔ کل یہ منزل بھی سر ہو جائے گی پھر اس کے بعد کیا یہ درد، یہ کرب ختم ہو جائے گا۔ کہیں پہلے سے بھی سوا ہو گیا تو؟“ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید کل کے بعد میرے درد کا اصل سفر شروع ہو گا۔ میرے دل کی واحد خواہش، واحد تسلی بھی ختم ہو جائے گی۔ رُوف کا قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا لیکن میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مجھے تمام عمر اب اسی کرب، اسی درد کے ساتھ گزارنی ہے۔ یہی میرا مقدر ہے۔“ ”نہیں بیٹی، تمہارا مقدر ایک ازلی سکون بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم اس وقتی بدلے کی خواہش کو اپنے دل سے نکال کر اُس قاتل کو معاف کر دو۔“ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا اور نائلہ تڑپ کر غصے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کیا..... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے معصوم شوہر اور اپنے بچے کے باپ کے سفاک قاتل کو معاف کر دوں۔ کیا آپ بھی اُسی کے کوئی ساتھی ہیں جو مجھے بدل کر ایک بار پھر مجھے لوٹنے کے لیے

برآمدے میں نکل آئیں۔ سکندر لپک کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ ”مجھے یقین تھا آپ انتہائی طویل فاصلے کے باوجود میری آخری خواہش پوری کرنے یہاں تک ضرور آئیں گے۔ میری زندگی تو اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے، لیکن آپ کا یہ احسان میری روح بھی تاباں نہیں بولے گی۔“ سکندر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جیل کی شدید مشقت اور تکلیفوں نے بھی اُس کے چہرے کی وجاہت پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اُس کی گہری کالی آنکھوں میں اب بھی خاصی چمک باقی تھی۔ سلطان بابا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا ”کہو نو جوان..... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم پہلے بھی کبھی کہیں ملے ہوں۔“ سکندر نے اُن کا ہاتھ چوم کر تعظیم سے چھوڑ دیا۔ ”نہیں! آپ مجھ سے نہیں ملے، لیکن میری آپ سے ملاقات بہت پرانی ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو، آج سے تین سال قبل ساحل کی درگاہ کے سامنے لنگر انداز بحری جہاز میں ایک بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ بم دھماکا میں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ بحری جہاز تقریباً خالی تھا، لیکن اس میں بھرے خام مال کی وجہ سے دن رات اُس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے اُس بلاسٹ کی تیاری کے لیے تقریباً تین ہفتے تک ایک زائر کا بھیج بدل کر آپ کی درگاہ ہی میں بھیجا پڑا تھا۔ ان تین ہفتوں میں بارہا عصر کی نماز کے بعد مجھے آپ کا درس سننے کا اتفاق ہوا۔ یقین جانیں، اگر میں اپنی زندگی کی راہ پہلے ہی متعین نہ کر چکا ہوتا تو ضرور ہمیشہ کے لیے اُسی درگاہ ہی میں آپ کے قدموں کے پاس اپنا ڈیرہ ڈال دیتا، کیوں کہ آپ مجھے ایک سچے انسان دکھائی دیئے تھے۔ ایک ایسا شخص جو بنا کسی فائدے کے اپنا سب کچھ تیاگ کر مجھ جیسے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ لیکن بلاسٹ کے فوراً بعد مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، کیوں کہ پولیس نے سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ البتہ میں نے اُسی دن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں گا اور آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی التجا کروں گا۔ اب اسے مقدر کا ستم کہوں، یا اپنی خوش نصیبی کہ آپ سے تب ملاقات ہو رہی ہے جب میری رخصتی کا وقت قریب ہے اور مجھے واقعی آپ جیسے کسی بزرگ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس نے بڑے حوالدارانے پانی میں شرابور دو سپاہیوں کے ساتھ آکر جیلر اقبال کو مطلع کیا کہ جلاد پہنچ گیا ہے۔ جیلر نے اُن دو سپاہیوں کو وہیں نگرانی پر چھوڑا اور خود جگت میں سلطان بابا سے اجازت لے کر پھانسی کے انتظامات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ جلاد کی آمد کی خبر سن کر سکندر

خاطر میں یہ ابھی سے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد آپ خود اس لفافے کو اس سفاک شخص تک پہنچا دیجیے گا۔“ نالہ اپنی بات ختم کر کے تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ سلطان بابا نے وہ لفافہ کھولا اور اس میں تہ کی ہوئی بند تحریر پر وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے نظریں دوڑائیں، جیسے جیسے وہ خط پڑھتے گئے، ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور میں اور جیلر ویسے ہی اپنی جگہ کھڑے بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ سلطان بابا نے تحریر ختم کرنے کے بعد خط کو دوبارہ تہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور گہری سانس لے کر بولے۔ ”جیلر صاحب! قیدی کی آخری خواہش کب پوری کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے ہماری اُس سے آخری ملاقات کا وقت کیا طے کیا ہے آپ نے۔“ جیلر نے پٹٹائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”عام طور پر پھانسی کے قیدی کی آخری ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا ہوتا ہے۔“ سلطان بابا نے برستے آسمان کی جانب نگاہ ڈالی، جو اس وقت اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے والی نالہ ہی کی طرح بادلوں کا سارا پانی بہانے پر مصر لگتا تھا۔ ”نہیں، عصر کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہم ابھی کچھ دیر بعد ظہر کی نماز پڑھ کر قیدی سے ملنے چلیں گے۔ آپ سارے انتظامات کر دالیں۔“

بارش پوری رفتار سے شروع ہو چکی تھی اور جس وقت ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اور سلطان بابا جیلر کی سربراہی میں سزائے موت کے قیدیوں کے مخصوص احاطے میں داخل ہو رہے تھے، تب تک سارا سینٹرل جیل ہی ایک بڑے تالاب کی سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ قیدی اپنی اپنی کال کوٹھڑیوں کی سلاخوں سے چپکے ہوئے کھڑے تھے، کیوں کہ پانی پھانسی گھاٹ کی کوٹھڑیوں میں بھی داخل ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے چہرے کیا تھے، حسرت سے الے فریم تھے۔ اُن کی نظریں ہمیں یوں ٹٹول رہی تھیں جیسے ہم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ جیلر نے سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر اپنی اسٹک سے سلاخیں کھٹ کھٹائیں۔ ”سکندر، اٹھو! سے سلطان بابا ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ سکندر جو کسی گہری سوچ میں غرق، کوٹھڑی کی چھت سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لیے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سکر کر بیٹھا تھا، سلطان بابا نام سن کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کبوتر خانے کی مانند، چار بائی چھ کی یہ کوشی بس اتنی سی تھی کہ اگر کوئی لمبے قد کا قیدی، رات کو سوتے وقت ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا تو سلاخوں سے

اسی قدر بہتر تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ملکی قانون کی نظر میں یہ ایک بھیانک جرم ہے اور اس کی جو سزا مقرر ہے وہ میں بھگت رہا ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں صرف اپنے حصے کا وہ کام کر کے جا رہا ہوں جو قدرت نے میرے ذمے لگایا تھا اور باقی کام میرے جانے کے بعد میرے ساتھی پورے کرتے رہیں گے۔“ اس موقع پر میں خاموش نہیں رہ سکا اور بول پڑا ”لیکن اس بات کا تعین کون کرتا ہے کہ معاشرے میں پلتا ہوا کون سا شخص کرپشن کی غلاظت میں رہتے رہتے ہاسور بن چکا ہے اور اب اُسے سزا دے کر رخصت کر دینے کا وقت آچکا ہے؟“ سکندر نے پہلی بار غور سے میری جانب دیکھا۔ شاید اُسے سلطان بابا کی موجودگی میں اُن کے ساتھ آئے کسی خدمت گار سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔ سلطان بابا سکندر کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر بولے، ”یہ عبداللہ ہے، اسے میرا ہی ایک حصہ سمجھو اور جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر بتاؤ، ہم دونوں راز کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔“ سکندر کے چہرے پر اطمینان کی لہر آگئی۔ ہمارا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ یہ ایک منظم تنظیم ہے جو ہر کیس کی مبینوں چھان بھنگ کرتی ہے اور ہر پیریم کمانڈ سزا کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہم بلاوجہ بے قصوروں پر گولیاں نہیں برساتے۔“ اب دوسرا سوال سلطان بابا نے کیا ”جس نوجوان سائنس دان رؤف کے قتل کے الزام میں تمہیں جانسی کی سزا سنائی گئی ہے، اُس کا قصور کیا تھا؟“ سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکڑے۔ وہ بھی ی کی کرپٹ اور چور معاشرے کا ایک حصہ تھا، جس کی جڑیں کاٹنے کے لیے میں اور میری تنظیم مرگم تھی۔ وہ بظاہر اس ملک کا وفادار تھا اور لاکھوں روپے تنخواہ کی مدد میں وصول کر رہا تھا۔ اُس کے بیرونی دوروں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا خرچہ بھی ہماری غریب سرکار ہی اٹھاتی تھی، لیکن درپردہ وہ بھی ایک عیاش اور بے ایمان شخص تھا۔ میں نے خود آخری چار دن تک کسی گمرانی تب کی تھی جب وہ ایک کانفرنس کے بہانے کسی عورت کے ہم راہ بھور بن کے ایک مینے سوٹ میں مقیم تھا۔ اُس پر گولی چلانے سے قبل میں ہر طرح کا اطمینان کر چکا تھا۔ اب ہی میں نے اُسے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حالانکہ میری تنظیم کے بڑوں نے دو مہینے قبل ہی اس کے بوجھ سے معاشرے کو پاک کرنے کا فیصلہ کر کے مجھے آرڈرز پہنچا دیے تھے۔“ سکندر کے لہجے کا یقین اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اُسے اپنے عمل پر ذرا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔ سلطان بابا نے چند لمحے توقف کیا اور بولے، ”نالہ تمہاری کیا لگتی ہے؟“ جانے یہ سوال تھا، یا

کے چہرے پر ایک عجیب سی درد بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”چلیں اچھا ہوا، جیلر صاحب کی یہ پریشانی بھی ختم ہوئی۔ بہت پریشان تھے وہ اس جلاد کی غیر حاضری کی وجہ سے۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنی زندگی میں تو میں کسی کو کوئی سکھ دے نہیں پایا اور اب جاتے جاتے بھی زمانے کو سنا کر جا رہا ہوں۔“

سلطان بابا نے وہیں برآمدے ہی میں سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے نشست ڈال لی تھی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کچھ دیر میں دعا ختم کر کے سکندر پر پھونک کر بولے ”میں تمہیں تمہارے وہ اصول توڑنے پر مجبور نہیں کروں گا، جنہیں نبھانے کی خاطر تم نے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی ہے، لیکن میری بات یاد رکھنا کہ سوائے شرک کے، ہر گناہ کا کوئی نہ کوئی کفارہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے آخری پل میں بھی تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہو تو کفارہ ادا کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔ شاید وہی کفارہ تمہاری بخشش کا سبب بن جائے۔“ سکندر نے چونک کر ہم دونوں کی جانب دیکھا، لیکن نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ اتنے میں جیل کا ایک وارڈن لمبی سی خاکی برساتی پہنے وہاں آ پہنچا اور سکندر سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بھی قیدی نمبر ۳۱۸، تمہارا کوئی اپنا ہے، جو تمہاری خواہش کے مطابق کل تمہاری میت وصول کر سکے۔ اُس کا نام، پتا لکھو، یا پھر ہم رفاه عامہ کے محکمے کو لکھ دیں۔“ وارڈن کا میکا کی انداز اور اُس کا سوال سن کر سکندر ہنس پڑا۔ ”میرے تو سب سے قریبی اب تم ہی ہو کریم خان، کیوں نہ تمہارا ہی نام دے دوں؟“ کریم خان نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”نہ بابا نہ، میں تو پہلے ہی موسم کے تیور دیکھ کر ڈر رہا ہوں۔“ سکندر نے دوبارہ اُسے چھیڑا۔ ”فکر نہ کرو وارڈن صاحب، پھانسی بارش میں بھی دی جاسکتی ہے۔ ہاں، البتہ سنا ہے کہ لاش بھیگنے کے بعد بھاری بہت ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم لوگوں کو میری بارات رخصت کرنے میں کافی دُشواری پیش آئے گی۔“ سکندر کی بات سن کر وارڈن کریم مزید وہاں تک نہیں پایا، اُلٹے قدموں دوڑ گیا۔ سکندر کچھ دیر تک اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر اُس نے سلطان بابا کو جواب دیا ”آپ یقین کریں، میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ میں نے آج تک صرف معاشرے کے ناسوروں کے خلاف ہی ہتھیار اٹھایا ہے، وہ جو اس ملک اور یہاں کے غریب عوام کا خون چوس رہے ہیں اور جنہیں جس قدر جلدی رخصت کر دیا جاتا،

عصا اور دیمک

تو خواب دگر ہے تیری تدفین کہاں ہو؟
دل میں تو کسی اور کو دفنایا ہوا ہے
سانپوں میں عصا پھینک کے اب مجھو دعا ہوں
معلوم ہے دیمک نے اُسے کھایا ہوا ہے

سلطان بابا کا انکشاف سن کر سکندر کا وہی حال ہوا، جو اپنے انتہائی عزیز کی موت کا سن کر کسی کا ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ دیر تو سکتے میں جما بیٹھا رہا اور پھر یکایک چلا کر کہنے لگا ”نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، نالکہ کے شوہر کا نام تو عمران ہے اور نالکہ نے انتہائی اچھے گھرانے کا رشتہ قبول کیا تھا۔ اگر میں آپ کو اتنے قریب سے نہ جانتا ہوتا تو ضرور یہ سمجھ لیتا کہ یہ بھی پولیس ہی کی کوئی گٹھیا چال ہے، مجھ سے راز اُگلوانے کی۔“ سلطان بابا نے مزید کچھ کہے بنا اپنی جیب سے نالکہ کا دیا ہوا لفافہ نکالا اور سکندر کے حوالے کر دیا۔ ”ہو سکے تو اس تحریر کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کرو۔ نالکہ کے شوہر کا پورا نام عمران رؤف تھا اور یہ وہی مقتول ہے، جس نے کیمیکل انجینئرنگ میں بیرون ملک سے ڈگری میں ٹاپ کر کے اپنے ملک کی خدمت کے جنون میں یہاں کے ایک تحقیقاتی ادارے میں بطور جونیئر سائنس دان نوکری قبول کی تھی۔ لیکن بد قسمتی سے اس ہونہار نوجوان کی قضا تمہارے ہاتھوں لکھی تھی۔“ سکندر نے چھٹ کر وہ لفافہ سلطان بابا کے ہاتھ سے لے لیا اور جیسے جیسے اُس کی نظریں کاغذ پر لکھی تحریر پر پھیلی گئیں، ویسے ویسے اُس کا جسم خشک ریت سے بنے گھر وندے کی طرح بکھرتا چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں جب اُس نے تحریر ختم کی تو تب تک وہ بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں، موت زندگی سے رابطہ ٹوٹ جانے کے عمل کا نام ہے اور ضروری تو نہیں انسان کا زندگی سے رابطہ صرف سانس کی ڈور ٹوٹنے ہی سے منقطع ہو سکتا ہو، کچھ اموات ہم پر سانس لینے کے دوران بھی تو وارد ہو سکتی ہیں۔ ہم جیتے جی بھی تو کئی بار مرتے ہیں۔ سکندر پر بھی اُس وقت کچھ ایسی ہی موت طاری تھی اور اُس

کوئی ہم، جسے سنتے ہی سکندر کچھ اس زور سے اُچھلا، جیسے اُسے کسی نے ہزار دہائیوں کا پتلا دے دیا ہو۔ ”آپ..... آپ نالکہ کو کیسے جانتے ہیں؟“ سلطان بابا نے اصرار کیا۔ ”پہلا میرے سوال کا جواب دو۔ پھر میں بھی تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔“ سکندر کچھ لمحے اپنے حوالہ جمع کرتا رہا، پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا ”نالکہ کبھی میری رُوح کا حصہ تھی، میرا سب کچھ تھی۔ لیکن اب وہ میرے لیے ایک نامحرم، ایک اجنبی ہے۔“ سلطان بابا کچھ دیر تک سکندر کو غور سے دیکھتے رہے، پھر اُن کی ڈوبتی ہوئی سی آواز سنائی دی ”تو گویا تم نہیں جانتے ہو کہ رؤف نام جس نوجوان کو تم نے قتل کیا تھا، وہ اُسی نالکہ کا شوہر تھا اور نالکہ آج تمہاری وجہ سے یہ کہلاتی ہے۔“

ہے ہیں۔ فولاد کا ملمع جب اترتا ہے تو پھر موم کو پکھلتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ سکندر کا موم چہرہ بھی لکھل پکھل کر آنسوؤں کے جوہر میں ڈوب سا گیا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب جا کر ہکا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اُس نے پکھلتی نظریں اٹھائیں۔ ”کیا وہ یہیں ہے.....؟“ ہاں..... وہ جیل کے ریست ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔“ سکندر میری بات سن کر غمی سی ہنسی بنا۔ ”اوه..... تو میری چھانی کا نظارہ دیکھنے کے لیے یہاں تک آئی ہے۔ یہ رشتے بھی پل پل میں کیسے بدلتے ہیں۔ کل تک جو مجھے آئی ایک کھروچ کی تکلیف سے رو رو کر آسمان سر پر ٹالیتی تھی، آج وہ میرے بے جان وجود کو چھانی کے پھندے پر جھولتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہاں اس موت کی وادی میں بیٹھی میری سانسیں بند ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔“ مجھے یک بار پھر اس محبت نامی ازدھے کی سفاکی پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر اس عفریت کا پیٹ لب بھرے گا؟ کب تک یہ ہم معصوم انسانوں کی رُوح نگہتا رہے گا۔ کب تک ہمارے مذہب کی شہرگ میں اپنے قاتل دانت گاڑھے ہمارا خون پیتا رہے گا؟ اس کے جان لیوا زہر ایک تازہ شکار سکندر کی صورت میں اس وقت بھی میرے سامنے ادھ مرا موجود تھا۔

سکندر کی کہانی بھی اپنی محبت کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں میں سے ایک تھی۔ اُس کی اور ملکہ کی ملاقات انٹرویو نیوٹری کے ایک تقریری مقابلے کے دوران ہوئی تھی۔ جب نائلہ کی بدست تیاری اور تحقیق کے باوجود سکندر نے مقابلے کا پہلا انعام جیت لیا تھا۔ نائلہ مقابلے کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی ہار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت صرف دو دلوں کے ملاپ ہی کا نام ہوتا، ہمارے معاشرے میں جذبوں کے سوداگر اس معصوم جذبے کو لی سونے چاندی کے انباروں سے تولنے کا فن جانتے ہیں اور سکندر کے پاس تو کبھی عام لات میں بس کا پورا کر ایہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی بیوہ ماں نے بچپن ہی سے دوسروں کے لہروں کے کپڑے اور برتن دھو کر اُس کے سرکاری اسکولوں کی فیس بھری۔ لیکن نائلہ کے کروڑ بابا پیٹھ امجد کو اپنی لاڈلی بیٹی کا دل اُس کے پسندیدہ کھلونوں سے جوڑنا آتا تھا، تو وہ ان لٹونوں سے اُس کا من پھیرنا بھی خوب جانتا تھا اور اُسے اپنی حد سے زیادہ بگڑی ہوئی بیٹی کی تریامٹ“ کا بھی بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے غریب بھٹنچر جہان کو براہ راست دھکے مار کر اپنے محل سے نکالا تو اُس کی ضدی بیٹی بھی اُس کے ساتھ ہی

کی اس سے بڑی بد قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ یہ موت اُس پر تب طاری ہوئی، جب اُس کی اصل موت میں صرف چند گھنٹے ہی باقی بچے تھے۔ اگر اُسے آج یہ پتا نہ چلتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے شوہر کا قاتل ہے تو تقدیر کا کیا بگڑ جاتا۔ کچھ بھرم زندگی سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور انسان اپنی ساری زندگی میں کما تا ہی کیا ہے۔ یہی چند بھرم..... تو پھر اُس شخص کی حالت کیا ہوگی، جس کی عمر بھر کی جمع پونجی، اُس کا سب سے بڑا بھرم موت سے چند لمحے پہلے لٹ جائے۔ اتنے میں عصر کی اذان شروع ہو گئی۔ بارش نے بھی نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جانے کیوں اس وقت مجھے حال ہی میں پڑھے گئے ناول ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ شدت سے یاد آیا کہ ”یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی کبھی تو ساری عمر بھی برستی رہیں تو کسی کا اندر بھگو نہیں پاتیں اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔“ سلطان بابا نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ سکندر ویسے ہی گم صم سا سلاخوں سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ میں اور سلطان بابا عصر کی نماز پڑھنے کے بعد جیل کی جامع مسجد سے باہر نکلے تو گھنے کالے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان بابا سکندر کی طرف چلنے کا کہیں گے، لیکن میری توقعات کے برعکس اُن کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ”اب دل جلے کو تم سنبھالو ساحر میاں۔ میں ایک بار مقتول کی بیوہ سے مل کر اُس کا دل موم کرنے کی کوشش کرنا ہوں۔ پتا نہیں کیوں، لیکن مجھے اب بھی سکندر اپنی راہ سے جھنکا ہوا ایک نوجوان لگتا ہے، جسے استعمال کیا گیا ہے۔“ میں پلٹ کر ایک بار پھر رُک گیا اور میرے ہونٹوں پر کئی دن سے ٹکا ہوا ایک سوال آ ہی گیا۔ ”بابا آپ مجھے سب کے سامنے عبداللہ، لیکن تنہائی میں ہمیشہ ساحر بلانے ہیں..... ایسا کیوں؟“ وہ میرا سوال سن کر مسکرا دیے۔ ”اس لیے کہ عبداللہ کے اندر موجود ساحر بھی میرے لیے اتنا ہی اہم ہے، جتنا کہ عبداللہ..... اور ساحر کے اندر کا عبداللہ تو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ ہے۔ یاد رہے، نام بھی ہماری آدھی شناخت ہوتی ہے..... اور میرا مقصد کبھی تمہاری اصل شناخت مٹانا نہیں رہا۔“ سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے بڑھ گئے اور میں یونہی سوچ میں ڈوبا، جھپٹتا ہوا دوبارہ سکندر کی کونھری کی جانب چلا آیا۔ سکندر کے ہاتھوں میں اب بھی نائلہ کا دیا ہوا خط ویسے ہی تھا۔ ایک بہت ہی مضبوط اور آہنی اعصاب کا انسان جب ٹوٹتا ہے تو پھر ٹوٹنا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید ہم سب ہی بیک وقت اندر سے فولاد اور موم کے بنے

سب کچھ ٹھکرا کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکل جائے گی، اس لیے اُس نے بڑی مہار سے سارے معاملے کو سنبھال لیا۔ بیٹی کی پسند کو اُس نے ایک بہترین اداکار کی طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر قبول کیا اور سکندر کی انا پر پہلی ضرب اُس نے پہلے ہی روز اُس وقت لگائی، جب اُس نے اپنے دفتر کی سیٹ اور سارا کاروبار سکندر کے حوالے کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اُس توقع کے عین مطابق سکندر نے اپنی ہونے والی سنگیتر نائلہ کے سامنے ہی سیٹھ امجد کی یہ چڑکش ٹھکرا دی کہ وہ نائلہ کو اپنے ہاتھوں سے کما کر کھلائے گا۔ سیٹھ امجد یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر جیسے غریب، لیکن آئیڈیلٹ نو جوان جب تک اپنے خوابوں کی دنیا سے نکلتے ہیں، تب تک اُن کے پاس کسی آفس میں بڑا، یا چھوٹا بابو بن کر کلرک کرنے، یا پھر کسی ڈپارٹمنٹل سٹور پر شام کو پارٹ ٹائم میگزین شپ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن ہزار تجربوں کے بعد بھی ایسے احمق سدھرتے ہیں، نہ سدھر پائیں گے۔ دوسرا وار نائلہ کے باپ نے نائلہ کے چائے لانے کے لیے اُٹھ جانے کے فوراً بعد کیا۔ جب اُس نے باور باتوں میں سکندر کو نائلہ کے ایک دن کے خرچ کے بارے میں بتایا، جو سکندر کے مہینوں کے خرچے کے برابر تھا۔ جب تک نائلہ چائے لے کر آئی تب تک سیٹھ امجد سکندر کو یہ بات بہت اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ اُس کی ناز و نعم میں پُلی نازک بیٹی کو پانے کے لیے سکندر کو مرنے اپنے خوب صورت الفاظ سے بنے محل تراشنا چھوڑ کر کوئی قدم بھی اٹھانا ہوگا۔ اور پھر جب سکندر نے خود امجد کو یہ بتایا کہ اُس کا ارادہ پہلے ہی سے اس سال کے آخر میں ہونے والے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ہے اور اُسے قوی اُمید ہے کہ وہ سی ایس ایس کا معرکہ سر کرنے کے بعد سرخرو ہو کر نائلہ کو اُس کے معیار کے مطابق نہ سہی، لیکن ایک قابل عزت جیون کا کام دینے کے قابل ضرور ہو جائے گا، تب ہی وہ نائلہ کی رخصتی کی درخواست لے کر سیٹھ امجد کے در پر دستک دے گا۔ یہ سن کر امجد نے گہری سکھ بھری سانس لی، کیوں کہ فی الحال مصیبت اپنی مرضی سے سات آٹھ مہینے کے لیے ٹل رہی تھی اور یہ آٹھ مہینے اُس کے لیے بہت بڑے اُس نے دھیرے دھیرے اپنی بیٹی کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ زندگی صرف چند دنوں، خوب صورت باتوں اور مستقبل کے سپنوں کا نام نہیں ہے، اس لیے اُسے سکندر کی نمائی کرتے رہنا چاہیے کہ زندگی میں ترقی کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سکندر نے مقابلے

کے امتحان میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کر رکھے تھے، ایسے میں اچانک جب نائلہ اُسے اپنے باپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کے مشورے دینے کے لیے چلی آئی تو کبھی کبھار سکندر بے حد چڑ جاتا تھا اور یوں رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی جھڑپوں کی صورت میں ”جھج“ نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیے۔ شوٹی قسمت، سکندر مقابلے کے امتحان کے انٹرویو میں فیل ہو گیا۔ سیٹھ امجد کو اپنا آخری اور سب سے کاری وار کرنے کا موقع مل گیا اور اُس نے ہمدردی کی آڑ میں اپنی بیٹی کو خوب سمجھا کر سکندر کے پاس بھیجا کہ سکندر نے آج تک اپنی سی جو کر لی تھی، وہ کر کے دیکھ لی، لہذا بہتر یہی ہے کہ اپنی ضد چھوڑ کر سیٹھ امجد کا کاروبار سنبھال لے اور بیوہ ماں کو لے کر سیٹھ امجد کے بیٹگلے ہی میں شفٹ ہو جائے۔ امتحان میں ناکامی کا صدمہ دل پر لیے بیٹھے سکندر کو اس لمحے گھر دامادی کا یہ طعنہ کسی گالی کی طرح لگا اور وہ بھڑک کر نائلہ پر برس پڑا۔ نائلہ بھی خود کو ترکی بہ ترکی جواب دینے سے روک نہیں پائی اور باقی کام سیٹھ امجد کی جلتی پر تیل چھڑکنے کی پالیسی نے کر دیا۔ تیسرے ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سکندر اور نائلہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب دونوں کا مزید ساتھ چلنا ممکن نہ ہوگا اور پھر آخر کار وہ ”آخری الوداع“ بھی آپہنچا، جو شاید ایسے ہر محبت کرنے والے جوڑے کا ازل سے مقدر ٹھہرتا ہے۔ پھر سے وہی انا کی دیواریں، پھر سے وہی معصوم تحائف کی واپسی۔ آخر یہ محبت کرنے والے جب بچھڑنے لگتے ہیں، تو ایسی آخری ملاقات کا اہتمام ہی کیوں کرتے ہیں، جس میں وہ اپنی رہی سہی نازک اور خوب صورت یادوں کو بھی لوٹا آتے ہیں! اور جدا ہونے والوں کی نشانیاں بھی کتنی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہی خوشبو میں بے گلابی خط، چند خشک پھول..... ٹوٹی ہوئی چڑیوں کے چند ٹکڑے، خزاں کی کسی سرد شام میں ایک ساتھ پی گئی کافی کا کوئی بل..... خالی سینما کے سب سے پچھلے سال میں اکٹھے بیٹھ کر دیکھی گئی انتہائی فلاپ فلم کے دو ٹکٹ..... پہلے سادوں کی پہلی بارش میں بھیگ کر بچنے کے لیے جائے پناہ کی تلاش میں دوڑتے وقت ٹوٹ جانے والے سینڈل کا ایک فیتہ..... نائلہ کے پاس بھی اس آخری ملاقات کے لیے چند لمبی سی سوغاتیں تھیں، جو وہ سکندر کو لوٹانے کے لیے آئی تھی۔ سنہرے رنگ کا ایک ٹوٹا کاف لک، ایک پرانا پارکر پین، چند پرانے ٹشو پیپر، جو سکندر نے کپڑوں پر چائے گرنے کے بعد استعمال کر کے پھینک دیے تھے۔ سکندر کے استعمال شدہ پرنوم کی آدھی بوتل، خزاں رسیدہ چند

تین مہینے کی مختصر مقدمے بازی کے بعد اُسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ تب سے لے کر آج کی اس برسی شام تک سکندر اس پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا، اپنے اہل کے فرشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کی کہانی ختم ہوئی تو ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر یکایک سکندر نے سلاخوں سے اپنے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”ایک مرتے ہوئے شخص کی ایک آخری تمنا پوری کرو گے.....؟ میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ اُس سے ملنا چاہتا ہوں، صرف اُسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا، انجانے میں ہوا۔ میں اُس پولیس آفیسر کو اپنا آخری بیان بھی ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں، کیوں کہ اب بھی بہت سے بھٹکے ہوئے نوجوان اس تنظیم کے آلہ کار ہیں..... شاید میرا بیان اُن میں سے ایک کی نجات کا باعث بن جائے..... جلدی کرو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

جس وقت راجیل صاحب کچھڑ میں لت پت اپنے جیل کے عملے سمیت بارش میں بھیگتے ہوئے جیل کوٹھری کے احاطے میں داخل ہوئے، تب رات پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ موسم بیڑوں کی روشنی میں سکندر کا دو گھنٹے کا طویل بیان ریکارڈ کرنے میں جانے کتنے کورے صفحوں کا مقدر سیاہ ہو گیا اور جب بیان مکمل ہونے کے بعد راجیل صاحب چلا چلا کر جیل کے دائرہ سیٹ سے مختلف چوکیوں کو دوہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے کے احکامات آگے بڑھا رہے تھے، اُس وقت رات کے دو بج چکے تھے، سکندر کی پھانسی میں صرف دو گھنٹے ہی باقی تھے، لیکن نائلہ نے سکندر سے ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب سکندر سے اُس کی ملاقات پھانسی گھاٹ پر ہی ہوگی۔ راجیل صاحب نے اُسے سمجھانے کی بے حد کوشش کی، حتیٰ کہ سکندر کے کفارے کے طور پر اُس کا دیا گیا آخری بیان بھی نائلہ کو دکھا دیا کہ کس طرح اُس کی تنظیم نے دھوکے سے محبت وطن عناصر کو سکندر کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹایا، جن میں نائلہ کا شوہر بھی شامل تھا، لیکن نائلہ کے پتھر دل کو پگھلنا تھا، نہ پگھلا۔ آخر کار سلطان بابا کے اشارے پر مجھے اُس نازنین دل گرفتہ کے در پر آدمی رات کو دستک دینی پڑی، اُس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ گزشتہ رات سے روتی رہی ہے۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی تلخی سے کہا۔ ”تو اب آپ آئے ہیں، اُس قاتل کی صفائی پٹا کرنے کے لیے۔ مجھے حیرت ہے کہ پوری جیل ہی اُس کی جان بخشی کے لیے کیوں دوڑی

پتے اور سکندر کی اخبار میں چھپی چند نظمیں..... بس وہی کل اٹاٹھ تھا، اُن دونوں کی تین مرا محبت کا..... جنہیں لوٹاتے وقت ایک ایسا لمحہ بھی آیا، جب دونوں کی ہی پلکیں بھیگ چکی تھیں اور قریب تھا کہ دونوں ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس کمزور لمحے کی گرفت میں آجاتے۔ سیٹھ امجد اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ ایسی آخری ملاقاتیں کبھی کبھی تجدید محبت کی بنیاد بھی بن جاتی ہیں، لہذا اُس نے پورا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خود بھی اس ریستورنٹ کی چلی منزل میں موجود تھا، جہاں اُوپر سکندر اور نائلہ آخری بار مل رہے تھے۔ اُس کے ہر کارے اُن دونوں کے آس پاس ہی موجود تھے، لہذا جیسے ہی سیٹھ امجد کو خبر ملی کہ دونوں اب اس موڑ پر ہیں، چار یا دوں کا بہاد انہیں بہا کر لے جاسکتا ہے تو اُس نے فوراً نائلہ کے موبائل پر کال کر کے اُنہیں واپس حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ نائلہ ٹوٹے دل کے ساتھ وہاں سے اُٹھ آئی اور سکندر اندر جلتی آگ نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔

محلے کی ایک تنظیم کے لیڈر نے اُسے بڑے لیڈر سے ملوایا، جس نے سکندر کو مشورہ کیا کہ وہ اپنے اس لاوے کا رخ اُن لوگوں کی جانب کر دے، جو معاشرے میں ایسی انصافیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جیسی سکندر کے ساتھ سی ایس ایس کے امتحان میں ہوئے۔ خرچے کی وہ پروا نہ کرے، کیوں کہ آج سے اُس کی ماں کی ذمہ داری تنظیم پر ہے۔ یوں سکندر نے اپنی زندگی کا پہلا جرم اُس رات کیا، جب اُس نے پہلی مرتبہ تنظیم والوں کے ساتھ مل کر اخبار والوں کا ایک دفتر جلایا۔ کہتے ہیں کہ ماچس سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں اور آشیانے بھی، لیکن سکندر کے گھر پولیس کا پہلا چھاپہ پڑا اور اُس کی ماں کو پتا چلا کہ اُس کے گھر کو خود اُسی کے گھر کے چراغ سے آگ لگ چکی ہے تو وہ پہلا صدمہ ہی برداشت نہیں پائی اور دل کا ایک ہی دورہ اُس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تب سے سکندر کا ہر بڑھتا ہوا اُسے جرائم کی دلدل میں دھکیلتا چلتا گیا اور پولیس کی یہ حسرت ہی رہی کہ وہ کبھی رکتے ہاتھوں سکندر کو گرفتار کر سکے۔ سکندر کی پہلی اور آخری گرفتاری میں بھی پولیس کی کوشش سے ناکامی سکندر کی بد قسمتی کا عمل دخل تھا۔ نہ سکندر کی جیب عین چوراہے پر دغا دیتی اور نہ ہی قریب گزرتی موبائل پولیس کی نظر جام ٹریفک کے جھوم میں پھنسے سکندر پر پڑتی۔ اس سے آگے کہانی بہت مختصر تھی۔ سکندر کو گرفتاری کی رات ہی خصوصی تفتیش کے سیل میں منتقل کر دیا گیا

ی سندر نے کال کوٹھری سے باہر قدم رکھا، فضا میں آس پاس کے قیدیوں کے نعرے گونج اٹھے..... ایک بولا، کلمہ شہادت..... سب بیک زبان بولے..... اشہد ان لا الہ الا اللہ..... سندر کے قدم زمین پر تو پڑ رہے تھے، مگر وہ خود مجھے اس وقت کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ سلطان بابا کے سامنے پہنچ کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پایا اور رو پڑا۔ ”بابا..... میرے اس آخری سجدے کی قبولیت کی دعا کیجیے گا..... میں نے اپنی ساری زندگی غیروں کے سامنے ماتھا ٹیکنے میں گنوا دی..... یہ آخری چند لمحے ہی میری کمائی ہیں..... اور میری یہ چند ٹکوں کی کمائی بھی اب آپ کی نذر ہے۔“ سلطان بابا نے سندر کو گلے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اگلے قدم پر میں کھڑا تھا۔ سندر کی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے گڑی گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں کس کی شبیہ تلاش کر رہا تھا۔ کاش میری آنکھوں کو چند لمحے کے لیے ہی سمی، پر قدرت اتنی صلاحیت تو دے دیتی کہ میں اس سیاہ نصیب کے لیے اُس گل رخ کا چہرہ اپنی آنکھوں میں سجالاتا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سندر کی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وہاں جا کر کسی مقام پر رُک سکو تو میرا انتظار کرنا..... ابھی میں نے تمہیں اپنی کہانی نہیں سنائی..... میرا یہ قرض تم پر ابھی باقی ہے۔“ سندر میری بات سن کر ہلکے سے مسکرایا اور گلے لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سب قیدی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر سندر کو چھو کر اُسے ”الوداع“ کہتے ہوئے رو رہے تھے۔ نیا جلا دگھاٹ کے باقی عملے کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سندر کو تختے پر چڑھا دیا گیا۔ جلاد نے کالے رنگ کا غلاف نما کپڑا سندر کے چہرے پر چڑھانے کی کوشش کی، لیکن اُس نے ایک ہاتھ سے اُسے کچھ لمحے رُکنے کا اشارہ کیا۔ نالکہ ابھی تک گھاٹ پر نہیں لائی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد راجیل صاحب اُسے لیے ہوئے پھانسی گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نالکہ کی نظر اُپر اُٹھی اور سندر کی اپنی جانب گڑی ہوئی نظر سے ملی۔ میں نے اس سزاوار بھیکے موسم میں بھی اس نظر کے ٹکراؤ سے چنگاریاں سی نکلتی ہوئی دیکھیں۔ سزائے موت کی کال کوٹھریاں، جن کی پشت پر یہ پھانسی گھاٹ موجود تھا، وہاں سے کسی قیدی نے زور کی تان لگائی..... ”من عاصم، من عاجزم، من بے کسم..... تاجدار حرم..... ہونگا کرم..... ہم غریبوں کے بدن بھی سنور جائیں گے.....“ بادل زور سے گر جا، بارش کی بوچھاڑ نے ہم سب کے جسم پوری طرح بھگو دیے۔ ہماری آنکھیں تو پہلے ہی بہہ رہی تھیں۔ جلاد نے کالا غلاف سندر کے

چلی آرہی ہے۔ ویسے اُسے یہ فن تو ہمیشہ سے بہت کمال آتا ہے، اپنی باتوں سے اُس نے سب کو بھی زیر کر ہی لیا، یا پھر کوئی نئی بولی دے دی ہے۔ اُس کی نام نہاد تنظیم نے آپ کو بھی.....“ میں نے خاموشی سے اُس کے طنز کا وار برداشت کیا۔ ”میں آپ کے پاس کوئی رحم کی اپیل لے کر نہیں آیا۔ دنیا میں مری ہوئی محبت سے زیادہ مردہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی زیادہ مرے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس مردہ محبت کا جنازہ اپنے وجود کے اندر دفنائے زندہ لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میری نظر میں آپ اور سندر بھی ایسے ہی دو مرے ہوئے جسم ہیں، جو دنیا کے دکھاوے کے لیے اب تک سانس لے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو سندر اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش نصیب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ کچھ لمحوں کے بعد کم از کم وہ اس سانس لینے کی منافقت سے تو چھوٹ جائے گا۔ آپ کو البتہ یہ جھوٹا بھرم شاید مزید کچھ سال تک جاری رکھنا پڑے گا۔“ نالکہ حیرت سے گنگ میری بات سن رہی تھی۔ میں جانے کے لیے پلٹا تو اُس کی ٹوٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہریں..... میں تیار ہوں..... آپ جیلر صاحب کو مطلع کر دیں۔“ کچھ ہی دیر میں جیل کی فضا سیٹیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ قیدی کی آخری ملاقات شروع ہو چکی ہے۔ جانے سندر، نالکہ کی ملاقات کیا رنگ لائے گی۔ میں یہی سوچتا ہوا فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر گھاٹ پہنچا تو سندر کی کال کوٹھری کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جیلر اقبال سمیت جیل کا ڈاکٹر اور مجسٹریٹ صاحب بھی آچکے تھے۔ سندر اپنا آخری غسل لے کر تیسویں پارے کی تلاوت ختم کر چکا تھا۔ تمام پھانسی گھاٹ کی کوٹھریوں کے چراغ جل چکے تھے اور سندر کے آس پاس کے سبھی قیدی اپنے ایک دیرینہ ساتھی کو آخری الوداع کرنے کے لیے اپنی اپنی کوٹھری کی سلاخوں سے سرنگائے، آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ سندر کی خواہش پر سلطان بابا بھی سندر کے اس چند قدم کے آخری سفر میں اُس کے ساتھ قدم ملانے کے لیے موجود تھے۔ سندر نے قرآن پاک واپس رحل پر رکھ دیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس دوران سندر کا آخری طبی معائنہ کیا اور سندر کو پیش کش کی کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر جانے میں کچھ وقت محسوس کر رہا ہو تو اُس کے لیے اسٹرپچر کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اُس نے ڈاکٹر کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ جیسے

کی ایک مڑی تڑی سی پرچی دہلی بارش سے بھیگ رہی تھی۔ سلطان بابا نے کاغذ کی یہ کھول کر اُسے پڑھا اور پھر اُسے میری جانب بڑھا دیا۔ شاید یہ تمہارے لیے ہے..... میں نے جلدی سے کاغذ کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ ”آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا..... ہم دونوں ہی بہت پہلے مر چکے تھے، اب صرف شرط اس منافقت سے پہلے جان چھڑانے کی ہے، جو ان سانسوں کی صورت میں ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جان چکی ہوں کہ سکندر کو رؤف کے قتل میں استعمال کیا گیا ہے اور میں نے دل سے اُسے معاف بھی کر دیا، لیکن اُس کی تنظیم، اس بیان کے بعد اُسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میرے لیے سکندر بہت پہلے مر چکا ہے اور میں ایک بار پھر اُسے اُن لوگوں کے ہاتھ سے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اُس کے پچھلے تمام گناہوں کا کفارہ آج یہیں ادا ہو جائے اور وہ سرخرو ہو کر آگے جاسکے۔ میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں بھی زندہ رہنے کی اس منافقت سے جلد از جلد چھٹکارا پا لوں۔“ میں نے نائلہ کی تحریر اپنی مٹھی میں جکڑ لی۔ اُسے ہماری کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی سکندر کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

PAKISTAN VIRTU
www.pdfbook

چہرے پر چڑھا دیا اور سکندر کو کاندھے سے پکڑ کر بند تختے کے درمیان میں لاکھڑا کیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ کال کوٹھریوں کی جانب سے ”اللہ ہو، اللہ ہو“ کی صداؤں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ پھانسی گھاٹ کی اونچی دیواروں کی وجہ سے اپنے ساتھی کو سانسیں ہارتے دیکھ تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن اُن میں سے کئی ایسے تھے، جنہوں نے اس سے پہلے بھی اپنے کسی ساتھی کو پیروں پر چل کر موت کی اس وادی میں جاتے اور پھر چار کاندھوں پر سوار واپس آتے ہوئے دیکھا تھا، لہذا انہیں ہر لمحے کی ترتیب کا خوب اندازہ تھا کہ ٹھیک کس لمحے جلاد کے ہاتھ لیور کی جانب بڑھیں گے اور کب لیور کے کھٹکے سے وہ موت کی چیخ بلند ہوگی۔ لہذا وہ اسی ترتیب سے باواز بلند دعائیں دہرا رہے تھے۔ پھر وہی موت..... اور پھر وہی مذہب..... جلاد نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھا، جو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے نائلہ سے دھیرے سے کچھ پوچھا، لیکن نائلہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجسٹریٹ نے جلاد کو اشارہ کیا۔ جلاد نے لیور پر ہاتھ رکھا اور اپنی قوت مجتمع کی۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح تیزی سے گھومنے لگی۔ جلاد نے نائلہ کی جانب رحم طلب نظر ڈالی۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، نائلہ کا جسم تیزی سے لرزنے لگا۔ تیز ہوانے بارش کی برجھی جیسی بوندوں کا رخ ہماری جانب کر دیا۔ مجسٹریٹ نے پانچ انگلیاں اٹھا کر جلاد کو پانچ سیکنڈ گننے کا اشارہ دیا۔ جیلر اقبال کے ہونٹوں پر کلمے کا ورد مزید بلند ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ قیدیوں کے نعرے چیخوں میں بدلنے لگے..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... مجسٹریٹ کی پہلی انگلی بند ہوئی..... پانچ..... چار..... تین..... دو..... ایک..... جلاد نے زور سے لیور کھینچا..... فضا میں تختہ کھلنے کی چنگھاڑ گونجی..... کھڑاک..... سکندر کا جسم فضا میں پہلے اپنے بوجھ سے تیزی سے نیچے کی جانب گرا اور پھر سفاک پھندے کی بندش نے اُس کی گردن کو جکڑ لیا۔ ٹھک کی آواز آئی اور سکندر چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ ٹھیک اُکا لمحے ایک اور کھٹکا ہوا اور نائلہ کا جسم بھد سے زمین پر کئے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ ڈاکٹر اہ جیلر تیزی سے نائلہ کی جانب بھاگے۔ ڈاکٹر نے فوراً نبض دیکھی اور پھر جلدی سے نائلہ کی ش رگ پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی، جو برف کی طرح سرد ہو چکی تھی۔ نائلہ کی رُوح بھی سکندر کے ساتھ ہی پرواز کر گئی تھی۔ سلطان بابا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نائلہ کی بند مٹھی پر گرا، جہاں کا

حویلی بھی کبھی ڈوبی ہوئی تھی اور مرکزی عمارت کے سامنے اتنا بڑا وسیع اور کشادہ لان تھا، جس میں اس جیسی چار چھ مزید عمارتیں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ لان کے پتھوں بچ ایک بہت پرانا پیپل کا درخت کچھ عجیب شان بے نیازی سے اکیلا ایستادہ تھا۔ درخت کے چاروں طرف سینٹ کا بڑا سا گول چبوترہ تھا اور اس کی صدیوں پرانی شاخوں کے پتھوں بچ ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ حویلی میں داخلے کی روش کو سرخ بھری سے پانا گیا تھا اور یہی روش پورج سے آگے جا کر انگریزی کے حرف ”ڈی“ کی شکل میں حویلی کے بیرونی گیٹ پر ختم ہوتی تھی۔ داخلے اور بیرونی دونوں گیٹوں پر دربانوں کی موجودگی یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ حویلی کے مکین آنے اور جانے کے دو مختلف گیٹ استعمال کرتے ہیں۔ پورج میں پہلے ہی سے ایک کچی عمر کا شخص نفیس شیروانی اور سر پر قرآنی پہنے، چند نوکروں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے اترنے پر جب اُس نے تعارف اور استقبال کیا تو پتا چلا کہ یہی موصوف حاجی رزاق صاحب ہیں۔ چائے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں حویلی کے عظیم الشان ڈرائنگ روم سے باہر لے آئے۔ اُن کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی، لیکن پھر کچھ پوچھتے پوچھتے رُک سے جاتے۔ آخر کار اُن کے مہمان خانے کی خوب صورت انیکسی میں داخل ہوتے وقت سلطان بابا نے خود ہی اُن کی انجمن رفع کر دی۔ ”رزاق صاحب یہ عبداللہ میاں ہیں..... یہ بھی میرے ساتھ ہی رہیں گے..... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“ حاجی رزاق نے جلدی سے سلطان بابا کی بات کاٹ دی۔ ”میں نہیں جناب..... میری کیا مجال کہ میں کوئی اعتراض کروں..... میں بس یہی کفرم کرنا چاہتا تھا کہ صاحب زادے بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے، یا ان کے لیے کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ سو بسم اللہ..... آپ کے ساتھ رہیں..... ہمارے سر آنکھوں پر.....“ یہ مہمان خانہ، یا انیکسی حویلی کی مرکزی عمارت کے داہنی طرف بیرونی گیٹ سے تقریباً متصل واقع تھا اور ہم اس وقت شیشے کی دیوار سے پرے جس برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے بھی وہ پیپل کا پیڑ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ حاجی رزاق کی باتوں سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ اُن کی سلطان بابا تک رسائی مولوی خضر کے توسط سے ہوئی ہے۔ لیکن ہماری یہاں آمد کا کیا مقصد تھا، یہ عقدہ بھی کچھ دیر میں حاجی رزاق ہی کی زبانی کھلا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان سمیت ایک مہینہ تیس دن قبل اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے، لیکن ان

یا قوط

ٹرین کو رحیم پور کا اسٹیشن چھوڑے ہوئے تقریباً بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ سکندر اور نائلہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے کہہ کر پلٹ جاؤں۔ محبت کا یہ رنگ بھی ہو سکتا ہے، مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا، لیکن پھر سلطان بابا کا گہرا سمندر جیسا سکوت اور صبر دیکھ کر میں خود ہی کو ملامت بھی کرتا کہ آخر جو کچھ مجھ پر ہیتی ہے وہی سب کچھ اُن کے دل نے بھی جھیلنا ہے، لہذا انہیں مزید پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ جانے یہ سب سوچتے سوچتے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر تب جاگا، جب سلطان بابا کی ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ساحر میاں اٹھ جاؤ..... ہماری منزل آگئی ہے۔“ انہوں نے شاید دھیرے سے میرا کاندھا بھی ہلایا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا، لیکن اس وقت صبح سے پہلے کی شدید دُھند اور کبھی دُوبا ہوا تھا اور اسی دُھند میں چلتے پھرتے قلی، ٹھیلے دار اور وینڈنگ کنٹریکٹر سب ہی ایک خواب ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ حسب معمول نہ میں نے سلطان بابا سے کوئی سوال کیا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا چمڑے کا بیگ تھا جس میں میرے اور سلطان بابا کے دو جوڑے کپڑے اور اُن کا مسواک وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میں بیگ اٹھائے پلیٹ فارم پر اترا تو سفید وردی میں ملبوس ایک ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں وہاں کھڑا تھا اور اسٹیشن پر لگے بلب کی چیلی روشنی کے دائروں اور سفید دُھند کے ہیولوں میں ہمیں دُھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی جلدی سے آگے بڑھا اور سلطان بابا سے مخاطب ہوا ”بابا جی..... کیا آپ حاجی رزاق صاحب کے مہمان ہیں۔ میں آپ ہی کو لینے کے لیے آیا ہوں۔“ کچھ دیر بعد ہم ڈرائیور کے ساتھ اسی کی دہائی کے ماڈل کی ایک کشادہ مرشدیز گاڑی میں دُھند بھری سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑی حویلی کے بیرونی چھانک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

کر اس درخت کے پاس آ جاتی ہے اور باقاعدہ اس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مستقل بخار کی کیفیت نے اُسے اس قدر چڑچڑا کر دیا ہے کہ اب تو اُس نے اپنے مگنیتر عامر سے بھی بات چیت بالکل بند کر دی ہے۔ حالانکہ ایک وہ وقت بھی تھا جب وہ پہروں بیٹھ کر عامر کا شام کی چائے پر انتظار کیا کرتی تھی۔ حاجی رزاق بیٹیوں کی ایک خاص حد تک آزادی کے قائل تھے اور عامر تو اُن کے اپنے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ رخصتی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہو جائیں، لیکن اب تو رباب عامر کا نام سن کر ہی غصے سے کانپنے لگتی تھی۔ اگر عامر، رباب سے شدید محبت نہ کرتا ہوتا تو یہ رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ وہ خود بھی رباب کی اس حالت سے بے حد پریشان تھا اور میڈیکل کی اصطلاح میں جو کچھ بھی علاج ممکن تھا، اپنے سینئر ڈاکٹروں کے مشورے سے آزما چکا تھا، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ رباب کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ حاجی صاحب کی بیگم دبے لفظوں میں کئی بار اُن سے کہہ چکی تھیں کہ انہیں یہ کوئی آسیب وغیرہ کا چکر لگتا ہے، لیکن عامر کو ان توہمات سے شدید چڑھتی تھی۔ پھر بھی رباب کی ماں نے سب سے چھپ کر ایک بہت ”پنپنی ہوئی“ پیری کو اپنی کراماتی دھونی دینے کے لیے حویلی میں بلا بھیجا۔ لیکن جیسے ہی اُسے چند لمحے کے لیے خود اُسی کے کہنے پر رباب کے ساتھ اکیلے کمرے میں چھوڑا گیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ چیختی چلاتی ہوئی بدحواسی سے کچھ ایسی تیزی سے وہاں سے بھاگی کہ اپنی پیری فقیری کے سارے کراماتی لوازمات بھی اٹھانا بھول گئی۔

عامر کو شام کو جب اس بات کا پتا چلا کہ اُس کی چچی نے رباب کا ”آسیب“ اتارنے کے لیے کسی عورت کو بلوایا تھا تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب اگر کسی نے بھی ایسے کسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ عامر غصے کا بے حد متیز تھا اور حاجی رزاق تو دونوں طرف سے پس رہے تھے۔ ایک طرف بیٹی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی تو دوسری طرف داماد رخصتی سے پہلے ہی پھسلا جا رہا تھا۔ لیکن جب میڈیکل نے پوری طرح جواب دے دیا تو انہوں نے بیٹی کی زندگی کے لیے داماد کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور مولوی خضر کے ہاتھ پیغام بھیج کر سلطان بابا کو اپنے ہاں بلوایا، البتہ عامر اس بات سے ابھی تک بے خبر تھا۔ ابھی حاجی رزاق کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بوندا باندی سنے تیز بارش کا روپ دھار لیا اور ہم جس شیشے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اُس کی

ترپین دونوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو انہوں نے سکون سے گزارا ہو۔ بقول حاجی رزاق، یہ حویلی اُن سے پہلے بھی بہت سے خریدار اور کرائے دار دیکھ چکے ہیں، لیکن جانے کیوں، یہاں کوئی بھی چند راتوں سے زیادہ ٹک نہیں پایا۔ حاجی رزاق ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے اور پھر جب کروڑوں کی یہ جائیداد لاکھوں کے عوض بکنے لگی تو وہ خود کو اسے خریدنے سے باز نہیں رکھ پائے۔ انہوں نے قریباً چار ماہ قبل یہ حویلی خریدی تھی، تب یہ تقریباً کھنڈر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دن رات مزدوروں کو لگو لگا کر اور چار پانچ ٹھیکے داروں کی نگرانی میں اس کھنڈر کو ایک بار پھر سے اس کی موجودہ چمکتی دکتی حالت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس مہمان خانے میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے، یہ نئی تعمیر تھی۔ اس سے پہلے یہاں انجیر کے درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا، جسے صاف کر دیا گیا تھا۔ لاکھوں روپے اس حویلی کی تزئین پر خرچ کرنے کے بعد جس روز انہوں نے اپنے پورے خاندان سمیت پہلا قدم اس دالان میں رکھا، بس وہیں سے اُن کی مصیبتوں کی داستان شروع ہو گئی۔ حاجی رزاق کے خاندان میں اُن کی بیگم کے علاوہ اُن کی دو لاڈلی صاحب زادیاں شامل تھیں..... ۱۹ سالہ رباب اور ۱۷ سالہ نایاب۔ رباب بچپن ہی میں اپنے چچا زاد عامر سے منسوب کر دی گئی تھی، جو اس وقت اپنی طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے دوسرے سال میں تھا اور اگلے سادوں سے پہلے اُن کا رباب کی رخصتی کا منصوبہ تھا۔ حاجی رزاق کے بقول، جس وقت وہ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے، وہ عصر کا وقت تھا اور شام کی چائے انہوں نے نوکروں سے کہہ کر باہر والاں ہی میں لگوائی تھی، کیوں کہ اندر کمروں میں ابھی جھاڑ پونچھ جاری تھی۔ لڑکیاں حویلی کے دالان میں چہل قدمی کرتی رہیں اور اسی اثناء میں مغرب کا وقت بھی ہو گیا۔ انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ چھوٹی نایاب تو ماں کے ساتھ اندر کی آرائش دیکھنے کے لیے جا چکی ہے اور وہ خود آخری سامان لانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور منشی کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف رہے مگر..... جب فراغت کے بعد پلٹ کر اندر جانے لگے تو نظر بڑی بیٹی رباب پر پڑی، جو کچھ عجیب سے انداز میں دالان میں کھڑی ہو کر پچیل کے پیڑ کر دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آواز دی تو وہ چونک کر پچلی اور کھوئے کھوئے انداز میں اندر کی جانب بڑھ گئی، لیکن اس کے بعد سے آج تک کسی نے اُس لڑکی کو اپنے آپے میں نہیں دیکھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت بگڑتی گئی اور اب تو وہ باقاعدہ راتوں کو اٹھ

ڈانٹا۔ ”رُباب..... یہ کون سا طریقہ ہے مہمانوں سے بات کرنے کا.....“ رُباب نے پلٹ کر ایک نگاہ غلط پہلے حاجی رزاق اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر سلطان بابا کو اسی طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتی ہوئی پلٹ کر وہاں سے چل دی۔ حاجی رزاق نے بے بسی سے ہماری جانب دیکھا۔ ”معافی چاہتا ہوں..... لیکن میں خود بھی بے بس ہوں۔“ سلطان بابا نے، جو رُباب کو دیکھنے کے بعد کسی گہری سوچ میں گم ہو چکے تھے، حاجی رزاق کو تسلی دی کہ اللہ بہتر کرے گا۔

بارش کا زور تو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، لہذا سلطان بابا کی فرمائش پر حاجی رزاق نے چند چھتریوں کی پناہ تلے ہی ہمیں پوری حویلی کا دورہ کروایا۔ سلطان بابا نے بطور خاص حاجی رزاق سے دریافت کیا کہ اس مکان کی بیرونی چار دیواری کے حساب سے حویلی کو کل کتنے کونوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ گھر کی اندرونی ساخت کے مطابق حویلی کے کل سات کونے بنے تھے۔ سلطان بابا نے اُسی وقت قریب کھڑے نوکروں میں سے ایک کو بازار بھیج کر پانچ گنج لمبی لوہے کی سات کیلیں لانے کا کہا۔ سب اپنی ذہن میں مگن تھے، لیکن نہ جانے مجھے کیوں مسلسل ایک عجیب سی بے چینی اور الجھن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اس سارے عمل کی نگرانی کر رہا ہو اور پھر جب ہم حویلی کے پچھلے حصے میں باغ کی جانب والے کونوں میں سلطان بابا کی پڑھی ہوئی کیلیں ایک ایک کونے میں گاڑ رہے تھے تو اچانک ہی میری نظر راہی کروں کی اُن کھڑکیوں کی جانب اُٹھ گئی، جو یہاں پچھلے باغ کی جانب کھلتی تھیں، تب میں نے اُن میں سے ایک کھڑکی میں رُباب کو اپنی آنکھوں میں خون لیے گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت وہ غصے میں چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری نظریں ٹکرائیں تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردی لہر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دُعا نظر بکھ اور ہی تھی..... اپنے اندر ایک پیغام..... ایک دھمکی لیے ہوئے..... ایک جانی دشمن کی نظر..... ابھی میں اُس ماہ رُخ کی نظر کے بیچ ہی میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک گیٹ کی جانب سے ککار کی اسکرچ کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ایک وجیہ نوجوان غصے میں دندانہ مارا ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔ میں اُس کے پہلے جملے ہی سے سمجھ گیا کہ وہ رُباب کا منگیتر عامر ہے۔ اُس نے چھوٹے ہی کہا ”رزاق چچا..... یہ میں کیا سن رہا ہوں..... آپ نے پھر کسی

دیواروں سے ٹکرا کر بارش کے موتی ایک عجیب سا جمل ترنگ بجانے لگے۔ یہ بارشیں چار دینیا کے کسی خطے کی بھی ہوں..... ہوتی بالکل ایک جیسی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مبہوت کر دینے والی..... دلوں کے رنگ دھو دینے والی..... ابھی ہم شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر فٹا ہونے والے بوندوں کی سرگم سن ہی رہے تھے کہ اندر سے کالے لباس اور کالی چادر میں لباس ایک حسین لڑکی ہاتھ میں پانی کا فوارہ اُٹھائے نکلی اور اس برستی بارش میں بھی پتیل کے پیڑ کو پانی دینے لگی۔ اُسے اپنے بھیگنے کا کوئی ہوش نہیں تھا اور اُس کے چہرے کی پیلاہٹ اور زردی، میں یہاں اُن دُور بیٹھے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔ حاجی رزاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اُس کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہی میری بیٹی رُباب ہے..... اس کی ابتر حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔“ دُعا رُباب کی نظر اُٹھی اور اُس نے شدید غصے اور بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اُس کی نظر تیر کی طرح ایک سیدھ میں شیشے کی اس دیوار سے پرے بیٹھے ہم لوگوں پر گز گئی، حالانکہ بیڑا اس برآمدے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ بارش میں ہمارے ہیولے تک باہر سے گزرتے کسی شخص کو واضح نظر نہیں آ سکتے تھے، لیکن رُباب نے سیکڑوں گز دُور سے ہماری جانب یوں دیکھا جیسے ہم اُس کے بالکل سامنے ہی بیٹھے ہوں۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑے فوارے کو زور سے اُگے جانب پٹا اور غصے میں پھنکارتی ہوئی، تیز بارش کی لپٹوں سے الجھتی ہوئی ہماری جانب بڑھ کر طوفانی ہوانے اُس کے سر سے چادر ڈھلکا دی اور جس وقت اُس نے شیشے کے دروازے کو دینے والے انداز میں دھکا دیا، تب تک اُس کا کانچ سے بنا کول وجود ایسے دھل چکا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موتی سمندر کی تہ سے باہر نکالا گیا ہو۔ اُس کا بھیگا گلابی حسن غصے سے سرخ رہا تھا۔ گھنی لٹیں بھیگ کر چہرے سے یوں لپٹی جا رہی تھیں، جیسے بے نقاب فتنے پر حجاب کا ڈالنا چاہتی ہوں۔ رُباب کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی غصے سے ہم سب کی جانب دُعا رہی اور پھر اُس کی نظریں سلطان بابا پر ٹک گئیں جیسے اُسے اُن کا وجود سخت ناگوار گزرا۔ رزاق صاحب بالکل ہی بوکھلا سے گئے۔ ”آؤ بیٹا آؤ..... یہ سلطان بابا ہیں..... بہت دُور تم سے ملنے آئے ہیں۔ اور یہ.....“ رُباب نے باپ کی پوری بات سننے بغیر ہی درمیان کاٹ دی ”کیوں آئے ہو یہاں.....؟“ وہ براہ راست سلطان بابا سے مخاطب تھی۔ اب اُس نے اپنے باپ، یا میری جانب دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی رزاق نے اُن

دُخل دینے کا معاملہ ہے..... اور یاد رہے کہ اس پوری کائنات کا نظام، اس بنیاد اور اصول پر قائم ہے کہ ہر ذی رُوح اپنے مقرر کردہ دائرے میں سفر کرے اور دوسری دنیا کے محور میں دُخل اندازی نہ کرے۔ اسی اصول کی بنیاد پر یہ لاکھوں کہکشائیں، چاند، ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں اور اس گردش کی ذرا سی بھی غیر قدرتی تبدیلی، یا تغیر کو قیامت سے تشبیہ دی جاتی ہے، کیونکہ اس اصول سے بال برابر انحراف بھی اس قدر تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا ہے جو کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔“ مجھے پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... یہاں اس گھر میں کون سی دوسری دنیا کے مکین مداخلت کر رہے ہیں.....؟“ سلطان بابا نے تسبیح ختم کر کے خود پر اور مجھ پر پھونکا۔ ”جنات..... اس حویلی پر واقعی کسی آسیب کا سایہ ہے۔“ میری حیرت سے وہ سمجھ گئے کہ میں اس ترقی یافتہ دور کی بھاگتی دروٹی سیٹلائٹ اتج میں اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ”جنات“ پر یقین تو رکھتے ہو نا..... قرآن میں باقاعدہ اُن کا کئی جگہ ذکر موجود ہے..... اور اُن کا مسکن بھی یہی ہماری دنیا ہے..... بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہم سے مخفی ہیں اور اُن کا دائرہ حیات اور معاشرہ ہمارے محور کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ہم سے یک سر جُدا ہے اور عام حالات میں وہ کبھی ہمارے معاملات میں دُخل دینے کی کوشش نہیں کرتے، البتہ ہم انسانوں کی طرح اُن میں بھی نیک اور بد، شریف اور شریر مخلوق کا تصور موجود ہے۔ البتہ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ اس گھر پر آسیب کا بھاری سایہ ہونے کے باوجود مجھے ابھی تک یہاں کسی شر کا شائبہ تک نہیں ہوا، کیونکہ معاملہ اگر بڑی، یا شرارت کا ہوتا تو اب تک وہ مخلوق آسمان سر پر اٹھا چکی ہوتی، حتیٰ کہ اُس نے اس وقت بھی کسی طرح کی دُخل اندازی نہیں کی، جب میں نے اُس کی امکانی بندش کا بندوبست کرنے کا سامان کیا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسے موقع پر پلٹ کر جوابی وار ضرور کرتی ہے۔ آگ کے خمیر سے اٹھی اس مخلوق کا برتاؤ بھی کسی تاریک طرح ہی بھڑکیلا، گرم اور جلا دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن خلاف توقع اس بار اُس کا رویہ بالکل مختلف ہے اور دھیان رہے، اس بار تمہاری تربیت کا یہ سب سے نازک اور مشکل مرحلہ ہے۔ ہرگز رتا دن تمہیں اس متوازی دنیا کی مزید جہتیں بتا کر جائے گا۔ شرط صرف خود کو سنبھالے رکھنے کی ہے۔ اب تک ہم جس متوازی دنیا کے اسراروں کا صرف

ڈھونگی کو رُباب کے علاج کے لیے بلوا لیا ہے..... میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔“ حاجی رزاق گڑبڑا سے گئے۔ ”آؤ عامر بیٹا..... ان سے ملو..... یہ سلطان بابا ہیں..... میں نے انہیں.....“ عامر غصے سے دھاڑا ”آئی ڈیم کثیر کہ یہ کون سے بابا ہیں..... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟“ حاجی رزاق کی صورت حال کچھ عجیب سی ہو گئی۔ اُن کے داماد نے آتے ہی اُن کے مہمانوں کو ڈھونگی قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں سلطان بابا نے حاجی صاحب کی مشکل آسان کی اور بولے ”کسی کے بچ، یا ڈھونگ کا فیصلہ کرنے کے لیے تم سے بہت کم وقت لیا تو جوان..... ہمیں حاجی صاحب نے نہیں بلایا..... ہم دو دن کے مہمان ہیں..... خود ہی آئے ہیں، کچھ دیر سستا کر آگے بڑھ جائیں گے..... ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ عامر براہ راست سلطان بابا کی بات سن کر کچھ مخمضے میں پڑ گیا، لیکن تب تک حاجی رزاق سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”تم سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی عامر میاں..... کچھ بھی ہو، مگر میں کسی کو بھی اپنے گھر میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں دوں گا۔“ عامر غصے سے پلٹا اور زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ پورا دن سلطان بابا نے حویلی کے محل وقوع اور اندرونی جائزے میں گزار دیا۔ شام کی چائے پر حاجی رزاق کی بیگم اور اُن کی چھوٹی بیٹی نایاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں بیٹیاں شاید ماں ہی کا عکس تھیں۔ نایاب بھی اپنی بہن کی طرح لاکھوں میں ایک تھی، لیکن اس وقت بہن کی پریشانی کی وجہ سے خود بھی کملائی سی تھی، البتہ رُباب سے ہمارا دوبارہ سامنا نہیں ہوا۔ رات کو تنہائی میسر ہوئی تو میں نے سلطان بابا سے استفسار کیا۔ انہوں نے ایک گہری سی سانس لی۔ ”بڑی آزمائش پڑنے والی ہے ساحر میاں..... دعا کرنا کہ خدا ہمیں ثابت قدم رکھے۔“ میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیسی آزمائش..... اس لڑکی کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے.....؟“ سلطان بابا نے اپنی تسبیح گھماتے ہوئے جواب دیا ”شاید تمہیں مولوی خضر نے بتا ہو کہ بظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود، اس دنیا کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی دنیائیں موجود ہیں..... لیکن ہم اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن اور عقل کو عطا کی جانے والی محدود بصارت کی وجہ سے اس متوازی اور بالکل ہماری دنیا کے ساتھ جیتی جاگتی اُس دنیا کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بس، یوں سمجھ لو کہ یہ بھی ایک ایسی ہی متوازی دنیا کے کسی مکین کا ہماری دنیائیں

تذکرہ ہی کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک متوازی دنیا اپنی مخلوق سمیت خود اس گھر میں موجود ہے.....“ جانے سلطان بابا کی اس تنبیہ میں ایسا کیا تھا کہ مجھے خود اپنے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رات دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اب مجھے سمجھ آنے لگا تھا سکندر اور نائلہ سے ملاقات بھی دراصل میری تربیت ہی کا ایک حصہ تھی، لیکن کیسے؟ دفعۃً میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جہماکے ہوئے۔ مولوی خضر نے بہت تفصیل کے ساتھ مجھے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھایا تھا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ موت تو خود زندگی کی تب تک حفاظت کرتی ہے، جب تک اُس کے نزول کا وقت نہیں آ جاتا اور موت زندگی کو خود وہاں کھینچ لاتی ہے، جہاں پر انسان کی آخری سانس لکھی ہوتی ہے۔ مجھے مولوی خضر کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا سنایا ہوا قصہ بھی یاد آیا کہ کیسے جنات خود مرنے والے کی فرمائش پر اُسے ہزاروں میل دور وہاں چھوڑ آئے تھے، جہاں وہ اپنی دانت میں موت سے بھاگ کر جانا چاہتا تھا، لیکن ملک الموت کو اُسی مقام پر اُس کی سانسیں ضبط کرنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک اور بجلی کوندی، تو گویا رحیم پور کی سینٹرل جیل کے اُس پھانسی گھاٹ پر کسی اور کی قضا طے تھی، جس کے لیے قدرت نے سکندر کا اتنا لمبا اسکرپٹ لکھ ڈالا تھا۔ سکندر کی سانسیں تو کب کی گئی جا چکی تھیں۔ اُس کی موت تو بڑی واضح اور طے شدہ تھی، لیکن نائلہ جو اُس پھانسی گھاٹ سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی دیس میں بیٹھی ہوئی تھی، اگر وہ واپس اپنے ملک کو فلائٹ لے کر وہاں نہ پہنچتی اور وقت پر پہلے رحیم پور اور پھر جیل تک نہ پہنچ پاتی تو بظاہر اُس کی موت کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نائلہ کی فلائٹ کیوں مس نہیں ہوئی۔ ٹرین لیٹ کیوں نہیں ہوئی اور وہ اُس برستے طوفان سے چند لمحوں پہلے رحیم پور تک کیسے آ پہنچی تھی، جب کہ اُس کے آنے کے چند لمحوں بعد ہی رحیم پور کا واحد پل بھی برساتی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ وہ پل نائلہ کی ٹیکسی گزرنے سے پہلے کیوں نہیں بہا؟ گویا سب کچھ پہلے ہی طے شدہ تھا۔ نائلہ کو اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے بہانے اُس پھانسی گھاٹ تک پہنچنا ہی تھا، جہاں اُس کی آخری سانس لکھی ہوئی تھی۔ اور اُوپر والے کا اسکرپٹ تو دیکھیے کہ غضب کا تھا، دنیا کو مرنے والی کی موت کا کوئی بہانہ بھی فراہم کرنا تھا قدرت کو۔ لہذا

پہانے کا بھی پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ سکندر کے ہاتھوں خود اُسی کی محبت کے شوہر کو قتل کروا کر اس کی پھانسی کا بندوبست کیا گیا اور پھر انتقام کی آگ میں جلتی نائلہ کو قاتل کے سامنے لا کھڑا کیا، تاکہ پہلے تو وہ اُسے پہچان کر معاف کر دے اور پھر خود بھی اُس کی موت کے جھٹکے کے ساتھ ہی اپنی سانسیں بھی جاں آفریں کے سپرد کر دے۔ اب پتا نہیں رُباب کی اس حویلی میں کچھ پرکون سا بھید اور اسرار کھلنے والا تھا۔ اس متوازی دنیا کی وہ کون سی پرت تھی، جس کا میرے اس کمزور وجود پر انکشاف ہونا تھا۔ میں تو سکندر اور نائلہ کے اس پہلے تجربے ہی سے رُوح کے آخری ریشے تک نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک ہی مجھے لا علمی کے سکون پر رشک اور آگہی کے مذاب سے شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے عام لوگوں کی زندگی ایک نعمت لگنے لگی، لیکن آگہی کا یہ راستہ اور دوسری دنیاؤں کے اسرار و رموز کا یہ راستہ بھی تو میں نے خود ہی چنا تھا۔ کیا اس طرح بیچ راہ میں حوصلہ ہار دینا ٹھیک ہوگا؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک کھٹکے نے چونکا دیا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا اور بارش نہ جانے کس وقت تھم چکی تھی۔ پہلے تو میں اسے واہمہ ہی سمجھا، لیکن پھر دوبارہ ویسی ہی آواز پیدا ہوئی، شاید باہر دالان میں کوئی تھا۔ میرے اور سلطان بابا کے کمرے علیحدہ علیحدہ تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ انہیں بھی جگا دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پچھلی کئی راتوں سے انہوں نے مکمل آرام نہیں کیا، تنہا ہی باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے انیسکی کے شیشے سے بند برآمدے کا دروازہ کھولا تو تیز اور سرد ہوا کے ہچکے جھونکے نے پورے وجود کو جھرجھرا سا دیا۔ اور تبھی وہ گھنٹھر وڈوں کی جھنکار جیسی تیز سرگوشی پہلی مرتبہ واضح طور پر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کان کے بہت قریب اور دھیرے سے کہا ”یا قوط۔“ ہاں..... یہی لفظ تھا۔ سرگوشی کا لب و لہجہ عربی اور انتہائی نستعلیق نہ ہوتا تو شاید میں بھی اُردو والے یا قوت اور اس لفظ یا قوط میں فرق نہ کر پاتا۔ لیکن آخری حرف ”ط“ کی گردان اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا، لیکن وہاں دُور دُور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ البتہ سرگوشی اتنے قریب سے کی گئی تھی کہ مجھے ابھی تک اپنے کان کی لو کسی کی گرم سانس کی حدت سے پھٹکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ابھی اس لمحے کا شکار تھا کہ دفعۃً میری نظر دُور دالان میں چلتے ہوئے کسی سائے پر پڑی۔ ارے..... یہ تو رُباب تھی۔ لیکن اس اندھیری رات اور سناٹے میں وہ اس وقت ننگے سر،

آسیبِ محبت

اس ماہِ رُخ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، لیکن میری ساری توجہ اُس ہستی کی جانب تھی، جس کی طرف دیکھ کر رُباب بات کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیا، سامنے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ مرف پیل کا پیڑ اسی شان سے کھڑا تھا، جس کی اوٹ میں چھپ کر میں نے رُباب کی ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ پھر زور سے چلائی۔ ”میں پوچھتی ہوں کس کی اجازت سے تم یہاں آئے ہو..... چلے جاؤ یہاں سے..... نکل جاؤ میرے گھر سے..... نکل جاؤ۔“ رُباب کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اتنے میں اندر سے اُس کے ماں باپ، بہن اور کچھ نوکر دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دوسری جانب مہمان خانے سے سلطان بابا بھی شور سن کر باہر نکل آئے۔ رُباب تب تک بالکل ہی ٹنڈا ہوا ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ اُسے فوراً اندر منتقل کر دیا گیا۔ سلطان بابا نے مافی صاحب کے اصرار کے باوجود انہیں واپس حویلی بھیج دیا کہ وہ جا کر اپنی بیٹی کی خبر گیری کریں۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں کھڑے کھڑے ساری بات بتادی۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم اُس پیڑ کی جانب دیکھتے رہے، پھر اچانک بلند آواز سے بولے ”میں جانتا ہوں، تمہارا برا ایسے ہے..... اس سے پہلے کہ میں کوئی حتمی قدم اٹھاؤں میں آخری بار تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنے اثر سے آزاد کر دو..... اگر ان لوگوں سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے، یا انجانے میں ان سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو انہیں معاف کر دو..... میں تمہیں تمہارا برا چھوڑنے کو نہیں کہتا، تم چاہو تو خود اکیسے، یا پھر اگر دوسرے ساتھی بھی تمہارے ساتھ ہیں تو ان سمیت ہمیشہ یہیں رہ سکتے ہو، لیکن شرط صرف یہی ہے کہ اب تم ان بھلے لوگوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرو گے..... میں تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں..... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے.....“ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے پلٹے اور مہمان خانے کی جانب چل پڑے۔ لمبا وہیں حیرت کے سمندر میں گنگ کھڑا، اُس بے جان درخت کو دیکھتا رہا کہ وہ اتنی دیر تک کُنا دیدہ ہستی سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تو دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا سایہ تک نظر

بال کھولے کیا کر رہی تھی؟ وہ اس وقت بھی اُسی کالے جوڑے میں ملیں تھی اور اُس کا مہتاب چہرہ اس وقت بھی کسی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں برآمدے کے سامنے راہ داری کے ستون کی اوٹ لے کر اُسے دیکھتا رہا۔ رُباب کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی پیل کے پیڑ کے سامنے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ہیولے کی غیر واضح حرکتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ وہاں کسی سے جو گفتگو تھی۔ میں ستون کی اوٹ سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ مجھے یہاں سے دُھند اور کمر میں لپٹی رُباب کا چہرہ تو واضح نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اُس کی آواز بالکل واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھی۔ ”نہیں..... بہت انتظار کر لیا میں نے..... اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم تو مجھے دیکھ سکو..... جب بھی تمہارا دل چاہے، مجھے اپنی نظر سے نہار سکو..... لیکن میرا من تمہیں دیکھنے کے لیے یونہی ترستا رہے، تڑپتا رہے..... میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہو یا قوط..... میں بھی تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے ترس رہی ہوں..... پل پل مر رہی ہوں..... میرے صبر کو اور مت آزماؤ..... ورنہ اب میں واقعی تم سے رُڈھ جاؤں گی.....“ یہ رُباب کس سے باتیں کر رہی تھی؟ جواب میں کسی نے کچھ کہا، یا نہیں، یہ میں سن نہیں پایا، کیوں کہ اچانک ہی مخالف سمت کی بہت تیز ہوا چل پڑی تھی اور جب ہوا کی لہر رُباب کی اوٹ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کچھ سننے کی کوشش کی، لیکن اب پھر رُباب بول رہی تھی ”نہیں..... اور کتنا چھپو گے مجھ سے..... بس، اب اور نہیں سہا جاتا مجھ سے یہ آنکھ بھولی کا کھیل..... دیکھو..... کبا حالت ہو گئی ہے میری..... میں اتنی سخت جاں نہیں ہوں یا قوط..... میں مر جاؤں گی..... تم کرا مجھ پر.....“ رُباب کی حالت بالکل بھکاریوں جیسی ہو رہی تھی۔ آخر یہ کون سی ہستی تھی، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ پری زادیوں گڑ گڑا رہی تھی۔ اب تو میرے صبر کا پیمانہ بھی لبر لہ ہو چلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے درخت کی آڑ سے نکل کر رُباب کے سامنے آ گیا۔ وہ کھٹکے سے گھبرا کر پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے کی تمام ملامت اور نرمی ایک پل میں غائب ہو گئی۔ وہ نرمی طرح چلا کر بولی: ”تم.....؟ تمہاری ہمت کبے ہوئی اس وقت یہاں آنے کی.....“

کی طرف آئی، لیکن اُس نے ہماری جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر عصر کی نماز بھی ہو گئی۔ سلطان بابا نے سلام پھیر کر میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں..... کیا اب بھی وہ خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟“ میں نے حیرت سے اُن کے انداز کو ٹٹولا۔ آخر انہیں مجھ سے یہ تصدیق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ خوشبو تو اسی طرح چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو جائے نماز اٹھاتے ہوئے بولے ”چلو تصدیق ہو گئی۔ یاد رکھو..... مشورہ کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ حواس خمسہ بھی کبھی کبھار دھوکا دے جاتے ہیں۔“ مطلب یہ کہ یہ خاص خوشبو، جو ہمیں محسوس ہو رہی تھی، اُس کا تعلق اُس نادیدہ ہستی کی موجودگی سے تھا۔ گویا اُس ہستی نے سلطان بابا کی مہلت کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سلطان بابا نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں کسی خاص دعا میں مشغول رہیں گے اور میں اُن کے دروازے کے باہر بیٹھ جاؤں، تب تک کسی کو اس کمرے کے اندر نہ آنے دوں، جب تک وہ خود باہر نہ آجائیں۔ انہوں نے مجھے سختی سے تلقین کی کہ میں نماز بھی وہیں برآمدے ہی میں کمرے کے باہر ادا کروں اور کسی کو بھی انہیں پریشان کرنے سے روکوں۔ میں نے اُن کی ہدایت کے مطابق دروازے ہی پر ڈیرا ڈال لیا اور پھر اس دوران پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نماز کا وقت بھی ہو کر گزر گیا اور پھر رات ڈھلنے لگی۔ میں گزشتہ رات بھی سو پایا تھا، اگرچہ یہ جگہ راتے اب میرے لیے معمول کی بات تھی، لیکن نہ جانے وہ اندھیری رات میری ہڈیوں پر اس قدر بھاری کیوں ثابت ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب تو مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر میں نے مزید اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی تو میری رُوح آنکھوں کی پتلیوں سے ہو کر باہر نکل جائے گی۔ جانے کتنی بار میرا سر ڈھلکا اور کتنی بار میں اپنی جھونک میں لڑکھڑا کر پھر سے سنبھل کر بیٹھا۔ ایسی ہی جان لیوا غنودگی کا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اچانک کسی نے شیشے والے برآمدے کا دروازہ کچھ اس زور سے دھڑ دھڑایا کہ کمزوری چٹختی علیحدہ ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دھماکے سے جا کھلے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پتوں بچ دی حسن بے حجاب اپنی آنکھوں میں خون اُتارے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ رُباب کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا اور بال کھلے ہوئے۔ ہم دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، پھر اُس کی سرسراتی سی آواز ابھری ”وہ کہاں

نہیں آ رہا تھا۔ جب میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے کمرے میں ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ شاید ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بڑی یاد آیا کہ ٹھیک یہی خوشبو مجھے تب بھی محسوس ہوئی تھی جب میں نے سلطان بابا کے ہمراہ پہاڑ مرتبہ اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے خشمگین نگاہوں سے میری جانب دیکھا ”لڑکے..... اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو، بعض مرتبہ ہلکی سی چوک کا بھی بہت بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہاں! یہ وہی خوشبو ہے اور تم۔ شاید غور نہیں کیا کہ یہ خوشبو اُس وقت پتیل کے اُس پیڑ سے بھی ابھر رہی تھی، جب وہ لڑکے وہاں موجود تھی اور جب میں اُس سے باتیں کر رہا تھا، لیکن تمہارے حواس کو منظر نے منتشر کر رکھا۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، وہاں سارا کھیل ہی حیات کا ہے۔ حیات پر عبور حاصل کر گے تب ہی وجدان تک پہنچو گے.....“ میری تربیت کے دوران یہ پہلی سرزنش تھی جو سلطان بابا نے مجھے کی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے اتنی بڑی بڑی توقعات کیوں وابستہ کر لی تھیں؟ میں تو ایک بہت معمولی سا انسان تھا، جس کا چند دن پہلے تک مذہب سے دُور دُور تک کوئی واسطہ، رابطہ ہی نہ تھا۔ اور پھر ماضی کی کیا بات کروں؟ تو حال کے ان دنوں میں بھی اکثر کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ تک کہنا بھول جاتا تھا۔ اُس سلطان بابا میرے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتے اور وہ زور سے بسم اللہ نہ پڑھتے تو؟ سے ایسی روزمرہ کی نیکی بھی چھوٹ جاتی تھی۔ تو پھر جب میرے نسیان کی یہ حالت تھی تو ایسے میں عبداللہ، مولوی خضر اور سلطان بابا جیسی بڑی ہستیاں مجھ سے کسی غیر معمولی برتاؤ کی اُم کیوں لگائے بیٹھے تھے؟ میں اپنی سوچوں میں گم، بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کہتے ہیں: سب سے بڑی چور ہوتی ہے۔ وہ انسان کی آدمی عمر چرائیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ؟ سے یہ چورنی بھی رُوخی ہوئی تھی۔ میں یونہی کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کس وقت سلطان نے فجر کی نماز کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ سلطان بابا نے اُس نادیدہ ہستی جس وقت بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی، اُس وقت رات کے تقریباً ساڑھے تین بجنے کو کٹھن مطلب یہ کہ آج سہ پہر تک وہ مہلت ختم ہو جانی تھی لیکن دن تیزی سے ڈھلنے کے باوجود اُن تک کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ رُباب ایک آدھ بار دالال

ہے اس کی.....؟ اس کے حال پر رحم کرو..... بخش دو اسے.....“ رُباب نے جھلاہٹ میں جلدی سے مزید چند لائنیں صفے پر گھسیٹیں اور پھر کاغذ سلطان بابا کو تھما دیا۔ لکھا تھا ”میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں..... آپ ہمارے درمیان نہ آئیں..... میں آپ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا.....“ اس بار سلطان بابا کی آواز میں ایسی سختی تھی، جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ”یہ محبت نہیں سحر ہے..... تم ناری ہو اور یہ خاکی ہے..... اس کی زوجہ پر قابض ہو کر اسے اپنے بس میں کرنے کو تم محبت کہتے ہو..... تمہیں تو اس کی زبان بولنے کے لیے بھی خود کو اس کے قلب پر طاری کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو، میں نے اب تک حتی الامکان سختی سے گریز کیا ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں آخری حد تک بڑھ جاؤں۔“ تحریری جواب آیا۔ ”میں آپ کی حد جانتا ہوں، اس لیے لپکتی ہوں کہ مجھے میری حد تک نہ دھکیلیں..... ہاری اور خاکی کا سوال تو ب اٹھتا، جب بات جسم کے ملاپ کی ہوتی، یہ رُوح سے رُوح کے ملن کا مقدمہ ہے..... آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بولی، یہ لفظ بھی میرے نہیں ہیں، لیکن لفظ تو بس رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی دنیا سے رابطے کے لیے یہ ذریعہ بھی اپنانا پڑا تو میں اپنا لوں گا۔ آپ جو شرط بھی لگائیں گے مجھے قبول ہوگی، بس مجھے یہاں سے بے دخل نہ کریں..... مجھے یہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں۔ میری ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی.....“ اس مرتبہ سلطان بابا باقاعدہ گرجے۔ ”بس..... بہت ہو گیا۔ یہ فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس لڑکی کی رُوح پر سے اپنا قبضہ اٹھانا ہوگا، ورنہ.....“ لیکن سلطان بابا کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رُباب وہاں سے اُٹھ کر واپس چل دی۔

میں نے سائنس کی اصطلاح میں پینائٹم کے بارے میں پڑھ ضرور رکھا تھا، لیکن اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اس پینائٹم کے زیر اثر دیکھا تھا۔ اگر یہ سارا عمل میری آنکھوں کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو میں ضرور اسے کسی ایسے ہی ٹرانس کا کرشمہ سمجھتا، لیکن سائنس کی اب تک کی مد انسانی ذہن کی مقرر کردہ ہے، جب کہ عبد اللہ کا لقب پانے کے بعد جس متوازی دنیا کا میں مسافر بنے جا رہا تھا، اس کی سرحد ہی شاید وہاں سے شروع ہوتی تھی، جہاں آ کر سائنس کی حدیں دم توڑ دیتی تھیں۔ یہ کیسا عجیب واقعہ تھا، جو میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر تھا۔ آسیب کے قصے تو میں بھی بچپن ہی سے سنتا آیا تھا اور بچپن میں تو ہم باقاعدہ ایک دوسرے کو

ہیں.....؟“ غالباً اُس کا اشارہ سلطان بابا کی جانب تھا۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا ”وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔ مجھے یہی حکم ہے۔“ اس بار وہ باقاعدہ غرائی ”کیوں نہیں مل سکتے۔ بلایا ہے تو ملنا بھی پڑے گا۔“ اُس نے قدم آگے بڑھائے اور میں باقاعدہ دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی راہ میں مزاحم کھڑا دیکھ کر اُس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ”ہٹ جاؤ میرے راستے سے، ورنہ.....“ ابھی اس کی بات آدھی منہ میں تھی کہ اندر کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی پشت سے سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ”اسے اندر آنے دو عبد اللہ میاں..... ہم اسی کا انتظار کر رہے تھے۔“ میں اُلجھن آمیز حیرت لیے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ شتاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ وہ سلطان بابا کے بالکل سامنے جا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”آپ ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا، جب کہ وہاں وہ فرد واحد تھی۔ سلطان بابا نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”میں نے پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ بارہ گھنٹے کی مہلت کے بعد مزید مہلت نہیں ملے گی۔ تم میرا سامنا کرنے سے کیوں کتراتے ہو۔ اس معصوم کا سہارا کیوں لے رہے ہو.....؟“ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان یہ کس قسم کی گفتگو جاری تھی۔ یہ سوال کس سے کیے جا رہے تھے اور جواب کون دے رہا تھا۔ رُباب نے بے بسی سے سر پٹا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے وسط میں پڑی چھوٹی سی تپائی کے نچلے حصے میں ایک قلم اور کاپی رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اٹھا لیں اور جلدی سے چند حرف گھسیٹ کر کاغذ پھاڑا اور سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ بابا نے غالباً مجھے سنانے کے لیے بلند آواز میں تحریر پڑھی۔ ”میں آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتا، نہ ہی میں رُباب کے نازک اور کومل وجود پر طاری ہو کر اُسے اذیت دے کر آپ سے دو بدو بات کرنا چاہتا ہوں، آپ کو سلیمان علیہ السلام کا واسطہ..... آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔“ سلطان بابا نے کاغذ ایک جانب رکھا۔ ”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو..... تم نے اب تک اسے، یا اس کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہی تمہاری شرافت کی دلیل ہے..... لیکن تمہارا سحر بھی اس بنت آدم کے کومل وجود پر بے حد گراں ہے۔ دیکھتے نہیں، کیا حالت ہو گئی

پتھر کو لٹگو کو لے کر آیا ہوں۔ یہ سیدھا سادہ ہسٹریا کا کیس ہے۔ آپ اس میں کچھ نہیں کر سکتے، لہذا دخل اندازی نہ کریں تو بہتر ہوگا۔“ رُباب خشکیوں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ نفسیات کے پروفیسر نے اپنی عینک درست کی۔ ”جی جی..... بالکل..... دراصل بچی کے اشہور میں بچپن کا کوئی خوف دوبارہ گیا ہے، جو اس گھر میں آکر پھر سے اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کے دل سے یہ ڈر نکالنا ہوگا۔“ سینئر ڈاکٹر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہسٹریا کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں، لیکن ان سب کا علاج ممکن ہے۔ بس ہمیں مریض کے آرام.....“ لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رُباب زور سے چلائی۔ ”چلے جاؤ..... نکل جاؤ تم سب یہاں سے.....“ حاجی وزاق اور ان کی بیگم لاچار سے کھڑے یہ مارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان بابا نے سکون سے ڈاکٹروں کی ساری بات سنی اور پھر دھڑکے سے بولے۔ ”آپ کا مریض آپ کے سامنے ہے۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں، اس کی دعا کر سکتے ہیں۔ مجھے بس اس کے لیے دعا کرنے دیں..... کیا مجھے دعا کی اجازت بھی نہیں دیں گے آپ لوگ؟“ سلطان بابا کی بات نے وقتی طور پر انہیں لا جواب کر دیا اور ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بکس کھولے اور انجکشن وغیرہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلطان بابا مجھے لیے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں بہت دیر اُسی پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ سائنس اور روحانیت کا یہ جھگڑا آخر کب تک چلے گا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ دنیا میں سائنس پہلے وارد ہوئی تھی، یا روحانیت۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں علم اپنے اندر ہر سوال کے جواب کی وسعت رکھتے تھے۔ اگر میں نے رُباب کو رات کو اس سوپ میں نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی ان ڈاکٹرز کی بات پر یقین کرنے میں کچھ تامل نہ ہوتا، لیکن سائنس تو صرف جسم کے زخموں کو مندل کرنا جانتی ہے..... اور اگر کسی کی روح گھائل ہو تو وہ کہاں جائے.....؟ ہماری زندگی میں دعا کی کیا اہمیت ہے؟ دعا کو عبادت کا مغر کیوں کہا گیا ہے؟ معجزہ کسے کہتے ہیں؟ معجزات اور دعاؤں کا آپس میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ دفعۃً مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جس متوازی دنیا کے اہلکار جاننے کے لیے میں گھر سے نکلا تھا، اس دنیا کے زخموں کی پہلی سائنس ہی ”دعا“ تھی۔ اور اس دنیا کی باری اور روگ سحر اور جادو تھا۔ میرے ذہن میں ایک اور عجیب بات بھی آئی کہ جب سائنس

”اُلٹے پیروں والی چڑیلوں“ کے قصے سنا کر ڈرایا بھی کرتے تھے۔ شاید رات اور اندھیرے کے خوف سے جو ایک براہ راست تعلق ہوتا ہے ایسے قصوں کو جنم دینے میں اُس کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن یہاں تو آسیب، ایک گل رُخ کی محبت میں نہ صرف خود گرفتار تھا، بلکہ اُسے اس دل رُبا کے محبوب ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ کیا واقعی جن و انس کے درمیان ایسی کسی محبت کا گمان بھی پایا جاسکتا ہے؟ مجھے ایک مرتبہ پھر سے ”محبت“ نامی اس عفریت کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہوا۔ یا قوط نامی یہ نادیدہ ہستی، جو عام حالات میں شاید اپنی ایک پھونک سے اس پوری حویلی کو تہس نہس کر سکتی تھی، جو شر اور بگاڑ پیدا کرنے پر آجاتی تو شاید اُسے روکنا بھی ہم کمزور انسانوں کے بس میں نہ ہوتا، لیکن ایک نازک سی لڑکی نے اُسے اس قدر مجبور و بے بس کر ڈالا تھا کہ وہ خود سوالی بن کر ہم انسانوں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یا قوط نے سلطان بابا کی تنبیہ کا اثر نہیں لیا تھا۔ خود سلطان بابا کے ذہن میں بھی یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگی کہ زیادہ سختی لڑکی کے لیے کسی مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اس حویلی نے اب تک یا قوط کا ایک ہی رُخ دیکھا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر بیک وقت صحرا اور ساون ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے اندر کا ساون ہمارے ارد گرد موجود کسی ایک آدھ خوش نصیب کے اوپر ہی برستا ہے، باقی اپنے تو ساری عمر ہمارے اندر کے صحرا کی تپش ہی جھیلے رہتے ہیں۔ یا قوط کے اندر کا ساون بھی صرف رُباب کی حد تک ہی تھا اور دھلتی ہوئی جھگی رات مجھے ہر پل یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں اس کے صحرا کی پیاس ہمارے حلق میں کانٹے چھو جائے گی۔

فجر کی نماز پڑھتے ہی سلطان بابا نے چند پڑھی ہوئی مینیں اٹھائیں اور میرے ہاتھوں انہیں ٹھیک پیپل کی جڑوں کے قریب گاڑ دیا۔ اور شاید ٹھیک اسی وقت رُباب کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ سورج نکلنے تک اُس کی وحشت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اُسے قابو میں رکھنے کے لیے اُس کی ماں اور بہن کو باقاعدہ جکڑنا پڑ رہا تھا۔ شاید گھر کے کسی نوکر نے عامر کو بھی خبر کر دی تھی اور صبح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے سینئر ڈاکٹر اور نفسیات کے ایک پروفیسر کے ساتھ حویلی آ پہنچا۔ ہمیں اپنی مگتیر کے پاس دیکھ کر اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ ”آپ لوگ ابھی تک یہی ہیں۔ پلیز آپ لوگوں کو جو چاہیے۔ وہ لے کر یہاں سے چلتے بنیے۔ میں اپنے

احساس کیوں ہوا کہ کبھی کبھی یہ دنیا بُری وجہ سے اتنی بُری جگہ نہیں بنتی، جتنا بُرا اسے ہم چہے "اچھے" بنا دیتے ہیں۔ رُباب کی اس بے کل نظر کے بعد میں خود بھی سارا دن بہت بے چین سا پھرتا رہا۔ سلطان بابا اپنے وظیفے میں مشغول تھے، لہذا اُن سے اپنی یہ بے کلی بانٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

شام کو پھر وہی ڈاکٹروں کی ٹیم آئی اور پھر سے وہی سارا سلسلہ دوبارہ دہرایا گیا۔ جب وہ لوگ حویلی کے پورچ سے نکل رہے تھے، تب میں وہیں دالان ہی میں موجود تھا۔ سینئر ڈاکٹر، عامر سے کچھ بات کر رہا تھا کہ "آج کل ڈائی پولر تھیوری آف گرے وٹیشن (Dipolar Theory Gravitation) کا بہت چرچا ہے۔ عامر تم انٹرنیٹ پر ضرور اس صفحے کی تفصیلات پڑھنا۔ انسان کا لاشعور اس سے کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور بھی مغرب تو یہ بات ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ ہم بذات خود ایک واہمہ ہیں، ایک حقیقی دنیا کا سا تو اس عکس ہیں۔ ایسے میں اگر رُباب کسی متوازی دنیا کے خواب کو حقیقت سمجھ بیٹھی ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ بس ایک ذرا سا سراسر مل جائے اس گتھی کا، ہم یہ کیس ضرور حل کر لیں گے۔ یوجسٹ ڈونٹ وری ڈنیر، یہ صرف اور صرف خواب در خواب کی بیماری ہے۔ ہمیں اب سے پہلے رُباب کو اُس کے آخری خواب سے باہر لانا ہوگا۔ پھر آخر سے پہلا اور پھر دوسرا۔ دراصل وہ خواب میں بھی خواب دیکھ رہی ہے۔ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں..... لیکن یاد رہے..... بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی اور ہم نے رُباب کے خواب در خواب کے تسلسل کو اسی طرح سے توڑا کہ ہم نے اُس کے آخری خواب سے پہلے کے کسی خواب کو راستے میں چھیڑ دیا تو پھر ہمارے ہاتھوں سے اس بھول کھلیاں کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا۔ اور رُباب یونہی ساری عمر کے لیے بھٹکتی رہ جائے گی....." وہ سارے کافی دیر تک وہیں سر جوڑے رُباب کی بیماری پر بحث کرتے رہے۔ تو گویا نفسیات کی اصطلاح میں رُباب پیاز کی تہوں کی طرح تخیل کے جال میں پھنس گئی ہے اور اب اُسے اس خوابوں کی دنیا سے نکالنے کے لیے پیاز کی آخری تہ سب سے پہلے کھولنی ہوگی اور پھر زنجب دار اُسے اس تخیل کے جال سے نکالنا ہوگا۔ اور اس سارے عمل میں اگر کہیں غلطی سے کئی کوئی غلط تہ کھل گئی تو رُباب ہمیشہ کے لیے اپنے اُسی خواب کی تہ کی قیدی بن جائے گی۔

نہیں تھی، تب ایسے رنگوں کی دوا کیا ہوتی ہوگی؟ میرے خیالوں کا تسلسل اندر سے بلند ہوتی رُباب کی چیخوں نے توڑ دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا جانے کب کے مہمان خانے کی طرف جا چکے تھے۔ رُباب کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے میں نے اُسے ڈاکٹروں کے نرنے میں درد اور بے چینی سے ترپتے ہوئے، زور لگا کر چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اور کرب سے چلا تے ہوئے دیکھا۔ سلطان بابا نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ انہوں نے پیپل کے پیڑ کے گرد یا قوط کے لیے آخری بندش لگا دی ہے اور اب اگلے چند گھنٹے نہایت سخت گزریں گے، کیوں کہ اب وہ نادیدہ ہستی بے ٹھکانہ ہو چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اب کھلی جنگ کا طبل بج چکا تھا اور سلطان بابا کی پیش قدمی کے بعد اب ہمیں یا قوط کی جوانی کا رروائی کا منتظر رہنا چاہیے تھا۔ لیکن رُباب اتنی بے چین کیوں تھی؟ کیا یہ کرب اور تکلیف واقعی ایک محبوبہ پر لگائی گئی پابندیوں کا نتیجہ تھا، یا پھر سینئر ڈاکٹر کے بقول، یہ اُسی ہسٹریا اور خوف کی کیفیت تھی جو رُباب کے لاشعور میں بہت پہلے سے کہیں چھپا بیٹھا تھا اور روپ بدل بدل کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم اُس نازک سی لڑکی کو بے قرار سا ترپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر کافی فاصلے پر، لیکن بالکل سیدھ میں پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ جانے اُس ایک نظر میں کیا کچھ تھا، بے بسی، لا چاری، غصہ، رحم کی فریاد، شکایت اور گلہ۔ مجھے یوں لگا کہ وہ نظر صرف نظر نہیں، کسی گھائل کی آخری آہ ہے۔ جو زہر میں بجھے ایک تیر کی طرح عین میرے دل کے وسط میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔ میں گھبرا کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا، لیکن اس کے بعد پورا دن ایک عجیب سی بے چینی میرے سارے رگ و پے میں دوڑتی رہی۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے اس بد نصیب کے لیے رحم کی اپیل کر دوں۔ آخر ہمیں کیا حق حاصل تھا، کسی کے خوابوں کی سلطنت کو بول تخت و تاراج کرنے کا۔ اگر یا قوط نامی کوئی ہیولا رُباب کے خوابوں کا مرکز بن چکا تھا اور چاہے وہ صرف ایک سپنا ہی تھا اور رُباب کے انتہائی طاقت ور تخیل نے اس خواب کو اُس کے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں لا کھڑا کیا تھا، تب بھی ہم کون ہوتے ہیں کسی کے خوابوں پر ڈاک ڈالنے والے؟ اور پھر اُس کا سنگیتر اور باقی ڈاکٹر اپنی سی کوشش تو کر ہی رہے تھے، کم از کم ہمیں اُس لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایک بات کا شدت سے

ٹا۔ گھاس پر جی شبنم کے قطرے کسی تیز برچی کی نوک کی طرح میرے تلوؤں میں پیوست ہو کر میرے وجود کو چھیدتے ہوئے میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ خوشبو مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے..... جگاتا ہوا جادو آئے
تجھ کو چھو لوں تو پھر اے جان تمنا
مجھ کو دیر تک اپنے بدن سے تیری خوشبو آئے

پہل کے پیڑ کی جانب سے ایک آہٹ بلند ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا، کسی کا نازک وجود
نہا میں پھیلی دُھند اور کہرے پر تیرتا ہوا سا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری
بصارت کو اپنی دو آنکھوں میں سمو کر کہرے کی اس سفید چادر کو چیرنے کی کوشش کی۔ سیاہ لباس
میں ملبوس اس نازنین کا آنچل ڈھلکا اور میرے وجود میں روشنی کے کئی مینار پھوٹ پڑے۔
برے سامنے زہرا بے نقاب کھڑی تھی۔ ہاں..... وہی..... میری اپنی..... زہرا۔

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں خود بھی تو کسی ایسے ہی خوابوں کے
جالے میں پھنسا وقت کا شکار تو نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی تو ایسے ہی منظر دکھائی دیتے رہتے
ہیں۔ میرے ذہن میں بھی چند لمحوں کے بعد مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں، کہیں درگاہ
میں داخلے کے وقت سے لے کر اب تک میں خود بھی کسی خواب در خواب سلسلے کا شکار تو نہیں
ہوتا گیا تھا؟ یا خدا..... یہ کیسے بھید، کیسے راز تھے؟ میں اسی الجھن کے تانے بانے بننا اور
اُدھیرتا رہا۔ جانے کب رات ڈھلی اور کب حویلی میں سناٹے نے اپنا راج پھیلایا، مجھے اندازہ
ہی نہیں ہوا۔ سلطان بابا تو ویسے بھی عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور
جاتے وقت وہ خاص طور پر مجھے تاکید کر کے گئے تھے کہ انہوں نے یا قوط کے غیر مرئی وجود کے
لیے پوری حویلی ہی کو بندش لگا کر جائے ممنوعہ میں تبدیل تو کر دیا ہے، لیکن وہ اتنی آسانی سے
ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں ہے، لہذا اُسے جہاں سے بھی ایک ذرا سی بھی درز، یا کوئی
ایسی جھری ملی کہ جس سے وہ پھر سے خود کو اس ماحول میں تحلیل کر سکے تو وہ ایک لمحے کی تاخیر
کے بنا، اپنی پوری طاقت سے اس موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے میں اگر
ذرا سی بھی کوئی خلاف معمول حرکت، یا بات محسوس کروں تو فوراً نہیں مطلع کر دوں۔ میں اسی
فکر میں اپنے ذہن کے ریٹے اُدھیرتا رہا اور رات بھگتی گئی۔ شاید ساڑھے تین کے آس پاس کا
کوئی وقت ہوگا کہ اچانک ہی میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ وہی
مخصوص سی خوشبو مجھے اپنے اطراف تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹک کر خود کو یہ
یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا وہم ہے۔ سلطان بابا نے پوری حویلی کے گرد ایک غیر مرئی
آہنی دیوار اٹھا رکھی تھی، جس میں کوئی چھید، کوئی نقب لگانا ناممکن تھا تو پھر یہ خوشبو کیسی.....؟
اچانک باہر دالان میں کوئی کھٹکا سا ہوا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ آواز پہل کے پیڑ کی جانب
ہی سے آئی تھی۔ میں نے چند لمحے سلطان بابا کے کمرے کی جانب سے کسی حرکت کی توقع میں
انتظار کیا، لیکن اسی اثناء میں دوسرا کھٹکا ہوا اور میرے قدم میکا کی انداز میں باہر کی جانب اُٹھ
گئے۔ میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا تو سرد بھگی ہوا کے ایک جھوٹے نے میری سوئی ہوئی
روح تک کو پہلی سلامی دے کر چگا دیا۔ باہر دالان میں بھی وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی
مہک کی شدت اندر برآمدے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جلدی سے ننگے پاؤں ہی باہر نکل آ

صلیب عشق

جاتا ہے اور جس کے بعد اپنی پہلے گزری اور بعد میں بسر ہونے والی ساری زندگی صرف اور صرف وقت کا ضیاع ہی لگتی ہے۔ وہ لمحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر تک یونہی پپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرا تمام حافظہ میرے ذہن کی سیٹ سے مٹ سا گیا ہے۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے کچھ دیر قبل وہ کھڑی ہو گئی۔ ”اب میں چلتی ہوں..... کل پھر اسی وقت یہیں ملاقات ہوگی لیکن دھیان رہے..... میرے یہاں آنے کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے..... ورنہ میرا یہاں آنا مشکل ہو جائے گا.....“ میری زبان سلب ہی رہی اور وہ دھیرے دھیرے دھند کی چادر میں بہتی ہوئی اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میرا جسم پپ رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آکر اپنے بستر پر گر گیا۔ اور صبح جب میں فجر کی نماز قضا ہو جانے کے باوجود سلطان بابا کے کمرے میں نہیں گیا تو روشنی ہونے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور میرا جسم چھوتے ہی انہیں میرے شدید بخار کا پتا چل گیا۔ حاجی رزاق تو بالکل ہی بوکھلا گئے اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اپنے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیوں کی سرد لہر محسوس کرتا رہا جو شاید حاجی رزاق کا نوکر وقفے وقفے سے میرے ماتھے پر رکھ رہا تھا۔ عصر تک میری جان میں کچھ جان آئی۔ آنکھیں کھولیں تو سلطان بابا کو اپنے سرہانے متشکر سا بیٹھا دیکھ کر میں نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ ”لیٹے رہو میاں..... یہ بخار اچانک کہاں سے پال لیا.....؟“ میں نے انہیں رات کا واقعہ بتانے کی کوشش کی لیکن میرے لفظ کھو سے گئے تھے۔ شدید جھکنا اور نقاہت کے مارے میرے منہ سے صرف ”ہوں، آں“ کے علاوہ کچھ نہیں نکل پایا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں کمرے میں ٹھن محسوس کر رہا ہوں، لہذا مجھے باہر کھلی فضا میں لے جائیں۔ باہر شام کی ٹھنڈی ہوائ نے میرے حواس کافی حد تک بحال کر دیے۔ باہر اس وقت سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور خلاف معمول تھی۔ آج رُباب بالکل پُر سکون دکھائی دے رہی تھی۔ میری کرسی والا ان میں جہاں ڈالی گئی تھی وہاں سے میں عامر اور اُس کے ڈاکٹروں کی ٹیم کو اپنی پہلی کامیابی پر خوشی مناتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ عامر اپنے سر کو یقین دلا رہا تھا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ خاص نفسیات کا مسئلہ ہے۔ آپ نے دیکھا، ڈاکٹر ڈاکر کے کل کے پہلے ہی ڈوز نے کتنا اثر ڈالا ہے اور آج رُباب کس قدر پُر سکون ہے.....؟“ آپ خواہ مخواہ

ہاں وہ زہرا ہی تھی اور وہی اُس کا رُوح کے اندر تک جذب ہو جانے والا حسن تھا لیکن وہ یہاں سیکڑوں میل دُور، رات کے اس سنائے میں کیا کر رہی تھی۔ وہ مجھے یونہی ایک ٹک بکچھ رہی۔ دفعۃً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا وجود ایک پل میں ہی کئی من بھاری ہو گیا ہے۔ میرے کاندھوں میں اس اچانک بوجھ کی وجہ سے شدید درد اٹھا لیکن شاید میں زہرا کو اپنے سامنے پار یہ سب بھول ہی گیا۔ میں لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ ”آپ یہاں.....؟ اس وقت..... لیکن کیسے.....؟“ زہرا اپنی مخصوص سی دھیمی مسکراہٹ اپنے کول ہونٹوں میں دبا کر بولی ”کیوں..... میں یہاں نہیں آ سکتی.....؟ کیا سبھی کرامات صرف آپ کے لیے ہی مخصوص ہیں.....؟“ میں لا جواب سا ہو گیا لیکن میری آنکھیں فردوس تر ہوتی گئی..... ”لیکن پھر بھی..... میرا مطلب ہے.....؟“ اُس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بس اور کچھ نہ کہو..... جانے تنہا صدیوں سے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میری یہ پیاسی آنکھیں، خشک اور خنجر پڑی ہیں۔ خاموش رہو اور میرے من پر اپنی شبیہ کا ساون برسنے دو.....“ میں نے چونک کر زہرا کو دیکھا۔ اُس نے آج تک کبھی مجھے ”تم“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اُس کی محویت اور بے خودی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم پتیل کے پیڑ کی اوٹ میں آسنے سامنے بٹہ گئے۔ جو لوگ زندگی میں اس صلیب عشق پر اپنا وجود وار چکے ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ خاموشی اور تنہائی کے ایسے چند لمحے جب ہونٹ خاموش ہوتے ہیں اور صرف سانس بولتی ہیں۔ یہ لمحے سات جنم میں بھی صرف ایک آدھ بار ہی کسی نصیب والے کا مقدر بنتے ہیں۔ لیکن کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری رُوح اُن سے کبھی سیراب نہیں ہوتی، جن سے ہمارا آنکھیں کبھی نہیں ٹھکتیں۔ جن کو نہارنے کے دوران ہمیں اپنی پلکیں موندھنے کا وقفہ بھی صدیوں جیسا لمبا اور اذیت ناک لگتا ہے کہ جس مقام پر پہنچ کر ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد حاصل ہو

ہی دوسوں میں پڑے ہوئے تھے، دنیا کی ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج سانس کے پاس نہ ہو۔“ حاجی رزاق کے چہرے پر بھی اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے رُباب دالان کی طرف نکل تو میری نظر دُور سے اُس کے شانت وجود پر پڑی۔ اچانک وہ پلٹی اور اُس کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی گز دُور ہونے کے باوجود اُس کی وہ دو بڑی بڑی کالی اور سلگتی ہوئی آنکھیں بالکل میری گھائل آنکھوں کی پلک سے پلک جوڑے مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ چند لمحوں کے بعد لہجے میں یونہی دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر اندر چلی گئی۔ اور میرا جسم پھر سے اُسی بے پناہ بوجھ تلے دبتا گیا لیکن میں پھر چاہ کر بھی سلطان بابا کو کچھ نہیں بتا پایا۔ وہ میری بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کافی پریشان تھے اور میں اُن کے چہرے پر مستقل ایک بے چینی اور تفکر کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ جب بھی میری اُن سے نظر ملتی وہ مجھے میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈتے سے ہوئے نظر آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ ہی دیر بعد اُن کی کھوجتی نظر سے کچھ خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لہذا مغرب کے قریب میں سرد ہوا کا بہانہ کر کے وہاں سے ندر اپنے کمرے میں اُٹھ آیا۔ میرا رُواں رُواں اس وقت آدمی رات کا وقت جلد از جلد ہونے کے انتظار میں جلا جا رہا تھا لیکن یہ ستم گر وقت تھا کہ لمحوں کو صدیوں میں تبدیل کر کے کٹا رہا۔ وپر سے سلطان بابا کی وہ کڑکٹی نظر، جو مجھے اپنے وجود کے اندر گڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ندا خدا کر کے عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے سکون کی سانس لی لیکن وقت ٹالنے کا جان لیوا مرحلہ اب بھی ویسے ہی درپیش تھا۔ میں دھیرے سے اُٹھ کر آمدے میں آکر بیٹھ گیا اور اپنی نظروں میں سات جنموں کا انتظار لے کر اُس جانب دیکھنے لگا وہاں سے کل رات زہرا آئی تھی اور پھر وہی گھڑی کی ٹک ٹک اور وہی میری پلکوں کی دویاں..... شاید میری قضا سے کچھ لمحوں پہلے وہی آہٹ ابھری اور میں یوں لپک کر باہر نکلا کہ میسے شدید پیاس میں دم توڑنے والے کسی زخمی کے لب پانی کے آخری بچے ہوئے قطرے کے لیے کھلتے ہیں۔ باہر وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں تیز قدموں سے پھیل کے بیڑ کے عقب میں بچ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں میری ساعتوں کو نئی زندگی بخشنے والی قدموں کی وہ چاپ ابھری جو بیشہ ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو اُتھل پھل کر دیتی تھی۔ زہرا اُسی جانب لے چلتی ہوئی آئی۔ راکر میرے مقابل کھڑی ہو گئی اور گزشتہ رات ہی کی طرح میں پھر سے وہ سارے سوال

بول کر مہبوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ جتنی مرتبہ زہرا میرے سامنے آئی تھی، چاہے درگاہ میں، یا چاہے کہیں اور..... ہر بار میری یہی حالت ہوئی تھی۔ اُس کے یا قوتی لب ہلے اور میرے کان میں جیسے پھر سے وہی انجان سرگوشی سی ہوئی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی ”یا قوت..... تم آگئے..... کتنا انتظار کرواتے ہو.....“ میں چونکا لیکن اُس کی وہ جان فزا مسکراہٹ مجھے کب کچھ سوچنے دیتی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر میرے اور قریب آگئی اور اُس کی مہکتی ہوئی سانسیں میری شہ رگ کو چھو کر میری رگ جان میں ایک نئی زندگی بھر گئیں۔ جانے لوگوں نے زندگی کو صرف سانس لینے سے کیوں متصل کر رکھا ہے۔ زندگی تو کچھ اور شے ہے۔ سانس لینے اور جینے سے بہت بڑھ کر، بہت سوا ہے، جیسے زہرا کے میرے قریب آنے کا وہ لمحہ۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں زندگی کی وہ لہر اپنی رُوح میں سینپتا، ایک چٹکھاڑتی ہوئی دھاڑ بنائی دی ”عبداللہ.....“ میں گھبرا کر پلٹا اور سلطان بابا کو اپنے پیچھے غصے میں تھناتے ہوئے آتے دیکھا۔ زہرا نے ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”یہ شخص ہمیں جدا کرنے آ رہا ہے یا قوت..... مجھے اس سے بچا لو..... بچا لو مجھے۔“ میں نے بھی زہرا کو بچانے کی خاطر خود کو اُس کی ڈھال بنا لیا۔ سلطان بابا کی آنکھوں سے غصے کے مارے چنگاڑیاں سی نکل رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آئے اور بنا کچھ کہے اُن کا ہاتھ اُٹھا اور پوری قوت سے گھوم کر میرے چہرے پر ایک زور دار چانٹے کا نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ تھا، یا کوئی بجلی کا جھٹکا، ایک ہی لمحے میں میرا سر کچھ اس طرح چکرایا کہ مجھے ساری دنیا ہی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میری بند ہوئی آنکھوں نے پلٹ کر زہرا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں رُباب کو کھڑے دیکھ کر میرے رہے سہے حواس نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہی موجود تھا لیکن میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے بیک وقت کسی نے سیکڑوں سویاں پرو دی تھیں۔ سلطان بابا میرے سر ہانے ہی آنکھیں موندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ ہونے پر انہوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ ”اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟“ میں کچھ بول نہیں پایا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ رات کو میں زہرا کے قریب کھڑا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن رُباب وہاں کہاں سے آ پہنچی تھی۔ سلطان بابا نے میری آنکھوں میں ابھرتے

ات کی کھوج میں اپنا سر پیٹ رہی تھی کہ آخر ۲۴ گھنٹے میں ہی ایسی کیا کیا پلٹ ہو گئی کہ سب ٹیچنٹ ہو کر رہ گیا تھا اور رُباب ایک بار پھر سے تھکے سے اکھڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے شام دھلتی گئی میرے اندر بے چینی کی سونیاں پیوست ہوتی گئیں اور مکمل اندھیرا ہونے تک میں خود ابل سے بنا ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔ میرے وجود کا قابض اپنے خونخوار پنجہ میری رُوح میں دھیرے دھیرے گاڑ رہا تھا اور کرب اور بے چینی سے میں اپنا سر ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔ ہاں رُباب کی بھی یہی حالت تھی۔ سلطان بابا دو قدم میرے دروازے میں رُکتے تو اگلے ہی لمحے حاجی صاحب کے بلاوے پر انہیں اندر زنانے کی طرف دوڑ لگانا پڑتی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے وجود کے اندر قطرہ قطرہ کر کے کوئی سیاہ سیال مادہ ٹپکایا جا رہا ہے۔ میرے سرخ خون میں شامل ہو کر میرے وجود کے اندر تاریکی بھر رہا ہے۔ میری سانسیں راہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سب کچھ ہنس نہں کر دوں۔ بری حالت دیکھتے ہوئے سلطان بابا نے نوکروں کو میرے کمرے کا دروازے باہر سے بند کرنے کی ہدایت کر دی۔ کیوں کہ انہیں خود رُباب کی حالت کے پیش نظر زنانے کی طرف توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ آخر کار آدھی رات کے ٹھیک اُس لمحے جب میں گزشتہ رات رُباب سے ملنے کے لیے دالان کی طرف گیا تھا، میری آواز بھی میرے لیے اجنبی ہو چکی تھی۔ مجھے لگا کہ خود میرے اندر سے اس غراہٹ بھری آواز میں کوئی اور بول رہا ہے۔ میں زور سے باہر نکلا۔ ”سلطان بابا.....“ کچھ ہی دیر میں بابا کمرے میں داخل ہوئے تو گھبرائے ہوئے سے انی رُزاق بھی اُن کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے تڑپ کر اُنھنے کی کوشش کی لیکن تب مجھے پتا چلا کہ جانے میری غنودگی کے کس لمحے میں حاجی صاحب کے نوکر سلطان بابا ہی کی ہدایت پر اسے ہاتھ میری پشت پر پٹنگ کی لوہے والی جالی کے ساتھ باندھ چکے ہیں۔ میں نے زور سے خود کو جھٹکایا اور دایا بولا، لیکن وہ لفظ میرے تھے اور نہ ہی وہ لہجہ..... ”آپ اپنی سی ہر کوشش لے کے دیکھ چکے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ چند لمحوں کی یہ عارضی قید مجھے میری راہ سے ہٹا سکے گی؟.....“ میں ہر قید توڑ کر اپنی منزل تک پہنچوں گا۔ اب یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ اب مجھے روک سکیں تو روک لیں.....“

سلطان بابا غصے سے گرجے۔ ”مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ اب یہ کھیل زیادہ عرصہ نہیں چلنے

سوال پڑھ لیے اور گہری سی سانس لے کر بولے۔ ”شکست انسان کا مقدر تب بنتی ہے جب وہ اپنے قلعے کی ہر درز، ہر روشن دان، ہر دروازے پر پہرے بٹھا کر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، بنیاد جانے کہ وہ جن پہرے داروں کو پہرے پر چھوڑ آیا ہے دشمن انہی میں سے اپنا راستہ تلاش کرنے کی دھن میں ہے۔ اُس نے تنہی پر کند ڈال کر میرے قلعے میں نقب لگائی ہے میاں..... بڑی بھول ہو گئی مجھ سے..... سبھی جگہوں پر بندش لگا دی لیکن تمہیں بھلا دیا۔ سچ ہے، انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے.....“ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ اتنے میں باہر سے رُباب کی چیخیں بلند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور پتا چلا کہ اُس کی حالت پھر سے بُری طرح بگڑ چکی ہے۔ سلطان بابا کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ شاید جس وقت میں رُباب کی کھڑکی کے سامنے کھڑا اُسے ڈاکٹروں کے زرخے میں ترپتا ہوا دیکھ رہا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے میرا دل رُباب اور یاقوت کی ماورائی سی محبت کے لیے نرم پڑ رہا تھا شاید اُسی وقت اُس نادیدہ ہستی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے سلطان بابا کے آہنی حصار میں کہاں سے نقب لگانی ہے اور اُسی رات اُس نے میرے وجود پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ رُباب جو جانے کب سے یاقوت کو کسی سانچے، کسی روپ میں دیکھنے کی خواہش میں فنا ہوئی جا رہی تھی اُسے بھی اپنے محبوب کو کسی انسانی صورت میں اپنی آنکھوں سے نہانے کا موقع مل گیا۔ میرے حواس کو اُس زور آور ہستی نے کچھ اس طرح سے جکڑا کہ خود مجھے بھی رُباب نہیں، زہرا ہی دکھائی دی۔ بقول سلطان بابا وہ مجھے وہی کچھ دکھا رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے من میں بنے ٹکس کو ہی اُس نے رُباب کے وجود کے آئینے سے بدل کر رُباب کو زہرا کی صورت میں مجھے دکھایا۔ جس وقت سلطان بابا میرے ساتھ ہوئی اس ”واردات“ کی خبر مجھے سنار ہے تھے اس وقت بھی میرا پورا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ یہ جذبے کیا اتنے طاقت ور بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ہمارے جسم میں، ہماری رگوں میں داخل ہو کر اور ہماری نسلوں میں خون بن کر اس طرح دوڑ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے اندر کی ساری فزیالوجی بدل سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے علاوہ مجھے اپنے بخار کی اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں سلطان بابا سے بھی شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ اُن کی ساری محنت صرف میرے اس کمزور وجود کی وجہ سے مٹی میں مل گئی تھی۔ دوسری طرف باہر دالان میں عامر اور باقی سارے ڈاکٹروں کی ٹیم اس

دوں گا میں.....“ میں زور سے ہنسا۔ ”اچھا.....؟ تو پھر کیا کریں گے..... اپنے اس پیارے شاگرد کو مار ڈالیں گے کیا.....؟ یاد رکھیے، اب میں اس کے جسم سے کہیں نہیں جانے والا..... مجھے اس کے جسم سے نکالنے کے لیے آپ کو اپنے اس عزیز کے جسم نازک کو اتنی اذیت دینا ہو گی کہ اس کی سانسیں ہی بند ہو جائیں۔ صرف اس کا مردہ جسم ہی میرے اخراج کا باعث بن سکتا ہے۔ تو پھر کہیں.....؟ ہے ہمت اپنے شاگرد کو قربان کرنے کی.....؟“ سلطان بابا نے غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کانٹنے اور میں دیوانہ وار قہقہے لگاتے لگاتے درد اور بے چینی سے بے سدھ ہوتا چلا گیا۔ جانے یہ نیند بھی کیسی راحت لکھی ہے قدرت نے ہمارے نصیب میں۔ درد چاہے کتنا ہی شدید اور مار دینے والا کیوں نہ ہو، یہ ایک مہربان ماں کی طرح اپنی گور میں تھپک تھپک کر ہمیں سلا ہی دیتی ہے اور کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہم اپنا ہر غم، ہر دکھ درد بھلا کر کسی معصوم بچے کی طرح اس بے رحم دنیا کی گھاتوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم ساری زندگی ہی یونہی سو کر گزار سکتے تو اپنے دامن پر لگے اُن گنت دانگوں کی کالک سے توجھ جاتے۔ لیکن افسوس ہر اچھی چیز کی طرح یہ کم بخت نیند بھی ہم سے دامن چھڑا ہی لیتی ہے۔ سو مجھ سے بھی وہ بے وفا اپنی آنکھیں چرا گئی اور میری آنکھ کھلی تو کمزوری اور نقاہت سے میری پلکیں اٹھنا بھی میرے لیے دہمچ ہو چکا تھا۔ میرے قریب ہی وہ بزرگ پریشان، میرے ہمد، سلطان بابا چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا کلائیوں میں جلن اور سوزش کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو کتنے جیسے گہرے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے جن میں سے ہلکا ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ سلطان بابا نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”مجھے معاف کر دو ساحر میاں۔ کل رات تمہاری حالت کے پیش نظر میں نے ہی تمہیں باندھنے کا حکم دیا تھا اُن لوگوں کو۔“ میں نے تڑپ کر اُن کے مہربان ہاتھ سختی سے جکڑ لیے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا یہ بوسیدہ جسم اگر آپ کی راہ کی رکاوٹ بن رہا ہے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ اسے جلا کر ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں..... لیکن پھر کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالے گا۔“ اُن کی آنکھیں شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے بھیگی ہوئی دیکھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی میرے وجود پر اُس عفریت کا سایہ قابض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ فجر سے لے کر مغرب سے کچھ پہلے تک میں اپنے آپے میں رہتا تھا اور پھر میرا یہ جسم میرے لیے پرایا ہو جاتا تھا۔ میرے ذہن میں سوال اُبھرا ”تو پھر اس وقت میں خود کہاں

ہوتا ہوں؟ کیا خود اپنے ہی ذہن کے کسی پوشیدہ اور خوابیدہ گوشے میں میرا شعور جا چھپتا ہے اور میں خود بھی خواب کی کیفیت میں چلا جاتا ہوں؟“ مجھے خود سے زیادہ سلطان بابا کی فکر تھی۔ وہ تو رُباب کو اس سائے سے بچانے کے لیے آئے تھے اور یہاں خود اُن کا اپنا شاگرد بھی اُن کے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں خود کو کس طرح سے اُن کی راہ کا پتھر بننے سے روکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے اس وجود کی وجہ سے ہی یا قوط سے شکست کھا رہے تھے کیونکہ میرا جسم اُن کی راہ میں حائل تھا۔ وہ مجھے اذیت نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ اب تک جانے وہ کیا کچھ کر گزرے ہوتے۔ اور یا قوط کو ہرے جسم سے نکالنے کا واحد ذریعہ اب شدید اذیت ہی رہ گیا تھا۔ لیکن میں انہیں اس طرح ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اُن کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں سے مس کیں۔ ”میری ایک بات مانیں گے بابا.....“ انہوں نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اُن کی ہتھیلی پلکوں پر ٹھہرے موتیوں کو دیکھا۔ ”آپ مجھے مار ڈالیں۔ ختم کر دیں مجھے..... اگر یہی ایک ذریعہ ہے اُسے میری روح کے اندر سے نچوڑنے کا۔ تو آج میں اِسی وقت آپ کو اپنا خون معاف کرتا ہوں لیکن دیر نہ کریں۔ آپ کا مقصد نیک ہے اور بلا جھجک اپنا فرض ادا کریں۔“ انہوں نے میرا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں..... تم میرے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہوں لیکن بات صرف فتح اور شکست کی نہیں ہے۔ کچھ جنگیں صرف فتح پانے کی غرض سے نہیں لڑی جاتیں۔ اوروں کا بھی بہت کچھ لگا ہوا ہے اس داؤ پر۔ بس اتنا یاد رہے کہ ابھی ہم دونوں کو بہت اذیت جھیلنی ہے لیکن ہم آخری سانس تک مقابلہ کریں گے.....“ وہ برا سر تھکتے رہے اور میرے بے بس اُنسو اُن کے شانے کو بھگوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا فاکہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی سانسیں روکنے کا کوئی بندوبست کر لوں گا لیکن اب انہیں مزید پریشان نہیں کروں گا۔ مجھے رُباب کا خیال آیا اور میرے من میں عجیب سی سوچ آئی۔

تم ہو اوروں کی محفل میں مصروف
یہاں میں ہوں اور عالم تنہائی
اب لوگ مجھے تیرے نام سے جانتے ہیں
جانے یہ میری شہرت ہے یا رسوائی؟

بمذاہب تک پہنچ سکے۔ لیکن اگر اس نے زیادہ زور لگایا تو لوہے کی یہ بیڑیاں عبداللہ کے جسم کے ریشوں میں سے گزر کر اس کی ہڈیوں کو چیر کر رکھ دیں گی۔ مگر تم فکر نہ کرو..... جب تک برے اس پیارے کے جسم میں زندگی کی ایک بھی رشتہ باقی ہے میں تمہاری سنگیتر تک اسے نہیں پہنچنے دوں گا۔ تم بس اپنے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دینا.....“ عامر نے زور سے سر ہلایا۔ اچھے یقین نہیں آ رہا..... لیکن..... لیکن یہ بھی تو پاگل پن ہے..... نہیں..... میں ایسا نہیں دے دوں گا۔“ عامر کو یکایک نہ جانے کیا ہوا وہ بھاگتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا اور کچھ دیر بعد ہی میری جلتی ہوئی رُوح پر کسی نے جیسے ٹھنڈے پانی کی آبشار بہا دی۔ عامر رُباب کا ہاتھ پڑے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ رُباب کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت غراور کمزور لگ رہی تھی۔ اُس نے رُباب کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور وہ میرے قدموں کے رب ہی ڈھے گئی۔ عامر زور سے چلایا۔ ”یو..... میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ ب خدا کے لیے ہمیں بخش دو۔ اگر اس معصوم لڑکی کی جان لینے سے ہی تمہاری تشفی ہو سکتی ہے آج یہ قصہ ہی ختم کر دو۔ مار ڈالو اسے اور یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“ رُباب کے پیچھے اُس کی ماں اور بہن بھی دوڑتی ہوئی چلی آئی تھیں اور اس وقت حاجی رزاق سمیت وہ سب ارادے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے سامنے سائنس کی طاقت کو حتمی علاج ماننے لے ایک انسان کے عقیدے نے اپنا کالج کا بھرم توڑ ڈالا تھا۔ جیسے ہی میری رُباب پر نظر کی میری ساری بے چینی، ساری تپش، ساری آگ پل بھر میں سرد ہو گئی تھی۔ وہ بھی بنا پلک پائے میری جانب دیکھتی رہی۔ میرے لب ہلے۔ میں نے سلطان بابا کی جانب نظر مائل۔ ”انسانوں کی سنگ دلی کے قصے تو بہت سنے تھے۔ اُن کی بے رحمی اور مکاری کے ماننے بھی عام ہیں لیکن آج دیکھ بھی لیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری محبت جسم کی حدود بہت آگے کی ہے۔ یہ رُوح سے رُوح کا مقدمہ ہے۔ لیکن آپ نے اپنے علم کی دھاک اٹانے کے لیے خود اپنے عزیز شاگرد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اُن کا یہ نازک اور کمزور انسانی جسم زیادہ عرصے تک میرا وجود نہیں جھیل پائے گا لیکن پھر بھی اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ تھاں کہ میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میری محبت میں خیر ہے..... اسے شر میں

وقت ڈھلتا رہا اور پھر سے وہی قاتل رات میرے سامنے اپنے خون آشام جبر سے کھولے آکھڑی ہوئی۔ میری رگوں میں وہی بے رحم، سفاک اور جلا دینے والی آگ، انگارے بھرتی گئی۔ میری سانس بھرتی گئی اور کچھ ہی دیر میں میری نس نس سے چنگاڑیاں سی ٹٹنے لگیں۔ آج میرے جنون کا یہ عالم تھا کہ بان کی بنی ہوئی وہ موٹی رسی بھی میری راہ کی رکاوٹ بننے میں ناکام ہو رہی تھی لہذا ایک نوکر کہیں سے ایک موٹی سی فولادی زنجیر اٹھا لایا اور آٹھ دس بندوں نے مجھے جکڑ کر میرے پیروں میں اُس زنجیر کی میڑی ڈال دی۔ جنوں، قفس اور آہنی بیڑیاں..... یہ تو اس بے رحم قدرت کا پسندیدہ کھیل تھا جو وہ ازل سے ہم بے بس اور لاچار انسانوں کے ساتھ کھیلتی آ رہی تھی اور شاید ابد تک یہ بے رحم تماشا جاری رہنے والا تھا۔ میری حالت دیکھ کر خود حاجی رزاق بھی رو پڑے اور انہوں نے کسی کے ذریعے عامر کو خبر کروادی کہ وہ بھی آکر میری دیوانگی کا یہ نظارہ دیکھ لے اور اگر اُس کی سائنس میں اس جنوں کی بھی کوئی توضیح موجود تھی تو وہ بھی بیان کر جائے۔ لیکن ناصح بھلا کیا جانے کہ زخم کے بھرنے سے پہلے ہی ہم جیسے دیوانوں کے ناخن ہمیشہ بڑھ آتے ہیں۔ عامر نے میری حالت دیکھی تو اُسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ سلطان بابا میرے قریب ہی بیٹھے بار بار کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہے تھے۔ اُن کی ہر پھونک سے چند لحوں کے لیے میرے جلتے ہوئے وجود پر ایک ٹھنڈی پھواری تو ضرور پڑ جاتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ رُوح کے ریشے تک جلا دینے والی تپش پھر سے میرے جسم کو گھیر لیتی تھی۔ میرے اندر کی بے چینی مستقل مجھے رُباب کے کمرے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرے اندر سے طاقت کا ایک لاوا سا اُٹلنے کے لیے جیسے اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن میرے اپنے جسم کی لاچاری، کمزوری اور بوسیدگی اس طاقت کا ٹھیک استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔ ورنہ میں کب کا اس زنجیر کے کٹڑے کر کے وہاں سے نکل چکا ہوتا۔ عامر حیرت کے عالم میں گنگ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر وہ بھی بے چین سا ہو گیا۔ ”آپ اسے کھول دیں ورنہ یہ خود کو کوئی نقصان پہنچا کر ہی دم لے گا۔“ سلطان بابا نے غور سے عامر کی جانب دیکھا۔ ”عبداللہ کا انسانی جسم یہ عذاب زیادہ دیر تک جھیل نہیں پائے گا۔ کیونکہ ہمارے اس فانی جسم کے برداشت کی اپنی کچھ حدیں ہیں۔ اور چونکہ اس وقت وہ عبداللہ کے جسم کی حدود کا محتاج ہے اس لیے وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح اسی جسم کی آڑہ

بدلنے کی کوشش نہ کریں..... اب تو اس کا سب سے بڑا دعویٰ دار بھی اس کے حق سے دربردار ہو گیا ہے.....“

ابھی کچھ دیر باقی ہے

سلطان بابا کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میری جانب دیکھتے رہے پھر جیسے کسی حتمی فیہ پر پہنچ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا۔

سلطان بابا نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی ”بولو..... ہمت ہے ایک انسان کی کسوٹی پر ہزار اترنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہم انسانوں کی مکاری اور ہمارے ظالم اور جابر ہونے کے بارے میں کہا تھا، لیکن اب ان میں سے ہی ایک انسان تم سے تمہارا وعدہ مانگ رہا ہے۔ لڑ صرف اتنی سی ہے کہ تم جیتے تو رُباب تمہاری اور اگر میں جیتا تو تمہیں یہ بے سیرا ہمیشہ کے لیے ہوا کر جانا ہوگا۔ اور یاد رہے، میرے اور تمہارے درمیان ضامن صرف وہی ہوگا جو ہم دونوں کا پروردگار ہے..... یعنی میرا اور تمہارا اللہ.....“

کچھ دیر تک کمرے میں گھمبیری خاموشی طاری رہی۔ پھر میرے لب ہلے۔ ”ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے..... بتائیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

سلطان بابا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ”تم اس لڑکی سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور نہارے بقول یہ خود بھی تمہاری محبت میں شدید طور سے مبتلا ہے۔ تمہیں یہی بات ہم سب پر اہت کرنا ہوگی۔ اگر میری بات سچ نکلی اور یہ تمہارے سحر کے زیر اثر ہوئی تو تمہارا دعویٰ نوردخو غلط ثابت ہو جائے گا۔ تمہیں ایک بار اُسے مکمل آزاد کر کے کسی بھی روپ میں اُس کے ماننے آنا ہوگا۔ اگر رُباب یا قوط کے عشق میں مبتلا ہوئی تو اُسے تمہیں قبول کرنے میں کوئی لکھا ہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یاد رہے، اُس وقت اُس کے ذہن اور دل پر تمہارا کوئی اثر ہی نہیں ہونا چاہیے۔ بولو..... منظور ہے یہ کسوٹی.....“

میں نے اُنہیں آمیز انداز میں سر ہنچا۔ ”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ جانتے ہیں میں فی ظاہری شکل و صورت میں اس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ ڈر جائے گی۔ اور پھر آپ لوگ ارکی بات کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ یہ صرف رُوح سے رُوح کے تعلق کا معاملہ ہے۔ میری رُوح لے دھاگے اس کی رُوح کی ڈور سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو جسم اور ظاہری شکل و صورت کی بندشوں میں قید کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“ سلطان بابا بولے ”میں نے اسی لیے پہلے

”ٹھیک ہے..... میں اس لڑکی کی رُوح پر ہمیشہ کے لیے تمہارا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں..... میں، یا کوئی بھی اور، کبھی بھی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا لیکر میری بھی ایک شرط ہے.....“

ہم سب نے ہی چونک کر سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ حاجی رزاق اور اُن کے پورے خاندان کا عام رسمیت پریشانی کے مارے رنگ ہی اڑ گیا۔ حاجی صاحب ہکلائے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ..... اس طرح تو.....“

سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر حاجی رزاق کو روک دیا اور میری جانب متوجہ ہوئے۔

”ہاں..... تو بولو..... منظور ہے یہ سودا.....؟“

دیہ اور آرام کر لیتے تو بہتر ہوتا۔“ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے سوائے نقاہت کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حالانکہ یا قوط کے لفظ میری زبان سے ادا ہوتے تھے اور اسی کی بولی میری باتوں کے ذریعے باقی سب تک پہنچتی تھی لیکن خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مجھ اٹھتے ہی میرے حافظے کی سلیٹ بالکل صاف ہو جاتی ہے اور مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے رات کو کیا پیغام پہنچایا تھا۔ لہذا مجھے ایک بار پھر سے سلطان بابا سے کرید کرید کر ہر بات پوچھنا پڑتی تھی۔ میں نے پوری بات سن کر حیرت سے سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ ”لیکن آپ اُس کی بات پر اس قدر اعتبار کیوں کر رہے ہیں؟ اگر یہ جنون ہے تو جنون کسی اصول کو بھی نہیں مانتا۔ جنوں تو نام ہی اصولوں سے ہٹ جانے کا ہے۔“ سلطان بابا نے ہنسی کر میری جانب دیکھا۔ ”واہ میاں..... بڑی بات کہہ دی آج تم نے۔ واقعی..... جنوں کو کسی اصول، کسی شرط، کسی وعدے کا پابند نہیں کیا جاسکتا..... لیکن ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے..... مجھے اُس کی شرط مان کر اُس پر سے اپنا سپرہ آج شام سے پہلے اٹھانا ہی ہوگا اور بدلے میں اُس کے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا کہ وہ وقتی طور پر رُباب کو اپنے سحر سے آزاد کر دے گا۔ ہمیں یہ جوا کھیلنا ہی ہوگا۔“ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کسی اُن جانے فطریے کے آثار اُن کے لاکھ چھپانے کے باوجود بھی محسوس کر لیے اور اُسی لمحے میں نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ اگر اس مرتبہ یا قوط نے میرے جسم کے ذریعے انہیں ہرانے کی کوشش کی تو میں خود اُسی لمحے اپنی جان لے لوں گا۔ لیکن کیسے؟..... بس یہی طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اُس روز نرم دھوپ تلے کرسی ڈالے میں بہت دیر تک اپنی درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر آج تک کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ مجھے اس متوازی دنیا کے دروازے پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس کے اسرار اور رموز ہر ذی رُوح کا مقدر نہیں بنتے۔ آج مجھے اس رازداری کی وجہ بھی کچھ مل گئی تھی۔ یہ اسرار کبھی کبھی اتنے ہی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے اور انسان کو ایسی جان کنی کی حالت تک بھی پہنچا سکتے تھے جس سے میں خود اس وقت دوچار تھا۔ کچھ دیر بعد عامر کے سٹنڈرڈ اکثرڈ کی وہی ٹیم بھی وارد ہو گئی جس میں ایک مشہور ماہر نفسیات بھی شامل تھا۔ وہ کئی دالان میں بیٹھے عامر کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ صرف مینافزکس

ہی کہہ دیا تھا کہ تم جس صورت میں بھی چاہو، اس کے سامنے آ سکتے ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ تم حسین سے حسین تر روپ دھار سکتے ہو۔ تمہارا دعویٰ تو رُوح سے رُوح ملاپ اور رشتے کا ہی ہے نا..... تو پھر اس کی رُوح تمہاری رُوح کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہ کرے گی۔ اور اگر تب بھی رُباب کے من نے تمہیں پہچان کر قبول کر لیا تو ہمیں بھی کیا اعتراض نہیں ہوگا۔ بات اس بار یہاں بھی چہرے اور جسم کی شناخت کی نہیں ہے..... دل کے دل کے رشتے کی پہچان کی ہے..... اگر تمہاری محبت سچی ہے اور تمہارا دعویٰ اٹل ہے تو پھر اپنے تسلط سے آزاد کرنے میں خوف کیسا.....؟ ایک بار تم نے اسے اپنی جانب خود کو تھما، اب ایک بار خود اسے اپنی جانب بڑھنے دو..... ورنہ یہ مان لو کہ تم تسلط کے ذریعے اس محبت کو پانا چاہتے ہو.....“

کمرے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنے مساموں سے پھوٹ کر جسم بننے والے پسینے کی آہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک میرے اندر چپ کا سناٹا رہا۔ جیسے میں نے خود بھی اپنے اندر ہتھیار ڈالنے کی جھنجھکی سی اور میرے لب ہلے۔ ”تھکا ہے..... یہی آپ کی ضد ہے تو مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ میں یہیں اس گھر میں رُباب سے ملاقات کروں گا۔ مجھے اُمید ہے اس کے بعد آپ سب اپنے وعدوں کی پاسداری کریں گے..... بس مجھے دو دن کی مہلت دے دیں..... میں نہیں چاہتا کہ رُباب اس نڈھال اور مضطرب حالت میں مجھ سے ملے..... یہ اڑتالیس گھنٹے میں اسی کی خاطر مانگ رہا ہوں۔ لیکن آپ کو بھی مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ ان دو دنوں میں کوئی بھی رُباب کے کسی بھی فیصلے، یا طریقے پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہوگا۔ کوئی رشتہ بھی اس کی آزادی میں خلل نہیں ہوگا۔ غالباً یہ اشارہ عامر کی جانب تھا، یا پھر ایک ہاری ہوئی ماں سے کوئی خطرہ محسوس کر کے یہ شرط لگائی گئی تھی؟ بہر حال سلطان بابا نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا ”ہوں..... بے فکر ہو۔ رُباب پر کسی بھی طرف سے اور کسی بھی رشتے کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ سلطان کا تم سے وعدہ ہے۔“ اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر میری آنکھ دوسرے روز دن چڑھے کھل پائی۔ میری زنجیر کھولی جا چکی تھی۔ لیکن سلطان بابا کے چہرے پر ابھی تک غور پر چھائیاں واضح تھیں۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا ”اب کیسی طبیعت ہے میاں.....“

معارض نہیں کیا۔۔۔۔۔ تو پھر آپ کا یہ شکوہ کچھ بے جا معلوم ہوتا ہے۔“ میرا تفصیلی جواب سن کر ہار سمیت اُن سب کے چہرے حیرت کا اشتہار بن گئے۔

پھر عامر کے منہ سے صرف اتنا نکلا ”کیا؟“۔۔۔۔۔ کیا تم پڑھے لکھے ہو۔۔۔۔۔؟“ مجھے یاد آیا کبھی یہی سوال میں نے عبداللہ سے بھی کیا تھا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جو عبداللہ نے مجھے دیا تھا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ یہاں آنے سے پہلے کچھ صفحے کالے کیے تھے، لیکن سب بے فائدہ ہی رہا۔۔۔۔۔“ اب ان کی ساری توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ”ابھی کچھ دیر پہلے تم مینافزکس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیا تم نے سائنس پڑھی ہے؟“ ”پڑھی ہے لیکن اتنی ہی جتنا ایک طالب علم انٹر کے امتحان تک پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تو بس کالج اور یونیورسٹی میں صرف وقت ہی ضائع کیا۔ لیکن یہاں معاملہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ ہم نہ جانے ہمیشہ سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کر کیوں کھڑا کر دیتے ہیں؟ مذہب اس لیے تو وارد نہیں ہوا تھا کہ وہ سائنس کو رد کرے۔۔۔۔۔ مذہب تو خود علم کے راستوں پر طے کی تلقین کرتا ہے اور سائنس بھی تو ایک علم ہے۔۔۔۔۔ اور کیا ضروری ہے کہ سائنس مذہب کی بات کی تصدیق کرے؟ یاد رکھیے مذہب سائنس سے بہت پہلے آیا تھا، لیکن مذہب نے کبھی سائنس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تو پھر آپ سائنس کو کیوں مذہب کے راستے کی دیوار مانا چاہتے ہیں؟ اور بھلا یہ کیا فارمولا ہوا کہ سائنس مذہب کی جس پیشین گوئی کو ثابت کر دے تو سچ اور باقی سب غلط۔۔۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا سائنس کی بھی اپنی کچھ حدیں نہیں ہیں؟ تو پھر ہر سوال کے جواب کی توقع صرف سائنس کے علم سے ہی کرنا سراسر نادانی نہیں ہے، کیونکہ سائنس بھی تو صرف ایک علم ہی ہے۔۔۔۔۔ ان ہزاروں دیگر علوم کی طرح جو انسان دل سے کھوج رہا ہے۔ تو پھر صرف سائنس کے علم کے فارمولے پر ساری کائنات کو پرکھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔۔۔۔۔؟“ میں شاید جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور میری دماغی معمول سے کچھ زیادہ بلند ہو گئی تھی لہذا مجھے معذرت کر کے اپنی بات ختم کرنا پڑی۔ لیکن عامر سے رہا نہ گیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم نے کبھی اس نظریے سے دھجائی نہیں۔۔۔۔۔ اور پھر ذہن بھلا کہاں تسلیم کرتا ہے ایسی توجیہات۔۔۔۔۔ جو چیز عقل میں نہ آئے اور آنکھ اُسے دیکھ بھی نہ سکے اس پر یقین ذرا مشکل سے ہی آتا ہے اور پھر تم تو باقاعدہ

(Metaphysics) کے کھیل ہیں۔ انہی میں سے پھر کسی نے اسی ڈائی پولر تھیوری آف گرے وی ٹیشن (Dipolar Theory of Gravitation) کا بھی ذکر کیا۔ عامر اُن سب کے سوالوں اور بحث کے جواب میں انہیں لے کر میری طرف آگیا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں اب بھی مینافزکس کے کرشموں پر یقین رکھتا ہوں۔ اور سائنس کی ہر تھیوری آج بھی اُسی طرح مجھ پر واضح ہے۔ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے تماشے بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور اُن پر میرا اعتقاد بھی۔۔۔۔۔ لیکن کل رات جو میری نظروں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے میں اُسے کیسے جھٹلا دوں۔ رُباب کے چہرے پر آج صبح سے چھائی ہوئی سرخی اور اُس کی برسوں پرانی وہ مسکان بھی میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی ہے۔۔۔۔۔ آج اُس کے جسم میں پھر سے بہتے خون کی حرارت محسوس کی ہے میں نے۔۔۔۔۔ اور یہ جو لڑکا آپ کے سامنے اس وقت خاموش بیٹھا ہے، کل رات میں نے اس کے اندر خود وہ عفریت بھرا ہوا دیکھا ہے جو سب کچھ ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں سائنس پر یقین کروں، یا اپنی آنکھوں پر۔۔۔۔۔؟ کیا اب آپ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پورا گھر ہی کسی خواب کا حصہ ہے۔۔۔۔۔؟ کوئی تہ در تہ خوابی بھول بھلیاں اسے گھیرے ہوئے ہے؟ یا پھر اس وقت بھی ہم کی خواب کی کیفیت میں ہیں؟ ڈاکٹر لا جواب ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر مار نفیسات نے میری جانب قدم بڑھائے۔ ”کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تم اپنی کل رات کی کیفیت کو بیان کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟ کیا تمہیں بچپن میں بہت سخت مذہبی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔۔۔۔۔؟ کیا تمہیں رُباب میں کوئی ذاتی دل چسپی محسوس ہوئی ہے کبھی۔۔۔۔۔؟“ تو گویا حضرت اب بھی اسے انسانی ذہن کا کوئی شعبہ سمجھ رہے تھے۔ میرے ظاہری حلیے کی وجہ سے وہ مجھے کوئی مذہب سے متاثرہ اُن پڑھ سمجھ بیٹھے تھے اور اُن کا گمان یہ تھا کہ میں رُباب کے ظاہری حسن سے متاثر ہو کر یہ سارا اسٹیج تیار کر رہا تھا تاکہ آخر کار اُسے پاسکوں۔ چند لمحے کے لیے تو میرا ذہن غصے سے اُبل سا ہی گیا۔ پھر مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آگئی۔ ”کیوں جناب؟ کیا آپ کی مینافزکس کی ابتدا ہی مذہب پر شک کرنے سے ہوتی ہے۔۔۔۔۔؟ مذہب نے تو کبھی بھی آپ کی فزکس، مینافزکس، سائیکالوجی، پیراسائیکالوجی، یا کسی بھی قسم کی سائنس پر کوئی

ب کے ذریعے حال دل بیان کرنے لگے تو اُسے دھتکار دیتے ہیں۔ ہاتھ سے نکلتی لہروں کی بجائے علاج کے لیے تو گھنٹوں تظار میں بیٹھ کر انتظار کر لیتے ہیں لیکن دوسری جانب اگر آپ ہاتھ تھام کر اُس پر دم کر کے پھونک دے تو ہم شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مرنے پر زندگی ہم اس کی کھوج میں تو دن رات ایک کیے رکھتے ہیں، لیکن ہمارے آس پاس جو بے پناہ مٹی بکھری پڑی ہے اُس سے ہمیشہ غافل رہتے ہیں۔ یاد رکھیے، نیل آرمسٹرانگ کے چاند پر نے سے پہلے بھی چاند موجود تھا لیکن تب تک سائنس ہمارے شق القمر کے عقیدہ کو شک کی دہلیز سے دیکھتی رہی۔ یہ سب باتیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟ صرف یہی کہ ہمارے متوازی ایک مانی دنیا بھی ازل سے موجود ہے اور اُس دنیا کو جاننے کے لیے بھی ایک سائنس موجود ہے ہم رُوحانیت کہتے ہیں۔ اس دنیا کی سائنس میں جو کمال حاصل کر لے اُسے سائنس دان اجاتا ہے اور اُس دنیا کا سائنٹسٹ ”صوفی“ کہلاتا ہے۔ جیسے یہاں کی سائنس ظاہری جسم درد کو دور کرنے کے لیے ڈسپین، یا دوسرا کوئی پین کٹر (Painkiller) دیتی ہے ویسے ہی مانی سائنس رُوح کے درد کے لیے دعا، دم اور ورد کی شکل میں درد کو مارنے کی دوا تجویز کرتی ہے۔ جس طرح ہماری اس ظاہری دنیا کی بیماریاں اور اُن کا علاج موجود ہے، اسی طرح رُوحانی دنیا میں بھی ہم بیمار پڑتے ہیں اور ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ رُباب بھی ایک مانی رُوحانی بیماری کا شکار ہے اور اُس کی اس بیماری کا تعلق بھی ہماری متوازی دنیا کی ایک ق کے اثر سے ہے۔ آپ لوگ بھی بس یہی دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور اس دنیا کے دی مرحلے کے کینسر کی طرح اُس کی رُوح کا ناسور لا علاج نہ ہو چکا ہو..... سلطان بابا نے اس ناسور کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ایسے میں اگر آپ ہی کا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر اُن کے لیے مشکلات بہت بڑھ جائیں گی.....“ بولتے بولتے لی آواز بیٹھ سی گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ سلطان بابا نہ جانے کب سے میرے عقب میں رُسے میری یہ ساری تقریریں سن رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر اچانک ہی مجھے گلے لگا لیا۔ راور اُس کی ٹیم کی آنکھوں سے بھی شک و شبہ کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں اور اس بار جب ل نے سلطان بابا سے ہاتھ ملایا تو اُن سب کی نگاہیں احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔ چلتے عامر دولہے کے لیے رُکا اور مجھ سے بولا ”آج تم نے ہمیں زندگی گزارنے کا ایک ایسا نیا

ایک پوری متوازی دنیا کی بات کر رہے ہو، اسے ہضم کرنا تو ہم جیسوں کے لیے واقعی بڑا مشکل ہے۔“ میں نے ان چاروں کی جانب غور سے دیکھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ سائنس سے کہیں کہ رُوح کی توجیہ بیان کر دے..... ہمارے اندر ایسی کیا چیز پائی جاتی ہے جو نہ ہمیں نظر آتی ہے نہ ہی عقل کی حد اُسے چھو سکتی ہے لیکن اُن کے نکل جانے سے ایک پل میں ہم بے جان مٹی کے پتلے کی طرح ڈھسے جاتے ہیں۔ وہ جب تک ہمارے جسم کے اندر رہتی ہے، رگوں میں خون کو رواں رکھتی ہے اور جسم چھوڑ جائے تو ہر عضو اپنے آپ مر جاتا ہے۔ کیوں.....؟ کیا آپ نے اس رُوح کو کبھی دیکھا ہے.....؟ سائنس سے کہیے کہ وہ رُوح کو ثابت کر دے، یا پھر اس کی نفی ہی کر دے.....

اور رُوح کی حقیقت تو میں نے بہت بڑی مثال دے دی ہے..... آپ صرف سائنسی طور پر مجھے اس بات کی وضاحت ہی کہیں سے لادیں کہ ہم مسلمان اگر مردے کو دفناتے وقت زمین سے یہ کہہ دیں کہ یہ جسم امانا دفن کیا جا رہا ہے تو سالوں بعد بھی اس میت کی منتقلی کے وقت جب زمین کھودی جاتی ہے تو وہ مرا ہوا جسم تازہ کیوں ہوتا ہے.....؟ جب کہ سائنس کے اصولوں کے مطابق تو اس جسم کو گل سڑ جانا چاہیے۔ وہ کون سی چیز ہے جو زمین کو اُسے کھانے سے روکتی ہے.....؟ جواب دیں..... یہ تو بہت عام اور روزمرہ کی بات ہے۔“ وہ چاروں لا جواب ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”میرا مقصد آپ لوگوں کو لا جواب کرنا نہیں ہے، لیکن یہ سب باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا سے پرے بھی کچھ دنیا میں موجود ہیں۔ ہم ایلینز (Aliens) کے وجود کو تو اُڑن طشتریوں کے ذریعے ثابت کرتے اور مانتے ہیں لیکن جنات کی ہمارے آس پاس موجودگی سے انکاری رہتے ہیں۔ فون، یا ایس ایم ایس کے ذریعے ایک پل میں دنیا کے دوسرے کونے تک پیغام پہنچانے کے کمال کے تو معترف ہیں، لیکن ایک ماں کے دل سے نکلی ایک پکار پر ہزاروں میل دور بیٹھے اُس کے بچے کے دل کی اچانک تیز دھڑکن کے جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چھوٹی سی ٹی وی اسکرین پر لہروں کے ذریعے بچہ زندہ تصویروں، یا لائیو ٹیلی کاسٹ پر تو یقین کرتے ہیں لیکن بند آنکھوں اور سن کے اندر لگی اسکرین جو دل سے دل کے تار جڑنے پر روشن ہوتی ہے اُسے کبھی قابل بھروسہ نہیں سمجھتے۔ ٹیلی بیٹھی کے ذریعے دوسروں کے دل کا حال جاننے کو معتبر جانتے ہیں لیکن جب کوئی

ہا آیا۔ وہ بھی شاید رات بھر سو نہیں پائے تھے۔ آج شام ۴۸ گھنٹے پورے ہونے کے بعد باب کی اور شاید ہماری بھی قسمت کا فیصلہ جو ہونے والا تھا۔ میں نے اُن سے یونہی پوچھ لیا۔ بابا..... ہم مذہب سے اس طرح مطمئن کیوں نہیں ہو پاتے جس کا ملیت سے سائنس، یا دینی اور علم ہمیں مطمئن کر جاتا ہے؟“ وہ ہلکے سے مسکائے۔ شاید وہ خود بھی مجھ سے ایسے کسی ال کی توقع کر رہے تھے۔ ”وہ اس لیے کہ ہم نے صرف کلمے، نماز اور روزے کو مذہب کی ٹیل سمجھ لیا ہے۔ جب کہ یہ بنیادی رکن تو صرف مذہب کی ابتدا ہیں..... اصل آغاز مذہب تو اُس کے بعد ہے..... اور پھر انتہا کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہاں تک تو شاید کئی پیغمبر بھی نہیں پہنچ گئے۔ تو پھر ہم جیسے معمولی انسان بھلا مذہب کی انتہا کو کیا پائیں گے؟..... جس دن ہم یہ سمجھ گئے کہ فی الحال ہم صرف اسلام لائے ہیں..... ایمان لانا ابھی باقی ہے اس روز رے مسئلے حل ہو جائیں گے..... لیکن شاید ابھی وہ منزل کچھ دُور ہے..... بہر حال ہمارا سفر تو لی ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔“

اتنے میں حاجی رزاق صاحب نے آکھ بتایا کہ رباب کئی مرتبہ عامر کا پوچھ چکی ہے اُسے جواب دیا جائے۔ سلطان بابا نے انہیں سمجھایا کہ معاہدے کی رُو سے فی الحال عامر کا ب کے سامنے آنا، یا اُس سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ مبادا یا قوط اسے خلاف ورزی سمجھ کر پھر نہ جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ عامر کی غیر موجودگی کا کوئی مناسب بہانہ بنا دیا جائے، کیونکہ تو بات صرف چند گھنٹوں کی ہی رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہمیں کوئی بھی ایسی خلاف معمول بات نہیں کرنی چاہیے جو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔ حاجی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ان کی بیگم اور چھوٹی بیٹی نایاب بھی بے حد پریشان ہیں اور وہ کسی صورت رباب کو کھونا نہیں دے۔ سلطان بابا نے پھر وہی بات کی کہ وہ سب دعا کریں۔ خدا بہتر کرے گا۔ سچی بات تو یہ کہ میں خود اندر سے بے حد خوف زدہ اور پریشان تھا اگر یا قوط نے سلطان بابا کی شرط مانی اور اپنی محبت کو اس کڑی کسوٹی پر ثابت کرنے کی ہامی بھری تھی تو اُس کا دعویٰ بھی کچھ وزن نہ ہوگا اور پھر میں تو خود اس محبت نامی اژدھے کا نگلا ہوا شکار تھا۔ میری رگوں میں بھی تو یہ دوا ہر اسی جذبے کی دین تھا۔ ہاں..... وہی محبت جو انسان پر ابتدا میں تو صبح کی نرم اور دھوپ کی طرح اُترتی ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ تپتے صحرا کی اس دو پہر کی شکل

نظریہ دیا ہے جو ہمیشہ سے ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تو تھا لیکن ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ آج کے بعد میں ہر مریض کو دوا کی پرچی دیتے وقت ایک مشورہ اور بھی دوں گا کہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے رہنا۔ دوا تو خون کے غلیوں میں جذب ہو کر اپنا کام کرے گی مگر لیکن دعا تمہاری رُوح کے غلیوں میں جذب ہو کر تمہاری بیماری دُور کرے گی۔“ اُن کے جانے کے بعد سلطان بابا نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”ساحر میاں..... لگتا ہے مولوی خیر نے پوری تربیت کے بعد ہی تمہیں میرے سپرد کیا ہے۔ جیتے رہو.....“ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی لیکن یہی سچ بھی تھا۔ یہ ساری باتیں جو میں نے آج عامر اور اُس کی ٹیم کو قائل کرنے کے لیے کی تھیں ان سب پر میں خود مولوی خیر سے گھنٹوں بحث کر چکا تھا اور انہوں نے ہر بات اس قرینے سے کی تھی کہ میرے سب نقشہ سوال جواب پاتے گئے۔ رفتہ رفتہ شام بھی وصل گئی لیکن میری رگوں میں بھر جانے والی اس آگ کا آج دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ گویا یا قوط فی الحال اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ اندر زنانے سے آنے والی اطلاعات کے مطابق رباب بھی بہت حد تک نارل ہو چکی تھی اور آج ہفتوں بعد اُس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی کھایا تھا۔ دھیرے دھیرے رات ڈھلنے لگی اور وہی اداسی حولی کی دیواروں اور درزوں سے جھانکنے لگی جو یہاں کا خاصہ تھی۔ سلطان بابا احتیاطاً کئی بار میرے کمرے میں جھانک چکے تھے لیکن آج میں اپنے جسم پر کسی قسم کا بوجھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میری نظر رات بھر بار بار دالان میں اسی شان سے ایستادہ پینل کے پیڑ کی جانب اُٹھ جاتی تھی اور میرے من میں عجب و غریب قسم کے سوال آتے رہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہو گا.....؟..... اُس کی دنیا میں انتظار کیسا ہوتا ہوگا اور اُس کے انتظار کے لمحے کیسے کٹتے ہوں گے؟ کیا وہ بھی ہم انسانوں کی طرح سجدے میں گر کر اپنے پروردگار سے اس نازنین کی ایک جھلک، ایک لمحے کا ساتھ مانگتا ہوگا؟ اُس کی دعا کیسی ہوتی ہوگی۔ اُس کے جسم اور اُس کی رُوح پر انتظار کے یہ کرب ناک لمحے کیسی کیفیت پیدا کرتے ہوں گے.....؟ کیا وہ بھی محبوب کی جدائی میں روتا ہوگا.....؟ کیا اُس کے آنسو بھی ہم بے بس انسانوں کی طرح صرف نمکین پانی کہلاتے ہوں گے؟ کیا اُس کا دل بھی ہوتا ہوگا.....؟ کیا وہ بھی آہیں بھرتا ہوگا.....؟ انہی سوالوں کے جھرمٹ میں صبح بھی ہو گئی۔ فجر کی نماز کے بعد میں خود سلطان بابا کے کمرے میں

اختیار کر لیتی ہے جہاں میلوں دُور تک مجھ جیسے بے بس انسانوں کے لیے کوئی نخلستان، سایہ میسر نہیں ہوتا۔ اس کی رُوح تک کو جھلسا دینے والی گرم کرنیں ہمارے نازک بدن، مسام چیر کر ہمارے اندر پیوست ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے حلق میں کانٹوں کا جنگل اُگ رہا ہے اور دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ کر کے ہماری جان اسی محبت کے دہکتے سورج سے جاتی ہے۔ جذبول اور خواہشوں کی گلابی تتلیاں بے بسی سے ہمیں تڑپاتا اور دم توڑتا ہوا رہتی ہیں اور کچھ ہی دیر میں خود اُن کے سنہری پر بھی جل جاتے ہیں۔ ہاں..... ایسی ہی ہے اور ظالم ہوتی ہے یہ محبت.....

آخر کار وہ پہر بھی آہی گیا جب شرط کے مطابق ہمیں رُباب کو اُس کے کمرے میں اُچھوڑا آنا تھا۔ حاجی رزاق جب عامر اور بیگم و بیٹی کے ہمراہ کسی بہانے سے نکل کر مہمان خانہ کی جانب آ رہے تھے تو اُن کی چال سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اُس جواری کی چال ہے جو زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیل کر آ رہا ہو۔ ستم یہ تھا کہ بازی تو کھیلی جا چکی تھی لیکن جیت مات کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ باقی گھر والوں کے رنگ بھی اڑے ہوئے تھے۔ ہم سب سادھے مہمان خانے کے شیشے کے برآمدے سے باہر حویلی کے اُس حصے کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں رُباب کا کمرہ واقع تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری تشویش بے چینی میں بدلنے لگی کیوں کہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ میں اِسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ جانے یا قوط کو روپ میں رُباب کے سامنے آئے گا اور کس طرح سے اُسے اپنی محبت کا یقین دلائے گا؟ اور اگر اُس کے دعویٰ کے مطابق رُباب بھی اُس کی محبت میں اُسی کی طرح مبتلا تھی تو کیا ہم رُباب کو دوبارہ دیکھ بھی پائیں گے، یا نہیں..... اور اگر یا قوط اپنے وعدوں سے پھر گیا تو.....؟ اور کہیں یہ اُس کی ہمیں رُباب سے چند لمحوں کے لیے دُور رکھنے کی سازش ہوئی تو.....؟ ایسے نہ جانے کتنے سوال میرے ذہن میں سوئیاں چھو رہے تھے کہ اچانک اندر سے رُباب کی چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اُس نے چلا کر کہا..... ”عامر.....“ ہم سب بُری طرح اُچھلے میرے ذہن میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ اوہ میرے خدا..... یہ بات میرے، یا سلطان..... کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ یا قوط کو ہم نے خود کوئی بھی روپ بدلنے کی اجازت دینے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ عامر کا بہروپ بھی تو بھر سکتا ہے۔ اور اب اگر وہ ایسا کرے

چکا ہے تو اُس نے معاہدے کی کسی بھی طور خلاف ورزی نہیں کیونکہ ہم نے ایسی کوئی پابندی اس پر لگائی ہی نہیں تھی۔ ہم سب رُباب کی پہلی چیخ کے بعد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑے تھے اور پھر جب چند ہی لمحوں کے بعد رُباب کی چیخیں ایک تسلسل اور جنونی انداز میں شروع ہوئیں تو ہم سب ہی اُس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے پیچھے سے پہلے ہی رُباب بے ہوش ہو کر فرش پر گر چکی تھی اور اُس کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ سلطان بابا نے فوراً رُباب کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چند آیتیں زیر لب پڑھیں اور پانی کے ایک گلاس پر کوئی سورۃ پڑھ کر دم کیا اور رُباب کی ماں کو قطرہ قطرہ کر کے وہ پانی رُباب کے حلق میں پکانے کا کہہ کر ہم سارے مرد کمرے سے نکل آئے۔ وہ ساری رات ہم سب نے رُباب سمیت کانٹوں پر گزاری کیوں کہ ہمیں اب بھی اس امتحان کے نتیجے کا پتا نہیں تھا۔ سب کچھ رُباب کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہونا تھا اور رُباب نے ہوش میں آنے کے لیے پورے چودہ گھنٹے لیے۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر تک وہ ہم سب کو اجنبی اور بھنی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر روتے ہوئے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ سلطان بابا نے اُسے تسلی دی کہ اب ہم سب اُس کی حفاظت کے لیے وہاں موجود ہیں لہذا وہ اطمینان رکھے اور ہمیں گزشتہ رات کا پورا واقعہ سنائے۔ بڑی مشکل سے رُباب نے اپنے حواس یک جا کیے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ ہمیں صرف اتنا بتا پائی کہ کل رات کو وہ کافی دیر تک عامر کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کرتی رہی لیکن فون بند پا کر اُس نے جھنجھلاہٹ میں عامر کو SMS کر دیا کہ اگر اُس نے فوراً ہی رُباب سے رابطہ نہ کیا تو وہ عمر بھر اُس سے بات نہیں کرے گی۔ اِسی اثناء میں باہر آہٹ ہوئی تو رُباب نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ تبھی اُسے عامر کی جھلک دکھائی دی۔ جو شاید اُسے ستانے کی خاطر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رُباب لپک کر اُس کے قریب پہنچی تو عامر نے اُسے اس اندھیرے کونے کا بلب جلا کر روشنی کرنے سے منع کر دیا کہ گھر والے چونک جائیں گے اور خود اُس نے رُباب کا ہاتھ تھام لیا۔ رُباب کے بقول اُس وقت عامر کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور خلاف معمول عامر نے اُسے ایک بار اقرار محبت کی تجدید پھر سے اپنے لفظوں میں کرنے کا کہا۔ رُباب اُلجھی سی گئی کیوں کہ اُس نے آج تک عامر کا ایسا برتاؤ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گھر میں گھستے ہی آسمان سر پر اٹھالینے کا قائل تھا اور محبت کی تجدید تو دُور وہ تو رُباب کو اُس کے اس

لیکن سلطان بابا نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہ ایک انسان کا وعدہ نہیں کہ کچے دھاگے کی طرح پٹ جائے۔ اب وہ عمر بھر اپنے عہد کی پاسداری میں رُباب کے قریب بھی نہیں پھٹے گا۔ اُسی لمحہ جانے مجھے ایک عجیب سا احساس کیوں ہوا۔ سلطان بابا نے بات کرتے وقت غیر ارادی طور پر دو مرتبہ پتیل کے پیڑ کی جانب نظر ڈالی اور مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا نے اُس سیاہ نیب کو کم از کم اس پیڑ پر بیرے کی اجازت دے دی ہے، لیکن گھر والوں کے اطمینان کے لیے وہ اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتے۔ آخر کار ہمارے رُخصت ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ ماہی رزاق کے تمام گھر والوں کی آنکھیں اس پلِ غم تھیں۔ سلطان بابا نے خاص طور پر رُباب اور عامر کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میں پتیل کے پیڑ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”کیا ہوا؟“ میں خاموش رہا اور پھر دھیرے سے اُن کے کان میں کہہ ہی ڈالا۔ ”ایک دل جلے کو آخری سلامی پیش کر رہا تھا۔“ اُن کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لہرا کر غائب ہو گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حاجی رزاق کے نامان کو ہم آخری سلام کر کے باہر نکلنے لگے تو ایک لمحے کوڑے اور مجھے سامنے کھڑا کر کے اُلے۔ ”ساحر میاں..... آج سے تمہارا ساحر سے عبداللہ تک کا سفر ختم ہوا۔ تم ہر امتحان پر برے اُترے ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب چاہے تم کہیں بھی رہو، تمہارا اس متوازی دنیا کا یہ زہر جاری رہے گا اور اب تم اپنی دنیا خود کھوج سکتے ہو..... جاؤ..... گھر لوٹ جاؤ۔ زہر تمہارا نگار کرتی ہوگی..... مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں..... بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے..... برے ساتھ کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکے ہو..... اب میرا فرض ہے کہ میں تمہارا حق ادا کر لال..... خوش رہو ہمیشہ۔“ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں اُن کی بات سن کر پپ ہی تو گیا۔ ”کیا آپ مجھ سے اُکتا گئے ہیں.....؟ کیوں دُور کرنا چاہتے ہیں مجھ کو خود؟ زہرانے کہا تھا کہ وہ قیامت تک ہماری رُوحوں کے ملاپ کا انتظار کرے گی، لیکن آپ نا ابھی سے مجھ پر یہ قیامت کیوں ڈھانا چاہتے ہیں.....؟ ہاں البتہ آپ کے اگلے سفر میں ما آپ پر بوجہ بن رہا ہوں، یا میری وجہ سے آپ کی راہ کھوئی ہو رہی ہے تو پھر جیسے آپ کا.....“ انہوں نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ”تم ہرگز مجھ پر بوجہ نہیں ہو..... تم تو وہ اخر ہوس کی تمنا کوئی بھی راہی کر سکتا ہے.....“ وہ کچھ دیر کے لیے کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا پھر انہوں نے جیسے کوئی حتمی فیصلہ کر کے سر اٹھایا۔ ”ٹھیک ہے..... تم یہ سفر جاری رکھنا

”کتابی عشق“ پر اس قدر ٹوکتا اور تنگ کرتا تھا کہ کبھی کبھار تو رُباب تھک کر رو پڑتی تھی اور عامر کو اس طرح کے اظہارِ محبت سے تو سدا کی چڑ تھی۔ وہ نایاب کو اپنے ساتھ ملا کر رُباب کی ایسی نقلیں اُتارتا کہ رُباب پھر ہفتوں اُس سے بات نہیں کرتی تھی اور آج وہی عامر جب اس تاریک گوشے میں رُباب کے ہونٹوں سے محبت کے دو لفظ ادا ہو جانے کے انتظار میں اپنا سب کچھ لٹانے کا دعویٰ کر رہا تھا تو رُباب کا چوکنا لازمی تھا اور پھر عامر کے پرفیوم کی خوشبو بھی تو خلاف معمول کچھ عجیب سی تھی اور اُس کی وہ گرم سانسیں جو رُباب کا رُواں جلانے کا باعث بن رہی تھیں۔ رُباب نے ہنس کر اُسے یقین دلایا کہ وہ تو سدا سے اُس کی محبت میں پاگل ہے۔ لیکن عامر نے جب رُباب سے تیسری مرتبہ یہ بات پوچھی کہ کیا اُسے واقعی عامر سے محبت ہے اور کہیں وہ دوسروں کے سامنے اس بات سے سکر تو نہیں جائے گی تب رُباب کا ماتھا ٹٹکا اور اُسے پہلی بار یہ ہڈیوں کے گودے کو جمادینے والا سرد احساس ہوا کہ اُس کے پاس کھڑا یہ شخص عامر نہیں کوئی اور ہے۔ اور جیسے ہی اُس کے حلق سے پہلی چیخ بلند ہوئی تب کسی نے جیسے اُس کے تمام حواس یک بار ہی بیدار کر دیئے۔ وہ جان چکی تھی کہ اجنبی ہاتھوں کا یہ لمس اور مہکتے وجود کی یہ خوشبو کسی نا محرم ہستی کی ہے۔ بس پھر کیا تھا رُباب کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش کھو بیٹھی اور شاید یہ وہی لمحہ تھا جب ہم سب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ یا قوت شرط ہار چکا تھا۔ رُباب اُس کی انجان محبت کو شناخت نہیں کر پائی۔ اور شاید یہ پہلا محبت کی ہار تھی جس پر وہاں موجود ہر شخص خوش تھا۔ لیکن شاید وہاں کوئی اور بھی تھا جو اپنی محبت کے یوں سر بازار لٹ جانے پر ماتم کناں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے پتیل کے پیڑ پر نظر ڈالی۔ باہر ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور پیڑ کے پتوں سے پانی کی بوندیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھیں۔ قدرت نے جب ہم خود غرض انسانوں کو کسی کی محبت کی ہار کا جشن مناتے ہوئے دیکھا تو شاید اُس سے رہانہ گیا اور اُس نے اس ہار کے غم میں خود آنسو بہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تبھی یہ برستی بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔ دوسری دنیا کا تھا لیکن قدرت کا تو اپنا تھا..... اتنا ہی اپنا، جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی قریب، جتنی قربت کا دعویٰ ہماری یہ انسانی مخلوق کرتی ہے۔

اگلے دو روز حاجی رزاق اور گھر والے اسی فکر میں گھلتے رہے کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائے

دامن اور چنگاری

چاہتے ہو تو پھر یونہی سہی..... لیکن یہاں سے ہماری راہیں عارضی طور پر جدا ہوتی ہیں۔ ہم دونوں یہاں سے ریلوے اسٹیشن سے مشرق اور مغرب کی طرف جانے والی الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوں گے۔ تمہاری گاڑی جو مغرب کی طرف جائے گی وہ تمہیں جبل پور کے اسٹیشن تک پہنچائے گی اور میں مشرق کی راہ لوں گا۔ لیکن دھیان رہے جبل پور کی درگاہ بذات خود ایک بہت بڑا امتحان ہے اور اب تمہیں تجا ہی اس امتحان سے گزرنا ہوگا۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔“ میں نے سر جھکا دیا۔ ”آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔“ انہوں نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ حویلی کے بڑے پھانک سے نکلنے وقت نہ جانے میری نظر خود بخود پلٹ کر اُس پتیل کے پیڑ کی جانب کیوں اٹھ گئی جو اپنے شاخیں کسی ماتم زدہ بیوہ کے انداز میں کھولے، کھڑا ہوا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سوگوار پیڑ کسی سے یہ کہہ رہا ہو.....

ابھی کچھ دیر باقی ہے
خزاں کے بیت جانے میں
گلوں کے مسکرانے میں
خوشی کے گیت گانے میں
بہاروں کے زمانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے.....
میں تم کو بھول جاؤں گا
نہ تم کو یاد آؤں گا
میں تم سے دُور رہ کر بھی
تمہیں جی کر دکھاؤں گا
تمہیں معلوم ہے لیکن
یہ سب میں کر نہ پاؤں گا
کہ تم کو بھول جانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے.....
ابھی..... کچھ دیر باقی ہے

کہتے ہیں ”زندگی میں کتنے پل ملے.....“ یہ سوچ کر جینے سے بہتر ہے کہ ”ہر پل میں کتنی زندگی ملی.....“ اس بات کو جینے کا پیمانہ بنایا جائے۔ لیکن سلطان بابا سے جدا ہونے کے بعد جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے حصے کے پل اپنی زندگی گنوا بیٹھے ہیں۔ ٹرین کو اسٹیشن چھوڑے اب گھنٹہ بھر سے زائد ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن ابھی تک وہیں اسٹیشن پر سلطان بابا سے ہوئے الوداع میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے میری منزل کہاں تھی؟ سلطان بابا نے تو صرف جبل پور اسٹیشن کا ٹکٹ میرے حوالے کر کے مجھے اس ٹرین پر چڑھا دیا تھا لیکن جبل پور نامی قصبے میں مجھے کہاں جانا تھا؟ کس سے ملنا تھا.....؟ یہ سارے سوال میرے سامنے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لیکن اب تک تو مجھے ان حالات کا عادی ہو جانا چاہیے تھا..... میں کیوں بار بار ان بے معنی سوالوں میں خود کو الجھا لیتا تھا۔ میرے گھر سے نکلنے اور درگاہ سے یہاں اس ٹرین کے اکاٹومی کلاس کے ڈبے تک کے سفر میں جانے ایسے کتنے الجھے سوال میری زندگی میں آ کر اپنا حل پا چکے تھے۔ ایک سوال اور سہی..... میں نے تھک کر اپنی آنکھیں موندھنے کی کوشش کی اور اپنا سر اُدھڑی ہوئی سخت نشست کے ٹیک پر ٹکانے کی کوشش کی لیکن ٹرین کے جھٹکے بھلا میرا توازن کہاں برقرار رہنے دیتے.....؟ تنگ آ کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک ماں اپنے بچے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں..... یہ تو سارے ڈبے مل کر اللہ ہو..... اللہ ہو کا ورد کر رہے ہیں۔ ماں نے بچے کے دل سے ڈرنے والے کے لیے خود ہی ٹرین کے دوڑنے کی آواز اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرانے اور ٹھکا ٹھک جیسی آواز کو ایک سر میں ڈھال کر اُسے اللہ ہو کی شکل دے دی اور اپنے بچے کو تھپکنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کا بچہ بھی اس گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اللہ ہو کا ورد کرنے لگا۔ دوسری جانب کچھ تبلیغی حضرات بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ عصر کی نماز ٹرین میں ہی ادا کر لی جائے، یا پھر کسی چھوٹے اسٹیشن پر دو چار

میں یوں مگن تھے جیسے انہیں زندگی میں اس ٹرین سے اُترنے کے بعد دوبارہ کبھی تاش کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ اب تک جانے کتنی بازیاں کھیل چکے تھے لیکن کسی پر بھی بازی جیتنے کی خوشی، یادِ اُوہار جانے کے ڈھکے کے آثار نمایاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر بازی کے اختتام پر چند نعرے بلند ہوتے اور پھر سے وہ چاروں نئی بازی کے پھیرے میں الجھ جاتے، جانے یہ کیسی سعیِ لاحاصل تھی.....؟.....

اچانک ٹرین کی رفتار کم پڑنے لگی۔ اُوپر برتھ پر لیٹے ہوئے ایک حضرت نے جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اپنے چہرے پر ڈٹی ہوئی چادر ہٹا کر درجنوں بار تفتیشی انداز میں دولت پور کے اسٹیشن کا پوچھ چکے تھے انہوں نے ایک بار پھر جلدی سے چادر ہٹائی اور وہیں سے آواز لگائی ”کیوں میاں..... دولت پور کا اسٹیشن تو نہیں آ گیا۔“ اور پھر حسب معمول کسی کا جواب نہ پا کر دوبارہ اپنے چہرے پر اپنا کھس پھیلا کر خرائے لینے لگ گئے۔ ٹرین نے چند زوردار جھٹکے لیے اور پھر ایک لمبی سی اسکرینج کی آواز کے ساتھ آخری پتلی لے کر رُک گئی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کے پلیٹ فارم کے سروں پر جڑے تختوں پر لکھا نام تک ماہ و سال کی گردش کی تاب نہ لاتے ہوئے مٹ چکا تھا۔ تاش کی بازی والوں میں سے کوئی ایک چلایا۔ ”چل بے سلو..... اسٹیشن آ گیا۔ اب شرط کے مطابق بھاگ کر گرم گرم پکوڑے اور چٹنی پکڑ لا..... اور دیکھ پکوڑوں پر چاٹ مصالحہ ڈالو! نا نہ بھول جائیو.....“ سلو نے حکم کی تعمیل میں فوراً پلیٹ فارم پر بمپ لگائی اور پکوڑے والے کے ٹھیلے کی جانب دوڑ لگا دی۔ مولانا کی بیگم نے بھی شاید گرم پکوڑوں کے تذکرے کو سن کر اپنے میاں کے کان میں کچھ کھسر پھسری۔ مولانا بادل خواستہ کراچے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ڈبے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بیگم کو قاب تانے رکھنے کی ہدایت کی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جانے انہیں کیا ہوا کہ میرے سے کھنکار کر رُکے اور آہستہ سے بولے ”میاں..... میں ذرا نیچے سے کچھ سامان پکڑاؤں۔ آپ زنانے کا دھیان رکھیے گا.....“ میں نے چونک کر حیرت سے اُن کی جانب دیکھا لیکن وہ آگے بڑھ چکے تھے۔ پورے ڈبے میں انہیں میں ہی قابل اعتبار کیوں دکھائی دیا.....؟

اُرخود ہی میری توجہ اپنے حلیے کی جانب چلی گئی۔ اوہ..... تو ایک بار پھر میرا یہ ظاہری حلیہ ہی مرا تعارف ثابت ہوا تھا۔ جانے ہم انسانوں نے کسی کی ظاہری وضع قطع کو ہی شرافت و

منٹ کا وقفہ لے کر باقاعدہ جماعت کروالی جائے۔ اُن سے ذرا پرے ایک ادھیڑ عمر کے مولانا اپنی بیوی کو بار بار اپنے برقعے کا نقاب ٹھیک طرح سے گرانے کی تلقین کیے جا رہے تھے۔ اُن کی بیگم کا شاید اتنے بھاری نقاب کے اندر دم گھٹ رہا تھا اور اسی لیے وہ ہر پانچ سات منٹ کے وقفے کے بعد اپنا نقاب ذرا سا اُلٹ دیتی تھیں اور جلدی جلدی چار چھ لمبی سانسیں لے کر اپنا دم بحال کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن تبھی مولانا صاحب کی خشکیوں لگا ہیں اور اُن کا دھیرے مگر کڑے تیوروں کے ساتھ ”زیلغا“ بولنا ہی اُن کی بیگم کے لیے کافی ہوتا اور وہ بے چاری جلدی سے اپنا نقاب دوبارہ گرا دیتی تھیں۔ دراصل مولانا صاحب کا بھی تصور نہیں تھا۔ سامنے ہی بوگی میں دو نشستیں چھوڑ کر کالج کے تین لائبریری سے لڑکوں کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا جو ذرا ذرا سی دیر میں ریڈیو پر بجتے کسی گیت کی تال میں تال ملا کر اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے اور ایسے میں اُن تینوں کی نظر زیادہ تر اگلے حصے میں بیٹھی اُن دو نازک سی لڑکیوں پر ہوتی تھی جو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں باپ کے ساتھ شاید کسی قریب میں شرکت کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھیں۔ لڑکیاں شوخ تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر کھل کر ہنس رہی تھیں اور اپنی ماں سے کسی بات پر بحث میں مصروف تھیں۔ جب کہ لڑکیوں کے ماں باپ شادی پر دی جانے والی سلامی اور خرچے کے رونے رو رہے تھے۔ کالج کے لڑکے گاہے بگاہے پاس سے گزرنے والے پھیری والوں سے کبھی گرم بھنے ہوئے نمکین چنے، کبھی گزک تو کبھی لکھا اور فالسے کی بوتلیں خرید خرید کر لڑکیوں کے بھائی کو بھی اس دعوت عام میں شریک کر لیتے تھے اور اُن کی زیادہ تر خواہش یہی ہوتی تھی کہ یہ نیبو اور مرچ لگا بھنا، گرم مونگ پھلیاں اور نرم ریوڑیاں بھائی سمیت اُس کی دونوں بہنوں تک بھی ترسیل ہوتی رہیں۔ مولانا صاحب دل پر پتھر رکھے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے اور بار بار زیر لب ”لاحول ولا قوۃ“ کا ورد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اُن سے دو نشست پیچھے دو صاحبان بڑی شد و مد سے ایک دوسرے کے پتے اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے میں مصروف تھے، حالانکہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے اسٹیشن پر اُترتے ہی وہ یوں اپنی اپنی راہ لیں گے کہ پھر کبھی پلٹ کر بھی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھیں گے۔ لیکن بہر حال، وقت تو کسی طور کاٹنا ہی تھا۔ مجھ سے پچھلی نشستوں پر سرگیت اور بیڑی کے دھویں کے بادل تیر رہے تھے اور اس نیلگوں ماحول میں چار حضرات بیٹھے تاش کھیلنے

نجات کا معیار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ یا پھر شاید ہم ظاہر پرستوں کے پاس اس وقتی پیمانے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہو بھی نہیں سکتا تھا.....؟..... تبھی تو وہ مولانا اپنی پوری ”زیلجا“ میرے حوالے کر کے اطمینان سے پلیٹ فارم پر اتر چکے تھے۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی بیگم نے شوہر کے اُٹھتے ہی اپنا نقاب کچھ اس طرح سے کس کر لپیٹا اور یوں سکڑ سٹ کر بیٹھ گئیں کہ چاہ کر بھی کسی کی نظر اُن کی جانب اُٹھ نہیں سکتی تھی۔ جانے کیوں مجھے اُس وقت بہت شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ پردہ ہی عورت کی سب سے بڑی ڈھال ہے اور مرد کی غیر موجودگی میں یہ پردہ ہی عورت کا سب سے بڑا تعارف بھی بن جاتا ہے۔ مولانا کی بیگم کو جب تک میاں کی ڈھال میسر تھی وہ گاہے بگاہے خود کو بے نقاب بھی کر لیتی تھیں لیکن جیسے ہی اُن کی یہ آڑھ چند لمحوں کے لیے اُن سے کچھ دُور ہوئی تو فوراً انہوں نے اپنی ڈھال یعنی اپنے پردے کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنالیا۔ مجھے اُس پل ایک اور انجانا اور بہت عجیب سا اور اک بھی ہوا کہ مرد کی نظر اور عورت کی حیا میں دامن اور چنگاری کا تعلق ہے۔ مرد کی نظر چنگاری ہے تو عورت کی حیا ایک نازک دامن ہے۔ کبھی چنگاری دامن کی طرف لپکتی ہے تو کبھی دامن اس چنگاری کو ہوا دے کر بڑھکا دیتا ہے۔ اور نتیجہ دونوں صورتوں میں صرف اور صرف آگ بن کر ہی وارد ہوتا ہے۔ یہ دامن اور چنگاری کا کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

ٹرین کو اس اسٹیشن پر رُکے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہوئے تو کچھ لوگ معلومات کے لیے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ پتا چلا کہ چند لمحوں میں ہی کوئی کرا سنگ ہونے والی ہے لہذا اسٹل ملنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تبلیغی جماعت کے حضرات کو بھی موقع مل گیا کہ تب تک جلدی سے جماعت ہی کروالی جائے۔ نیچے اترتے اترے اُن میں سے کسی صاحب نے مجھے بھی دعوت دی اور میں بھی اُن کے ساتھ ہی نیچے پلیٹ فارم پر اتر آیا لیکن جماعت کھڑی ہونے سے پہلے ایک عجیب سی صورت حال آن کھڑی ہوئی۔ جن صاحب نے امامت کروانی تھی وہ اچانک پلٹے اور اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھ سے بولے ”حضرت..... آئیے آپ جماعت کی امامت کیجیے.....“ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا لیکن جب انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آگے کھڑا کرنا چاہا تب میں بالکل ہی ہولکھا گیا اور میں نے بڑی مشکل سے پوری جماعت کو یقین دلایا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا خود کو..... لیکن سبھی نمازیوں نے امام صاحب کی ہاں میں

”سلام مولانا جی..... میرا ایک سوال ہے آپ سے..... دراصل مجھے دعائے قنوت پوری اُنہیں ہوتی..... تو کیا میں عشاء کی نماز کے وتروں میں دعائے قنوت کی جگہ تین بار قل ہو اللہ بھلے لیا کروں.....؟“ لڑکے کے سوال کے خاتمے تک اُس کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر کراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف دقت گزاری اور لوگوں کی نظر کی برچھیوں کو لٹانے کے لیے یہ موضوع چھیڑ رہے تھے تاکہ انہیں اس گوری میم کے قریب بیٹھنے کا مزید

ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا جسم تو مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے رُومان کی رُوح کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹے ہیں۔

میں جانے کتنی دیر عشق اور رُومان کی یہ اُلجھی گھٹیاں سلجھاتا رہا۔ گاڑی کافی دیر سے کمال آباد نامی شہر کے جکشن پر کھڑی تھی۔ اچانک میری نظر باہر پلیٹ فارم پر پڑی اور کچھ دیر کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ اب میں واقعی جاگتی آنکھوں سے بھی سنے دیکھنے لگا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے زہرا کو کسی درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہو۔ ہاں بالکل..... وہ زہرا ہی تو تھی لیکن نقاب کے بغیر اور عورت بھی میرے لیے انجانی تھی، لیکن زہرا.....؟ یہاں.....؟ کمال آباد کے اس ریلوے پلیٹ فارم پر؟ اگلے ہی لمحے میں لپک کر اٹھا اور تقریباً دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا اور یہاں بھیڑ بھاڑ بھی کافی تھی لیکن ابھی تک میں دُور جاتی اُس عورت کی سفید بڑی سی چادر دیکھ سکتا تھا جسے میں نے زہرا کی اس شبیہ کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جب تک میں پلیٹ فارم کے خارجی دروازے تک پہنچتا تب تک وہ اسٹیشن سے نکلتی بھیڑ میں گم ہو چکی تھیں۔ میں نے لپک کر باہر دیکھا لیکن سڑک پر تانگوں، سائیکل رکشوں اور موٹر گاڑیوں کے اس ہجوم میں مجھے اُن دونوں کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اتنے میں گاڑی نے تیسری سیٹی بھی بجا دی اور جب تک میں بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک پہنچا، ٹرین تقریباً پلیٹ فارم چھوڑ ہی چکی تھی۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر بھی میں کافی دیر تک اسی اُدھیڑ بن میں ہی اُلجھا رہا۔ کیا یہ میری نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔ زہرا اتنی بھیڑ میں بنا نقاب کیسے گھوم سکتی ہے؟ اور پھر وہ اجنبی عورت اُس کے ساتھ کون تھی؟ لیکن روپ تو بالکل زہرا کا ہی تھا، وہی خیرہ کن اور مبہوت کر دینے والی ٹیبلٹ..... مگر وہ یہاں اس دُور دراز شہر میں کس غرض سے آ سکتی ہے؟ ایک بار تو جی میں آیا یہیں کمال آباد کے مضافات سے گزرتی ٹرین کی زنجیر کھینچ کر اتر جاؤں اور واپس شہر جا کر اُسے تلاش کروں لیکن کہاں.....؟ میرے لیے تو وہ شہر بھی اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کہ خود میرا یہ وجود ایک اُس لمحے میرے اپنے لیے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ہم یک لخت اپنے آپ ہی سے بیگانے اور اجنبی بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا وجود اور اپنی ہر کھوج اور کوشش بے معنی اور لا حاصل سی لگنے لگتی ہے۔

کچھ وقت اور موقع مل سکے۔ میرے ہونٹوں پر بھی اُس کا سوال سن کر مسکان آگئی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں..... میں تو خود ابھی تک تین بار قل ہو اللہ سے ہی کام چلا رہا ہوں۔“ میری بات سن کر اُس پاس بیٹھے سبھی لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ سارے لڑکے بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اُن میں سے ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ارے یار تم تو بالکل ہم جیسے ہو۔ پھر اتنی دیر سے یوں سنجیدہ سی صورت بنا کر کیوں بیٹھے ہو؟“ چند لمحوں میں وہ تینوں مجھ سے یوں کھل مل چکے تھے کہ جیسے میں بھی اُن کا کالج فیو یا ہم جماعت ہوں۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں اُن میں سے ایک نے مجھ سے یہ سوال بھی کر ڈالا کہ ”حافظ جی! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میں جو آج اُن کے ساتھ اس ٹرین میں بیٹھا ہوا یہ سفر کر رہا تھا، یہ راستے یہ منزلیں..... میرا کبھی کچھ اُس ایک محبت کی دین ہی تو تھا۔ پتا نہیں ہم محبت جیسے جذبے کو کبھی حلیے کی بنیاد پر کیوں پرکھتے تھے۔ کیا شرعی لباس پہننے سے، یا چہرے پر چند ہفتوں کی ڈاڑھی بڑھ آنے سے انسان ان لازوال رُوحانی جذبوں کا حق رکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے؟ میں نے اُسے جواب دیا کہ فی الحال تو میں محبت کی کھوج میں ہوں..... ہاں البتہ اگر کبھی اس کھوج میں مجھے کامیابی ہوئی تو اُسے ضرور مطلع کر دوں گا۔ سبھی لڑکے چلائے کہ ”مولانا آپ ہمیں اپنی شادی میں ضرور مدد کیجیے گا۔“ کبھی بوگی والے ہنس پڑے۔ اچانک ہی مجھے بہت ٹوٹ کر زہرا کی یاد آئی۔ کیا ہم کبھی واقعی مل پائیں گے؟ کیا یہ دنیاوی ملن جسے لوگ یہاں شادی کے بندھن کا نام دیتے ہیں، کیا یہی بندھن ہی صرف اسی زمینی محبتوں کی معراج ہوتا ہے؟ کیا صرف ایک رسم کے ادا ہو جانے سے اور ایک بندھن میں بندھ جانے سے ہماری محبت کی تکمیل ہو جاتی ہے؟ پر مجھے تو جانے کیوں یہ جسمانی ملاپ ہمیشہ سے ہی اُس گلابی اور اُن چھوئے احساس کی فنا جیسا لگتا تھا جسے ہم صرف دل سے دل اور رُوح سے رُوح کا ملاپ، یا محبت کہتے ہیں۔ مجھے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جیسے ہم اس بندھن کے سودے میں کچھ نہ کچھ محسوس کر دیتے ہیں۔ لا حاصل کی کسک اور دسترس سے دُوری کی تراب کا بھی تو اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے جس کا خمار ملکیت مل جانے کا احساس مٹا دیتا ہے۔ کبھی کچھ لوگ جس لمحے اس بندھن کی گانٹھ باندھ رہے ہوتے ہیں ٹھیک اُسی پل وہ اپنے رُومان کے اُمول سنہری جال کی گرہیں سدا کے لیے کھول بیٹھے

میں بھی ناامیدی اور مایوسی کے ایسے ہی گردابوں میں پھنسا ہوا تھا کہ اُن لڑکوں کی منزل آگئی اور مغرب سے پانچ منٹ پہلے ایک درمیانے درجے کے اسٹیشن پر وہ تینوں مجھ سے مل کر اتر گئے۔ اترنے سے پہلے اُن میں سے ایک نے شاید اپنا پتا، یا ٹیلی فون نمبر لکھ کر اُن دو بہنوں میں سے ایک کی جانب اُچھالا لیکن چائے والے لڑکے کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے وہ درمیان میں ہی کہیں گر گیا۔ تب تک لڑکیوں کے باپ کی توجہ اُن کی جانب ہو چکی تھی لہذا وہ مایوسی کے عالم میں مجھ سے گلے ملتے ہوئے دھیرے سے میرے کان میں بولا ”اپنی قسمت خراب ہے حافظ جی..... ہو سکے تو اترنے سے پہلے بڑی والی کو ارشد کا سلام کہیے گا۔ اُس کا نام ناہید بتایا ہے اُس کے بھائی نے.....“ فوراً ہی ٹرین نے جھٹکا لیا اور اسٹیشن ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ تینوں میری جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے مغرب کے وقت کے اندھیرے کا حصہ بننے لگے۔ حسب معمول مغرب کے وقت کے عجیب سے اثر نے میرے ارد گرد اداسی کے سائے لپے کر دیئے۔ میں نہ جانے کیوں اس زوال کے وقت اس قدر نڈھال سا ہو جاتا تھا۔ سارے دن کی تہائی ایک ہی لمحے میں میرے اندر بے سیرا کر لیتی تھی۔ اچانک ہی میرے ارد گرد چنبیلی کے تیل جیسی عجیب سی خوشبو کھڑ گئی۔ میں نے چونک کر سامنے والی برتھ پر نظر ڈالی تو ایک چھوٹے قد کا منحنی ساختہ شخص جس کے بال شاید اسی تیل میں چڑے ہوئے تھے اور پیچھے کی جانب چپکا کر بنائے گئے تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی، لیکن نیزے کی نوک جیسی چبھتی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ مجھے اُس کی آمد اور برتھ پر چڑھنے کی بالکل بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شاید وہ اُس وقت برتھ پر آ چڑھا ہو جب میں چلتی ٹرین میں ہی بیٹھے بیٹھے مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی چبھتی نظروں سے اُلجھن سی ہونے لگ گئی تھی۔ جانے یہ جبل پور کا اسٹیشن کب آئے گا۔ اُس نے شاید میرے اندر کی بے چینی بھانپ لی اور وہیں سے بولا ”کہاں جانا ہے.....؟.....“ میں سٹ پٹا سا گیا۔ ”جی..... جبل پور.....“ ”ہونہہ..... جبل پور میں کس کے پاس جاؤ گے.....؟.....“ مجھے بھی وہیں اُترنا ہے.....“ میں نے بات بنائی ”وہ مجھے لینے خود ہی اسٹیشن پر آ جائیں گے.....“ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ خود مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ مجھے جبل پور میں کس کے پاس جانا ہے۔ میں تو سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اس ٹرین میں آ بیٹھا تھا اور مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ مجھے

میں پور کے اسٹیشن پر اتر جانا ہے۔ لیکن شاید اُس کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی لگا تار اُسی رنج مجھے گھورے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے یوں لگنے لگا کہ اُس کی نظر کی یہ دھار میرے پور کے آ رہا ہو جائے گی۔ وہ تو بھلا ہوا سامنے بیٹھے ہوئے دیہاتی نما ایک مسافر کا جس نے اپنے کھانے کا ڈبہ کھولا اور کبھی مسافروں کو کھانے کی پیش کش کرنے لگا۔ حالانکہ اُس کے نقینہ شکل اتنا کھانا تھا کہ صرف ایک انسان کا ہی پیٹ بھر پاتا لیکن شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے ”رزق کی برکت اور فراوانی، نیت کی فراوانی سے متصل ہوتی ہے۔ اُس شخص کے کھانے کا پہلے ہی خالی تھا لیکن اُس کی نیت بھری ہوئی تھی اور باقاعدہ چھلک رہی تھی..... اور اس لگاؤ کا نور اور اطمینان اُس کے چہرے سے بھی صاف عیاں تھا۔ اُس نے لجاجت سے دے بھی کہا ”بیٹا..... ایک لقمہ تو لے لو..... میری خوشی کی خاطر.....“ میں نے مسکرا کر ایک لڈو ڈالا اور سالن میں بھگو کر منہ میں رکھ لیا۔ سچ ہے کہ خلوص اور محبت کا اپنا ہی ایک ذائقہ ہوتا ہے جسے اگر زبان کے ذائقے کے غدد نہ بھی محسوس کر سکیں پر رُوح اس ذائقے سے بخوبی آشنا ہوتی ہے۔ اس سارے ہنگامے میں کچھ پل کے لیے ہی سہی، پر کم از کم مجھے اس عجیب الخلقہ شخص کی گھورتی نگاہوں کے احساس سے نجات مل گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اوپر برتھ کی بنگاہ ڈالی تو وہ مرتبہ چادر تانے لیٹ چکا تھا۔ اگلے حصے میں بیٹھی بہنوں میں سے بڑی لڑکی، جس کا نام ارشد نے ناہید بتاتا تھا، نے اپنے ریڈیو کی سوئی گھمائی اور چند سرسراہٹوں کے رکی نغے کے بول فضا میں گونجے۔

”مالک نے بنایا..... انسان کو

انسان محبت کر بیٹھا.....

وہ اوپر بیٹھا..... کیا جانے.....؟

انسانوں پہ کیا گزری ہے..... گزری ہے.....

دیوانوں سے یہ مت پوچھو..... دیوانوں پہ کیا گزری ہے.....

تبلیغی جماعت میں سے ایک بزرگ جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے اُن کے چہرے پر لڑکی کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ دھیرے سے بڑبڑائے ”لا حول ولا..... یہ شاعر حضرات ناکیا کیا اول فول بکتے رہتے ہیں۔ یہ تو زنا کفر ہے..... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اُسے

اوپر بیٹھے کچھ خبر ہی نہیں..... نعوذ باللہ.....“

اسی جستجو سے اپنی تقدیر کو بدل سکے.....؟..... افسوس میرے پاس سوال تو بہت تھے لیکن ایک بھی نہیں تھا.....

میں نے ایسے ہی کچھ سوال ٹرین سے اُترتی ہوئی ناہید کی آنکھوں میں بھی دیکھے۔ شاید اترتے وقت مجھ سے یہی گلہ کر رہی تھی کہ میں نے ارشد سے اُس کا مکمل پتا خود ہی پوچھ لیا۔ کیوں نہیں بتا دیا.....؟..... اب وہ کبھی زندگی بھر اُسے دیکھ نہیں پائے گی۔ کسی سے بیاہ لے بیوی، پھر ماں، پھر نانی، دادی بن جائے گی لیکن جاڑے کی خشک رات کی طرح یہ غلغلہ ختم ہو جائے گا۔ دل میں کچھ سی پیدا کرتی رہے گی۔ ایک چہرہ وقت کی دھول میں لاکر مٹنے کے باوجود اُس کے کورے دل کے آئینے میں اپنا ہیولہ چھوڑ جائے گا۔ نہ جانے پہلے بھر میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرا دل اپنی ٹٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ مجھے یوں ناہید اور ارشد کے انجان مقدر کی پرچی کسی اور سے نہیں، خود مجھ سے ہی کہیں گم ہو گئی۔ ناہید کے اُتر جانے کے بعد میں خود بھی نہ جانے کتنی دیر یونہی گم صم سا بیٹھا رہا، تاوقتیکہ کوئی سے چلایا ”جبل پور آ گیا..... جبل پور.....“

میں نے چونک کر سر اٹھایا تو ٹرین رُک چکی تھی۔ میں اپنا مختصر سا بیگ لے کر اندھیرے پان سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ اسٹیشن سنسان پڑا ہوا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ٹرین بانے کے بعد صرف میں ہی وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ اچانک مجھے اس سناٹے میں پھر سے دو آنکھوں کی جھپکن کا احساس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا تو دُور اندھیرے میں وہی عجیب و غریب جسامت والا کمزور سا شخص ایک لیپ پوسٹ کی مرل سی پیلی روشنی کے دائرے میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں بل بھر میں ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک عجیب سی اٹک کا احساس ہوا۔ آخر یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا تھا.....؟

ساری تبلیغی جماعت نے اُن کی بات سن کر اپنا سر دھنا۔ شاید بغاوت اور شکر انسانوں کے خمیر کے ساتھ ہی گوندھا گیا ہوگا۔ تبھی ہم اپنے شعروں میں، اپنی دہائیوں میں اپنی شکایتوں میں اوپر والے سے اپنے حال سے بے خبر ہونے کی فریاد کرتے رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ شعر اور غزلیں بھی زیادہ مشہور ہوتی ہیں جن میں خدا سے شکوہ کیا گیا ہو۔ ہر بزدل جو خود اپنے دل کی بات براہ راست خدا سے کہہ نہیں پاتے وہ ایسے شعر اور غزلیں پڑھ ہی خوش ہو جاتے ہیں جس میں خدا کے سامنے اُس کی دی ہوئی تقدیر کی وجہ سے برابری فسانے بیان کیے گئے ہوں۔ شاید اسی لیے انسان کو ازل سے ”ناشکرے پن“ کے طعنے سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں شکوہ نہ کرنے والوں کا گروہ خود کو خدا زیادہ قریب تر اور پسندیدہ ہونے کا حق دار سمجھتا تھا، وہیں یہ سارے شاعر، ادیب اور اُن چھ دوسرے شکوہ گر بھی خود کو خدا کا سب سے زیادہ لاڈلہ بتاتے تھے۔ اب یہ تو خدا ہی جانتا تھا اُن نہیں سے زیادہ سچا کون تھا۔ ”جو ہم“ ”شکوہ کنان“، یا ”شکوہ گریزاں“.....؟

اگلے اسٹیشن پر دونوں شوخ بہنیں بھی اپنے بھائی اور ماں باپ سمیت اُتر گئیں۔ جاہل ہوئے بڑی بہن کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ مجھے ارشد کی کہی ہوئی بات یاد آگئی اور میرے ہونٹوں پہ خود بخود ایک دھیمی سی مسکان اُبھر آئی۔ ہمارے ارد گرد نہ جانے ایسی کتنی کہانیاں بننے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بعض مرتبہ تو خود ہمیں بھی پتا نہیں چلتا کہ ہمارے مقدر کی کوا سی نظر ہم سے چوک گئی ہے۔ محبت کی جانے کتنی داستانیں بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ارشد کا پھینکا ہوا پرچہ ناہید کے قریب گرنا اور وہ اُسے پڑھ لیتی تو کیا ہوتا.....؟..... اگر تقدیر صرف اُسی قدر لکھے کا نام ہے جو ہمارے ساتھ پیش آتا ہے؟ اور جو ہمارے ساتھ ٹپڑ آتے آتے پیش نہیں آتا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ارشد کے پھینکے ہوئے پرچے درمیان میں اُس شخص کا کاندھا نہ آتا اور وہ رُقعہ ناہید کے پیروں میں جا گرنا تو کیا اُن کی ار مختصر سی محبت کی کہانی کا انجام کچھ اور نہ ہوتا.....؟ کہیں ہماری بیک وقت دو تقدیریں تو نہیں لکھی گئی ہوتیں.....؟..... کہیں ہم ہر بار انجانے میں اپنی اصل تقدیر سے چوک تو نہیں رہے ہوتے.....؟..... کہیں خدا نے بندے کو یہ اختیار تو نہیں دے رکھا ہوتا کہ وہ اپنی ہمت اور محنت

سودوزیاں

نہت پر بیٹھ گیا اور اُس نے تانگے کو اینٹوں سے بنی سڑک پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد کوچوان نے اپنی جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور مجھ سے پوچھا ”بابو جی..... بیڑی پیسے ع.....؟“ ”نہیں..... میں بیڑی نہیں پیتا.....“ وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ ”اچھی بات ہے..... یہاں کی بیڑی ویسے بھی کچھ خاص ذائقہ دار نہیں ہوتی۔ بیڑی تو اصلی جبل پور کی ہوتی ہے..... وہی بارڈر پار والا جبل پور..... سنا ہے کہ وہاں بیڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہوتے تھے۔ جہاں سے ساری دنیا کو بیڑی بھیجی جاتی تھی..... پھر وہاں سے کچھ مزدور سرحد سے اس پار اس گاؤں میں آکر بس گئے اور انہوں نے یہاں بھی بیڑیوں میں دیہی تمباکو بھرنا شروع کر دیا تو اس علاقے کا نام بھی سرحد پار والے جبل پور کے نام پر پڑ گیا۔ پر جناب، اصل جبل پور زانی طرف والا ہے۔ ہمارا والا تو اُس کی نقل بھی نہیں..... کیا بات ہے اُس طرف کی بیڑیوں کی..... ایک کش میں ہی رُوح تازہ ہو جاتی ہے..... پر جی میری گھر والی کہتی ہے کہ بیڑی پینا کی لت ہے..... بندے کو آخری عمر میں ٹی بی ہو جاتی ہے..... پر جناب بیڑی نہ پی کر لمبی عمر پنے سے تو یہی بہتر ہے کہ بندہ بیڑی پی کر جلدی مر جائے.....“ وہ لگاتار اور بنا رُک کے بولے جا رہا تھا۔ شاید اُسے بہت دنوں سے کوئی اچھا سامع میسر نہیں آیا تھا۔ اُس کا نام بشیر تھا جواب براہو چکا تھا۔ یہ تانگا اُس کے باپ کے دور کی جاگیر تھا جو ترے میں اُس کے حصے میں آیا تھا اب وہی وہ واحد تانگا تھا جو گاؤں بھر کی سواریوں کو اسٹیشن چھوڑنے اور وہاں سے گاؤں کے لیے جانے کے کام آتا تھا۔ سردی کی وجہ سے دُھند بڑھتی جا رہی تھی اور ہم اب ایک کچی سڑک پر چلے تھے۔ کوئی دُور سے ہمیں دیکھتا تو ہم اُسے شاید بادلوں میں تیرتے ہوئے ہی نظر آتے۔ دُور اب تیزی سے ہانپ رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے گرم بھاپ وقفے وقفے سے بھاری اُڑ کے ساتھ یوں چھوٹ رہی تھی جیسے کوئی پرانا اسٹیم انجن دُور جا رہا ہو۔ بشیر نے تانگے، بانسوں کے اگلے سرے پر لگے گیس کے دونوں ہنڈولے جلا رکھے تھے اور اُن سے پھیلتی ندی سی روشنی میں ہم کبرے کی اس چادر کو چیر رہے تھے جس کی شدت کی وجہ سے ہم گز بھر بڑی چیز کو بھی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کسی آبادی کے آثار شروع ہوئے حسب معمول پہلا استقبال گلیوں کے آوارہ کتوں نے کیا۔ کچھ چیزیں، کچھ باتیں شاید دنیا کی خطے میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ رات کا فسون ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ کچھ

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اُس شخص سے اس آنکھ چھوٹی کا مقصد پوچھوں کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ ”کیا آپ کا نام عبداللہ ہے؟“ میں اس قدر حوٹھا کہ اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی سا شخص عام مزدوروں کے حلیے میں کھڑا نظر آیا۔ اُس نے اپنا صافہ سر پر خوب کس کر باندھ رکھا تھا اور پرانے بوسیدہ گرم کوٹ کو آخری بٹن تک خوب کس کر سینے پر باندھ رکھا تھا۔

”جی..... میں عبداللہ ہوں.....“ اُس نے میرا جواب سنتے ہی لپک کر میرا بیک اُٹھا لیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کریم خان صاحب نے بھیجا ہے۔ میرے پیچھے چلے آئیں.....“ میں اُس سے یہ بھی نہیں پوچھ پایا کہ یہ کریم خان صاحب کون ہیں جنہوں نے آدھی رات کو اُسے مجھے اسٹیشن سے لانے کے لیے بھیجا ہے۔ شاید اُس کے انداز میں ہی اتنی بے ساختگی تھی کہ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ اچانک مجھے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے شخص کا خیال آیا اور میں پلٹ کر دیکھا اور پھر میرے قدم جم سے گئے۔ لیمپ پوسٹ خالی پڑی تھی۔ وہاں اب دُور دُور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اندھیرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ پھر سے میرے رہبر کی آواز گونجی۔ ”بابو جی چلیں..... ہمیں بہت دُور جانا ہے.....“ میں چونک کر پلٹا لیکن پلیٹ فارم سے نکلتے نکلتے بھی میں نے کئی بار مڑ کر دوبارہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے تو نہ جانے زمین کھا گئی تھی، یا آسمان نگل چکا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت اس لیے ہوئی کہ اسٹیشن سے باہر نکلنا واحد راستہ صرف وہی بڑا سا آہنی دروازہ تھا جس کے قریب ہم اس وقت کھڑے تھے، پھر کہاں چلا گیا.....؟

میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو رات کے کبرے اور سفید بادلوں جیسی دُھند میں نے کُراہ خان کے بھیجے ہوئے بندے کو ایک تانگے میں کوچوان کی جگہ بیٹھ دیکھا۔ میں بنا کچھ کہے بھلا

دیواروں اور کچے دالان والی حویلی تھی۔ کرم دین جو وہیں بیرونی ڈیوڑھی کے پاس ایک چھوٹی سی لوہے کی انگیٹھی سلگائے ہوئے بیٹھا تھا اُس نے جلدی سے ایک پیڑھا میرے بیٹھے کے لیے اسی انگیٹھی کے پاس رکھ دیا اور خود جلدی سے اپنی کوٹھڑی سے سلور کی ایک بڑی سی چینک اٹھا کر لے آیا اور مٹی کے پیالے میں گرم گرم چائے انڈیل کر اُس نے میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ ہماری زندگیوں میں کچھ تعلق کس قدر مضبوط اور لازم و ملزوم بن جاتے ہیں جیسے صبح سویرے اور چائے کے کپ کا تعلق..... مگر جب چائے ایجاد نہیں ہوئی ہوگی تب لوگوں کی صبح کیسے ہوتی ہوگی؟ میں گرم پیالے کے کناروں سے نکلتی بھاپ کے عقب میں کرم دین کے بھریوں بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ ہمارے ٹھروں میں صبح ہمیشہ ایک دم چھم سے کود کر اور ایک چیختے چنگھاڑتے شور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب کہ یہ دُور دراز کے گاؤں اور علاقے ہر روز صبح کو ایک مہربان اور نرم اُجالے کی طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا عموماً مرغ کی بانگ، چرنے کی کوک اور بان گھٹ پر لگے ہینڈ پمپ کی چوں چوں سے ہوتی ہے۔ مویشی اور ڈھور ڈنگر چونک کر سر اٹھاتے ہیں اور بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی ٹن ٹن بج اُٹھتی ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد کمیت کی رکھوالی کرنے والے راکھے لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے منہ اندھیرے گھر کو لوٹتے ہیں تو اُن کے قہقہے راہوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پن چکی کی سیٹی بھی بلند ہوتی ہے۔ گھروں کے آنگن میں دودھ اور لسی بلونے کی رڑک گونجنے لگتی ہے۔ بڑے بوڑھے اور بزرگ کھنکار کھنکار کر جوانوں کی مست نیند میں رخنہ ڈالنے لگتے ہیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں شرق کی جانب سے ایک گلابی آگ فلک کو دھکانے لگتی ہے جو دھیرے دھیرے سنہری آتشیں رگت دھار لیتی ہے اور یوں نہ جانے کتنے مرحلوں کے بعد سورج اپنا دمکتا مکھڑا دھیرے دھیرے سر کاٹا ہوا گاؤں کی ایک روشن صبح کو مکمل کرتا ہے۔ اتنی خوب صورت صبحوں کے چشم دید گواہ یہ گاؤں والے تھے تو اتنے اُبلے چروں اور پاک من کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ صبح میری زندگی کی اُن چند صبحوں میں سے ایک تھی جسے میں نے گھونٹ گھونٹ جیا تھا۔ بالکل اس گرم باپ اُڑاتی چائے کے پیالے کی طرح..... جو اس وقت میرے ہاتھوں میں تھا تھا۔ میں نے آخری گھونٹ لیا ہی تھا کہ اندرونی پھانک کھلا اور اس میں لمبے قد کا ایک رعب دار شخص اپنے

ڈرانے والا، کچھ چھپانے والا..... اور بہت سے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا۔

تاتکا ایک بڑی سی کچی حویلی کے پھانک نما لکڑی کے دروازے کے قریب جا کر رُک گیا۔ بشیرے نے آواز لگائی ”اوئے کرمو اوئے..... مہمان آئے ہیں..... بوا کھول دے.....“ اندر سے کسی بوڑھے کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ ”آیا.....“ کچھ ہی دیر میں پھانک کھل گیا اور بشیرے نے تاتکا اندر وسیع صحن میں ہی ہکا دیا۔ صحن کچی اینٹوں سے چنا گیا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ حویلی کا بیرونی صحن ہوگا۔ کیونکہ صحن کے چاروں طرف مہمان خانے کے طرز پر کمرے بنے ہوئے تھے اور سامنے ہی ایک اور ڈیوڑھی نظر آرہی تھی جس کے اندر ایک دوسرا لکڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا جو اندر والے صحن کی جانب کھلتا تھا۔ بوڑھا کرمو اپنے ہاتھ میں ایک سال خوردہ سی لائین اٹھائے ہماری جانب بڑھا اور اُس نے جلدی سے مجھے سلام کیا اور میرا بیگ تھام لیا۔ بشیرے نے اُسے ہدایات جاری کیں۔

”مہمان کو روٹی نکر کھلا کرنے والے مہمان خانے میں سلا دینا۔ خان صاحب اب صبح ہی ملاقات کریں گے..... کیا سمجھا.....؟“ کرمو نے سر ہلایا۔ بشیرا مجھ سے رخصت ہو کر چلا گیا اور کرم دین نے مجھے پُرانے طرز کی ایک بیٹھک میں پہنچا دیا جو وہیں صحن کے دائیں طرف بنی ہوئی تھی۔ کمرہ کافی کشادہ تھا اور کھڑکی اس صحن کی جانب کھلتی تھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے بشیرے نے مجھے چھوڑا تھا۔ پٹنگ کے ساتھ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا چھت پر لگے ایک کنڈے سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کپڑے کے بنے ہوئے ہتھ پٹکے سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج کل سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے ڈوری کو پلیٹ کر پٹنگ کی پانچتھی سے باندھ دیا گیا تھا۔ بائیں طرف دیوار کے اندر ہی ایک بڑی سی انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس میں کچھ ہی دیر میں کرم دین نے دھکتے ہوئے انگاروں کی پوری پرات اُلٹ دی اور کمرہ کچھ ہی دیر میں خنک سے خوشگوار حدت اختیار کر گیا۔ کرم دین عرف کرمو کے اصرار پر میں نے چند لقمے حلق سے نیچے اتارے اور رات ڈھلنے کا انتظار کرنے لگ گیا۔ نیند کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ سہیلی تو ویسے ہی عام حالات میں بھی مجھ سے رُخس رہتی تھی تو اس انجان منزل پر بھلا کب میری پلکوں تلے ذریہ جانے والی تھی۔ سو یونہی پلکیں جھپکاتے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں باہر صحن میں نکل آیا۔ یہ پُرانے طرز کی بڑی سی لیکن کچی

سراپے کو گرم کھیں میں لپیٹے اندر سے برآمد ہوا۔ دو نوکر اُس کے دائیں بائیں اُس کا حقدار، تمباکو وغیرہ اٹھائے ہوئے تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے زور سے بھیج کر گلے لگا لیا۔

”معاف کرنا جی..... رات کو مجھے ذرا تپ چڑھ گئی تھی۔ دوا پی تو اُوگھ آ گئی اور میں آپ کا استقبال نہیں کر سکا۔ میرا نام کریم خان ہے..... سلطان بابا نے آپ کے آنے کی خبر کر دی تھی۔ پر آپ تو بالکل نوجوان ہو جی..... میں سمجھا تھا کہ سلطان بابا نے پہاڑی والی درگاہ کی خدمت کے لیے کسی بزرگ کو بھیجا ہو گا.....“

اودہ..... تو میری ڈیوٹی اس بار جبل پور میں لگائی گئی تھی۔ یہ تو مجھے اُسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب سلطان بابا نے مجھے ٹکٹ دے کر جبل پور کے لیے روانہ ہونے کو کہا تھا۔ لیکن اتنی دُور..... ملک کے اس دوسرے کونے میں بھیجنے کی کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔ صرف درگاہ کی خدمت ہی کرنی ہوتی تو سلطان بابا یہیں جبل پور کے آس پاس سے کسی خدمت گار کو بھی بھجوا دیتے۔ کریم خان نے مجھے بتایا کہ سلطان بابا سال چھ مہینے میں یہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ گاؤں سے پرے پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ میں مدفون بزرگ بھی کریم خان کے آباؤ اجداد سے ہی تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپاہیوں میں شامل تھے اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے انہی سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گئے تھے جنہوں نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں، جاں آفریں کے سپرد کی تھیں۔ تب سے لے کر اب تک اس درگاہ پر جلنا دیا کبھی بجھنے نہیں دیا گیا تھا اور اسے ایک نور کے استعارے کے طور پر لیا جاتا تھا جو اس دنیا میں ظلم اور کفر کے اندھیرے کو مٹانے کی نشانی کے طور پر روشن رکھا گیا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ اللہ کے وہ سارے نیک بندے جو ایسی درگاہوں اور مقبروں میں مدفون تھے جنہوں نے خدا کی وحدت اور اُس کے کلمے کی خاطر اپنی جان دی، یا اپنی ساری زندگی لوگوں کو یہ سمجھانے میں بتادی کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، انہیں اپنے مزاروں پر شرک جیسی بدعات دکھ کر کس قدر اذیت ہوتی ہوگی۔ جب وہ یہ دیکھتے ہوں گے کہ لوگ انہیں وسیلہ بنا کر خدا سے مانگنے کے بجائے خود انہی سے آس لگائے بیٹھے ہیں تو اُن کی رُوح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ کریم خان صاحب نے

پھاڑی تک جانا چاہتا ہے لیکن میں نے وہیں سے اُسے رخصت کر دیا۔ جاتے جاتے میں نے اُسے ایک بار پھر چھیڑا ”یہ تو بتاتے جاؤ کہ اگر اس بار واقعی بیٹا ہوا تو اُس کا نام کیا رکھو گے.....“ کچھ سوچا ہوا ہے پہلے سے کہ نہیں.....“ بشیرا جوتانگے پر بیٹھ کر اپنا چھانٹا پکڑ چکا تھا دھیرے سے مسکرایا اور اُس نے میری جانب غور سے دیکھا..... پہلے تو نہیں سوچا تھا جی..... پر اب سوچ لیا ہے..... میں اُس کا نام ”عبداللہ“ رکھوں گا.....“ بشیرا زور سے ہنسا اور تانگا چکی سڑک پر ٹپ ٹپ کی دھن پر دوڑنے لگا۔ میں کچھ دیر تک اپنے اس نئے بنتے رشتے کو دیکھتا رہا۔ ہم انسان کس قدر بھولے اور نازک ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی رشتوں کے کول دھاگے اپنی زوج کے ریشوں سے جوڑ لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم پل پل ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے اندر احساس نام کا یہ جو جذبہ رکھا ہے یہ ہمیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ ایک آس ٹٹی ہے تو دوسری جنم لے لیتی ہے۔ بشیرا بھی ایک نئی آس لیے واپس جا رہا تھا۔

جب میں اپنا سامان لیے اُوپر چوٹی پر بنی درگاہ کے کچے صحن میں پہنچا تو بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ دسمبر کی چکی دھوپ میں بھی میرا ہاتھ پسینے سے بھیگ چکا تھا اور اسی پسینے نے میرے ماتھے سے ٹپک کر درگاہ کی سرزمین کو اپنا پہلا سجدہ پیش کیا۔ میں کچھ وہیں صحن میں بیٹھ کر سستاتا رہا۔ میرے ارد گرد درجنوں کبوتر اور چڑیاں دانہ چک رہی تھیں۔ شاید کوئی کچھ دیر پہلے ہی انہیں دانہ ڈال گیا تھا۔ درگاہ کے صحن کے وسط میں مضبوط ٹین کی چادروں والی چھپرے کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی تھی جس کے اُوپر سبز چادر اور کچھ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خشک پتیاں تیز ہوا سے بکھر کر صحن میں پھیل رہی تھیں۔ اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا تو ایک بچی عمر کا مردشاںوں پر کسبل ڈالے اور ہاتھ میں جلانے والی لکڑی کے چند سٹکے لیے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ قریب آ گیا اور میری جانب ہاتھ بڑھا کر بولا ”اوہ..... تو تم ہو عبداللہ.....“ مجھے خان صاحب نے تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا نام اصغر ہے..... اصغر احمد..... میں اپنی ایک منت کے سلسلے میں کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں..... اچھا ہوا تم آ گئے..... کبھی کبھی بہت تنہائی کا احساس ہوتا تھا یہاں.....؟“

میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ کون سی منت تھی جس کی خاطر وہ

اولاد زینہ کی ”منت“ ضرور مانگوں۔ بدلے میں بیٹا ہونے پر وہ مجھے پورے ایک سوا کیا دن روپے اور گڑ کی پوری ایک پوری نذر کرے گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ ”ایک سوا کیا دن روپے میں وہ پورا بیٹا مانگ رہے ہو، کم از کم پورے دو سوا ایک روپے کی منت تو ہونی چاہیے۔“ بشیرے نے چونک کر پیچھے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں شرارت کی تحریر پڑھ کر وہ بھی زور سے ہنس پڑا۔ ”واہ جی..... جی خوش کر دیا آپ نے بشیرے کا..... اب مجھے پورا یقین ہے کہ بشیرے کی دعا بھی ضرور پوری ہوگی.....“ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس یقین کے ساتھ خود خدا سے دعا کیوں نہیں کرتا کہ اللہ اُسے بیٹا عطا کرے۔ جواب میں اُس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے ”ناجی نا..... بھلا یہ گناہ گار بشیرا اس قابل کدھر کہ خود اللہ میاں سے کچھ مانگ سکے..... اور پھر بشیرے کا مانگنا تو صرف مانگنا ہو گا نا جناب..... لیکن آپ لوگ تو اللہ جی سے ضد بھی کر سکتے ہو..... یہ کام صرف مانگنے سے نہیں ہوتا جی..... یہ تو ضد والا معاملہ ہے..... صرف دعا سے ہی بیٹا ملتا ہوتا تو میری گھر والی پچھلے سات سال سے سجدے میں نہ گری ہوتی.....“ میں نے چونک کر بشیرے کی جانب دیکھا۔ اس سیدھے سادھے سے دیہاتی نے دعا کا کتنا بڑا کلیہ بتا دیا تھا مجھے۔ لیکن کیا واقعی ہم اللہ سے ضد بھی کر سکتے تھے؟ اور اپنی خواہشیں اور دعائیں ضد کر کے بھی اس سے منوا سکتے ہیں؟ جب کبھی بہت لاڈلہ بچہ اپنی پسند کا کھلونا نہ ملنے پر گھر کے صحن میں پیر پیر شیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے تب یا تو اُسے اپنی ماں سے مار پڑتی ہے، یا پھر ممتا کی ماری ماں کسی بھی طرح مانگ مانگ کر اُسے وہ کھلونا دلوا ہی دیتی ہے۔ تو کیا یہی کلیہ اُس ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے کے ہاں بھی چل جاتا ہوگا؟ وہاں تو مار پڑنے کا بھی امکان نہیں تھا تو پھر ہم انسان اپنے خدا سے ضد کیوں نہیں کرتے.....؟ کہیں یہ ہمارے عقیدے کی کمزوری تو نہیں؟ کہیں ہم طلب اور دعا کے اصل اصول سے ناواقف تو نہیں.....؟

تانگا اب اس دورویہ ایستادہ درختوں والی سڑک سے آگے بڑھ کر ایک کھلے میدان والی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور دُور پہاڑی پر واقع ایک چھوٹی سی درگاہ کے آثار اب دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگے تھے۔ آخر ہم اُس مقام پر بھی پہنچ گئے جہاں سے آگے تانگے کے راستے کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ بشیرے نے بہت اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ ہی میرا سامان اٹھا کر اُوپر

درد اور مسیحا

اگلے روز صبح سویرے نیچے گھاٹی میں جبل پور کے ڈاکے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی سنائی دی۔ اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میں درگاہ کے صحن میں نکلا تو ڈاکیا اپنا خاکا نیلا لٹکائے بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتا نظر آیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اصغر صاحب کے لیے کوئی خط آیا ہوگا۔ ڈاکیا مجھے عبداللہ کے نام سے جانتا تھا لیکن اُس کی بات سن کر میں زور سے چونک پڑا۔

”جناب یہاں کوئی ساحر صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں کیا؟.....“
اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں خود ساحر ہوں۔ ”کیوں؟..... خیر تو ہے۔“
”جی سب خیر ہے۔۔۔۔۔ اُس کے نام کا ایک خط آیا ہے۔ پتا اسی درگاہ کا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ساحر کے نام کے سامنے چھوٹے حاشیے میں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔“
میں نے ڈاکے سے خط لے لیا اور خط پر لکھی تحریر دیکھتے ہی میری سانس جیسے رکنے لگیں۔ وہ زہرا کی تحریر تھی۔ ہاں۔۔۔۔۔ اُسی کے کوئل ہاتھوں کی انگلیوں کے شاہکار لفافے پر جگمگا رہے تھے۔

میں زہرا کی تحریر لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ حرف بھی تو ہم انسانوں جیسی ہی پہچان کتے ہیں ان میں سے ہر حرف اپنا ایک چہرہ رکھتا ہے اور میں زہرا کے ہاتھ سے بنے ان سیاہ کوئل کو خوب پہچانتا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور میری نظر سفید کاغذ پر لرے ان موتیوں پر پھیلنے لگی۔
”آداب۔۔۔۔۔“

مجھے ہر بل یہ احساس کیوں ستاتا ہے کہ آپ کو اس راہ پر دھکیلنے کے بعد میں خود ہی بار آپ کی راہ کا کاٹنا بن جاتی ہوں۔ میں اور اماں اس وقت کمال آباد میں ہیں۔ زندگی کی اٹ کسی جانب سرٹکانے نہیں دیتی۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا پتا پرانی درگاہ سے

اس ویرانے میں پڑے ہوئے تھے۔ کیوں کہ بظاہر اپنے حلیے سے وہ صاحب کافی متحمل خاندان سے دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ میں انتہائی قیمتی گھڑی، گلے میں سونے کی چین، انگلیوں میں ہیرے کی تین تین انگوٹھیاں اور چہرے پر دولت کی وہ خاص چمک جو اس درگاہ کے غریبانہ سے ماحول میں بھی اپنی جلوہ دکھا رہی تھی۔ میں نے اُن کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔
”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔۔۔۔۔ چلیں اگر تنہائی صرف ایک سے دو ہونے سے ختم ہو سکتی ہے تو پھر وہ نفری تو میری آمد نے پوری کر دی ہے۔۔۔۔۔ اُمید ہے ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔“
کچھ ہی دیر میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے اصغر صاحب کو بھی نماز کی دعوت دی لیکن مجھے اُن کا جواب سن کر ذرا سی حیرت ہوئی۔

”نہیں عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ میں اپنی نمازیں تنہائی میں ہی ادا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ دراصل اس کا تعلق بھی میری منت سے ہی ہے۔ اُمید ہے تم بُرا نہیں مانو گے۔۔۔۔۔“
”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ نماز آپ کا اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اپنی نماز ادا کریں، میں اپنی نماز پڑھ لوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر درگاہ کے صحن میں بنے ہوئے کچے کدوں میں سے ایک کی جانب بڑھ گئے۔ میرے رہنے کا انتظام بھی انہی کدوں میں سے ایک میں کیا گیا تھا لیکن میں نے وہیں صحن میں بچھے جائے نماز پر عصر پڑھ لی۔ حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی مجھے اُسی ازلی بے چینی اور مختلف دوسووں اور خیالات نے آگھیرا جو ہمیشہ سے میرے اور میری نماز کے درمیان حائل تھے۔ ششم پشتم نماز پڑھ کر میں نے سلام پھیرا اور یوں ہانپنے لگا جیسے میلوں دُور سے دوڑ کر آ رہا ہوں۔ مولوی خضر نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی نمازیں جو صرف زمین پر ہاتھ ٹکانے کی حد تک ادا کی جاتی ہوں، وہ پلٹ کر واپس نمازی کے چہرے پر مار دی جاتی ہیں۔ شاید یہی اپنی ہر نماز کے بعد مجھے اپنے چہرے پر ایک اُن دیکھے طمانچے کا احساس ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں نے اپنی نماز کو فلک چھوئے بنا ہی واپس پلٹتے ہوئے محسوس کیا اور اسی بے چین دل کے ساتھ درگاہ کی کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھت کی منڈیر سے سرکتی دھوپ مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ میری زندگی کا ایک اور قیمتی دن ضائع ہو کر گزر گیا ہے۔۔۔۔۔ آج بھی میں نے روز کی طرح صرف اپنا وقت ہی کھویا تھا۔۔۔۔۔ بدلے میں کچھ پانہیں سکا۔

اچانک اندر کی جانب سے ایک آہٹ ہوئی اور کسی عورت کے ہلکے سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں اُسے دکھ کر زور سے چونکا۔ یہ وہی عورت تھی جو اُس دن ریلوے اسٹیشن

زہرا کی ماں سے شادی کی تھی۔ تمہاری آمد کی اطلاع مجھے زہرا نے ہی کی تھی۔“ میں نے چینی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”لیکن زہرا کہاں ہیں.....؟“ ”تم نے آنے میں کچھ دیر دی۔ وہ لوگ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اپنے شہر کی گاڑی پکڑنے کے لیے نکل چکے ہیں۔ تمہارے لیے زہرا نے یہ لفافہ دیا ہے۔ دراصل مقبول صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں دل دورہ پڑا ہے۔ بس خدا اپنا رحم کرے۔“ میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ ”اگر وہ صرف آدھا گھنٹہ قبل یہاں سے نکلے ہیں تو شاید میں انہیں ریلوے اسٹیشن پر آخری لحاظ پر مل پاؤں.....؟“ مجھ سے ایک پل بھی مزید وہاں نہیں ٹھہرا گیا۔ وہ مجھے روکتی ہی رہ گئیں۔ میں کم از کم ایک پیالی چائے تو پیتا جاؤں لیکن میں اُن سے دوبارہ آنے کا کہہ کر تیزی سے کسی سواری کی تلاش میں لپکا۔

میں نے ٹرین کی پہلی سیٹی کی آواز اُس وقت سنی جب میں اپنی دھونکنی جیسی پھولتی سار کے ساتھ دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم کے مرکزی دروازے سے اسٹیشن کے اندر داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ انسانی نظر ایک پل میں کتنے مناظر اپنی بصارت میں سمیٹ سکتی ہے لیکن ایک لمحے میں میری آنکھوں نے پوری گاڑی کا یوں جائزہ لیا جیسے میری بصارتیں ہزار گنا بڑھ گئی ہوں لیکن وہ کہاں تھی جسے نہارے بنا میری دو آنکھوں کا یہ نور بس اس نعت کا ایک نثار ہی تو تھا۔ گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور میری حالت اُس وحشی کی طرح ہونے لگی جو اپنے جنوں میں قفس کی سنگلاخ دیواروں سے سرکھانے کے لیے اپنی زنجیریں تڑوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جانے پل بھر میں ہی کیوں مجھے وہ گاڑی ٹین اور لوہے کا جوڑ نہیں بلکہ ایک عرفیت نام آنے لگی جو کچھ ہی پل میں میری آخری سانس بھی مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ میں نے دیوانوں کی طرح ایک سمت قدم بڑھائے۔ ٹرین کو پہلا جھٹکا لگا۔ جب تک میں خود اپنی مرضی سے زہرا سے دور تھا تب تک میرے دل کو ایک انجانی سی ڈھارس تھی کہ وہ دُور سہی پر قریب ہے، لیکن آج جب وہ میرے وجود کے اتنے نزدیک ہو کر بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کسی کند چھری سے میرا سینہ چیر کر اُسے میرے دل میں پیوست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرا سارا صبر، تمام چین و قرار ایک پل میں ہی لٹ گیا تھا۔ یہ جلاد دل بھی ہم معصوم انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ

میں چند گھڑیوں میں ہی وہی پرانا ساحر بن گیا ہوں جو ساحلی درگاہ پر ایک کار ریس جیتنے کے بعد چند لمحوں بعد ہی زہرا کی پہلی نظر کا شکار ہو کر وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ”ایئر کنڈیشنڈ سلیپر، ہاں..... اس نازک اندام کو تو وہیں ہونا چاہیے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ گاڑی نے دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی اے سی والی بوگی تھی۔ دفعۃً میری سماعتوں کو دھوکا سا ہوا۔ ”ساحر.....“ یہ تو وہی رُوح میں اتر جانے والی آواز تھی۔ میں تڑپ کر پلٹا۔ ہاں..... وہ زہرا کی ہی آواز تھی۔ اے سی سلیپر بوگی کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میری سدا گردش میں رہنے والی تقدیر کا واحد روشن تارہ جھلک رہا تھا۔ میں اپنی جگہ ٹنڈ ہو گیا۔ اُس کا ڈبہ چیونٹی کی رفتار سے میری نظروں کے سامنے سے گزرا۔ وہ بے چینی سے پھر بولی۔ ”ساحر..... گاڑی چھوٹ رہی ہے.....“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کی بوگی مجھ سے چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ میں کھڑکی سے جھانکتی زہرا کی جانب لپکا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی۔ میرے شکستہ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری پلکیں بھینکنے لگیں۔ وہ تڑپ کر بولی ”خود کو سنبھالیں ساحر، میں نے سب کچھ خط میں لکھ دیا ہے۔ پڑھ لیجئے گا..... اور اپنا خیال رکھیے گا.....“ گاڑی نے مزید رفتار پکڑ لی۔ میری نظر زہرا کی نگاہ میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔ میری بصارت کے لیے دیگر ہر منظر جیسے دھندلا سا گیا تھا۔ وہ ٹرین، پلیٹ فارم، سیٹی بجاتا ٹی ٹی، وہاں پھرتے دیگر لوگ، وینڈنگ کنٹریکٹر، سارے قلی، کھرے میں لپٹی شام، گیس کے ہنڈولوں کی لمبکی پیلی روشنی کے دائروں میں ڈوبا وہ اسٹیشن، سب کچھ پل بھر کے لیے اوجھل سا ہو گیا۔ صرف میں اور وہ رہ گئے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ میرے گھائل قدم کسی چیز میں الجھ کر لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے بچا۔ زہرا نے بے قرار ہو کر بے اختیار اپنا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے مجھے گرنے سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن لوہے کی پٹری سے جڑے فاصلے تیزی سے اُسے مجھ سے دُور لے جا رہے تھے۔ اُس کا ہاتھ یونی فضا میں اٹھا رہ گیا۔ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اُس کی پلکیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ اُس کے لب ہلے، لیکن پہیوں کی گڑگڑاہٹ نے میرے نصیب کے لفظ بھی میری سماعتوں سے چھین لیے۔ جانے اُس نے کیا کہا تھا؟ شاید ”الوداع“..... لب تو میرے بھی ہلے تھے لیکن اپنے حرف تو میں خود بھی نہیں سن سکا تو بھلا اُس ناز خراماں کو کیا سنا

نگار سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن کہانی آج سے نہیں بلکہ بائیس سال پہلے شروع ہوتی تھی جب زہرا کے والد مقبول خان اپنی گریجوایشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہر پہنچے تھے۔ والدین کی اکلوتی اولاد اور بے پناہ دولت کی وجہ سے شاہانہ مزاج اور شہزادوں جیسی عادات تو شروع سے ہی تھیں، رہی سہی کسر جوانی نے پوری کر دی تھی اور شاید انہی چیزوں کے استخراج کی بدولت انہی کی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ نگار چند دنوں بعد ہی اپنا دل اُن کے قدموں میں ہار بیٹھی۔ مقبول بھی زیادہ عرصہ مزاحمت نہ کر سکے اور دونوں ایک جاں دو قالب کی تفسیر بن گئے۔ مقبول کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اُن کے والد یوں بچ تعلیم انہیں کسی بندھن میں بندھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لہذا فیصلہ یہی طے ہوا کہ فی الحال گھر والوں سے چھپ کر نگار سے شادی کر لی جائے اور کچھ عرصہ اس رشتے کو مخفی رکھا جائے۔ اُس وقت مقبول کا ارادہ یہی تھا کہ کسی مناسب موقع پر یہ راز والدین کے سامنے کھول دیں گے لیکن وہ مناسب موقع کبھی نہ آیا۔ اگلے سال نتیجہ آنے سے پہلے اُن کے والد کی طبیعت کچھ یوں بگڑی کہ مقبول کو سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگنا پڑا جہاں مقبول کے والد نے پہلے ہی سے اپنے بھائی کی بیٹی سے اُن کا رشتہ جوڑنے کا انتظام مکمل کر رکھا تھا۔ مقبول کے والد کی حالت کے پیش نظر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور شادی کے ٹھیک تیسرے دن والد اگلے جہاں سدھار گئے اور ٹھیک اُسی دن زریاب تین ماہ کی ہوئی۔ چالیسویں کے بعد جب مقبول نے تنہائی میں اپنی ماں کو نگار اور اپنی بچی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی صدے سے بے حال ہو کر بستر پر پڑ گئیں اور پھر انہوں نے قسم ہی کھا لی کہ جب تک مقبول اس چھوٹے گھر کی لڑکی نگار سے ہر رشتہ توڑ نہیں لیتے تب تک وہ انہیں اپنا حق نہیں بخشیں گی۔ اور یوں ایک عورت نے اپنے حق کی بخشش کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح ایک دوسری عورت کے حق پر ڈاکا ڈال دیا۔ نگار کو جب طلاق کا پروانہ ملا تو وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔ حالانکہ مقبول نے اپنی کمال آباد والی کوٹھی اور ماں اور بچی کی تربیت اور گزارے کے لیے بہت معقول انتظامات کر دیئے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد نگار نے اُس بے وفا کی دی ہوئی ہر سہولت اور آسائش کو ٹھکرا دیا۔ کئی سال بیت گئے اور زریاب کے ساتھ اُس کی چھوٹی بہن زہرا بھی جوان ہو گئی لیکن مقبول کی دوسری شادی اور طلاق کا راز راز ہی رہا۔ لیکن پچھلے ہفتے جب حاجی مقبول کو تیسرا دل کا دورہ پڑا تو انہیں اپنی ماضی کی غلطیاں یاد آئیں اور انہوں

دیتے.....؟..... کچھ ہی پل میں ہمارے درمیان وہی زمینی فاصلے حائل ہو گئے جو ہمیشہ سے اس نصیب جلی محبت کا مقدر ہوتے ہیں۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کافی آگے بڑھ چکی تھی اور اب دھیرے دھیرے اُس کھراؤ داندھیرے کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ تیزی سے دوڑتی گاڑی کی جانب سے میری طرف بڑھتے سرد ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے میرے گالوں تک پہنچے دو آنسوؤں کو مخالف سمت میں دھکیل کر اس فضا کا ایک حصہ بنا دیا۔ نہ جانے پانی کی وہ دو ٹمکنیں بوندیں کس بد نصیب کے دل کی زمین پر جا کر گری ہوں گی۔ لیکن جہاں بھی گری ہوں مجھے یقین تھا کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر گئی ہوں گی۔

میں نے جیب سے زہرا کا خط نکال کر وہیں پلیٹ فارم کے ایک بچ پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لیا۔ زہرا کی سوتیلی ماں کا نام نگار تھا اور انہیں اور زریاب کو میری جس مدد کی ضرورت تھی، وہ فوری نوعیت کی نہ ہونے کے باوجود اہم تھی۔ میں نے وہیں اسٹیشن کے تار گھر سے ہی پاپا اور اپنے دوست کا شف کو تار بھیجے اور خط کے بکسے میں خط بھی ڈال دیئے اور کاسنی حویلی کے نام بھی ایک خط لکھ دیا کہ وہ مطمئن رہیں میں نے حکام بالا کو اطلاع کروا دی ہے اور جلد ہی دوبارہ اُن سے آکر ملوں گا۔

اس تمام مصروفیت سے فارغ ہو کر میں رات کی آخری گاڑی لے کر جب جبل پور واپس پہنچا تو صبح کا سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کی طبیعت پہلے سے اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ انہیں سارا احوال بتا کر میں درگاہ کے پچھلے ایک ہفتے کے ترک شدہ معمولات میں جٹ گیا۔ لیکن سارا وقت میرے ذہن میں نگار اور زریاب سے متعلق زہرا کے لکھے ہوئے خط کے الفاظ ٹکراتے رہے۔

اگلی صبح میں گاڑی پکڑ کر کمال آباد بھی ہو آیا۔ میری توقع کے مطابق پاپا اور کاشف نے تمام متعلقہ حکام کو کاسنی حویلی کے مسئلے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ درگاہ میں میرے لیے کاشف کا ایک خط بھی موجود تھا جس میں اُس نے بتایا تھا کہ کمال آباد میں حالیہ تعینات اے ایس پی ہمارا ہی ہم جماعت خالد تھا جو سی ایس ایس کرنے کے بعد پولیس جوائن کر چکا تھا۔ خالد مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا اور اُس نے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین بھی دلایا۔

زہرا کے خط سے مجھے یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ اُس کی بھی اپنی ماں سمیت زریاب اور

نے اس جان لیوا بیماری کے بستر پر ہی زہرا کی ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ زہرا کی ماں تو کھل کر اپنے اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور کرجیوں کے شور کو بھی باہر نہیں نکال پائیں کیوں کہ اُن کے سہاگ کی حالت ہی اُس وقت کچھ ایسی تھی کہ انہیں اپنے پھٹتے ہوئے دل کی آخری سسکی کو بھی پی جانا پڑا۔ ہاں البتہ ماں نے تنہائی میں زہرا کے سامنے اپنے دل کے سارے سیلاب بہا دیئے۔ حاجی مقبول کی خواہش پر ہی زہرا اور اُس کی ماں کمال آباد آئے تھے تاکہ نگار سے مقبول کی خواہش کے پیش نظر اُس کی زیادتی کو درگزر کرنے کی درخواست کر سکیں۔ خود حاجی مقبول تو بستر سے کچھ ایسے لگے پھر دن بدن اُن کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ نگار نے وہی کیا جو کوئی اعلیٰ ظرف کر سکتا ہے لیکن اُس نے زہرا کی ماں کے ساتھ شہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر سے پرانے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتی تھیں اور ویسے بھی وہ خود بہت سی اُلجھنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہ کاسنی حویلی پہلے اُن کے دادا اور پھر باپ کی واحد اور آخری جاگیر تھی۔ لیکن دو سال پہلے زریاب کے نانا کے انتقال کے بعد اب زمانے کے گدھ اُن کی اس پشتینی جائداد اور بیٹی پر نظریں گاڑھے بیٹھے تھے اور وہ کسی بھی حال میں اپنے اس آخری خزانے کی حفاظت سے غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ اُن کی حالت کے پیش نظر ہی زہرا کی امی نے اُسے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ زریاب اور اُس کی ماں کی زندگی کا سب سے بڑا کائنات شہر کا مشہور غنڈہ جگن تھا۔ جو بیک وقت کوئل زریاب اور کمال آباد کے وسط میں کھڑی اُس کی جائداد کو ہتھیانے کے درپے تھا۔ اور جگن اس سلسلے میں ہر جھکندہ پہلے ہی آزما چکا تھا۔ میں نے زریاب اور نگار کو اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو ممکن ہوا، ضرور کروں گا۔ فی الحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ جگن کو علاقہ پولیس نے نقص امن کے خدشے میں مہینہ بھر کے لیے شہر بدر کیا ہوا تھا اور فی الحال اُس کی طرف سے ماں بیٹی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس رات میں نے پاپا اور کاشف کو جو تار اور خط بھیجے تھے وہ اسی مسئلے سے متعلق تھے کہ کمال آباد میں پولیس کی اعلیٰ قیادت کو کاسنی حویلی کی حفاظت کرنے کی درخواست کی جائے۔ میں جانتا تھا کہ کاشف تب تک نک کر نہیں بیٹھے گا جب تک سارا انتظام مکمل نہیں کر لے گا اور پاپا کا تو آئی جی پولیس کو ایک فون ہی کافی تھا۔ کہتے ہیں انسان ہی انسان کا سب سے بڑا درد اور انسان ہی اُس کا درماں ہے۔ لیکن فی الحال جگن کاسنی حویلی کا درد ثابت ہو رہا تھا۔ تیسرے دن ہی مجھے نگار کا پیغام ملا کہ جگن

”کاسنی حویلی“ پر وہی سدا پرانی یاسیت طاری تھی۔ اس شام عصر کے وقت جب میں پہنچا تو مجھے پوری حویلی میں پھولوں سے بھری کھاریوں اور اُن کی نہایت سلیقے سے کی گئی لہخراش کے پیچھے پیچھے ہنرمند ہاتھوں کا بھی پتا چل گیا۔ زریاب نہایت انہماک سے بڑا سا ہاتھ میں لیے پھانک سے متصل کھاری کی کاسنی پھولوں کی نل سے بے جان ڈالیاں اور لہجیاں اور ٹہنیاں تراش رہی تھی۔ شاید یہی اس پڑمردہ سے ماحول میں اس نازنین کا واحد اور تھا۔ تھی وہ اس کام میں اس قدر رگن تھی کہ اُسے میری آمد کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ لمحوں میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ گھبرا کر یوں پلٹی کہ اُس کے بے کار رنگ بھی انہی پھولوں کی طرح کاسنی سا ہو گیا۔ وہ جلدی سے مجھے سلام کر کے اندر لگی اور چند لمحوں بعد نگار اندر سے برآمد ہوئیں۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پتا چلا جگن نے خود تو پھرے کی وجہ سے حویلی کا رخ نہیں کیا لیکن اُس نے اپنے ہر کاروں کے لیے نگار کو یہ واضح پیغام بھیجا ہے کہ وہ کسی طور بھی زریاب سے دست بردار نہیں ہوگا اور یہ اردوہ پہرہ اُس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتا۔ زریاب جہاں بھی جائے گی وہ سائے کی راج اُس کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔ مجھے نگار کے چہرے سے ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ معاملہ پولیس، یا پھرے داری سے کہیں بڑھ کر تھا اور پھر پولیس کے سادہ لباس لے اہلکار بھی کب تک یوں کاسنی حویلی کے پھانک پر ٹنگے رہتے، یا پھر نگار اور زریاب کے پچھے بازار اور دیگر رزمہ کے آنے جانے کی جگہوں پر ڈوم چھلا بنے پھرتے رہتے؟.....؟

نارہ عورتوں کا تھا اور عورت کا پہرہ بذات خود ہمارے معاشرے میں ہزار سوالوں کو جنم دے

قدم اٹھا چکی ہوتیں۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا اس معاملے کے بیچ دغ پر غور کرتا رہا۔ اچانک میں نے نگار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو کر سفید ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے چونک کر اُس کی نظروں کے تعاقب میں پیچھے حویلی کے پھاٹک کی جانب دیکھا۔ ایک بھاری تن و توش اور گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص سر پر ترچھی قرآنی پہنے، ہونٹوں میں بیڑی اور کلوں میں پان دبائے ہوئے تانگا حویلی کے پھاٹک پر زکوائے ہمیں گھور رہا تھا۔ نگار کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز میں صرف اتنا نکلا..... جگن.....“

وہ شخص کچھ دیر تک ہمیں یونہی گھورتا رہا۔ پھر اُس نے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگا آگے بڑھ گیا اور پھر ایک دوسری لیکن انتہائی خوشگوار حیرت اُسی لمحے کے جلو میں میری مایوسیوں اور نا اُمید یوں پر پردہ ڈالنے کے لیے نمودار ہو گئی۔ تانگا بڑھتے ہی میں نے اُس کے عقب میں ایک سائیکل رکشہ کوڑکتے اور اُس میں سے سلطان بابا کو اترتے ہوئے دیکھا۔ چند لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ کمال آباد اور پھر کاسنی حویلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت عین میرے سامنے کھڑے میرے چہرے سے بے اختیار بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہے ہیں۔ نگار اور زریاب سلطان بابا کے لیے چائے وغیرہ کے انتظامات میں لگ چکی تھیں۔ میں نے سلطان بابا کو چند لمحوں میں ہی ساری کہانی ”الف“ سے لے کر ”ی“ تک سنا ڈالی، جسے سن کر وہ کافی دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر بہت دیر بعد سر اٹھا کر بولے ”کمال آباد کے آئی جی صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے مجھے اُن سے ملنا ہو گا.....“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ میں انہیں اس بات سے منع کر دوں یہ پولیس، یا قانون کا معاملہ نہیں تھا۔ مانا کہ آئی جی صاحب سارے ضلع کی کوتوالی جگن کے دروازے پر لا بٹھائیں گے لیکن اس سے بھی کیا ہو گا۔ وہ بھی جگن کو عمر بھر کے لیے تو قید نہیں کر پائیں گے نا..... یہ تو اُس کے دل میں پلتے کینے کو مزید بڑھاوا دینے کے مترادف ہو گا۔ لیکن چاہ کر بھی میں سلطان بابا کو یہ سب نہیں کہہ پایا اور سلطان بابا کے ساتھ اگلی صبح آئی جی صاحب کے دفتر جا پہنچا۔ ملاقات کا وقت صبح گیارہ سے بارہ بجے کا تھا اور ملاقاتیوں کی بھیڑ دیکھ کر مجھے کم از کم اگلے تین دن تک اپنا نمبر آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال میں نے قاعدے کے مطابق کاغذ کی ایک چٹ پر سلطان بابا کا نام لکھ کر استقبالیہ کلرک کو دے دیا جو دس پندرہ منٹ کے وقفے سے جمع شدہ

ڈالتا ہے۔ کیوں کہ ہم عورت کو پچاس فیصد قصور وار تو ازل سے ہی تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ باقی کسر شک کا پانچ، یا دس فیصد پورا کر دیتا ہے۔ اور معاشرہ اُس کے خلاف اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ نگار اور زریاب اور پولیس کے پہرے کی یہ ہم راہی بھی تو ایک طرح سے جگن کے اُس مقصد کی تکمیل تھی جو وہ زریاب کو بدنام کر کے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شرفا تو دیے! اس در سے سو قدم دُور چلتے ہیں جہاں ان وردی والوں کا پہرہ ہو اور اس پہرے میں اگر دونوں باہر بھی نکلتیں تو یہ مزید جگ ہنسائی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دینے کے مترادف ہوتا۔ اور پولیس جگن پر اُس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتی تھی جب تک وہ کوئی باقاعدہ ج نہ کرتا۔ وہ پہلے ہی علاقہ بدری کی سزا کاٹ کر آیا تھا اور اے ایس پی خالد اگر اُسے کسی بہانے سے دوبارہ جیل بھجواتا، یا پھر سے علاقہ چھوڑنے کا حکم دے بھی دیتا تو اس کی میعاد کیا ہوتی اور پھر کسی بھی دوسرے درجے کے وکیل کے ذریعے مجسٹریٹ صاحب کی عدالت سے پولیم کے اس حکم کے خلاف اتنا ہی پرچلایا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ بہر حال عدالت کسی بھی شخص کو مرز اس وجہ سے سزا نہیں دے سکتی تھی کہ اُس کی ذات سے دو کمزور اور معصوم عورتیں خوف زدہ ہیں۔ دھمکی ثابت کرنے کے لیے نگار کو عدالت کے پھیرے کاٹنے پڑتے اور زریاب کا دائر بھی اُلجھنے سے بچ نہ پاتا۔ جب کہ یہ سارا بکھیڑا ہی زریاب کے اُبلے دامن کو کسی بھی اپنے داغ سے بچانے کے لیے ہی کھڑا کیا گیا تھا۔ بات اگر کسی عفت مآب دویشیہ کی ہو تو یہ معاشرہ ہر طرف سے ایک دلدل ہی تو ہے۔ چھری خربوزے پر گرے، یا خربوزہ چھری کی زد میں آئے، نتیجہ تو ایک ہی تھا۔ دفعۃً مجھے محسوس ہونے لگا کہ جگن کے معاملے میں پولیس کو ڈال کر ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ اب یہ معاملہ پسند، یا لالچ سے بڑھ کر ضد اور انا کی سولہ بن چکا تھا جس پر جگن، یا زریاب میں سے کسی ایک کو ٹکنا ہی تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ نگار سے کہوں کہ وہ اپنا اور زریاب کا چھوٹا موٹا سامان باندھیں اور میرے ساتھ اسی وقت جیل کے لیے نکل چلیں۔ ابھی روشنی باقی تھی اور ہم رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے جیل پور پہنچ سکتے تھے۔ اگر جگن نے ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔ اور پھر جیل میں خان صاحب کی پوری حویلی موجود تھی ان دو مظلوم عورتوں کے سر پر سایہ کرنے کے لیے لیکن اگر کاسنی حویلی سے دست برداری ہی اس مسئلے کا حل ہوتا تو نگار خود بہت پہلے ایسا کلا

ناموں کی پرچیاں اندر آئی جی صاحب کے پی اے کو بھجوا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ اندر سے کچی عمر کے ایک صاحب جلد بازی میں برآمد ہوئے۔ اُن کی وردی پر لگے فیتوں سے زیادہ اُن کی شخصیت شاندار تھی۔ اُن کے پیچھے ہی بادردی اسٹاف، پولیس والے گارڈ اور چند اور عملے کے آدمی ہڑبڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ جس راہ داری میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں بھی کھلبلی سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ یہی صاحب آئی جی نصیر احمد ہیں۔ وہ سبھی لوگوں سے لائق تیر کی طرح ہماری جانب بڑھے اور گرم جوشی سے سلطان بابا کے گلے لگ گئے اور انہیں بڑی عزت اور محبت سے اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں حیرت سے اُن کی یہ ساری گرم جوشی دیکھتا رہا۔ دونوں نہ جانے کن کن زمانوں کی پرانی یادوں کو کافی دیر تک کریدتے رہے۔ نصیر صاحب کو بہت دیر بعد میرا خیال آیا اور انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ اُن کی سلطان بابا سے بہت مدت بعد ملاقات ہوئی ہے لہذا جذبات کی رو میں وہ میرا تعارف لینا بھول ہی گئے۔ ابتدائی تکلفات سے فارغ ہونے کے بعد اب مدعا کی باری آچکی تھی لیکن میں سلطان بابا کی فرمائش سن کر کچھ حیران ہوا۔ انہوں نے آئی جی صاحب سے جگن کو اُن کے آفس طلب کرنے کی فرمائش کی۔ نصیر صاحب نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا۔ ”کوئی خاص شخصیت.....؟..... جہاں تک میری معلومات ہیں، اس نام کا اس شہر میں ایک بدنام زمانہ اچکا اور لفتنگا رہتا ہے..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ سلطان بابا مسکرائے ”سب ٹھیک ہے نصیر صاحب..... بس یہ دھیان رہے کہ آپ کے عملے میں سے جو بھی جائے، اُسے میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں تک لے کر آئے.....“ اس مرتبہ نصیر صاحب کے ساتھ ساتھ میری بھی چونکنے کی باری تھی۔ آئی جی صاحب نے سلطان بابا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور فون پر کسی کو ہدایات جاری کر دیں کہ جگن کو عزت کے ساتھ اُن کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ میں ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پی اے نے نٹر کام پر بتایا کہ جگن کو لایا جا چکا ہے۔ آئی جی صاحب نے اُسے وہیں آفس میں بھیجنے کی ہدایت کر دی۔ کچھ ہی دیر میں جگن کمرے میں داخل ہوا۔ جگن جیسے غنڈے کے لیے آئی جی فیس میں طلب کیا جاتا بذات خود اُس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اُسے آج تک حوالدار سے لے کر سب انسپکٹر تک ہی بھٹکتے آ رہے تھے، جو کہیں نہ کہیں خود بھی جگن سے مرعوب ہی

ہے تھے۔ کوئی بڑا کیس ہو گیا تو انسپکٹر، یا ایس ایچ او آفس میں پیشی ہو جاتی تھی جہاں چھوٹے اہل کی خوشامد اور بڑے اہلکاروں کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کا وہ عادی تھا اور وہاں بلاوے اُس کے لیے اب صرف تفریح کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن اُسے یوں آئی جی آفس بھی طلب کیا جائے گا یہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دن کے لوگ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے اور آئندہ اُن کے ”دھندے“ یہ بلاوہ اُن کی ساکھ بڑھانے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن بہر حال آئی جی کا ہوا اور پھر نصیر صاحب کی شخصیت اور اُن کے دفتر کا وہ رعب دار ماحول..... یہ سب مل کر کسی غلط انسان کے حواس کچھ دیر کے لیے معطل کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اُس دن میں نے ی محسوس کیا کہ بعض مرتبہ عہدے سے بڑھ کر انسان کا سراپا بولتا ہے۔ نصیر صاحب کی یہ بھر کم شخصیت اور اُن کی اندر تک اتر جانے والی وہ گہری نظر کسی بھی چھوٹے موٹے مجرم ہاپانی کر سکتی تھی۔ لیکن جگن بہر حال علاقے کا دادا اور ایک گھاگ شخص تھا جسے کئی بار جیل کے بعد قانون کی اتنی سمجھ تو آ ہی چکی تھی کہ فی الحال اُس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کی پر اُسے کوئی سزا دی جائے۔ اور اپنے بلاوے سے لے کر آئی جی آفس پہنچنے تک وہ اپنے ل پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے سرد موسم کے باوجود دفتر میں داخل ہونے، لے کر اب تک کے مختصر عرصے میں وہ دو تین بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ چکا تھا۔ نصیر صاحب نے سر سے پیر تک ایک بھر پور نگاہ اُس پر ڈالی ”ہوں..... تو تم ہو جگن.....؟ ماں باپ کیا نام رکھا تھا؟“ وہ کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ”جی..... وہ..... جہانگیر..... سے ہوتے ہوئے نا پڑ گیا..... صاحب..... میرے کو یہاں.....؟“ نصیر صاحب نے اُس کا سوال منقطع کرتے ہوئے سلطان بابا کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ سلطان بابا ہیں..... میرے خاص ان..... یہ تم سے ملنا چاہتے تھے.....“ سلطان بابا نے آئی جی صاحب سے درخواست کی کہ انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اُن کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ملاقاتی کمرے میں جگن سے ملا کر لیں..... ویسے بھی ہماری وجہ سے اُن کے دفتر کے معمولات میں پہلے ہی کافی خلل پڑ رہا تھا۔ نصیر صاحب نے خوش دلی سے سر ہلایا اور چند لمحوں بعد ہم جگن کے سامنے ایک علیحدہ رے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ گزشتہ روز جگن کی مجھ پر کاسنی حویلی کے دالان میں

کھڑے ایک اچلتی سی نگاہ تو پڑ چکی تھی لیکن اُس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ اب اُس کا چہرہ باقاعدہ ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا لیکن جانے یہ سلطان بابا کا ٹھہرا ہوا لہجہ تھا، یا پھر اس ماحول کا اثر کہ وہ چاہہ کر بھی ہم سے کوئی سوال نہیں کر سکا۔ سلطان بابا نے شاید جان بوجھ کر کچھ زیادہ وقت لیا اور پھر دھیرے سے کھنکار کر بولے۔ ”معافی چاہتا ہوں جہانگیر میاں..... تمہیں اس طرح یہاں بلوا کر زحمت دی۔ اگرچہ پیاسے کو کنویں کے پاس جانا چاہیے، لیکن تمہارے پتے ٹھکانے سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کنویں کو پاس بلانا پڑا..... حالانکہ غرض ہماری ہی تھی.....“ جگن جو پہلے ہی سلطان بابا کے منہ سے اپنا اصل نام سن کر ہڑبڑایا سا ہوا تھا، اُن کی بات سن کر بالکل ہی بوکھلا سا گیا۔ ”نہیں نہیں بابا جی..... آپ کام بولو.....“ سلطان بابا کچھ دیر جیسے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اٹھا کر بولے ”نہیں..... یہاں کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا..... تم اپنا پتا دے دو..... میں اپنی درخواست لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا.....“ میں نے حیرت سے بابا کی طرف دیکھا، یہ کیا بات ہوئی.....؟ بھلا اس شہر میں جگن جیسے بدنام زمانہ کا پتا ڈھونڈنا کون سی مشکل بات تھی.....؟..... اور پھر اگر ہمیں اُس کے گھر جا کر ہی بات کرنی تھی تو پھر اُسے یہاں آئی جی آفس بلوانے کے لیے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی.....؟..... خود جگن کے لیے بھی سلطان بابا کی یہ بات کسی اچانک پھٹنے والے پٹانے سے کم نہیں تھی۔ انتظار بھی تو ایک طرح سے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے اور وہ دوبارہ اس پل صراط سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ لہذا اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ سلطان بابا اپنی بات وہیں کہہ ڈالیں لیکن سلطان بابا بھی شاید اُس کے گھر کی زیارت کا تہیہ کر کے ہی یہاں تک آئے تھے۔ سو آخر کار جگن کو ہی ہار ماننا پڑی اور بے دلی سے اُس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھوا دیا۔ نصیر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چلتے چلتے اُن سے کوئی بات کہی جسے میں آگے نکل جانے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے نہیں سن پایا۔ راستے بھر سلطان بابا خاموش رہے اور کاسنی حویلی پہنچ کر بھی میں نے حسب معمول اُن سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ جو بھی مجھ سے وہ جلد ہی کھل جائے گا۔ شام چاہے حویلی کے پھانک سے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں پھرتی لمبی سی تیج سیمیٹی اور اٹھ کھڑے ہوئے ”چلو میاں..... ذرا جہانگیر کے ہاں ہو آئیں۔“ انہوں نے

جگن کا اصلی نام سنا تھا وہ اُس کے تذکرے میں وہی نام لے رہے تھے۔ جب ہم سے باہر نکلے تو میں باہر آئی جی صاحب کی سرکاری موٹر کار کھڑی دیکھ کر زور سے چونکا۔ اُس کے ساتھ ہی باوردی شوفا اور چاق و چوبند محافظ کو دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی۔ آخر کروڑوں سے جگن جیسے غنڈے کے گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر سلطان بابا تو ایسے دوس سے ہمیشہ ہی اجتناب برتتے تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں.....؟ میں انہی سوچوں کو تھا جب گاڑی نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم ایک پس ماندہ سے علاقے میں داخل ہو جہاں کچی گلیوں کی مٹی میں اٹے بچوں نے کچھ دیر تک ہماری گاڑی کا پیچھا کیا اور پھر تھک حیرت بھری نگاہوں سے دھول اُڑاتی گرد کا حصہ بنتے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ پورے ہماری منزل کا بخوبی اندازہ تھا کیوں کہ اُس نے راستے میں ایک بار بھی ہم سے کوئی بات نہیں چاہی اور گاڑی سیدھی جگن کے بتائے ہوئے پتے پر ہی جا کر روکی۔ تب تک گلی تمام لوگ چوکنے ہو کر حیرت اور کچھ خوف سے آئی جی صاحب کے محافظ کو ہمارے لیے زے کھولتا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لیے بھی یہ جگن کی طرح ایک انہونی تھی کیونکہ آج تک مانے زیادہ سے زیادہ کسی سب انسپکٹر، یا ایس ایچ او کو جگن کے دروازے مغفلات جکتے، گز کے چند کلڑے مٹھی میں دبائے نظریں چرا کر جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس طرح لمبی سرکاری گاڑی میں سے ایک بزرگ درویش اُترتا وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے جو جگن کے ہاتھ پھیر کر اُسے دعائیں بھی دے رہا تھا۔ خود جگن کی اپنی سیٹی گم لگ رہی تھی اور اُسے سمجھ آ رہا تھا کہ ہمارا استقبال کیسے کرے۔ آئی جی صاحب کا ہمارے ساتھ پُر تپاک سلوک وہ چکا تھا اور اب ہمیں اُن کی گاڑی سے اُترتا دیکھ کر تو جیسے اُس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ اُس نے آج تک لوگوں کو خود سے ڈر کر نفرت سے بھاگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ یہ اُس لیے بھی ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ کوئی خود اُس کا مہمان بننے کے لیے اُس کے گھر کی دہلیز کے اُس کے کچے اور بوسیدہ صحن سے گزرا ہے۔ گھر میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ جگن کے چند بے کچھ ہی دیر میں لپک کر کسی قریبی بیکری سے چائے کے کچھ لوازمات پکڑ لائے اور اُن لہجوں اور حیرت آمیز نگاہوں کے درمیان ہمیں چائے بھی پیش کر دی گئی۔

خود میں بھی نہایت اچنبھے سے سلطان بابا کو یوں مزے سے چائے پیتا دیکھ رہا تھا جیسے

پڑنے پر ساری حکومتی مشینری اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں لیکن اُن کی آخری بات اور عاجزانہ درخواست نے جگن پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ آنے والوں کے ظرف کا پیمانہ اُس کے اندازوں سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ اُس کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی اپنے ہتھیار باہر میدان میں پھینک آئے ہیں، حالانکہ وہ چاہتے تو ان ہتھیاروں کی بدولت وہ یہ جنگ جیت بھی سکتے تھے۔ لیکن سلطان بابا کا مقصد جنگ کبھی تھا ہی نہیں..... وہ تو بس عاجزی ہی جانتے تھے۔ لہذا انہوں نے جگن کو درپردہ یہ احساس بھی دلا دیا کہ اگر وہ اپنے شرانگیز ارادوں سے باز نہ آیا تو بدلے میں اُن کے پاس زریاب کو کاسنی حویلی سے کہیں دُور لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کیوں کہ معاملہ ایک پردہ نشین کی حرمت کا ہے اور یہ وہ دودھاری تلوار تھی کہ جس کا شکار ہر حال میں وہ پری و ش ہی تھی۔ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے چپ ہو چکے تھے اور جگن کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اُس کے دل و دماغ میں اس وقت نہ جانے کتنے طوفان اور آندھیوں کے جھکڑ اپنی چیخوں سے اُتھل پھٹل چارہے تھے۔ وہ اُسی طرح گم صم سا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا تھا اور اُس پاس منڈلاتے اُس کے ہرکارے بھی دم سادھے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ماحول پردہ اعصاب شکن خاموشی طاری رہی۔ سلطان بابا نے اُٹھ کر جگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”اگر میری مانگ بہت بڑی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں میاں.....“ جگن کا جسم ذرا دیر کے لیے لرز سا گیا۔ میں بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ ہوا جو یہاں کے باسیوں کے لیے دیکھ پانا کبھی ممکن نہ تھا۔ جگن کو آج تک کسی نے زندگی بھر کبھی اتنی عزت اور پیار سے نہیں پکارا تھا۔ عزت تو دُور کی بات کسی صاحب اختیار نے اُس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ سلطان بابا نے اُس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ کیا رکھے کہ اُس کے اندر کا دس بارہ سالہ وہ یتیم بچہ کود کر باہر نکل آیا جسے آخری بار اسی محلے کی مسجد کے پیش امام نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی تھی۔ جگن کے فولادی جسم نے دو چار ہچکیاں لیں اور پھر وہ جامد برف کا پہاڑ کچھ یوں ٹوٹ کر پگھلا کہ اُس پاس سب ہی جل تھل ہو گیا۔ اُس کے کارندے اپنے اُستاد کو یوں بچوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر پہلے تو اُس کی جانب دوڑے اور چاہا کہ لپک کر اُسے سنبھال لیں لیکن اب اس پھرے دریا کے آگے بند باندھنا اُن میں سے کسی کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد خود اُن میں سے بھی

ہمارا واحد مقصد ہی یہاں آ کر جگن کی گلی کے کٹروالے ہوٹل کی تیز چینی والی چائے پینا ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ جگن کے خاندان کی ساری تاریخ معلوم کر چکے تھے۔ جگن بچپن سے ہی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور پھر چودہ سال کی عمر میں اُس نے وہ سرکاری یتیم خانہ بھی چھوڑ دیا اور تب سے مہینے کا ایک آدھ ہفتہ وہ کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل میں گزارنے لگا۔ رنر رنر علاقے میں اُس کی دھاک بیٹھتی گئی اور چھوٹے موٹے چور اُچکے اُس کے گردہ میں شامل ہوتے گئے اور وہ علاقے کا سب سے بڑا دادا بنتا گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد سلطان بابا نے پیالہ میز پر رکھا اور براہ راست جگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ”جہانگیر میاں..... تمہاری اتنی شہرت سنی تھی، تبھی اپنی ایک قیمتی چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھنے چلا آیا ہوں اور یاد رہے..... یہ کام پولیس، یا کو توالی کے بس سے باہر کا ہے۔ اُمید ہے مایوس نہیں کرو گے۔“ جگن گڑ بڑا سا گیا۔ ”لیکن آپ تو خود..... میرا مطلب ہے..... اچھا آپ بولو تو سہی..... میرے بس میں ہوا تو ضرور..... کیوں نہیں.....“

سلطان بابا کی نظریں اب بھی جگن پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ ”کاسنی حویلی کی ایک بیٹا ہے..... اپنی بیٹیا جیسی ہی ہے..... زریاب..... اسے بطور امانت تمہاری تحویل میں سونپنا ہے..... بولو..... کر سکو گے اُس کی حفاظت.....؟؟؟.....“ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گھمبیر نانے میں کسی نے کوئی کان پھاڑ دینے والا دھکا کر دیا ہو۔ جگن تو بوکھلا کر کھڑا ہو ہی چکا تھا۔ خور میرے کان بھی سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ سلطان بابا نے جگن سے براہ راست بات کرنے کے بجائے اتنا لمبا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر یہ درخواست وہ سیدھے راستے سے آ کر جگن کے سامنے پیش کرتے تو یقیناً وہ ہماری التجا کو بھی اُسی طرح ہلکی میں اُڑا دیتا جیسے ہر کمزور کی فریاد کا انجام ہوتا آیا ہے۔ سلطان بابا نے صبح ہی جگن کو یہ یاد کر دیا تھا کہ اُن کی ڈوری کہاں کہاں بندھی ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے شام تک کا وقت لے کر جگن کو خود کو اور انہیں مزید تولنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ اور پھر اب شام کو پولیس کے سب سے اعلیٰ عہدے دار کی گاڑی میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جگن کے دروازے پر اتر کر انہوں نے جگن کے حوصلوں پر آخری کاری ضرب بھی لگا دی تھی۔ اور اس ساری تمہید کا مقصد جگن کو صرف اتنا ہی احساس دلانا تھا کہ اُس کے مقابل اتنا وزن رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو وقت

لاریب

یونہی رات ہوئی اور پھر دن نکل آیا۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اصغر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی الجھن اور تناؤ کے آثار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ خاص طور پر نماز کے اوقات میں وہ عجیب بے چین سے نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن میں مذہب کو ہمیشہ سے ایک خاص حد کے اندر انسان کا بے حد ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں۔ لہذا میں نے کبھی بھی اُن کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ یونہی چار دن گزر گئے اور جمعرات کا دن آ پہنچا جب بشیر نے دیوں کا تیل بدلنے کے لیے آنا تھا۔ میں نے زور چوٹی سے نیچے گھاٹی میں بشیر کے کاٹا گاتے آتے ہوئے دیکھا لیکن آج تا نگے کی پچھلی نشست خلاف معمول ایک جالی دار پردے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر کچھ زنانہ سواریاں بھی تا نگے سے اتریں۔ کچھ دیر میں سب سے پہلے بشیر اور گاہ کے صحن میں وارد ہوا اور جلدی جلدی تیل کی پکی سے تازہ تیل ہر دیے کی کٹوری میں اُٹھیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ اُس کی زبان بھی چلتی رہی۔ ”خان صاحب کی حویلی کی زنانیاں آئی ہیں دعا کرنے، کرم دین بھی ساتھ ہے۔ لاریب بی بی آتی ہیں ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں..... اپنے خان صاحب کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ بڑی والی امینہ تو دو سال پہلے ہی بیاہ کر رحمان گڑھ کے چودھری اجمل کے ہاں چلی گئی تھی.....“ پھر جیسے بشیر نے کو کچھ یاد آیا اور وہ میرے قریب آ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”امینہ اور چھوٹی بی بی کی سگی ماں کا بہت سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب جو وہ بیگم صاحب لاریب بی بی کے ساتھ اُپر آ رہی ہیں وہ اُن کی سوتیلی ماں ہے..... خان صاحب نے بیٹیوں کے لیے دوسری شادی رچا لی تھی.....“

اتنے میں وہ دونوں درگاہ کے صحن تک آ پہنچیں اور بشیر نے کے رواں تمبرے کو جیسے بریک سی لگ گئی۔ آنے والیوں میں سے ایک مُرد باد اور سنجیدہ طبع تھی اور دوسری جو عمر میں چھوٹی تھی کافی شوخ و شنگ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر بشیر نے کی زبانی مجھے اس ماں بیٹی کے

چند اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ سچ ہے کہ شاید ”آنسو ہی بہترین کفارہ ہے۔“ سلطان بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اور جس وقت جگن ہمیں رخصت کرنے کے لیے اپنی گلی میں آیا تب تک اُس کا اپنے آنسوؤں سے ڈھلا ہوا چہرہ یہ صاف بتا رہا تھا کہ اب کمال آباد میں کاسنی حویلی کا اگر کوئی سب سے بڑا محافظ ہو گا تو وہ خود جگن ہی ہو گا۔ اب یہ طرف سے ظرف کا سودا بن چکا تھا اور آج تک اس بُرے انسان کے اندر کے ظرف کو تولنے کے لیے کسی نے اپنا ترازو یوں پیش ہی نہیں کیا تھا اور آج جب کسی صاحب ذوق نے اُسے خود کو اس کاٹنے پر پرکھنے کا موقع فراہم کیا تو اُس کے من کے اندر چھپی کان کا سارا سونا اس زنگ آلود آہن کے نیچے سے جھلک آیا تھا۔

اگلے روز جب ہم کاسنی حویلی سے رخصت ہوئے تو نگار اور زریاب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں اور سلطان بابا پھر سے کچھ نئے رشتے بنا کر اپنی اپنی راہ کے لیے نکل پڑے تھے۔ اسٹیشن پر جگن کا پورا ٹولا ہمیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ میں جبل پور کے اسٹیشن پر اترنے سے پہلے سلطان بابا سے جلد وہاں کا پھیرا لگانے کا وعدہ لینا نہیں بھولا۔ میں نے جبل پور اسٹیشن پر ہی زہرا کو ساری صورت حال ایک خط میں لکھ کر بھیج دی اور درگاہ کی جانب چل پڑا۔

”عبداللہ.....“ میں نے اُن کے سوال کے پہلے حصے کا جواب دینے سے گریز کیا۔
 اُن نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا اور بولیں ”اچھا عبداللہ..... تمہیں کچھ خدمت سرانجام دینا
 لی۔ ہمارا ہر جمعرات کو یہاں آنا ممکن نہیں، لہذا پچھلے خدمت گار کی طرح اب تمہی کو ہر
 رات یہاں نیاز بانٹنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ بشیر تمہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔ کوئی مشکل ہو
 پچھ لینا۔“

”جی بہتر.....“ وہ پلٹ کر جانے لگیں پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ اتنے میں دُور کھڑی
 ہزاروں کو دانہ ڈالتی لاریب بھی ہاتھ جھاڑ کر ہماری جانب بڑھ آئی۔ بڑی مالکن نے مجھ
 سے پوچھا۔

”تمہارے گھر والے کہاں ہیں..... شادی ہوئی ہے تمہاری.....؟“

”نہیں..... میں یہاں اکیلا ہوں..... ماں باپ دُور کسی شہر میں رہتے ہیں۔ میں اکلوتا
 ل۔“ اب لاریب کی باری تھی۔ میرا جواب سن کر وہ چونکی اور کچھ تیز لہجے میں بولی۔

”ارے..... تو انہیں بھی ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا نا..... وہ بے چارے اکیلے وہاں کیسے
 زارہ کرتے ہوں گے..... اُن کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دینا۔ بلکہ میں تو
 بتی ہوں اُن کو بھی یہیں بلوا لو..... پچھلے مجاور کا تو پورا خاندان اسی درگاہ میں رہتا تھا۔“

مجھے لاریب کی بات سن کر ماما کا جملہ یاد آ گیا کہ جہاں کہیں بسیرا کر وہیں بھی وہیں بلوا
 اور جانے کیوں یہ سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ آگئی کہ ماما اور پاپا
 ماما میرے ساتھ ہی اس درگاہ کے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہوں گے اور پتا نہیں کیسے میرے
 سے نکل پڑا۔

”پہلے میں خود تو اس دنیا کے طور طریقے اور رہن سہن سیکھ لوں..... پھر انہیں بھی یہیں
 لالوں گا.....“

لاریب اور بڑی مالکن نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ لیکن تیرکان سے نکل چکا تھا۔
 ب سے میں نے درگاہ کی زندگی اختیار کی تھی میری حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں
 پنے الفاظ، برتاؤ، یا کسی بھی اور طور طریقے سے دوسروں پر کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہونے دوں
 لاسے انہیں میرے ماضی، یا میرے رشتوں کے بارے میں کوئی بھی اندازہ ہو سکے۔

رشتے کا پتا نہ چلتا تو میں انہیں کبھی ماں بیٹی نہ سمجھتا، کیونکہ دونوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں
 تھا۔ شاید خان صاحب کی دوسری بیگم کی نوعمری میں ہی شادی ہوگئی تھی کیوں کہ وہ لاریب کی
 بڑی بہن ہی لگ رہی تھیں۔ دونوں نے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے فاتحہ پڑھی
 اور قبر پر پھول چڑھائے۔ میں جب کبھی ان قبروں پر لوگوں کو ازراہ عقیدت پھول چڑھاتے،
 یا اگر بتیاں جلاتے اور خوشبو بکھیرتے ہوئے دیکھتا تھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے
 چینی اور الجھن کا احساس ہوتا تھا جیسے ہم بیک وقت ان پھولوں کی نازک پنکھڑیوں اور اس قبر
 کی بے حرمتی کر رہے ہوں۔ اصغر صاحب نہ جانے صبح سویرے ہی کہاں نکل گئے تھے۔ میں
 احاطے کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی انگور کی بیلوں کی جانب بڑھ گیا جس کے پتے
 سردی کی وجہ سے زرد آتشیں رنگ کے ہو کر زمین پر یوں بکھرتے رہتے تھے جیسے کوئی مصور ہنر،
 دھانی اور زرد رنگوں کے چھینٹے کینوس پر گرانا چلا گیا ہو۔ انہی بیلوں کے نیچے شفاف پانی کی وہ
 کشادہ نالی بھی بہتی تھی جس کا منبع درگاہ سے باہر کسی اونچی چوٹی سے نکلتا ہوا ٹھنڈے میٹھے پانی
 کا وہ چشمہ تھا جس کا دھارا اسی درگاہ کے کھن سے اس نالے کی صورت ہو کر گزرتا تھا۔ اس
 بہتے جھرنے اور اس نالے کی رم جھم جھمی ٹیٹھی آواز نے درگاہ کے اس سکوت کو اور بھی
 مقدس بنا رکھا تھا۔ دو تین دن سے رات کو چونکہ سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا لہذا اس
 بہتے پانی پر شفاف سی برف کی ششے نما سی بن جاتی تھی، جو دن نکلنے اور دھوپ چڑھنے پر
 دھیرے دھیرے پکھل کر پھر سے اُسی رواں پانی کا حصہ بن جاتی تھی۔ اس وقت بھی ششے جیسی
 برف کی وہ پتلی سی تہ درمیان سے ٹوٹ کر پانی بن چکی تھی اور کناروں پر بچی اس کی باقیات
 قطرہ قطرہ پکھل رہی تھیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر سے برف اور پانی کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا کہ
 اچانک میرے قریب ہی بشیرے کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اور اُس کی بڑی
 مالکن نہ جانے کب سے وہاں کھڑے تھے۔ شاید مالکن نے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا لیکن
 میں اپنی محویت کی وجہ سے اُسے سن نہیں پایا۔ میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ وہ
 دھیرے سے مسکرائیں۔

”تو تم ہو اس درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو ابھی کم عمر ہو..... کیا جدی پشتی مجاور
 ہو.....؟ نام کیا ہے تمہارا.....؟“

۴۴ سے نیچے گاؤں کے بازار تک گیا تھا، کچھ لوگ اور لوبان وغیرہ چاہیے تھا۔ واپسی پر ہوئے رستے کی لالچ میں زیادہ چڑھائی چڑھ گیا۔ کم بخت اب عمر بھی تو نہیں رہی نا.....“

مصر صاحب حسب معمول بات کرتے وقت اپنے گلے میں پڑے اس سرخ دھاگا نما تعویذ پہنتے رہے جو میں پہلے دن سے اُن کے گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس دھاگے کی تختی اور اُن کے گلے میں پڑے سرخ نشانات دیکھ کر مجھے الجھن سی ہونے لگی فہم کی آخر اتنا کس کر دھاگا گلے میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ خواہ مخواہ ہی انسان خود کو ذہن میں ڈالے رکھے، لیکن میں ایک بار پھر اُن سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ شاید یہ دھاگا ہی اُن کی اسی منت کا ہی کوئی تسلسل تھا۔ مجھے گہری سوچ میں پڑا دیکھ کر وہ ہلکے سے سکرانے۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں ہمہ وقت میرے متعلق بہت سارے سوالات چلتے رہتے ہیں لیکن تمہاری یہی عادت مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ تم کبھی چاہ کر بھی پنے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ غیر ضروری سوالات سے اجتناب کرتے ہو اور یہی تمہارے گہرے اور اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے۔“

میں نے غور سے اُن کی جانب دیکھا۔ ”پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی شدید رد کا شکار ہیں۔ جب کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے ضرور کہیے گا۔“ اصغر صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

جبل پور ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں تھا جو چاروں جانب سے اُونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جن کی چوٹیوں کو شام ڈھلے عموماً بادلوں کی دھند ڈھک لیتی تھی اور پھر رات گئے، یا صبح دیر سے کچھ دیر کے لیے ہلکی بارش ضرور ہوتی تھی۔ گاؤں کا واحد بازار قصبے کے وسط میں واقع تھا، جہاں ٹین کی چھتوں اور لکڑی کے بڑے بڑے پرانے دروازوں والی چند دکانیں بٹوارے سے پہلے سے ایستادہ تھیں جن میں گندم، جو، گڑ، تیل اور دیگر راشن لیے بیٹھے دکان دار حیرت زدہ سی نگاہوں سے کسی اجنبی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ بازار کے آخری سرے پر ایک بڑا سا ٹال تھا جہاں سوختی لکڑی کے انبار سے لگے رہتے تھے۔ بازار کا لین دین زیادہ تر موسمی فصل کی بوائی اور کٹائی پر منحصر ہوتا تھا اور انہی دنوں میں لوگ اپنے پرانے اُدھار

دراصل میں جس راستے کا مسافر تھا اس کی منزل نمایاں ہونے سے نہیں بلکہ غیر نمایاں ہو کر نظر آ سکتی تھی۔ اسی لیے میں ہمیشہ بھیر اور ہجوم میں کھوئے رہنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن آج حد احتیاط کے باوجود شاید مجھ سے الفاظ کے چناؤ میں کوتاہی ہو ہی گئی تھی اور نتیجہ میں اسے سامنے کھڑی لاریب کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیرت سے اخذ کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ سورج کی ایک کرن اُس کی نازکی سی ناک پر پڑے کوکے سے منعکس ہو کر اُس کے گلابی چہرے پر نور کا ایک سنہری ہالہ سا بنا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا حسن پہلی نگاہ میں ہماری نظر کو خیرہ نہیں کرتا، بلکہ دھیرے دھیرے کچھ الگ زاویہ پر سے ہم پر کھلتا ہے۔ لاریب کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پرت در پرت کھٹنے والا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت شرارت سی بھری رہتی تھی اور اُسے ہمہ وقت اپنے نچلے ہونٹ دانٹوں میں دبائے کی عادت تھی جب کہ اُس کے چہرے پر بائیں گال پر ایک ہلکا سا گلابی گڑھا پڑ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ مسکراتی تھی، تب..... اور اس وقت یہ تمام کیفیات پوری طرح اُس کے چہرے پر واضح تھیں جب اُس نے میری بات کے جواب میں شرارتا کہا۔

”انہیں بھی یہیں بلوا لو..... ویسے بھی کافی کمرے خالی پڑے ہیں..... کچھ رونق ہی رہے گی۔“

بڑی مالکن نے کڑی نظروں سے لاریب کو گھورا۔ جواباً وہ منہ میں اپنی کالی چادر کا پلو با کر زور سے ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی کی آواز بالکل اس جھرنے سے مشابہ تھی جو درگاہ سے اُپر والی چوٹی سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ بڑی مالکن نے جانے سے پہلے مجھے دعا دی۔ ”کسی اچھے گھر کے لگتے ہو..... جیتے رہو.....“ وہ دونوں پلٹ کر چل دیں۔ بٹیرے نے جاتے جاتے مجھے یاد دلانا ضروری سمجھا کہ مجھے اُس کی منت کے پورا ہونے کی دعا کرتے رہنا ہے۔ کرم دین ہانپنا کانپنا اپنی لکڑی کی بڑی سی ڈانگ سنبھالے حویلی کی پیسیوں کے آگے تیز تیز دوڑا چلا جا رہا تھا۔ نیچے اُتر کر وہ تانگے پر بیٹھیں اور تانگا آگے چل پڑا۔ اسی اثنا میں اصغر صاحب بھی پسینہ مٹا کر شرابور درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت دُور سے پیدل چل کر آ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے اُنکو کی بیلوں کے نیچے رکھے گھڑوں میں سے ایک گلاس پانی بھر کر انہیں پیش کیا جسے وہ ایک ہی سانس میں اُنڈیل گئے۔ ”خوش رہو میاں..... میں دراصل کما

خان کو لگتا تھا کہ خدا نے اُس کے سبھی اچھے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں صائمہ کی صورت میں اُسے دے دیا تھا۔ دونوں بیٹیوں نے بھی ماں کو ماں سے زیادہ اپنی سہیلی اور سہیلی سے بڑھ کر ماں سمجھا اور اُسے وہی ماں دیا جو وہ اپنی سگی ماں کو دے سکتی تھیں۔ لاریب تو ویسے بھی صائمہ سے بہت قریب تھی اور دونوں ہی ایک جان دو قالب کی تشریح بنی اس اُونچی حویلی میں اپنے جیون بیتا رہی تھیں۔ لاریب کو کتابوں سے بے حد شغف تھا اور کریم خان نے بیٹی کی سہولت کے لیے حویلی میں ہی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی جہاں ہر ہفتہ پندرہ دن کے وقفے کے بعد شہر سے چند نئی کتابیں ضرور شامل ذخیرہ کتب ہو جاتی تھیں۔ لاریب کو اپنے بی اے کے رزلٹ کا انتظار تھا جس کے بعد وہ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن فی الحال کریم خان اس کے حق میں نہیں تھے مگر لاریب کو یقین تھا کہ اپنی ہر ضد کی طرح وہ اس بات کو بھی اپنی لاڈلی ماں کے توسط سے منوالے گی۔ ویسے بھی وہ تھی ہی اتنی شوخ و شنگ کے اُس کے ناز کے سامنے اُس کے باپ کا غصہ کچھ کم ہی ٹھہر پاتا تھا۔ سارا دن حویلی میں اُس کی ہنسی اور قہقہوں کا جل ترنگ بجاتا رہتا تھا اور وہ پورا دن کسی کو بھی تک کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ صبح سویرے دھوپ نکلتے ہی رضائیاں اور انگلیاں دھوپ میں ڈالی جا رہی ہیں تو گیارہ بجے گرم پکڑے اور سمو سے تلے جا رہے ہیں۔ ابھی اندر کا ہنگامہ ختم ہوا نہیں کہ سہ پہر سے پہلے آسمان پر بادلوں کی گھٹا دیکھتے ہی حویلی سے ماحقہ باغ میں جھولے ڈلوائے جا رہے ہیں۔ ابھی پہلی بوند گرتی نہیں کہ بارش کے پکوان باغ کے جھولوں تلے بننا شروع۔ ابھی نوکر باغ میں تیل کی کڑائیاں پہنچا کر اپنی کمر سیدھی بھی نہیں کر پائے ہوتے کہ شام کی چائے کا غلغلہ شروع، ساتھ ہی ساتھ دو پٹوں کی رنگائی اور سادوں کے لیے نئے کپڑوں کی بنائی، درزی تو سال بھر جیسے حویلی کے دروازے سے ہی منگا رہتا تھا۔ اور پھر مغرب ڈھلی نہیں کے حویلی کے سب سے بڑے کمرے میں انگیٹھیاں جلوانے کی دوڑ دھوپ شروع، خشک میوے کی پراتیں فافٹ وہاں پہنچا دی جاتیں اور پھر رات کے کھانے کے فوراً بعد گرم قہوہ، ببز، یا کشمیری چائے بڑے بڑے فنجانوں میں وہاں کمرے میں پہنچا دی جاتی اور پھر جب کریم خان باہر کے کھیروں سے فارغ ہو کر اپنی جیوتی بیٹی کے پاس آتے تو پھر رات گئے تک ماں باپ دونوں ہی بیٹی کی باتوں کی سرگم سے محفوظ ہوتے رہتے، وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی، چند لمحوں میں ہی سب

اُتارتے اور ایک نیا قرض سر پر اناج کی بور یوں سمیت اٹھائے چلے آتے۔ پھر بھی یہ سب لوگ خوش باش رہتے تھے اور اُن کی ہنسی اور آنسوؤں میں آنسوؤں کا ذائقہ ابھی خالص تھا۔ سچ ہے کہ زندگی الگ چیز ہے۔ زندہ رہنا الگ بات ہے۔ میں نے جبل پور کے لوگوں کو زندہ محسوس کیا تھا۔ اُن کی نیند پُرسکون تھی اور صبح اُن کے لیے دھوپ کی صورت میں سورج کا خنجر لیے وارد نہیں ہوتی تھی۔ قصبے کا واحد مال دار اور متمول گھرانہ کریم خان صاحب کا تھا جن کی حویلی پورے گاؤں کی واحد اور باعث تکریم نشانی تھی۔ خود کریم خان کا دل بھی اُن کے نام کی طرح بڑا تھا اور گاؤں کے نہ جانے کتنے گھرانے در پردہ اُن کی اعانت سے ہی چل رہے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد اُن کی زندگی کا محور اُن کی دو بیٹیاں ہی رہ گئیں تھیں۔ وہ بچیوں کو دل کا چھالا بنا کر رکھتے تھے اور اُن پر سوتیلی ماں لانے کے بے حد خلاف تھے لیکن سال بھر میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ لڑکیوں کی تربیت میں ایک خاص عنصر اُن کی ماں کا بھی ہوتا ہے جو ایک عورت کی موجودگی سے ہی پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسی عورت کہاں سے ملتی جو اُن کی بیٹیوں کو ماں نہیں، ایک سہیلی بن کر پالتی۔ آخر کار بزرگوں کی نظر میں کریم خان کی مرحومہ بیوی کی چھوٹی بہن صائمہ پر پڑی جس نے ابھی تازہ تازہ بارہویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور وہ درحقیقت کریم خان کی دونوں بیٹیوں کی پسندیدہ خالہ بھی تھی۔ تب کریم خان کی بڑی بیٹی ایند سا توں جماعت میں تھی اور سیکینہ نے ابھی چوتھی جماعت میں قدم رکھا تھا۔ یوں صائمہ اگلے مہینے ہی دو کپڑوں میں بیاہ کر کریم خان کی حویلی میں چھوٹی مالکن سے بڑی مالکن کی گدی سنبھال چکی تھی۔ ایسے وقت میں کریم خان کے سرال والوں کے ایثار اور سمجھ داری نے بھی بڑا کردار ادا کیا ورنہ صائمہ کی ماں کا دل تو اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو یوں رخصت کرتے وقت کتنا جا رہا تھا۔ لیکن دوسری جانب بھی تو اُن کے اپنے جگر ہی کے دو کٹڑے تھے جن کے لیے انہیں یہ قربانی دینا ہی تھی۔ صائمہ بیاہ کر کریم خان کے گھر آگئی اور پھر اُس نے ماں کے نام کے ساتھ لگا یہ ”سوتیلی“ کے لاحقے کو کچھ اس طرح سے مٹایا کہ لوگ سوتیلی لفظ کو ہی بھول گئے۔ صائمہ نے دونوں بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور بڑی کو تب تک رخصت نہیں کیا جب تک وہ قریبی ضلع سے بی اے کی فرسٹ ڈویژن کی ڈگری لے کر گھر واپس نہیں آگئی۔ اِسا طرح وہ آج کل اُسی تن دی سے لاریب کو اُس کی گریجویشن کی تیاری کروا رہی تھی۔ کریم

بار ہے تھے اور درمیان میں تھوڑا بہت ہوش آتا بھی تو بے سدھ سے پڑے رہتے۔ وہ ہڈیاں میں کچھ عجیب سی باتوں کی گردان بھی کر رہے تھے۔ ”توڑ دوں گا..... میں اس دھاگے کو توڑ دوں گا..... مجھے آزاد کر دو.....“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں کیسے سنبالوں کیونکہ مجھے ایسی کسی تیمارداری کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اور میرے پاس یہاں درگاہ میں ایسی کوئی خاص دوا بھی نہیں تھی جو اس بیماری میں انہیں پلا سکتا۔ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ انہوں نے آج تک کبھی اپنے کسی اتے پتے سے بھی مجھے آگاہ نہیں کیا تھا، نہ ہی مجھے اُن کے کسی اور رشتے دار وغیرہ کا پتا تھا۔ آدھی رات تک مجھ سے جو بھی بن پڑا وہ میں نے کیا لیکن اُن کی حالت سدھرنے کے بجائے مزید گہڑتی ہی گئی اور آخر کار مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ مجھے نیچے گاؤں جا کر کسی مدد کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن یوں آدھی رات کو میں کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ مجھے تو وہاں نیچے کسی حکیم، یا طبیب کا بھی پتا نہیں تھا۔ لہذا اس نیم شب میں جب سردی رگوں کو اندر سے کاٹ رہی تھی اور گاؤں بھر میں کسی بھی ذی روح کا نشان تک ڈھونڈنے سے نہ ملتا تھا، میں نے بڑی حوصلی کے پھانک پر دستک دی اور پھر جانے کتنی دیر بعد کسی دربان کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولنے والا کرم دین نہیں تھا، کوئی دوسرا کئی عمر کا مرد تھا جو یوں آدھی رات کو اپنی نیند خراب کیے جانے پر کافی حد تک برہم بھی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے پھانک کھلتے ہی درشت لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے.....؟“

میں نے اُس کے لہجے کو نظر انداز کر دیا۔

”میرا نام عبداللہ ہے..... میں پہاڑی والی درگاہ کا مجاور ہوں..... میں.....“ اُس نے

میری بات پوری ہونے سے قبل ہی کاٹ دی۔

”صبح آنا..... اس وقت سب سو رہے ہیں.....“ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند

کرنے کی ٹھانی اور زیر لب کہا ”نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات..... یہ بھی کوئی وقت ہے مانگنے

کا.....“ وہ مجھے کوئی بھکاری سمجھ رہا تھا۔ دیے ٹھیک بھی تھا، ہر طلب گار بھکاری ہی تو ہوتا

ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے روکا۔

”مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے..... دراصل اُوپر درگاہ میں ایک مریض کی حالت بہت

کو اپنا بنا لینے والی۔ حویلی کے کبھی نوکر بھاگ بھاگ کر اُس کے کام یوں کرتے تھے جیسے اُن سے ذرا سی بھی تاخیر ہوگئی تو اُن کی لاڈلی مالکن کہیں اُن کے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر دے گی۔ اور وہ تو دن بھر اس آس میں اپنے کان اپنی چھوٹی مالکن کی پکار پر لگائے رکھتے تھے کہ کب اُس کے مٹھے لبوں سے اُن میں سے کسی کا نام نکلے اور وہ دوڑتا، یاد دلاتی ہوئی اپنی ہر دل عزیز مالکن کے پاس پہنچ جائیں۔ تبھی تو کرم خان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنی اس بولتی مینا کو ایک بار پھر سے یونیورسٹی ہوسٹل کی بھول بھلیوں میں بھجوا دے۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو وہ شہر کے کالج سے امتحان دے کر لوٹی تھی۔ اب وہ کسی طور بھی اپنی لاڈلی کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن باہل جانے پیار پالتے ہوئے ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ بیٹیاں تو سدا سے پرایا دھن ہوتی ہیں۔ صائمہ بھی ہمیشہ شوہر کو یہی سمجھاتی رہتی تھی کہ بیٹی سے اتنا زیادہ پیار اور لگاؤ بعد میں بہت تڑپاتا ہے۔ لیکن ان جذبوں پر انسان کا قابو ہوتا تو پھر زندگی میں رونا ہی کس بات کا تھا اور پھر کچھ لوگوں میں کچھ ایسی ہی بات بھی تو ہوتی ہے، دل میں کھب جانے والی..... وہ بھی ایسی ہی تھی..... چند لمحوں میں ہی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر کر خون سے تحلیل ہو جانے والی..... اور اُس کی یہ شوخ طبیعت اور قہقہے اب واقعی حویلی کے در و دیوار میں تحلیل ہی تو ہو چکے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے آتے جاتے بشیرے اور کسی حد تک کرم دین سے پتا چلتی رہیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ ماما کی تاکید کے مطابق میں انہیں ہر ہفتے تاکید سے خط لکھ دیتا تھا اور ہر پندرہواڑے میسر آنے پر فون بھی کر لیتا تھا۔ اس دن بھی جب میں گاؤں کے واحد تار گھر سے ماما سے فون پر بات کر کے واپس درگاہ آیا تو بے حد ادا تھا۔ ماما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے خود تو نہیں بتایا لیکن پاپا سے جب بات ہوئی تو انہوں نے دبے لفظوں میں اُن کی طبیعت کا ذکر کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سلطان بابا کا کہیں اتنا پتا ملے تو میں اُن سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر ہو آؤں۔ لیکن شام ڈھلنے سے پہلے ہی اصغر صاحب کو شدید بخار نے آ گھیرا۔ سردی کی شدت کافی بڑھ چکی تھی اور وہ نہ جانے دن بھر کہاں بھٹکتے رہتے تھے۔ شاید اسی آوارہ گردی کے دوران انہیں سردی لگ گئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی بے سدھ ہو گئے اور مجبوراً مجھے انہیں کمرے میں اٹھا کر لانا پڑا۔ اُن کی بے ہوشی کے وقفے گہرے ہوتے

دوسرا مسیحا

نہی ہے..... مجھے اُس کے لیے کچھ دوائیں چاہئیں..... آپ اگر خان صاحب سے جا کر.....
اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ”نہیں نہیں..... خان صاحب اس وقت کسی سے
نہیں ملتے..... اور اب اس آدھی رات کو میں کہاں سے دوا دارو کا انتظام کروں.....؟“
اگر واپس نہیں جاسکتے تو یہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں ایک طرف پڑے رہو، خان صاحب صبح کی
نماز کے لیے اُنھیں گے تو تمہاری بات کروادوں گا..... اب جاؤ اور مجھے بھی سونے دو.....“

اُس نے ایک بار پھر مجھے دھتکار کر پھانک بند کرنے کی ٹھانی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ اُسے کس طرح سے صورت حال کی نزاکت سمجھاؤں۔ میں نے بھی مجبوراً واپسی کی ٹھانی۔
اتنے میں اندروالی ڈیوڑھی کے اندھیرے سے کسی عورت کی آواز ابھری۔

”دروازے پر کون ہے جمالے.....“

حویلی کا دربان چونک کر پلٹا۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے سے بڑی مالکن اور لاریب آگے
بڑھ کر دیوار کے ساتھ لگی جلتی مشعل کی روشنی میں آگئیں۔ وہ دونوں جانے کب دروازے پر
بات چیت اور بحث کی آوازیں سن کر ڈیوڑھی میں چلی آئیں تھیں۔ دربان گھبرا سا گیا۔
”پتا نہیں کون بھکاری ہے جی..... آدھی رات کو خان صاحب کو جگانے کا کہہ رہا تھا۔
میں نے کہہ دیا کہ ہم اس وقت اُن کی نیند خراب نہیں کر سکتے..... جو بھی چاہیے، صبح آ کر لے
جائے، بڑی مالکن.....“ انہوں نے جمالے کی بات پر دھیان نہیں دیا اور آواز دے کر بولیں۔
”کون ہے دروازے پر..... سامنے آؤ.....“

میں نے پھانک سے اندر قدم رکھ کر انہیں سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکیں۔ لاریب بھی
حیران سی تھی۔ ”عبداللہ..... تم..... خیریت تو ہے.....“

میں نے انہیں اصغر صاحب کی بیماری سے لے کر حویلی کا در کھٹکھٹانے تک کا تمام ماجرا
سنادیا۔ انہوں نے فوراً لاریب کو اندر سے میڈیکل بکس لانے کا کہا اور جمالے کو ٹھیک ٹھاک
جھاڑ پلائی کہ اُسے کتنی بار منع کیا ہے کہ کسی بھی سائل کو یوں دروازے سے واپس نہ لوٹایا
کرے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کرم دین کی گھر والی، جو حویلی کے احاطے میں ہی اپنی کوشٹری میں
بیمار پڑی تھی، کی دوا بنا کر اُسے دینے کے لیے جا رہی تھیں کیونکہ طبیب نے اُسے ہر چھ گھنٹے
کے بعد ایک تازہ دوا کی خوراک دینے کی تاکید کی تھی۔ اور لاریب کی ضد تھی کہ وہ خود ہی انہیں
دوا کھلائے گی کیونکہ کرم دین کو شک تھا کہ اُس کی گھر والی ان کڑوی کیلی دواؤں سے تنگ آ کر
اب انہیں آنکھ بچا کر بہا دیتی ہے۔ لہذا اب دوا کی تمام خوراکیں لاریب کی نگرانی میں پلائی
جاتی تھیں۔ اور پھر جب لاریب جاگ رہی ہو تو بھلا وہ اپنی سیکلی اپنی پیاری ماں کو کہاں
سونے دے سکتی تھی اور یہی جگ راتا انہیں رات کے اس پہر دروازے تک لے آیا۔ ورنہ
شاید مجھے پوری رات وہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں انتظار کرنا پڑتا۔ لاریب کچھ ہی دیر میں

بچے اُن کی حویلی کے مہمان خانے میں منتقل ہو جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ پتا نہیں کیوں اصغر صاحب ایک رات بھی درگاہ سے باہر نہیں گزرا نا چاہتے تھے۔ شاید یہ بھی اُن کی مانی ہوئی منت کی کوئی مجبوری تھی؟ خان صاحب نے جاتے وقت حکیم کو تاکید کہ وہ اصغر صاحب کے ٹھیک ہونے تک دن میں ایک مرتبہ درگاہ کا پھیرا ضرور ڈال جایا کریں کیوں کہ خان صاحب اصغر صاحب کو بھی اپنا مہمان سمجھتے تھے اور مہمان کی تیمارداری اور علاج میں وہ کوئی غفلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیب کے جانے کے بعد اصغر صاحب بہت دیر تک ممنونیت بھرے لہجے میں میرا شکریہ ادا کرتے رہے کہ میں نے اُن کے لیے بڑی زحمت برداشت کی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں موضوع بدلنے پر آمادہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اُن کا دھیان بٹایا۔ اس دن میں نے اُن سے احتیاطاً اُن کا پتا اور چند حوالے پوچھ کر ایک کاغذ پر لکھ لیے تاکہ آئندہ کسی ایسی ہنگامی صورت میں کام آسکیں۔ انہوں نے بے دلی سے مجھے اپنا پتا نوٹ تو کروا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خاص طور پر یہ تاکید بھی کی کہ میں حتی الامکان کوشش کروں کہ یہ پتا راز ہی رہے اور صرف اور صرف اُن کی موت کی صورت میں ہی اُن کے گھر والوں سے کوئی رابطہ کیا جائے۔ میں نے جب چونک کر اُن کی جانب دیکھا تو وہ مجھے ایک بے حد ٹوٹے ہوئے انسان دکھائی دیے۔ ”لمبی کہانی ہے میاں..... پر تمہیں سناؤں گا ضرور..... تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ بس ذرا میری طبیعت سنبھل جانے دو.....“ میں نے انہیں دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے منع کیا اور انہیں نیند کی گولی دے کر باہر صحن میں چلا آیا۔ سفید بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے نیلے آسمان پر آنکھ پجھکی کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک کسی پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے جا چھپتا اور پھر باقی سب اُسے ڈھونڈنے کے لیے ہوا کے دوش پر اُس کے پیچھے بھاگے جاتے۔ پھر اُن میں سے کوئی ایک اُسے جا پکڑتا اور اُن کے پیچھے باقی لگ جاتے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک ہوا، آسمان اور بادلوں کا یہ لافانی کھیل دیکھتا رہا۔ کبھی نرم چمکیلی دھوپ نے درگاہ کی منڈیروں کو چوم چوم کر انہیں الوداع کہنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُن سے یہ وعدہ بھی کرتی جاتی کہ کل صبح وہ پھر اُن سے ملنے آئے گی، لہذا وہ اداس نہ ہوں۔ لیکن شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میری اداسی تو بڑھتی ہی تھی، مجھے یہاں اس دھوپ جیسا کوئی دوست میسر نہیں تھا جو اس شرط پر مجھ سے الوداع ہوتا کہ ”کل پھر ملیں گے.....“ مغرب کی اذان کا

میڈیکل بکس لے آئی جس میں بخار کی انگریزی دوائیں بھری پڑی تھیں۔ بڑی مالکن نے دو بکس میرے حوالے کیا اور مجھے دوا پلانے کے بارے میں کچھ ہدایات جاری کر کے واپس درگاہ جانے کا کہا جب کہ جمالے کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً جا کر حکیم صاحب کو جگائے اور انہیں لے کر اوپر درگاہ مریض کے پاس پہنچے۔ ویسے تو گاؤں میں ایک سرکاری ڈسپنسری بھی تھی لیکن اُس کا پچھلا سرکاری ڈاکٹر سفارش کروا کر کسی بڑے ضلع میں اپنا تبادلہ کر چکا تھا اور پچھلے ڈیڑھ سال سے کسی نئے ڈاکٹر کی تعیناتی کھٹائی میں پڑی ہوئی تھی کیوں کہ جس کو بھی اس دور دراز علاقے میں تعینات کیا جاتا وہ آنے سے پہلے دوڑ دھوپ کر کے اپنا تبادلہ زکوالتا تھا۔ میں دواؤں کا بکس لے کر پلٹنے لگا تو بڑی مالکن نے مجھے آواز دی۔ ”سنو عبداللہ.....“ میں ٹھٹھک کر پلٹا تو وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ ”جمالے کی باتوں کا بُرا نہ ماننا..... تم کوئی مانگنے والے نہیں..... اس گاؤں بھر کے مہمان ہو..... لیکن تمہارے ساتھ آج جو برتاؤ اس حویلی کے دروازے پر ہوا ہے اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں..... خان صاحب کو پتا چلے گا تو وہ اس جمالے کی خوب خبر لیں گے.....“

میں نے جلدی سے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میرا حلیہ ہی شاید ایسا ہے کہ جمالے کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو دھوکا کھا جاتا۔ آپ خان صاحب کو اس ساری تفصیل سے آگاہ نہ کیجیے گا۔ یہ میری آپ سے گزارش ہے۔ معاف کرنے میں بڑائی ہے..... آپ بھی جمالے کو معاف کر دیجیے.....“

اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا ”جیتے رہو.....“ لاریب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن تب تک میں وہاں سے پلٹ چکا تھا۔ میں اوپر درگاہ میں پہنچا تو اصغر صاحب بالکل ہی بے سدھ پڑے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن کے حلق میں دوا اُنڈلی۔ کچھ ہی دیر میں جمالہ بھی حکیم صاحب کو لے کر پہنچ گیا اور حکیم نے بڑی جانفشانی سے دن چڑھے تک اصغر صاحب کی کچھ ایسی دیکھ بھال کی کہ دوپہر تک وہ بمشکل آنکھیں کھولنے کے قابل ہو سکے۔ حکیم صاحب ابھی وہیں موجود تھے جب خان صاحب بھی تیمارداری کے لیے درگاہ آ پہنچے اور کافی دیر وہیں اصغر صاحب کے سر ہانے بیٹھے رہے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ اصغر صاحب کچھ دن کے لیے

وران کے سامنے خان صاحب کے ساتھ پیٹھے سگار پی رہی تھی اور زور و شور سے کوئی بحث ہاری تھی۔ ممانے مجھے یوں جے دیکھا تو خود ہی لپک کر مجھ تک پہنچیں اور انہوں نے مجھے زور سے بھیج کر گلے لگا لیا۔ پاپا بھی اٹھ کر ہماری جانب چلے آئے۔ ماما کی آنکھوں سے جیسے ہوں کا زکا سیلاب بہہ نکلا۔ پاپا بھی ہم دونوں کو چپ کرواتے کرواتے اپنی آنکھیں بھگو بیٹھے اور ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دیتے دیتے میرے اپنے آنسو میرے گالوں سے ٹپکتے ہوئے ممانے دامن کو بھگونے لگے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے پاپا سے فون پر بات کی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ میرے لیے بے حد اداس ہیں۔ اگر کل صبح صاحب بیمار نہ پڑتے تو میں خود اُن سے ملنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ لیکن میرے فون کے دھما سے رہا نہیں گیا اور وہ سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے پاپاسمیت یہاں آ پہنچی تھیں۔ مجھے ماما کی طرف سے یہ سختی سے تاکید تھی کہ میں جہاں بھی بیرا کروں، اپنے مکمل پتے سے سب سے پہلے انہیں آگاہ کر دیا کروں۔ اس لیے مجھ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور لپور میں جب اتنی بڑی گاڑی داخل ہوئی تو سبھی نے یہی سمجھا کہ ہونہ ہو یہ اُن کے خان صاحب کے ہی مہمان ہوں گے، لہذا جس پہلے راہ گیر سے راستہ پوچھا گیا وہ انہیں درگاہ کے اُسے سیدھا خان صاحب کی حویلی تک لے آیا۔ نتیجتاً اس وقت ماما پاپا دونوں میرے سامنے ملے ہوئے تھے۔ ماما کی آنکھیں اب بھی بار بار چھلکی جاتی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہم ان کو یوں روتا دیکھ کر خود خان صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں ماما اور پاپا کو سنبھالا۔ ماحول کی اداسی کچھ کم ہوئی تو خان صاحب نے شکوہ کر ہی ڈالا۔ ”تو اللہ میاں..... تم عبداللہ نہیں ساحر ہو..... لیکن میاں تم نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کر..... اب جبل پور والے اس زیادتی کا قرض کیسے اُتاریں گے.....؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اب عبداللہ ہی ہوں۔ ہاں اس سے پہلے ساحر تھا لیکن ہاں سے میرا تعارف عبداللہ ہی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ براہ کرم ساحر کے تعارف کی دیوار کو سے رشتے میں حائل نہ کیجیے اور آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے حد مہربانی کا سلوک روا رکھا ہے ماما کے لیے میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا.....“

خان صاحب ابھی تک حیرت کے عالم سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ ”مجھے ابھی تک

وقت ہو چلا تھا، میں منڈیر پر رکھے دیے جلانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ مجھے نیچے گھائی میں بشیرے کے تانگے کی مخصوص گھنگھروں بھری ٹاپ اور اُس کے سال خوردہ بھونپو کی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر نکل کر نیچے جانے والے رستے سے جھانکا تو وہ نیچے سے ہی چلایا۔ ”ابو عبداللہ باؤ جی..... آپ کو خان صاحب نے ابھی بلایا ہے۔ جلدی سے نیچے آ جاؤ۔“ خان صاحب کے بلاوے کا سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں بڑی مالکن، یا لاریب نے انہیں رات والے واقعے کا تو نہیں بتا دیا؟ اگر ایسا ہوا تو خواہ خواہ جمالے کی شامت آ جائے گی۔ میں اسی سوچ میں گھرا نیچے اُترا تو بشیرا تانگا موڑ کر بالکل تیار کھڑا ملا۔ میں نے اُس سے معاملہ پوچھا تو بولا ”پتا نہیں جی..... خان صاحب سے ملنے کچھ مہمان بڑی سی گاڑی میں آئے ہیں کہیں دُور شہر سے..... اس کے بعد خان صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا..... معاملہ تو اب آپ اُنہی سے پوچھنا۔“ میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ خان صاحب نے اپنے مہمانوں کی آمد کے بعد بھی اگر مجھے بلاوا بھیجا ہے تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس اُدھیڑ بن میں ہم حویلی پہنچ گئے۔ مجھے کوئی گاڑی حویلی کے باہر کھڑی دکھائی نہیں دی۔ شاید اُسے حویلی کے اندرونی احاطے کے پیچھے والے گیراج میں پارک کر دیا گیا تھا جہاں خان صاحب کی اپنی گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔ حالانکہ میں نے کبھی گاؤں میں آتے جاتے انہیں اپنی کوئی گاڑی استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ گاڑیاں صرف شہر آنے جانے کے لیے استعمال میں آتی تھیں۔ کرم دین میرے پہنچتے ہی جلدی سے اندرونی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا اور مجھے حویلی کے اندر والے بڑے کمرے کی طرف چلنے کا کہہ کر حسب معمول بنا میرا جواب سنے آگے بڑھ گیا۔ میں نے جھپکتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میں اب تک جتنی بار بھی حویلی آیا تھا میرا تعلق صرف اس بیرونی مہمان خانے والے حصے تک ہی رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے اس اندرونی ڈیوڑھی سے گزر کر اصل حویلی میں قدم دھرنے کا اتفاق ہوا تو کچھ عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ جانے وہ کون سے خاص مہمان تھے جن سے ملوانے کے لیے خان صاحب نے مجھے اپنی حویلی کے زنان خانے کی سرحد بھی پار کروا دی تھی۔ بڑے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں اور جب میں نے بڑی سی چمک اٹھا کر اندر کمرے میں قدم رکھا تو میرے پاؤں جیسے زمین میں ہی گڑ کر رہ گئے۔ میرے بالکل سامنے والے صوفے پر ماما بیٹھی ہوئی تھیں

میں مجھ سے باتیں کرتے ہی گزاردی۔ مجھ سے ملنے کے بعد ماما واقعی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور اُن کی بیماری بھی کہیں ”اُڑن چھو“ ہو گئی تھی۔ میرے کمرے کا دروازہ حویلی کے بائیں باغ کی طرف لگتا تھا اور پپا نے بھی میرے ہی کمرے میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ بہر حال خود انہیں حویلی کے پردے کا خیال رکھنا تھا حالانکہ خان صاحب نے اُن کا اور ماما کا کمرہ اندر زنان خانے میں ہی لگوایا تھا۔ ماما تو اگلے ہی دن بڑی مالکن کے قہصے یوں سنانے لگ گئیں تھیں جیسے وہ اُن کی کوئی برسوں پرانی سہیلی ہوں۔ انہیں لاریب نے بھی بہت متاثر کیا تھا اور اس لڑکی کی زندہ دلی نے تو جیسے اُن کا دل ہی جیت لیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب سے ماما اور پپا نے حویلی آ کر میرا سحر ہونے کا راز کھولا تھا تب سے مجھے بڑی مالکن کے سامنے جانے کا سوچ کر ہی ایک عجیب سی جھجک گھیر لیتی تھی۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اُن کا سامنا کرنے سے بچ نہیں پایا۔ اگلی شام جب میں اصغر صاحب کو دوپلا کر درگاہ سے واپس حویلی لوٹا تو کرم دین نے بتایا کہ خان صاحب پپا کو اپنی زمینیں دکھانے کے لیے اپنے علاقے کی جانب نکل چکے ہیں اور میرے لیے ماما کا یہ پیغام ہے کہ وہ چائے پر باغ میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے جھجکتے قدم حویلی کے باغ کی جانب بڑھا دیئے۔ باغ میں ایک جانب حویلی کے نوکر مالے کے درختوں کے نیچے چائے کے لوازمات وغیرہ بڑی سی ٹرائی پر سجانے میں مصروف تھے، لیکن ماما مجھے کہیں آس پاس دکھائی نہیں دیں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ میں نے اپنے بالکل سامنے لاریب کو کھڑے پایا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی چائے کے ساتھ پروسے جانے والے ناشتے کی ایک ٹرے تھی۔ میں نے سلام کر کے جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں تھی۔ اُس کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ ”سنیں.....“ میں نے اُس کی جانب دیکھا۔ ”وہ دراصل.....“ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے معذرت کروں.....“ اُس کی پریشانی اُس کے ماتھے پر چمکتی پسینے کی چند ننھی بوندوں سے واضح تھی۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ ”معذرت کیسی.....؟“ آپ نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا جس کے لیے آپ معذرت خواہ ہوں.....“ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے..... ورنہ اُس رات جمالے نے دروازے پر آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ.....“ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”جمالے نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا..... دربان کا کام اجنبیوں

پوری طرح یقین نہیں آ رہا کہ کوئی اپنا محل اور شہزادوں جیسی زندگی چھوڑ کر، صرف ایک کھونج کے لیے یوں کٹیا کی زندگی اختیار کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس دور میں جب ظاہری شان و شوکت اور بے انتہا دولت ہی لوگوں کی زندگی کا مقصد اور معیار بن چکی ہو..... یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے.....؟“ اتنے میں اندر زنان خانے سے ماما کے لیے بڑی مالکن کا پیغام آ گیا کہ وہ کھانے میں اُن کی پسند کا پوچھ رہی ہیں اور اُن کی خواہش ہے کہ رات کے کھانے کی تیاری تک وہ اندر زنان خانے میں رہیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ ماما کا دل میرے پاس سے اٹھ کر جانے کو نہیں چاہ رہا ہوگا لیکن وہ دنیا کے بھرم اور تقاضے بھانا بھی خوب جانتی تھیں لہذا فوراً اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ پپا میرا ہاتھ پکڑے وہیں صوفے پر بیٹھے خان صاحب کے ساتھ گپیں ہانکتے رہے مگر خان صاحب کی نظر بار بار پھسل کر مجھ پر پڑتی رہی۔ کبھی کبھی انسان کا رُتبہ اور دنیاوی مقام بھی اُسے ایک عجبہ ہی بنا دیتا ہے۔ شاید اس وقت میری حیثیت بھی وہی تھی۔ مجھے اوپر درگاہ میں پڑے اصغر صاحب کی فکر بھی ستا رہی تھی لیکن خان صاحب نے یہ بتا کر میری تسلی کر دی کہ انہوں نے کرم دین اور جمالے دونوں کو ہی اصغر صاحب کی تیار داری کے لیے اوپر بھجوا دیا ہے اور میری درگاہ واپسی تک وہ لوگ وہیں رہیں گے۔ رات کا کھانا بھی ماما نے اندر زنان خانے میں ہی کھایا۔ پپا نے کھانے کے بعد خان صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی کہ وہ مجھے دو چار دن کے لیے اپنے ساتھ لے کر گھر جانا چاہتے ہیں تو خان صاحب باقاعدہ ناراض ہو گئے کہ یوں رات گئے کیا وہ اپنے مہمانوں کو جانے دیں گے۔ میں نے بھی پپا کو اصغر صاحب کی بیماری اور اپنی مجبوری کے بارے میں بتایا کہ سلطان بابا نے خصوصی طور پر مجھے یہاں بھیجا ہے لہذا اُن کو بتائے بنا یوں درگاہ کو چھوڑ جانا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔ دوسری طرف خان صاحب مصر تھے کہ برسوں بعد انہیں کوئی اپنے مزاج کا آشنا ملا ہے لہذا شطرنج کی چند بازیاں کھیلے بنا اگر انہوں نے پپا کو واپس جانے دیا تو یہ ”گناہ عظیم“ ہو گا۔ آخر کار گھنٹوں کی بحث اور مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جو دو چار دن ماما اور پپا میرے ساتھ گھر میں گزارنا چاہتے تھے اب یہیں خان صاحب کی حویلی میں ہی گزاریں گے۔ مجھے البتہ اتنی چھوٹ دے دی گئی کہ میں روزانہ صبح و شام درگاہ کا چکر لگا آیا کروں۔ ہمارے رہنے کے لیے دو کمرے پہلے ہی کھلوادئے گئے تھے مگر وہ ساری رات ماما اور پپا نے میرے کمرے

بگھوں میں مچلتے سوالات کی یلغار سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے ہی سوالات کا سامنا مجھے مان صاحب کی نظروں سے بھی تھا۔ بہر حال وہ ایک وضع دار شخص تھے اور میری ہچکچاہٹ کی وجہ سے جان چکے تھے کہ میں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ لہذا انہوں نے دوبارہ مجھے کسی امتحان میں ڈالنے سے گریز ہی کیا۔ چوتھے دن پپا نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو بات پھر گلوں شکوؤں سے ہوتی ہوئی مزید تین دن رُکنے تک چلی گئی اور یوں ساتویں دن بمشکل ماما پاپا کو خان صاحب اور بڑی مالکن سے واپسی کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب وہ لوگ یہاں آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے پہلے ہی ماما پپا سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ لوگ وقت زحمت اپنی آنکھیں نہیں بھگوئیں گے اور خوشی خوشی الوداع کہہ کر جائیں گے، لیکن یہ کم بخت الوداع ہمیشہ سے ہی خود میرا اپنا اندر کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سو اس مرتبہ اگر ماما اور پپا نے خود پر قابو پائے رکھا تو خود میری آنکھیں ماما سے گلے ملتے ہی نم ہو گئیں۔ بس پھر کیا تھا ماما تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں، اور ماں کی آنکھ کا سادون تو سدا ہی جاری رہتا ہے، پھر چاہے وہ آنکھ کے سوتوں سے باہر کو برے، یا پھر دل کے اندر کی زمین کو دھو رہے۔ ماما کو سنبھالتے سنبھالتے پپا بھی ٹڈال سے ہو گئے اور پھر بڑی مالکن، لاریب اور آخر میں خان صاحب بھی اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ ہم سب اس وقت حویلی کے بیرونی مہمان خانے والے حصے میں جمع تھے۔ جہاں پپا کا ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ماما نے حسب معمول جُدا ہوتے وقت تب تک اپنی نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک پپا نے مسکراتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ نہیں کر دیا۔ گاڑی چلنے کے دوران بھی ماما کی سدا بہار ہدایات کا پروگرام جاری رہا اور میں تب تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک اُن کی گاڑی دھول اُڑاتی ہوئی گاؤں کی واحد کچی سڑک پر اوجھل نہیں ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر خان صاحب سے بھی اجازت چاہی۔ پچھلے چھ دن سے میں ماما پپا کی وجہ سے اپنے فرائض پر مکمل دھیان نہیں دے پا رہا تھا اس لیے جلد از جلد درگاہ پہنچ کر اپنے معمولات کی طرف دھیان دینا چاہتا تھا۔ خان صاحب نے رات کے کھانے تک رُکنے کا کہا لیکن میں نے طریقے سے معذرت کر لی۔ بڑی مالکن اور لاریب بھی اُن کے پیچھے ہی کھڑی مجھے تک رہی تھیں۔ میری معذرت پر بڑی مالکن نے شرط لگا دی۔

کو روکنا ہی تو ہوتا ہے..... اور پھر اتنی رات گئے اگر جمالے کی جگہ میں بھی ہوتا تو وہی کرتا جو اُس نے کیا۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں.....“ وہ جلدی سے بولی جیسے اُسے میرے آگے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ ”بوجھ تو میرے دل پر اور بھی بہت سے ہیں، خود میرا رویہ بھی آپ سے کچھ نامناسب ہی رہا ہے..... میرے ذہن میں اُن گنت سوال ہیں لیکن فی الحال میں خود انہیں ترتیب نہیں دے پا رہی..... میں بہت الجھن میں ہوں..... آپ..... یہ سب..... کیسے.....؟“ واقعی شاید اُسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے۔ ایک دل چسپ بات یہ بھی تھی کہ لوگ ”آپ“ سے ”تم“ تک آتے ہیں۔ میرے معاملے میں وہ ”تم“ سے ”آپ“ تک آئی تھی۔ کیا ہم انسانوں کے یہ سبھی آداب و القابات صرف ہماری دنیاوی حیثیت اور رُتبے کا بدلہ ہوتے ہیں؟ کیا میں ”عبداللہ“ کی حیثیت میں ”آپ“ کہلائے جانے کا حق دار نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اُس شیشے جیسی نازک لڑکی سے یہ سوالات کر کے اُسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی اثنا میں اندر سے ماما اور بڑی مالکن بھی نکل آئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے دی۔ ”جیتے رہو.....“ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے..... تمہاری امی نے بتایا ہے کہ تم کتنے اچھے بیٹے ہو.....“ جس بات کا مجھے خدشہ تھا، وہی بار بار سامنے آ رہی تھی۔ مجھے اب درگاہ کے مجاور کے طور پر نہیں بلکہ ملک کے ایک مشہور صنعت کار کے بیٹے کے طور پر برتا جا رہا تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے آنے والے دن اور درگاہ کی وہ سادہ سی زندگی بہت زیادہ تکلفات میں گھرنے والی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چائے ختم کی اور وہاں سے اُٹھنے کی ٹھانی تو بڑی مالکن، جو لاریب کے ساتھ ہی بیٹھیں، ماما سے باتیں کر رہی تھیں، انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اندر سے ایک نیا سوئیٹر منگا کر میرے حوالے کیا۔

”انکار مت کرنا..... اس میں میری خوشی چھپی ہے.....“

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ ماما شاید میری اندرونی جھجک کو جان گئیں تھیں۔ لہذا انہوں نے مجھے اندر کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ اگلے دو دن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ دوبارہ میرا سامنا بڑی مالکن، یا لاریب سے نہ ہونے پائے۔ شاید میں اُن دونوں کی

”ٹھیک ہے..... لیکن تمہیں اس شرط پر رخصت ملے گی کہ اب گاہے بگاہے یہاں آئے رہو گے..... یہ اب تمہارا بھی گھر ہے..... خبردار جو کبھی کوئی غیریت برتی.....“

میں نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا کہ ”میں یہاں آپ کی حویلی سے اپنے پن کی ایسی سوغات لے کر جا رہا ہوں جو اب غیریت کی ایسی کسی دیوار کو بھی ہمارے رشتوں کے درمیان جائل نہیں ہونے دے گی۔“ لاریب جو اُن کے ساتھ کھڑی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھوں میں شرارت کی اک چمک سی لہرائی اور وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”انسان کے پاس لفظوں کا اتنا خوب صورت ذخیرہ ہو تو اسے استعمال کرنے میں اتنی کنجوی نہیں کرنی چاہیے۔“ لاریب کی بات سن کر ہم سبھی ہنس پڑے اور میں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے وقت اُن دل ربا چہروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور باہر کھڑے بشرے کے تانگے کی جانب بڑھ گیا۔

جب میں درگاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ اصغر صاحب کا کہیں اتنا نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ ابھی خدا خدا کر کے تو اُن کی ذرا طبیعت سنبھلی تھی پھر اچانک کہاں نکل گئے۔ میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اچانک درگاہ کی بیرونی دیوار کی پرلی جانب کسی دو اشخاص کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا کہ اس زوال کے وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے دیوار کے اوپر سے جھانکا اور اصغر صاحب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دوسرے شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہونے لگے۔ یہ وہی شخص تھا جو پلیٹ فارم پر مجھے دکھائی دینے کے بعد ایک دم غائب ہو گیا تھا۔

فاصلے ساتھ چلتے ہیں

وہ شخص پہلے مجھے ٹرین کی برتھ پر اور پھر پلیٹ فارم پر دکھائی دیا تھا۔ مجھے اُس کی وہ روح کو چیر دینے والی دو چھوٹی چھوٹی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں کیسے بھول سکتی تھیں پھر وہ اُس کا عجیب سا بے چین متحرک اور ہر لمحہ کسی کرب جیسی کیفیت میں رہنے والا منحنی اور غر سا وجود..... لیکن وہ شخص اس وقت یہاں درگاہ کے باہر کیا کر رہا تھا؟ تو کیا وہ اصغر صاحب سے ملنے کے لیے جبل پور آ رہا تھا؟ لیکن اگر اُسے اصغر صاحب سے ملنا بھی تھا تو وہ درگاہ کے ہریوں چوروں کی طرح کیوں اُن سے مل رہا تھا؟ کچھ ہی دیر میں اصغر صاحب بات ختم کر کے جب واپس اندر آئے تب بھی میں وہیں درگاہ کے صحن میں بھی کھڑا تھا۔ وہ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے۔ اُن کا ملاقاتی اندھیرے میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ سر ہٹ کر آگے بڑھے ”ارے عبداللہ میاں..... تم.....؟“ تم کب واپس آئے۔ تمہارے امی باواپس چلے گئے کیا.....؟“ ”جی وہ آج واپس لوٹ گئے ہیں..... لیکن آپ بستر سے کیوں اٹھ آئے.....؟“ اور یہ کون شخص تھا جس سے آپ وہاں اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے.....؟“

میرا سوال سن کر جانے مجھے کیوں لگا کہ جیسے وہ کچھ گھبرا سے گئے ہوں۔ ”ہاں وہ..... کوئی نہیں بس یونہی کوئی سائل تھا..... کسی منت کی تفصیلات پوچھنے آیا تھا.....“ پھر جیسے وہ اچانک ہی چونک سے گئے۔ ”تو کیا تمہیں وہ نظر آیا تھا.....؟ میرا مطلب ہے کہ..... باہر تو بہت اندھیرا تھا۔“ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا کیوں کہ ابھی تو صرف شام کا جھٹپٹا ہی چھایا تھا اور ایسا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ چہرے بھی پہچاننے نہ جا سکیں۔ ”ہاں میں نے اُسے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا..... جب میں جبل پور آ رہا تھا تب..... پہلے ٹرین میں اور پھر پلیٹ فارم پر..... لیکن پھر نہ جانے یہ شخص کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اُس دن کے بعد آج دکھائی دیا ہے.....“ اصغر صاحب میری بات سن کر نہ جانے پریشان سے کیوں ہو گئے۔ ”اوہ..... اس

لوٹے۔ لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے اور فوراً ہی انہوں نے ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹیاں بنا کر میرے ماتھے پر رکھنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر میں میں خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ”میں آج نیچے بازار گیا تو تمہارے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا۔ بھی تمہارے والد تو بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ سچ پوچھو تو میں اب تک شدید حیرت کے جھٹکے میں ہوں کہ اتنے بڑے گھرانے کا لڑکا اور وہ بھی اس عمر میں اس راہ پر چل نکلا ہے۔ اور وہ بھی یوں بے سرد سامان..... یہ کیسا جنون ہے.....؟ یہ کیسی تلاش ہے.....؟ میں اب تک سمجھ نہیں پایا.....؟“

مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں بول پڑا ”آپ بھی تو کسی ایسے ہی جنوں کے اثر میں یہاں تک پہنچے ہیں..... ہو سکتا ہے ہماری کہانی مختلف ہو لیکن ہمارے حالات مختلف نہیں ہو سکتے.....“ انہوں نے جلدی سے مجھے ٹوکا ”خدا نہ کرے عبد اللہ میاں..... کہ ہمارے حالات کبھی ایک جیسے ہوں۔ خدا تمہیں ایسی ہر آزمائش سے بچائے جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں..... انگاروں بھری وہ راہ خدا کسی دشمن کے حصے میں بھی نہ بچھائے.....“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا لیکن اُن کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہے تھے۔ ”میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ تمہارا واسطہ ضرور خدا کے کچھ خاص بندوں کے ساتھ رہا ہے جس دن تم نے اس درگاہ میں قدم رکھا تھا اور پھر کل جب تمہیں مجھ سے باتیں کرتا وہ شخص بھی دکھائی دے گیا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ واقعی تم باقیوں سے مختلف ہو، کچھ خاص ہو.....“

”آپ نے کل بھی اُس شخص کا ذکر کچھ عجیب سے الفاظ میں کیا تھا۔ ایسی کون سی بات ہے.....؟ آخر کیا بھید ہے اُس شخص کی پہچان میں..... آپ بتا کیوں نہیں دیتے.....؟“

اصغر صاحب نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ”سوچتا ہوں بتا ہی دوں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر تمہارے پاس میرے لیے سوائے نفرت اور حقارت کے اور کچھ نہیں بچے گا۔ لیکن شاید یہی نفرت، یہی بربادی اور یہی حقارت میرا مقدر ہے، سدا کے لیے..... اپنا ایمان بیچنے والا شخص کسی ایسے ہی، یا شاید اس سے بھی بدتر سلوک کا حق دار ہوتا ہے.....“ میں چپ رہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ آخر کار وہ گرہ کھٹنے ہی والی ہے جس نے اصغر صاحب کی شخصیت کو اتنا پُر اسرار بنا رکھا ہے۔ ہم دونوں درگاہ کے صحن میں نکل آئے جہاں سردی سے

کا مطلب ہے تم نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے..... لیکن.....؟ اچھا چلو خیر..... ہو گا کوئی..... تم اپنی سناؤ..... ماں باپ سے مل کر اچھا تو لگا ہو گا.....؟“ میں سمجھ گیا کہ وہ بات ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا اور انہیں حویلی میں پیش آنے والے واقعات بتاتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُن کے ملاقاتی کا چہرہ جیسے چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ اصغر صاحب کی شخصیت روز بروز پُر اسرار سے پُر اسرار تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری۔ اس لیے صبح ہی سے میرا سر کچھ بھاری سا تھا۔ اگلے دن جمعرات تھی اور حسب معمول ہر جمعرات کی طرح زیارت پر صبح ہی سے زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی میرے من میں یہ سوال بھی اٹھتا تھا کہ جمعرات کے دن میں، یا شام میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ ان درگاہوں پر خاص اسی دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مذہبی حوالے سے تو جمعہ کا دن اہم ہوتا ہے لیکن بعض جگہوں کے علاوہ جمعہ کے دن ان دُور دراز کی زیارتوں اور درگاہوں پر سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔ تو کیا یہ روایت مذہب سے کچھ سوا تو نہیں.....؟

شام تک تمام معمولات نبھاتے نبھاتے میں تھکن سے چور ہو چکا تھا اور پھر رات سے سر میں دھماکے کرتا وہ عجیب سا درد..... نتیجتاً مغرب کا وقت ہوتے ہوتے میرا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے رگ و رُوپ میں جیسے سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہی ایک عجیب سا احساس..... جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مغرب سے ذرا پہلے بشر اکرم دین کے ساتھ حویلی سے جمعرات کی شام کی مخصوص نیاز کی دگیں لے کر اُوپر درگاہ پہنچا اور مختلف زائرین اور سائلوں کو کھانا کھلانے کے دوران اُس کا ہاتھ جب اتفاقاً میرے ہاتھ سے جھو گیا تو وہ اُچھل ہی پڑا۔ ”اوجی یہ کیا..... آپ کو تو شدید تپ چڑھ رہا ہے عبد اللہ باؤ..... اور آپ پھر بھی کام کر رہے ہیں۔“ اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ زبردستی مجھے درگاہ کی بیردنی دیوار کے ساتھ پچھی دریوں کے قریب بٹھا کر جھٹ پٹ کرم وین کے ساتھ کھانا بانٹ کر نیچے گاؤں سے دوا لینے چلا گیا۔ میں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ اس بات کا حویلی والوں کو بتا نہیں چلنا چاہیے۔ اصغر صاحب حسب معمول پورا دن کہیں غائب رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جمعرات کے روز خاص طور پر کہیں ٹل جاتے ہیں اور درگاہ پر آیا ہوا نیاز کا کھانا، یا گوشت تو خاص طور پر پچھتے تک نہیں۔ اس روز بھی وہ آخری سائل کے جانے کے بعد ہی درگاہ واپس

نچنے کے لیے زائرین نے جنگل کی لکڑیوں کو جلا کر شام سے ایک بڑا سا لاؤ روشن کر رکھا تھا۔ اب صحن بالکل خالی ہو چکا تھا لیکن اصغر صاحب نے ایک شاخ کی مدد سے لکڑیوں کی راکھ کو کریدا اور چند مزید تختے اس انگاروں بھری راکھ میں پھینکے تو پھر سے آگ بھڑک اٹھی اور ہم دونوں بھی اسی لاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ اصغر صاحب نے اپنی یادوں کی راکھ کو بھی اپنی سوچ کی کسی لمبی چٹری سے کریدا اور پھر دھیرے دھیرے اُن کے ماضی کی سلگتی آگ بھی اُن کی سوچ کی لکڑیوں کو چٹانے لگی۔

”میری کہانی آج سے ٹھیک ایک سال پہلے، دسمبر کے اسی مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی فسانہ، کوئی کہانی نہیں تھی۔ میں ایک عام سینئر کلرک کی بوسیدہ اور پھٹ چڑھی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک بہت بڑے شہر کے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی لڑا کا بیوی اور چار بدتمیز بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ بڑے شہروں کے ان ڈربہ نما فلیٹوں میں ہم چھ بندے کس طرح گزارہ کرتے ہوں گے۔ میرے دونوں بیٹے ماں کے لاڈ پیاری کی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ بڑا کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد گرید پوائنٹن تو پاس کر چکا تھا مگر کم نمبروں کی وجہ سے شہر بھر میں جوتے چٹا پھرتا تھا اور چھوٹے نے تو بی اے میں ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد کتابوں سے نانا ہی توڑ لیا تھا۔ دونوں بیٹیاں بھی دن بھر سوائے فیشن میگزین پڑھنے، یا کیبل پر فلمیں دیکھنے کے علاوہ اور کچھ خاص نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بیٹی نے البتہ یونیورسٹی کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی تھی جب کہ چھوٹی بارہویں کا امتحان پاس کرتے ہی کسی شہزادے کے انتظار میں دن بھر میک اپ کورسز پر اپنا دھیان لگائے رکھتی تھی۔ دراصل بچے ہمیشہ ماں میں اپنا آئیڈیل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماں کو ہی فالو (Follow) کرتے ہیں اور میرے بچوں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے باپ کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، طعنے دیتے اور گلے شکوے کرتے ہی دیکھا تھا۔ لہذا قدرتی طور پر اُن کے دل سے میری عزت جاتی رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہ دکھاوے کے لحاظ اور شرم و حیا سے بھی رہ چکے تھے اور اب ترکی بہ ترکی مجھے جواب دینے لگے تھے۔ شاید اس میں میری بیوی کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ میں زندگی میں کبھی کوئی بھی آسائش انہیں مہیا نہیں کر پایا تھا۔ ایک سینئر کلرک کی تنخواہ ہوتی

نکتی ہے اور پھر اوپر سے مہنگائی کا یہ طوفان..... تنخواہ سے زیادہ تو بجلی اور گیس کے بل ہر ماہ بچے پر موگ دلنے کے لیے آجینچتے تھے۔ ایسے میں ننگا نہائے کیا اور نچوڑے کیا؟ میں کبھی ندرت کے مطابق بھی پیسے گھر نہیں لا پایا تھا تو پھر تفریح، پلنگ، یا سینما کی تو بات کرنا ہی غول تھا۔ میرے بچے اور بیوی ساری عمر پیٹ بھر کھانے کو ہی ترستے رہے۔ بیٹی نے نوکری کی تو بیوی کا ہاتھ کچھ کھلا لیکن یہ بھی میرے لیے مزید ایک طعنے کا سبب بن گیا کہ ”ہاں بیٹی..... اب تو بیٹی کی کمائی کا ہی آسرا ہے.....“ اپنی ساری نوکری میں مجھے کلرک کی لیے شیعہ ہی کچھ ایسے ہی دیئے جاتے رہے جہاں رشوت لینے کے مواقع بھی کبھی مجھے میسر نہیں رہے۔ تو یہ ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے رشوت لینا بھی نہیں آتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ کسی سے کہلوا کر کسی کمائی والے سیکشن میں تبادلہ کروا بھی لیا تھا لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رشوت لینا ہی ایک فن ہے اور میں اس فن سے قطعی نا بلند تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھولنے لگتے تھے اور ذرا سی رقم پکڑتے وقت بھی پورا جسم لرزنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ نہ جانے کیسے اتنی بڑی بی رقوموں کو بنا ڈکار لیے جیب میں ڈال کر، ضم بھی کر لیتے تھے۔ شاید میں شروع سے ہی بول تھا اور رشوت لینا، یاد دینا مجھ جیسے بزدلوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے دو چار تلوں میں ہی اس کمائی والے محکمے کے راشی افسر میرے آگے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیتے تھے کہ ”بس بہت ہو گیا میاں۔ اب یہاں سے چلتے ہو۔“ دراصل میری وجہ سے اوپر لوں کا لین دین بھی بگڑتا تھا کیوں کہ بہت سی جگہوں پر مجھ جیسے کلرک ہی ایسے کالے دھندوں پہلا دروازہ ہوتے ہیں۔ یوں میرے دن قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہی گزر رہے تھے۔ ہر صبح کا آغاز میرے سر ہانے رکھے الارم کلاک کی چیخ سے ہوتا تھا جسے میری بیوی بد مزگی سے بند کر دیا کرتی دوسری کروٹ دوبارہ یہ بڑبڑاتے ہوئے سو جاتی کہ ”نہ خود سوتے ہیں نہ ہروں کو سونے دیتے ہیں۔“ میں کچی اور بے آرام نیند سے تھکا ہارا جاگتا تو پورے گھر میں اُٹتی مجھے ایک پیالی چائے کا پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ بیوی کو تو ویسے ہی اپنے آرام میں خلل نہیں تھا۔ بڑی بیٹی کو اپنی نوکری پر جانے کی جلدی ہوتی، چھوٹی بیٹی کبھی خوش قسمتی سے جاگتی لیکن بھی جاتی تو وہ خود اس انتظار میں ہوتی کہ کوئی باورچی خانے میں جائے تو اُس کے ہاتھ بھی ایک کپ چائے بنا دے اور بیٹے کو ویسے ہی دن چڑھے جاگنے کے عادی تھے۔ مجھے

نور دفتر سے بے دخل کر دیئے جانے پر اُس کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر اس واقعے کی دفتر میں اور باہر تشہیر ضرور کروں گا۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی۔ بہر حال اُس دن کے بعد سے عظیم کا غصہ کبھی کم نہیں ہوا اور مجھے روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے شبانہ کے سامنے بے عزت ضرور کیا جاتا رہا۔ میں جتنی بھی دیر سے اپنے دوسرے دفتر پہنچتا، اتنے ہی وقت کے لیے مجھے دفتر کے اوقات کے بعد اور ٹائم لگا کر اپنا کام ختم کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ عظیم آج کا کام کل پر چھوڑنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لہذا مجھ سے عام طور پر شام ساڑھے سات بجے والی آخری بس بھی چھوٹ جاتی تھی جس کے بعد پیدل مارچ کر کے رات گئے گھر پہنچنا میری مجبوری بن جاتی تھی اور رات دیر سے گھر پہنچنے کے بعد پھر سے وہی بیوی کے طعنے اور بچوں کی کڑوی کیسی باتیں کہ ”دن بھر گھر سے غائب رہتے ہو..... بیوی بچوں کا بھی کچھ خیال ہے، یا نہیں.....“ یا بس تمہارا فرض جنم دینے کی حد تک ہی تھا۔ اب پڑے سڑتے رہیں..... جانے کہاں دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ بھی ہم نے تو ایسا دفتر کبھی دیکھا نہ سنا.....“ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے زہر کی چار پڑیاں لا کر گھر والوں کے کھانے میں ملا دوں تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ہی منٹ جائے لیکن یہاں بھی میری وہی ازلی برائی آڑھے آ جاتی تھی اور میں چپ چاپ کان لپیٹ کر کسی کونے میں پڑ کر سو رہتا۔ ایک اگلے اور نئے دن کے کانٹوں بھرے آغاز اور دوبارہ اسی ذلت بھری زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے.....“

اصغر صاحب بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ میں اُن کی کہانی میں اس قدر کھوسا گیا تھا کہ مجھے رات کے ڈھلنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ابھی میں نے عشاء کی نماز بھی ادا کرنی تھی اور اپنے اور اصغر صاحب کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ شام کو کرم دین کی لائی ہوئی دیگوں میں سے کچھ بچ گیا تھا لہذا میں نے جلدی سے وہی چادل گرم کر کے اصغر صاحب کے سامنے رکھے اور خود عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نماز پڑھ کر میں باہر نکلا تو اصغر صاحب ایک مرتبہ پھر سے لکڑیوں کے الاؤ کو دکھا کچے تھے۔ اُن کے چہرے پر آگ کی لپٹوں سے پڑتی روشنی میں میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی

ہر صبح ساڑھے چھ بجے والی ٹرام پکڑنی ہوتی تھی کیونکہ اسی صورت میں میں دو بیس بدل ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ سرکاری دفاتروں میں کلرک بادشاہ ہو ہیں اور انہیں ایک آدھ گھنٹہ لیٹ پہنچنے پر کوئی کچھ کہتا نہیں ورنہ دفتر کا اصل وقت تو صبح آ بجے ہی تھا۔ دن بھر دفتر میں جھک مارنے کے بعد اور مانگے کی چائے پینے کے بعد شام ۶ بجے جب میں وہاں سے فارغ ہوتا تو مجھے لمبک اور پرائیویٹ دفتر میں چار سے سات عارضی نوکری بھی بھگتانی ہوتی تھی جو میں نے اپنے قرضے اُتارنے کے لیے کر رکھی تھی۔ کچھ ڈسپنچر کا کام ہوتا تھا، یا پھر چند دفتری خط ٹائپ کرنا ہوتے تھے لیکن اس پرائیویٹ دفتر کا بار عظیم ایک نمبر کا ”کھڑوس“ شخص تھا۔ مجال ہے جو پل بھر کی دیر بھی برداشت کر جائے اور شوخ قسمت میں ہمیشہ دس پندرہ منٹ لیٹ ہو ہی جاتا تھا کیوں کہ اپنے سرکاری دفتر سے نکل کر مجھے پیدل ہی دو بلاک چل کر اُس نجی آفس تک آنا ہوتا تھا اور یوں دیر سے آنے پر روز ہی عظیم مجھے اپنی خوب صورت لیڈی سیکرٹری شبانہ کے سامنے جی بھر کر بے عزت کرتا تھا۔ مجھے اس بے عزتی کی بھی خاص پرواہ نہیں تھی کیوں کہ یہ نوکری میری انتہائی مجبوری تھی لیکن اس بے عزتی کے دوران مجھے شبانہ کی موجودگی بے حد گھلٹی تھی۔ کیوں کہ وہ میری بے عزتی کے دوران مستقل اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں تلے دابے ایک طنزیہ ہنسی ہنستی رہتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا کہ کوئی مجھے سربازارنگ کر رہا ہو۔ جانے عظیم کو اس طرح ایک عورت کے سامنے مجھے بے عزت کر کے کیا ملتا تھا۔ شاید اس تحریک کے پیچھے بھی عظیم کا کوئی انتقام ہی چھپا ہوا تھا کیوں کہ میں نے ایک دن غلطی سے کسی خط کی تصحیح کے لیے بنا دستک دیئے عظیم کے دفتر کا دروازہ کھول لیا تھا اور ٹھیک اُسی وقت عظیم اپنی سیکرٹری کو اپنے بہت ہی قریب بٹھائے کوئی ڈکٹیشن (Dictation) دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر شبانہ تو بوکھلا کر باس کی گود سے اُتر گئی لیکن عظیم کا چڑھا ہوا پارہ پھر کبھی نہیں اُترا۔ اُس دن اُس نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا کہ دراصل میں اُس کی جاسوسی کرتا پھرتا ہوں اور مجھے اتنے بڑے دفتر میں کام کرنے کے آداب بھی نہیں آتے اور یہ کہ اگر میں نے باہر جا کر دفتر کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ مجھے دھکے مار کر یہاں سے باہر نکال دے گا۔ ویسے اُسے اس وقت بھی ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن فی الحال اُس نے شاید یہ سوچ کر اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا کہ میں یوں

کہانی دھراتے وقت کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ دوبارہ اُن کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے بات وہیں سے جوڑی۔

”ہاں تو عبداللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں اس ذلت بھری زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنے دن کسی کو لھو کے تیل کی طرح کاٹ رہا تھا۔ پھر ایک دن ایک اور غضب ہوا کہ میں نے بس پر چڑھتے ہوئے گھر واپسی کے وقت اپنی بڑی بیٹی لبنی کو کسی بچی عمر کے مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ دیکھ لیا اور گھر آ کر میں نے باز پرس کی تو بس میرا بات کرنا ہی غضب ہو گیا۔ سارے گھر والے مجھ پر یوں برس پڑے جیسے خود مجھ سے کوئی گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ پتا یہ چلا کہ وہ صاحب اُسی اسکول کے مالک ہیں جہاں لبنی نوکری کرتی تھی اور اُن کا تو اب یہ معمول ہی بن چکا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد واپسی پر لبنی کو گھر ڈراپ کرنے آتے تھے۔ اُنٹا لبنی نے مجھے طعنہ دے دیا کہ تم کبھی سرشام گھر واپس لوٹو تو تمہیں کچھ پتا بھی ہو.....؟ بیٹوں نے سیدھی سادی دھمکی دے دی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ خود کریں گے۔ لہذا مجھے اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ شخص پورے گھرانے کو تھکے تھائف اور اپنے پیسے کے جال میں کچھ یوں پھانس چکا تھا کہ اب میرے گھر کا کوئی فرد بھی اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بار پھر مجھے ہی چپ سادھنا پڑی۔ لیکن اُس دن سے میرے وجود کے اندر خود اپنے لیے ہی ایک عجیب سی نفرت پلنا شروع ہو گئی کہ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں.....؟ میرا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے.....؟ کیا میں یونہی عمر بھر خود اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا رہوں گا۔ اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کیوں کہ مجھ جیسے ناکارہ انسان اور نالی سے کیڑے جیسی زندگی گزارنے والے شخص کو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیسے.....؟ خودکشی بھی تو ہمت مانگتی ہے نا..... لیکن میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اپنی اس بوسیدہ اور ذلت بھری زندگی کا خاتمہ کر کے ہی رہوں گا۔ کب اور کیسے.....؟ بس یہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

۔ کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ اچلتے ہیں

چھلاوہ

اصغر صاحب نے پانی کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا اور اپنی داستان جاری رکھی۔ رات خوب ہیگ چکی تھی اور سرد اور خشک ہوا ہمارے جسموں کو چیر کر گزر رہی تھی لیکن ہم دونوں ابھی تک اُسی الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”تو عبداللہ میاں..... میں نے وہ رات کس طرح کانٹوں پر گزاری یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اگلی صبح پھر وہی بیوی کی چیخ چیخ۔ پہلے سرکاری دفتر دیر سے پہنچا اور پھر حسب معمول وہاں افسروں کی ڈانٹ سنتے ہوئے اور اپنا کام لیٹ ختم کر کے دوسرے دفتر بھاگ بھاگ پہنچا تو پورے پندرہ منٹ لیٹ تھا۔ دفتر میں میرے واحد دوست جاوید نے مجھے دفتر میں گھتے ہی بتا دیا تھا کہ باس عظیم تین مرتبہ میرا پوچھ چکا ہے۔ میں دل میں ہزار خدشے لیے اُس کے کمرے میں پہنچا تو حسب توقع شبانہ وہیں موجود تھی اور عظیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی عظیم نے طنز کیا۔

”آگے نواب صاحب..... اس وقت آنے کی زحمت بھی کیوں کی جناب نے..... آپ حکم تو کرتے..... ہم فائلز آپ کے گھر ہی بھجوا دیتے.....“

میں ہکلا یا..... وہ سر..... میں وہ..... دراصل۔“

عظیم دھاڑا ”کیا میں میں کی رٹ لگا رکھی ہے..... یہ وقت ہے دفتر آنے کا..... آخر تم کب سدھرو گے..... تنخواہ لینے والوں کی قطار میں تم سب سے آگے کھڑے ہوتے ہو..... اور کام کے لیے آتے ہوئے موت آتی ہے تم کو.....“

شاید اُس دن عظیم نے میری بے عزتی کرنے کی ہر حد کو پار کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ شبانہ اُسی طرح لگا تار مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور میرے تن من میں جیسے آگ سی بھرتی جا رہی تھی۔ اُس دن مجھے پتا چلا کہ قاتلوں سے قتل کس لمحے میں سرزد ہوتے ہوں گے۔ اُس وقت میرے جسم میں اتنی جان ہوتی، یا میرے پاس کوئی چاقو، یا پٹیل ہوتا تو میں ضرور

ہمد کے بیڑ کے اوپر کوئی بیٹھا ہوا مجھے اپنی دوسرے انگارہ آنکھوں سے گھور رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن بیڑ کی شاخیں ویسے ہی سنسان پڑی تھیں۔ میں نے سر ہٹ کر دوبارہ آنکھیں موندھیں تو پھر وہی احساس چھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر بر آیا، لیکن اس بار آنکھیں کھولنے سے پہلے ایک آواز بھی میرے ذہن کے پردے سے ٹکرائی۔ ”کیسے ہوا صفر.....؟“ میری تو مانو جیسے جان ہی نکل گئی اور میں نے دوبارہ جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن بیڑ اب بھی ویسے ہی تنہا کھڑا تھا۔ میرے مساموں سے اتنی سردی کے وجود خوف کے مارے پسینہ نکل آیا اور میں نے وہاں سے بھاگ اٹھنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی میں نے اپنا بوجھ اپنے دوشل بازوؤں پر ڈالا ہی تھا اور میرا جسم ابھی پوری طرح اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ پھر سے وہی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ڈرو نہیں صفر..... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھو.....“

میں نے خوف کے مارے ادھر ادھر دیکھا ”لیکن تم ہو کون..... اور مجھے کھلی آنکھوں سے نظریوں نہیں آرہے.....“

میرے کانوں میں پھر سے آواز گونجی ”میں بند آنکھوں سے بھی صرف انہی کو نظر آتا ہوں جنہیں آنا چاہتا ہوں..... اگر تم زیادہ خوف زدہ نہیں ہو تو میں تمہیں کھلی آنکھوں سے نظر آ سکتا ہوں۔ تمہیں بس اپنے حواس قابو میں رکھنے ہوں گے.....“

ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ میں وہاں سے سرپٹ دوڑ لگا دوں لیکن پھر نہ جانے برے اندر اتنی ہمت کہاں سے آگئی اور میں نے ہکلاتے ہوئے اُسے اجازت دے دی۔

”ٹھیک..... ہے..... لیکن مجھے زیادہ ڈرانا نہیں۔ میں دل کا کمزور واقع ہوا ہوں۔“ میں گھمیس پھاڑ پھاڑ کر درخت کی شاخوں کو دیکھنے لگا کیوں کہ میرے خیال میں اُسے وہیں کہیں سے کودنا چاہیے تھا لیکن میں اپنے پیچھے سے اُس کی آواز سن کر بچ سے گرتے گرتے بچا۔

”اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو.....“

میں نے ڈرتے ڈرتے لرزتے دل کے ساتھ پیچھے نظر ڈالی تو کچھ دیر کے لیے میرے ہر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ ایک نہایت کالا بھنگ شخص جس کی آنکھیں دو دیکھتے انگاروں کی چمک رہی تھیں اور جس کی جلد کا رنگ ایسا تھا جس کی رات کی سیاہی میں جانچ، یا دیکھ پانا

اُن دونوں کا وہیں خون کر دیتا۔ مجھے عظیم نے یہ حکم نامہ بھی صادر کیا کہ میں آج پچھلے پورے ہفتے کی فائلز اور خط نکال کر ہی گھر واپس جاؤں گا ورنہ اگلے دن مجھے دفتر آنے کی ضرورت نہیں اور ان پندرہ دنوں کی تنخواہ میرے گھر پہنچا دی جائے گی۔ میں بکنا جھکتا اس جلا کے کمرے سے نکلا اور اپنی میز پر جا کر فائلوں کے انبار میں کھو گیا۔ جب تک میں نے کام ختم کیا، شام کے سوانسات بج چکے تھے۔ دسمبر کی شامیں ویسے بھی گہری راتوں میں بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتیں۔ میں دفتر سے نکل کر نیچے بس اسٹاپ پر پہنچا تو حسب توقع آخری بس بھی نکل چکی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف ۲۵ روپے اور پانچ روپے کا ایک سکہ نکلا، مطلب رکشے، یا ٹیکسی کی عیاشی تو ناممکن تھی۔ لہذا میں نے عظیم کو دل ہی دل میں گندی گالیاں نکالتے ہوئے پیدل ہی گھر جانے کی ٹھانی۔ پیدل مختصر راستے اختیار کرنے کے باوجود میرے گھر کا فاصلہ دفتر سے دو گھنٹے کا تھا۔ میں تنگ اندھیری گلیوں اور ویران سڑکوں سے ہوتا ہوا گھر کی جانب روانہ تھا۔ میرے شہر کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ ایسے راستوں پر دن میں بھی چلتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ یہ تو پھر رات تھی۔ لہذا ذرا سی آہٹ پر میرے روٹنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ راستے میں ایک ویران سا پارک بھی پڑتا تھا جسے میں نے پہلے اپنی راہ گزر کے لیے منتخب نہ کرنے کا سوچا کیوں کہ اس پارک کے متعلق عجیب و غریب قسم کی باتیں مشہور تھیں لیکن پھر جب میں نے اس لمبے راستے کا سوچا جو پارک کے اندر سے نہ گزرنے کی صورت میں مجھے طے کرنا پڑتا تو خود بخود میرے تھکے ہوئے قدم اس پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی جانب بڑھ گئے جسے راہ گیروں نے اپنی سہولت کے لیے پارک کر اس کرنے کے لیے توڑ رکھا تھا۔ پارک اُس وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گھاس کے خشک میدان کے بیچوں بیچ ایک بوڑھا بگد کا بیڑ اپنی ہزاروں جڑیں زمین میں گاڑھے اور میدان کے اوپر پڑ پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بزرگ اپنی ساری آل اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹ کھڑا ہو۔ بیڑ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا پتھر کا بیچ پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں نے کچھ پل اُسی بیچ پر بیٹھ کر سستانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے بیچ پر بیٹھ کر چند گہری سانسیں لیں تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ میں نے سر پیچھے نکال کر چند لمحوں کے لیے اپنی جلتی آنکھیں موندھ لیں لیکن آنکھیں بند کرتے ہی ایک لمحے کے ہزاروں حصے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس

تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں نے فوراً خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک کسی کی کرخت آواز فضا میں گونجی ”او بابا..... تم اس اندھیرے میں کیا کرتا ہے.....؟ میری توجہ نکلے نکلتے رہ گئی۔ میں نے ڈر کر جھٹ سے آنکھیں کھولیں تو سامنے پارک کا پٹھان چوکیدار حیران سا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے وہ شخص کھڑا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں ٹٹولا لیکن وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ چوکیدار ابھی تک میرے سر پر کھڑا شاید مجھے کوئی خبردار الحواس سمجھ رہا تھا۔ وہ پھر ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ ”او بھائی تم کون ہے..... ایسے رات کو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہیے..... خویہ اچھا نہیں ہوتا مڑاں.....“ اب میں اُس کو کیا بتاتا کہ میری آدمی روح تو پہلے ہی نکل چکی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا ”کیا تم نے ابھی یہاں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا..... وہ یہاں میرے قریب ہی کھڑا تھا۔“ چوکیدار نے حیرت سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ”کون.....“ ادھر تو کوئی نہیں تھا۔ خوچہ ہم اسی لیے بولتا ہے کہ ایسے رات کے وقت ادھر اکیلا مت بیٹھو..... تم ادھر اکیلا بیٹھا تھا اور جب ہم ادھر آیا تو تم اپنے آپ کے ساتھ بولتا پڑا تھا.....“ گویا میں خود کلامی میں مشغول تھا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ شاید کام کے دباؤ نے میرے دل و دماغ پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا اور اب میں جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا وہاں سے اٹھا اور کسی طرح گرتے پڑتے رات گئے گھر تک پہنچ گیا۔ شکر ہے کہ سب لوگ سو چکے تھے۔ میں اس وقت اُن کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور سر درد سے پھنسا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آج کے تمام واقعات پھر سے میرے ذہن میں چلنے لگے۔ کیا واقعی وہ سب صرف میرا وہم تھا، یا.....؟..... انہی سوچوں میں جانے کب مجھے نیند نے آگھیرا لیکن ابھی شاید میری آنکھ لگے ہوئے چند لمحوں ہی ہوئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پھر سے وہی دو انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، خود میرے ہی کمرے میں موجود دیوار میں لگی الماری جو چھت سے ذرا پہلے اپنی لمبائی ختم کرتی تھی، اُسی الماری پر وہ شخص بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ ایک جھٹکے سے میری نیند ٹوٹی تو میں پسینے میں شرابور تھا لیکن الماری کے اوپر کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ میرے خدا..... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا

ہے۔ یہ کون سی بلا میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور پھر اس جدید دور میں اگر کسی کو یہ سب بتاتا بھی تو وہ میرا مذاق ہی اڑاتا۔ میری بیوی ساتھ والے بستر پر پڑی خراٹے لے رہی تھی لیکن پھر میں دوبارہ سو نہیں پایا۔ ساری رات یہی آنکھ پجولی جاری رہی۔ میں جیسے ہی آنکھ بند کرتا، میری بند آنکھوں کے پردے پر وہ ہولناک شبیہ اتر آتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں منہ اندھیرے ہی گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر دفتر جا پہنچا۔ ابھی تک خاکروب نے پوری طرح دفتر کو ہماڑ دھبی نہیں لگایا تھا اور چڑاسی نے بھی اتنی صبح مجھے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت سے اپنے کاندھے اُچکائے۔ لیکن اس وقت میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں وہیں اپنی میز پر بیٹھا اپنے گھٹیا برائڈ کے سگریٹ پھونکتا رہا۔ دھیرے دھیرے لوگ دفتر آنا شروع ہو گئے اور جب میرا رمرزا دفتر میں داخل ہوا تو مجھے اپنے سے پہلے دفتر میں پا کر وہ تو خوشی اور حیرت سے اُٹھ چلا ہی پڑا۔ ”ابے یار اصغر..... تو..... آج سورج کس طرف سے نکلا تھا..... میں نے تو فوراً ہی نہیں کیا.....“ میں نے فوراً مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو ایک جانب لے جا کر کل شام کی ساری رُوداد سنا دی۔ کچھ دیر تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اُس پر جیسے ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا ”میں نے تو سنا تھا کہ انسان ساٹھ کے بعد ٹپٹاتا ہے..... تو تو چالیس کے بعد ہی.....“ وہ پھر ہنسنے لگا۔ میں ناراض ہو کر پلٹ کر واپس جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ابے یار..... ناراض کیوں ہوتا ہے..... دراصل لوگوں کا دماغ دو شادیاں کر کے خراب ہوتا ہے..... لیکن تجھے تیری دونو کریوں نے پاگل کر دیا ہے..... یہ صرف ذہنی دباؤ اور ہر وقت کی سوچ کے کرشمے ہیں۔ میری جان..... میں تو کہتا ہوں لعنت بیچ اس دوسری نوکری پر..... جس دن سے تو نے اس غبیث عظیم کے دفتر میں نوکری کی ہے تیری پریشانیاں گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہیں..... کیوں اپنی زندگی کو اتنے عذابوں میں ڈال رکھا ہے..... جس گھر اور اولاد کے لیے تو قرض پر قرض لیتا رہتا ہے انہوں نے تو کبھی آج تک تجھے گھاس بھی نہیں ڈالی۔ پھر اپنے اوپر تو یہ ظلم کیوں کر رہا ہے۔“ مرزا کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ ان دونو کریوں اور قرض کے چکر میں میں خود گھن چکر بننا جا رہا تھا۔ لیکن کیا وہ سب جو میرے ساتھ بیٹا، صرف ایک خواب ہی تھا؟ اور کیا کوئی خواب اتنے لمبے تسلسل سے بھی دیکھا جاسکتا ہے؟ میرا دل اُسے ایک خواب ماننے پر راضی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں

ہا ہوں..... ورنہ تم انسانوں میں ایسے جنونی اور پاگل بھی موجود ہیں جو میری ایک جھلک بننے کے لیے اور مجھے پانے کے لیے برسوں جانے کتنی تپسیا اور کتنے جاپ کرتے ہیں..... رات، صبح و شام اپنا جیون جلاتے ہیں، قبرستانوں میں، دریاؤں میں، صحراؤں میں ایک ل پر کھڑے ہو کر سالوں جتنز منتر پڑھتے ہیں۔ قبروں سے مردے نکال کر اُن کی ہڈیوں کا نہ بنا کر اپنی آنکھوں میں اس اُمید پر لگاتے ہیں کہ شاید وہ مجھے دیکھ پائیں گے لیکن جواب صرف اپنی پینائی ہی کھوتے ہیں عمر بھر کے لیے..... کئی تو ایسے بھی ہیں جو اپنے جیسے مرے انسانوں کا خون کرنے سے بھی نہیں چوکتے صرف اس اُمید پر کہ شاید وہ کبھی میری جھلک ہی پالیں گے لیکن میں اُن پر کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ میرا احسان مانو کہ میں کسی بانی، یا امتحان کے بغیر تم سے آج تک کلام ہوں.....“

مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی ہونے لگی تھی لہذا میں اپنی تلخی چھپا نہیں پایا۔ ”اچھا..... اب مجھ پر اس مہربانی کی وجہ بھی بتا ہی دو؟“ ”وجہ کچھ خاص نہیں ہے..... بس تم مجھے اچھے لگے ہو..... مجھ سے دوستی کرو گے.....؟“ ”دوستی؟ تم سے..... لیکن تم ہو کیا بلا..... مطلب ہے تم کون سی مخلوق ہو.....؟“ وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”میں جس سے بگڑا ہوں اُس کے لیے واقعی ایک بلا ہوں لیکن جس پر مہربان ہو جاؤں اُس کی دنیا بدل دیتا ہوں۔ تمہاری دنیا والے مجھے ’چھلاوہ‘ کہتے ہیں۔“ میں اُس کی بات سن کر اُچھل پڑا..... چھلاوہ..... تو کیا تم کوئی جن بھوت وغیرہ ہو۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”تم چاہو تو بھوت ہی سمجھ لو..... نہ کیا تم نے آج تک کوئی بھوت دیکھا بھی ہے؟ جنات کا وجود تو پھر بھی ثابت ہے، ورنہ تم ان ہی خود سب سے بڑے بھوت ہو.....“ میں ابھی تک اُلجھن میں تھا۔ ”کیا تم سامنے آؤ گے؟“ ”مجھ سے بات نہیں کر سکتے.....؟ مجھے یوں بند آنکھوں سے بات کرنے سے اُلجھن ہونے لگی ہے۔“ ”ٹھیک ہے لیکن یاد رہے کہ میں صرف تم پر ہی خود کو واضح کر رہا ہوں۔ دوسروں کے لیے میں اب بھی اوجھل ہوں۔ اب تم چاہو تو آنکھیں کھول سکتے ہو۔“ میں نے جھٹ سے صین کھول دیں۔ وہ بالکل میرے سامنے بچوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈر اپنے پیر سیکر لیے۔ اُس کے بیٹھے کا انداز بھی عجیب تھا جیسے کوئی بلی کوئی اونچی چھلانگ سے پہلے اپنے پیروں پر اپنا پورا بوجھ ڈالتی ہے اور اگلے بچوں کو زمین پر ٹکا کر اپنا جسم

سرکاری دفتر کا وقت ختم ہوا اور مجھے پھر سے اُسی اذیت گاہ کی جانب قدم بڑھانا پڑے جہاں روزانہ میری رُوح کا قتل ہوتا تھا۔ لیکن اُس دن اتفاق سے وہ جلاذ عظیم دفتر کچھ دیر سے پہنچا اور آتے ہی اُسے کسی ضروری کام کے سلسلے میں دوبارہ باہر جانا پڑ گیا۔ میں اپنے اندر سرشام ہی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، لہذا عظیم کے دفتر سے نکلنے کے بعد مجھ سے بھی دفتر میں نہیں بیٹھا گیا۔ میں دفتر سے نکلا اور میرے قدم خود بخود اُسی پارک کی جانب بڑھ گئے۔ مغرب کا وقت قریب ہی تھا اور بادلوں کی وجہ سے آج سرشام ہی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ پارک میں اُس پارک کی جانب کیوں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں اُس اُلجھن اور اُس اذیت کو ختم کرنا چاہتا تھا جو اس خواب اور حقیقت کا کچ جاننے کے لیے میرا اندر اس وقت جمیل رہا تھا۔ جب میں پارک پہنچا تو ابھی وہاں اکا دکا لوگ موجود تھے جو شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ جا کر اُسی بچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر چوکیدار کو اُس پاس نہ پا کر میں نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا..... میں نے آنکھیں کھول کر پھر اطمینان کیا اور ایک بار پھر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس بار بھی کوئی جھماکا نہیں ہوا۔ تو کیا واقعی وہ سب میرا دھمکا ہی تھا۔ میں نے تھک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کل جب میں یہاں آیا تو مغرب کے بعد کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب کہ اس وقت اچھی خاصی روشنی باقی تھی۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے گھر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو آج اپنا شک پوری طرح دُور کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ میں نے ٹہل کر پارک کا ایک چکر لگایا اور شاید وہ میرا تیسرا چکر تھا جب مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں چکر ختم کر کے واپس اپنے بچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جانے میرا دل اتنے زور زور سے کیوں دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک دو تین کہا اور آنکھیں بند کر لیں اور پوری طرح ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود میں ایک بار پھر اُچھل پڑا۔ ہاں..... وہی دو سلگتی آنکھیں..... میرے ذہن میں آواز گونجی ”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈرتے ڈرتے بند کیں اور زیر لب جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھا ”تم کون ہو.....؟ اور آخر میرے پیچھے ہی کیوں پڑے ہو..... اور تم کسی اور کو کیوں نظر نہیں آتے۔“ وہ آنکھیں ہنس دیں۔ ”میں صرف اُسی کو نظر آتا ہوں جس کو نظر آنا

چھوڑ چکے ہو..... ذرا غور تو کرو..... تم نے آخری نماز کب پڑھی تھی.....؟ تمہیں روزہ لے ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں.....؟ اور آخری بار تم نے کسی مسجد کا دروازہ کب پار کیا.....؟ تم اور تمہارا پورا گھرانہ تو عید کے دن بھی سورج چڑھے نیند سے جاگتا ہے..... تمہاری کتاب پچھلے سات آٹھ سالوں سے تمہارے گھر کے طاق میں پڑی پڑی مٹی سے اٹ چکی..... میں نے ایسی کون سی انہونی کہہ دی ہے جو تم یوں مجھ سے الجھ رہے ہو.....؟“ میں ہاکی باتیں سن کر مزید غصے اور خجالت کا شکار ہو گیا۔ بہر حال اُس نے کہا سب سچ ہی تھا۔ میں یہ سب کس نے بتایا؟ اور کان کھول کر سن لو کہ نماز پڑھنا پڑھنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنا ایمان ہی تمہاری دوستی کے عوض بیچ ڈالوں۔“

وہ ایک لمحہ پہلے مجھے زمین پر دکھائی دیا لیکن اب اگلے ہی لمحے وہ درخت کی پہلی شاخ پر ہوا دکھائی دیا۔ وہ مسلسل بات چیت کے دوران ہر لمحہ اپنی جگہ بدلتا ہی رہتا تھا۔ جیسے اُسے لاکروٹ بھی چین نہ ہو۔ میری بات سن کر وہ غصے میں آ گیا۔ ”کسی نے سچ ہی کہا ہے..... ننان ہو ہی سدا کے ناشکرے۔ ٹھیک ہے جاؤ مرو اُسی ذلت کی زندگی میں۔ جہاں صبح سے اب تک تمہیں صرف بے عزتی ہی ملتی ہے..... جس سے کل تک تم اتنے بے زار آچکے تھے کہ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ تم جیسوں کو مر ہی جانا پے۔ میں تمہیں آج جانے دے رہا ہوں، لیکن یاد رہے کہ اب اس طرف کا رخ تبھی کرنا۔ تم میری دوستی قبول کرنے کا فیصلہ کر لو، ورنہ اگر تمہیں میں نے دوبارہ تمہارے اس برائے ایمان کے ساتھ اپنے اس ٹھکانے کے آس پاس بھی بھٹکتے ہوئے دیکھا تو میں خود تمہاری لے لوں گا۔ تم نے ابھی تک میری دوستی دیکھی ہے..... میرا جان لیوا روپ نہیں دیکھا..... اب یہاں سے.....“ وہ ہل بھر میں جانے کہاں غائب ہو چکا تھا لیکن اُس کے لہجے نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو چوکیدار دُور سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ میں اُس کے سوالات سے بچنے کے لیے جلدی سے وہاں سے اور مخالف سمت چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔

تو لیتی ہے۔ وہ بھی یوں ہی زمین پر اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اور ہاتھوں کے پچھے کھولے ہوئے یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی اگلے ہی پل کسی پھر تیلے چیتے کی طرح کوئی اونچی زقند لگا کر درخت کی کسی اونچی شاخ پر جا بیٹھے گا۔ اُس کے وجود میں جیسے کوئی پارا سا بھرا ہوا تھا، اور انس سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میں اُس کی جانب دیکھ بھی نہیں پار ہا تھا۔ ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تم مجھ سے دوستی کرو گے، یا نہیں.....؟ لیکن کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دوستی اتنی آسان نہیں ہے۔ کچھ شرائط پر پورا اُترنا پڑتا ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد جب تم میرے دوست بن جاؤ گے تو دنیا کی ہر آسائش وہ سب کچھ جس کا تصور تم شاید اپنے آخری خواب میں بھی نہیں کر سکتے، وہ سب تمہارے قدموں میں ہوگا۔ بس صرف تمہاری خواہش دل سے ہونٹوں پر آنے تک کی دیر ہوگی اور اس جہاں کی ہر نعمت تمہارے اختیار میں ہوگی.....“

”اچھا.....؟ تو اب لگے ہاتھوں وہ شرائط بھی بتا دو جو تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے پوری کرنا ہوگی۔“

”شرط کوئی خاص بڑی نہیں ہے..... بس تمہیں اپنا ایمان مجھے سونپنا ہوگا۔“ میں اُس کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ”کیا مطلب.....؟..... تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”تم سمجھ نہیں، یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے۔ میں نے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں کہی؟ بس تمہیں اپنا مذہب ترک کرنا ہوگا۔ تم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مذہب کا کوئی بھی فرض رکن ادا نہیں کرو گے۔ کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھو گے۔ کلمہ، نماز، روزہ یہ سب تمہارے لیے میری دوستی کے بعد اجنبی ہو جائیں گے۔ بس اتنی سی شرط ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....“

غصے میں میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ”واہ..... کیا شرط ہے.....؟ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری باتوں میں آکر اپنا مذہب ترک کر دوں گا..... کبھی نہیں..... میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دوستی پر..... دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہ آنا۔“ وہ زور سے ہنسا ”تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو..... میں نے جو عمل تمہیں ترک کرنے کے لیے کہا ہے تم خود نہ جانے کب کا وہ سب

ایمان فروش

پر اٹھالے گی۔ میں نے پی سی او سے دو چار دوستوں کو فون کیا کہ شاید کچھ قرض کا انتظام ہو جائے مگر میں پہلے ہی سب سے اتنا قرض لے چکا تھا کہ اب تو کئی دوست میری آواز سن کر ہی فون بند کر دیتے تھے۔ چھلاوے نے ٹھیک ہی کہا تھا مجھ جیسوں کو تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور قدم بڑھا دیئے اور جب میں اپنے خیالات کی یلغار سے چونکا تو میں پھر وہی اسی پارک میں اسی درخت کے نیچے کھڑا تھا اور شام کا ملگجا اندھیرا میری قسمت کی کالک کی طرح آس پاس پھیل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے درخت کے پیچھے سے جھانکا۔

”تم پھر آگئے..... میں نے تمہیں خبردار بھی کیا تھا کہ.....“

”ہاں..... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مار ڈالو..... مجھ میں خود کو مارنے کی ہمت نہیں ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”بڑے بزدل ہو..... خود مر بھی نہیں سکتے..... اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے.....؟“

میں نے بے بسی سے سر جھٹکا ”ٹھیک ہے..... تم بھی اڑا لو مذاق..... میری اپنی دنیا والے بھی یہی کرتے ہیں.....“

”میری پیش کش اب بھی قائم ہے..... جس مذہب سے تم پہلے ہی میلوں دور ہو..... اُسے میری خاطر ترک کرنے میں آخر تمہیں اعتراض ہی کیا ہے؟ اچھا چلو..... میں تمہاری خاطر اپنی شرط میں کچھ نرمی پیدا کر دیتا ہوں لیکن صرف تمہارے لیے..... کیا سمجھے..... تم چاہو تو صرف ایک سال کے لیے آزمائشی طور پر اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھو سکتے ہو۔ اگر سال کے بعد تمہیں لگے کہ تمہاری پرانی زندگی ہی بہتر تھی تو تم واپس لوٹ جانا۔ لیکن خیال رہے کہ اس ایک سالہ معاہدے میں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ جو تم کہو گے وہ میں کروں گا اور جس چیز سے میں تمہیں منع کروں گا تمہیں اُس سے پلٹنا ہوگا۔ بولو منظور ہے۔“

میں ابھی تک اُسی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ ”لیکن..... میرا مطلب ہے کہ اگر کسی غلطی، یا مجبوری کی وجہ سے میں نے مذہب کا کوئی ایسا رکن اختیار کر لیا تو کیا ہوگا..... کیا اُس کے بعد.....“ اُس نے میری بات کاٹ دی ”اس کی تم فکر نہ کرو..... جب تم ایک بار سچے دل سے اپنا ایمان اُسے پاس گروی رکھو دو گے تو پھر سال بھر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات اول تو پیدا ہوگی میں..... اور پھر اگر تمہارا دل بھٹکا، بھی تو میرے پاس اس کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم یہ سرخ

اصغر صاحب کی داستان ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میرے کچھ اس طرح سے اُن کی کہانی میں مگن ہو گیا تھا کہ وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ ہمیں وقفہ لینا پڑا۔ حالانکہ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں نے اصغر صاحب کو کچھ آرام کرنے کا کہہ دیا لیکن خود میرا پورا دن اُن کی کہانی کے تانوں بانوں میں الجھا رہا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور رات کو پھر ہمیں تنہائی میسر آئی تو اصغر صاحب نے پھر سے اپنی کہانی کا سراویں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”عبداللہ میاں..... انسان بڑا کمزور ہے۔ وہ ارادے باندھتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ میرے ارادوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا..... میں اُس روز چھلاوے کو دھتکار تو آیا لیکن اگلے ہی روز صبح ہی سے میری پریشانیوں کا وہی پرانا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی سرکاری دفتر اور وہی افسروں کی جھج جھج، صبح سویرے ہی سب سے پہلے بیوی نے فلیٹ کے کرائے کا رونا شروع کر دیا کہ مالک کئی مہینوں سے کرایہ بڑھانا چاہتا ہے اور کل شام کو اُس نے فائل نوٹس بھی دے دیا ہے کہ کرائے میں ساڑھے تین ہزار کا اضافہ کرو ورنہ فلیٹ چھوڑو..... اور ہمارے پاس وقت بھی صرف دو ہفتوں کا ہی بچا تھا۔ بیوی سے لڑ کر اور جان چھڑا کر دفتر پہنچا تو وہاں بھی افسر اکھڑے ہوئے تھے کہ ہفتوں پرانی فائلز ابھی تک میری میز پر کیوں پڑی ہیں.....؟ وہاں سے ڈانٹ کھا کر عظیم کے دفتر پہنچا تو وہ پہلے ہی گزشتہ دن میرے دفتر سے جلدی اٹھ جانے کا پتا چل جانے پر غصے میں آگ بگولہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فائل اٹھا کر میرے منہ پر دے ماری اور مجھے آفس سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مطلب یہ نوکری بھی میرے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ دفتر سے باہر نکلا تو گھر واپسی کا سوچ کر ہی میرا دل اُلٹنے لگا کہ جب میری بیوی کو پتا چلے گا کہ میں کرائے کا انتظام کرنے کے بجائے اُلٹا اپنی لگی بندھی نوکری بھی گنوا آیا ہوں تو وہ تو آسمان سر

ہے.....“ میری بیوی کمرے سے مسکراتی ہوئی نکل گئی۔ اُس کی یہ مسکراہٹ میں نے آج سے ٹھیک ۲۵ سال پہلے دیکھی تھی جب ہماری تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ تب سے لے کر آج تک میں اُس کی مسکراہٹ تو دُور، اُس کے دو میٹھے بولوں کو بھی ترس گیا تھا۔ بیوی کے نکلنے وقت میری نظر ڈرینگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو اس میں مجھے پیچھے اپنی الماری کے اوپر وہ بیٹھا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک خواب کے سے عالم میں چائے ختم کی اور کمرے سے باہر نکلا تو میری بڑی بیٹی تولیہ اور صابن اور دوسری بیٹی ہاتھ میں میرے استری شدہ کپڑے پکڑی نظر آئی ”ابا آپ جلدی سے نہ لیں..... پھر ہم سب اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج عظمیٰ نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے پراٹھے بنائے ہیں۔“ عظمیٰ میری چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ میں حیرت سے وہیں گر پڑنے کے قریب تھا۔ اسی کیفیت میں غسل کر کے باہر نکلا تو میرا بڑا بیٹا دُور میرے جوتے پالش کر چکنے کے بعد انہیں کپڑے سے چکارا ہوا تھا۔ جب کہ چھوٹا میرے لیے خشک سلیپر لیے پہلے سے میرے انتظار میں غسل خانے کے باہر کھڑا تھا۔ میری تو جیسے زبان ہی گنگ ہو چلی تھی۔ میری بیوی اور بیٹیوں نے جس پیار سے مجھے ناشتا کروایا اور بیٹیوں نے جس محبت سے لنچ بکس کا ٹفن کیرئیر میرے حوالے کر کے مجھے دفتر کے لیے رخصت کیا دیا میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ قلیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچا تو جیسے بس میرے انتظار میں ہی کھڑی تھی اور میری پسندیدہ تین نمبر کی کھڑکی والی سیٹ بھی خالی تھی، جہاں بیٹھ کر میں ڈرائیور سے کہہ کر اپنی پسندیدہ کیسٹ بھی سن سکتا تھا۔ آج خلاف توقع کنڈیکٹر کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور جانے کیوں مجھے یہ بھی محسوس ہوا پل بھر کے لیے کہ میں نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے بیک ویو مرر میں اپنے اُسی مہربان کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

دفتر پہنچا تو چہرہ اسی نے نہایت ادب سے سلام کیا اور بتایا کہ توصیف صاحب دو تین بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ توصیف صاحب ہمارے سیکشن آفیسر تھے اور اُصولوں اور وقت کے نہایت پابند۔ میں نے جھجکتے ہوئے اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے دیکھتے ہی بولے ”آئیے آئیے“ افسر صاحب..... بھی مبارک ہو..... آپ کو سپرنٹنڈنٹ پر دموت کر دیا گیا ہے اور وہ جو ہاؤس

دھاگا اپنے گلے میں باندھ لو..... یہ پورے ایک سال تک تمہارے گلے میں موجود رہے گا اور تمہیں ہر اس بات سے بچائے گا جو مجھے پسند نہیں ہے، یا جس سے ہماری دوستی کی کسی بھی شرط پر کوئی بھی آنچ آسکتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ یہی سرخ دھاگا میرے اور تمہارے رابطے اور معاہدے کا ضامن ہوگا۔“ میں نے سر جھٹک کر دیکھا تو دھاگا اب اُس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں شدید ہچکچاہٹ اور کش مکش کا شکار تھا۔ اُس نے مجھے اُکسایا۔ ”سوچو مت..... ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں ملتے..... تمہیں کون سا دین، یا دنیا میں سے کوئی ایک بھی میسر ہے..... دین کی طرف تم گئے نہیں اور دنیا تم سے بھاگتی رہی..... اب ایک موقع ملا ہے تو کم از کم اس زندگی کو ہی جی جاؤ..... صرف ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ پھر عمر پڑی ہے دین کو جینے کے لیے..... باندھ لو دھاگا..... لوگ ایسی زندگی کا ایک پل جینے کے لیے عمر بھرا بیڑیاں رگڑتے ہیں..... اور میں تمہیں پورا ایک سال دے رہا ہوں..... باندھ لو یہ دھاگا..... دیر مت کرو.....“

میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ کئی جھگڑ چل رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور دھاگا گلے میں ڈال کر اس کی ڈور کس لی۔ دفتراے ایک زوردار آندھی چلی۔ مجھے یوں لگا یہ ہوا اس درخت کی شاخیں مجھ پر گرا کر ہی دم لے گی۔ گرد کا ایک طوفان اٹھا، مجھے ایک تیز چکر آیا اور میں لہرا کر وہیں زمین پر گر گیا۔

دوبارہ مجھے تب ہوش آیا جب کوئی دھیرے دھیرے پیار سے میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اُٹھ جائیں نا..... دیکھیں کتنی دیر ہو گئی ہے..... آج دفتر نہیں جانا کیا.....؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری جھگڑالو اور لڑاکا بیوی نہایت تمیز اور پیار سے مجھے جگا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں گرم چائے کا ایک کپ بھی تھا..... اوہ، بیڈنی (Bed Tea)..... میں نے جلدی جلدی زور سے اپنی آنکھوں کو رگڑا..... میں نے پہلے کوئی خواب دیکھا تھا، یا ابھی اس وقت کوئی سنا دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے پیار سے میرے بال سہلے اور تکیہ سیدھا کر کے مجھے بٹھایا اور چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے لگا دیا ”اُف کس سوچ میں پڑے ہیں..... جلدی کریں..... میں آپ کے کپڑے استری کر کے ہاتھ روم میں لٹکا دیتی ہوں۔ جلدی سے چائے پی کر نہ لیں۔ پانی گرم کر دیا

ذہن کو دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں..... اس وقت یہ تمہارا نہیں..... تم اس کے پاس ہو..... جودل میں بھڑاس بھری ہے..... سب نکال دو.....“ میں پھر سے خود اعتماد ہو گیا اور عظیم کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اُس سے کام کے بارے میں پوچھا۔ شبانہ میری کرسی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے وہ عظیم کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ عظیم نے جلدی سے فائل میرے سامنے پیش کی۔ میں نے دو صفحے پلٹے اور پھر فائل اٹھا کر پوری قوت سے عظیم کے منہ پر دے ماری۔ ”یہ کام کرتے ہو تم..... آج تک تمہیں ٹھیک طرح سے ڈرافٹنگ کرنا بھی نہیں آئی۔ بوڑھے گدھے ہو گئے ہو اور ابھی تک غلطیاں کرتے رہتے ہو۔“ عظیم کے ماتھے سے ویسے ہی پسینہ ٹپک رہا تھا جیسے روزانہ میرے ماتھے سے ٹپکتا تھا۔ شبانہ ویسی ہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے کھڑی طنز سے عظیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں پھر عظیم پر دھاڑا ”چلو اٹھاؤ یہ فائل اور اپنی منحوس صورت میری نظروں کے سامنے سے دُور لے جاؤ۔ دوبارہ اس طرح کا ڈرافٹ میرے سامنے لے کر آئے تو میں فائل سمیت تم کو بھی اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ.....“ عظیم غجالت اور شرمندگی سے کانپتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ مسکراتی ہوئی میری آغوش کی جانب بڑھی لیکن اب اُس کی باری تھی۔ میں زور سے چیخا۔ ”اور یہ تم کیا ہر وقت اپنے ہونٹوں پر طوائفوں جیسی نمائش مسکراہٹ سجائے میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر میں کام چاہیے..... بازار نہیں..... تم بھی دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں بھی ابھی اسی وقت دھکے مار کر دفتر سے نکلوا دوں گا۔ شبانہ کا رنگ ہی جیسے اُڑ گیا اور وہ چند لمحوں حیرت اور صدمے میں گنگ سی کھڑی رہ گئی اور پھر روتے ہوئے دوڑ کر دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ میرے اندر برسوں کے اُبلتے ہوئے لاوے پر جیسے کسی نے پورا ٹھنڈا دریا اُنڈیل دیا ہو۔ اتنا سکون میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں عظیم کے کمرے سے باہر نکلا تو سارے دفتر کے لوگ حیرت میں شاک زدہ سے کھڑے تھے اور یہ سارا ماجرا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی سب لوگ تھے جن کے سامنے میں برسوں سے ذلیل ہو رہا تھا اور آج انہوں نے مجھے اپنے اندر کا لاوا اُن لوگوں پر اُبلتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن سے وہ اندر ہی اندر شاید خود بھی شدید نفرت کرتے تھے لیکن خوف اور مجبوری کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ میں نے ہال سے نکلتے ہوئے سب

لون (House Loan) کے لیے آپ نے درخواست دے رکھی تھی، وہ قرضہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ کیشیئر سے اپنا چیک لیتے جائیے گا.....“ حیرت اور خوشی کے مارے میری آواز بند ہو گئی۔ میری پردوشن کا کیس پچھلے پانچ سالوں سے اٹکا ہوا تھا۔ کیوں کہ میری اے سی آرز (ACRs) ٹھیک نہیں تھیں اور یہ گھر کے لیے اس قرضے کی درخواست تو میں نے بھرتی کے دوسرے سال سے دے رکھی تھی اور اب تو میں اُسے بھول بھی چکا تھا۔ میں شادی مرگ کی کیفیت میں توصیف صاحب کے کمرے سے نکلا تو وہ مجھے میری میز کے اوپر اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ ”کیوں..... اب تو خوش ہو.....“..... ”خوش.....؟ ہاں مگر یہ سب.....؟ کیسے.....؟“ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو تم سوچو گے وہ ہو جائے گا..... صبح سے اب تک صرف وہی ہو رہا ہے جس کے بارے میں تم برسوں سے سوچتے آرہے ہو..... تم نے آج تک ہمیشہ یہی سوچا تھا نا کہ تمہارے گھر میں تمہاری عزت ہو، آرام اور سکون ہو..... اور تمہاری وہ سب چھوٹی چھوٹی سی خواہش پوری ہوں جن کے لیے تم برسوں سے ترس رہے ہو.....؟..... تو بس میں نے صرف تمہاری آج تک کی اُن خواہشوں کو ہی پایہ تکمیل پہنچایا ہے..... ویسے تم انسان بھی بڑے عجیب ہوتے ہو..... تم نے ان معمولی اور گھٹیا سی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی ساری عمر گنوا دی..... یہ معمولی سا ہاؤس لون اور اس سپرنٹنڈنٹ کی یہ بڑے کلرکوں والی نوکری..... بس یہی پہنچ گئی تھی تمہاری آج تک کی ہر سوچ، ہر جذبہ کی..... سچ پوچھو تو مجھے انوس ہو رہا ہے تمہارے معیار پر.....“

میں حیرت سے بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت دفتر میں کچھ زیادہ چہل پہل نہیں تھی کیوں کہ باقی سارے لوگ کانفرنس ہال میں تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ”مطلب یہ کہ میں جو بھی سوچوں گا، تم میرے لیے ویسا ہی کر دکھاؤ گے.....؟..... کچھ بھی.....“ ”جو بھی میرے دل میں آئے؟“ وہ مسکرایا ”آزمائش شرط ہے.....“ اور پھر میں نے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو جب میں عظیم کے دفتر پہنچا تو میرے دل نے کہا ”عظیم میرے لیے دروازہ کھولے.....“ اور پھر دروازہ کھلا تو عظیم میرے سامنے فائلیں لیے کھڑا تھا۔ اُس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ”آئیں سر پلیز..... ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے.....“ شبانہ بھی اُس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی۔ میں شدید خواہش کے باوجود کچھ ڈگڈگ سا گیا۔ اُس نے میرے

کے بعد اُس وقت ہوا جب ایک شام میں تھکا ہارا اپنے افس سے گھر پہنچا۔ میرا کاروبار اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے اور اپنے دو بیٹوں کے لیے الگ الگ تین عظیم الشان دفاتر قائم کرنا پڑے تھے۔ ہم نے اپنے کاروبار کے لیے ایک بڑی عمارت خرید لی تھی۔ اور میں، میرے بیٹے اور اُن کا سارا اشاف اسی عمارت میں بیٹھتا تھا۔ ہمارا زمینوں کی خرید و فروخت کا کاروبار تھا اور ہم شہر کے سب سے بڑے بلڈر کہلاتے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی بڑی گاڑیوں میں صبح گھر سے نکلتے اور شام تک ہم آدھا شہر فتح کر کے گھر واپس لوٹتے تو عام طور پر گھر سنسان ملتا تھا اور نوکروں سے پتا چلتا کہ بیگم صاحبہ کسی تقریب پر گئی ہوئی ہیں اور چھوٹی بیبیاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ البتہ اُس شام میں گھر پہنچا تو میں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ میری بیوی کی کلب والی تمام نئی سہیلیاں میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں اور اُن کے سامنے میز پر تاش کے چوں اور پیسوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فلیش چل رہا تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اُس دن پتا چلا کہ میری بیوی نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ ابھی میں حیرت کے اس پہلے جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے کھڑکی سے باہر چھوٹی غطفی کو شہر کے ایک مشہور لوفر امیر زادے کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا اور جس انداز میں وہ اُس سے گلے مل کر رخصت ہوئی وہ مجھے شرم سے پانی پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اُس وقت تو کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پائے رکھا لیکن رات کو جب میں نے بیوی سے گھر کو جوا خانہ بنانے اور بیٹی کی آزاد خیالی پر استفسار کیا تو اُس نے لا پرواہی سے اٹھلا کر کہا ”اوہ کم آن اصغر..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... آپ محلوں تک پہنچنے کے باوجود ابھی تک ذہنی طور پر اُسی دو کمرے کے فلیٹ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سوسائٹی میں موو (Move) کرنے کے لیے یہ سبھی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اور رہی بات غطفی اور شہزاد کی تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ لڑکے کے گھر والے چند روز میں غطفی کا رشتہ لینے آرہے ہیں۔“ میں نے تملاکر کہا ”بات رشتہ لینے دینے تک پہنچ چکی ہے اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ تم جانتی بھی ہو اس لڑکے کو..... ایک نمبر کا غنڈہ ہے..... امیر زادہ ہوا تو کیا ہوا۔“ میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو..... اس معاشرے میں لڑکی کا رشتہ دیتے وقت صرف لڑکے کی حیثیت اور بینک بیلنس دیکھا جاتا ہے۔ چلیں اب سو جائیں۔ خواہ خواہ پریشان نہ ہوں۔“ میری بیوی تو کروٹ بدل کر چند لمحوں میں خراٹے

کو الوداعی سلام کیا تو سب سے پہلے جاوید کے ہاتھ تالی بجانے کے لیے اٹھے اور پھر دھیرے دھیرے اُن سب کی تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔ میں مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے دھیرے سے خود سے سرگوشی کی ”تم نے یہ سب کیسے کیا.....؟ میرا مطلب ہے عظیم میرے سامنے یوں بیٹھکی بلی بنا کیسے کھڑا تھا؟ آخر وہ ہے تو میرا باس ہی.....“

وہ مسکرایا ”تم ان باتوں میں اپنا ذہن مت الجھاؤ..... یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہر حال فی الحال تم نئے نئے میرے دوست بنے ہو تو یوں سمجھ لو کہ یہ سب نظر بندی کا کھیل تھا۔ عظیم نے تمہیں اپنے ہی کسی بڑے افسر کے روپ میں دیکھا۔ تمہارے دفتر سے نکلنے کے بعد اُسے رفتہ رفتہ یہ احساس ہو گا کہ اُسے ذلیل کرنے والے خود تم تھے۔ بہر حال اب تم کچھ بڑا سوچو..... پورا دن گزر گیا یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے.....“ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا ”بڑا سوچو.....؟..... کیا مطلب.....؟“ ”مطلب یہ کہ سب سے پہلے تمہیں اس پٹھر فلیٹ سے نکال کر تمہارے لیے اپنے دوست کے ہم منصب زندگی کا سوچنا ہو گا۔ آخر اب تم میرے دوست ہو، کوئی معمولی انسان نہیں..... لیکن تم انسانوں کی مجبوریاں بھی دھیان میں رکھنا پڑتی ہیں۔ بہر حال یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو.....“

اور پھر میں نے واقعی سب اُسی پر چھوڑ دیا۔ اگلے تین دن کے اندر نہ جانے میرے برسوں پرانے خریدے گئے چند پرائز بانڈز اور حال ہی میں خریدا گیا لاٹری کا ایک ٹکٹ یکے بعد دیگرے یوں نکلے کہ اگلے ایک مہینے کے اندر میں پہلے لکھ جتی اور پھر اگلے چند مہینوں میں کروڑ پتی ہو چکا تھا۔ دولت مجھ پر یوں برس رہی تھی جیسے میں نے کوئی پارس پالیا ہو اور میں جس چیز کو بھی ہاتھ لگا تا وہ سونے کی بن جاتی۔ چھ مہینے کے اندر اندر میری زندگی یکسر بدل چکی تھی اور ان چھ مہینوں میں اس چھلاوے نے خود مجھ سے کوئی خاص کام بھی نہیں لیا تھا سوائے ایک آدھ بار کسی ویرانے سے چند جملے ہوئے بال اٹھا کر کسی گھر کے آگن میں ڈال آنے کے، یا پھر کسی جانور کا گوشت کسی ایک جگہ سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ پھینک آنا، وغیرہ وغیرہ۔ سچ بچھو تو مجھے وہ سب کام انتہائی بچگانہ سے بھی لگتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہو گا کوئی جادو مٹنے کا چکر، لہذا میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ ہاں البتہ اس تمام عرصے میں، میں دین سے بالکل دُور رہا اور خود دین رفتہ رفتہ میرے گھر سے دُور ہوتا گیا۔ اس کا انداز پہلی بار مجھے چھ مہینے

بھرنے لگی لیکن میری نیندیں اُسی روز سے حرام ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلاوے سے اس بارے میں شکایت کی تو وہ بھی طنزیہ سی ہنسی ہنس دیا۔ ”تمہاری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تم کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں الجھے رہنے ہوں۔ یہی جوا اگر تمہاری بیوی شہر کے کسی بڑے جم خانے، یا آفیسر کلب مناجگہ پر کھیلتی تو تم اسے نئی تہذیب میں شمار کرتے اور اگر وہی تاش کے پتے گھر میں کھل گئے تو وہ جوا ہو گیا؟ اور شکر کرو تمہاری بیٹی نے اُس لڑکے کو گھر رشتہ لانے کا کہا ہے۔ ورنہ جس ماحول میں وہ پل بڑھ رہی ہے وہاں لڑکیاں یا تو بھاگ کر شادی کرتی ہیں، یا پھر باہر شادی رچا کر گھر واپس آتی ہیں۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ایک دم اور آسانی سے بے تحاشا پیسہ مل جانے کے اپنے بھی کچھ اثرات ہوتے ہیں..... اور پھر تم انسان ایک اور پابندی بھی تو خود پر لگائے رکھتے ہو فضول سی۔ وہ کیا کہتے ہیں اُسے، ہاں..... حلال اور حرام..... تو اصغر صاحب تمہارے گھر میں پانی کی طرح بہتا پیسہ بھی تو تمہارے انسانی معیار کے مطابق حرام کا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سارے کمالات اسی حرام کے پیسے سے کھائی ہوئی روٹی کے ہوں.....؟“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی باتیں تلخ اور کڑوی تو کوئین سے بھی زیادہ ہوتی تھیں، لیکن سچ ہوتی تھیں۔ اگلے دن ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی۔ میرا چھوٹا بیٹا کرکٹ پر کروڑوں کا سٹھ کھیلتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوروں کی کوئی ٹیم آئی تھی خاص اُسے پکڑنے کے لیے۔ چھلاوے کی مدد نہ ہوتی تو عمر بھر باہر کی جیلوں میں سڑتا رہتا۔ ابھی اس پریشانی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ بڑی بیٹی نے نشے میں ڈھت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے کسی راہ گیر کو پکڑ دیا۔ بیٹی کی ایف آئی آر میں نے جب یہ پڑھا کہ اُس کے میڈیکل ٹیسٹ میں شراب کا نتیجہ مثبت آیا ہے تو میں بالکل ہی ڈھس گیا۔ آسانی سے ملا ہوا بے تحاشا اور حرام کا پیسہ واقعی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ میں ایک شام اسی غم میں اداس سا اپنے دفتر میں بیٹھا ساحل کی طرف کھلتی کھڑکی سے دُور نگر انداز جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آواز میرے من میں گونجی..... ”کیا بات ہے..... بہت اداس ہو..... اب تو زندگی کی ہر نعمت تمہارے پاس ہے..... اب اس اداسی کی وجہ کیا ہے..... میرے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی دوست اداس اور پریشان ہو تو پھر میرا کیا فائدہ.....“ میں نے ٹھنڈی سی آہ بھری ”پتا نہیں..... میرا دل اب ان سب چیزوں سے اُوب سا گیا ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ غربت کے اپنے مسائل اور امارت کی اپنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں

میں انسان کا مقدر صرف بے چینی ہی ہے..... سکون کہیں بھی میسر نہیں آتا۔“ اُس نے میرا دل بھلانے کی کوشش کی۔ ”اچھا چھوڑو یہ مایوسی کی باتیں۔ یہ بتاؤ کبھی کوئی عشق وغیرہ کیا ہے زندگی میں.....؟“ ”عشق.....؟..... کیوں دل جلاتے ہو..... تمہارے آنے سے پہلے کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے..... ایسے میں عشق کسے سوچ سکتا ہے؟“ اُس نے اصرار کیا ”پھر بھی..... شادی سے پہلے کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی.....؟ کیا تمہارے پاس کوئی بھی سنہری یاد نہیں ہے.....؟“ میں ماضی کے درپچوں میں کھو گیا۔ ”ہاں کبھی تھی کوئی..... لیکن پھر وہی امارت اور غربت کی دیوار..... ہم یونیورسٹی فیلو تھے..... وہ بہت چاہتی تھی مجھے..... لیکن جب اُس کے سیٹھ باپ کو پتا چلا تو اُس نے اپنے کارندوں کے ذریعے میری وہ خبر لی کہ یاد رہے اور مجھے دھمکی بھی دی کہ اگر میں اُس کی بیٹی کے آس پاس بھی پھنکا تو میری خیر نہیں۔ بعد میں سنا ہے اس کی کسی بڑے صنعت کار کے ساتھ شادی ہو گئی تھی..... اب تو نہ جانے وہ کہاں ہوگی.....“ اُس وقت تو چھلاوہ چپ رہا لیکن صبح میرے دفتر کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ برے اشاف میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی کہ یوں ”ڈنٹ ڈسٹرب“ کا بورڈ لگا دیکھ کر بھی برے آفس کا دروازہ کھٹکھٹا سکے..... میں نے چونک کر سر اٹھایا تو دروازے میں وہی کھڑی تھی۔ ہاں..... وہ سعدیہ ہی تھی..... میری پہلی محبت..... وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی..... بلکہ اس کا سگووار سا حسن اور بھی کچھ نکھر گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا۔ ”سعدیہ.....؟“ ”یہاں.....؟“ وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی اور پھر اُس نے جو بتایا وہ میرے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ چھ مہینے پہلے تک ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک ایک دن اُس کا باپ ایک ایکسڈنٹ میں مارا گیا۔ باپ کی اہل و عیال اور جائیداد شوہر کے قبضے میں آئی تو اُس نے نہ جانے کن الے تللوں میں اُڑادی اور تہ رفتہ اُس کا رویہ سعدیہ سے بھی بد سے بدتر ہوتا گیا۔ باپ کی موت سے ٹھیک دو ماہ بعد سے طلاق کا تحفہ دے کر گھر سے نکال دیا گیا اور پچھلے ہفتے ہی وہ اپنی عدت ختم کر کے نوکری کا تلاش میں نکلی تو اُسے میرا پتا چلا اور آج وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کے لیڈنٹ کی جو تاریخ بتائی تھی وہ ٹھیک اُس سے اگلا دن تھا جب میں نے اپنے گلے میں یہ رخ دکھا گا باندھا تھا۔ میں نے مشکوک نظروں سے اُس کے پیچھے صوفے پر اکڑوں بیٹھے اُس بطن کے چیلے کو دیکھا جس نے اپنے کاندھے اُچکائے اور میرے دل کی جانب اشارہ کیا۔

تیسری رات

اصغر صاحب کی داستان ابھی جاری تھی لیکن ہماری دوسری رات بھی اسی داستان گوئی میں صبح کے سپیدے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مجبوراً ایک بار پھر ہمیں باتوں کا سلسلہ روکنا پڑا۔ میں نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اصغر صاحب اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ آخر اب اس درگاہ پر اُن کی موجودگی کی وجہ کیا ہے؟ میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ راز بھی خود ہی کھل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ وقت آج کی تیسری رات کا ہی ہو۔ کیوں کہ مجھے اصغر صاحب کی داستان اپنے منطقی انجام کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر میں خود آج سے چھ ماہ پہلے والا ساحر ہوتا تو میں کبھی بھی اُن کی اس ساری کہانی پر یقین نہ کرتا۔ کیوں کہ اس جدید سائنسی دور میں ایسی منفی غیبی قوتوں کا موجود ہونا از خود ایک بہت بڑا سوال ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں ازل سے لے کر ابد تک نیکی اور بدی کی جنگ جاری تھی اور جاری رہے گی۔ اور پھر خود ہمارا نفس بھی تو ایک چھلاوہ ہی ہے۔ ہم سے چھل کرنے والا، ہمیں فریب اور دھوکے میں رکھنے والا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ خود ہمارا نفس ہمارے سامنے کبھی اسی چھلاوے کی صورت آکھڑا ہو جاتا ہو جیسے اصغر صاحب والا چھلاوہ اُن کے لیے ہزاروں نفسانی ترغیبات لے کر آکھڑا ہوا تھا؟

پتا نہیں ایسے اور نہ جانے کتنے سوالات تھے جو میرے ذہن میں ایک عجیب سی اٹھل پھل چائے ہوئے تھے۔ اب مجھے دھیرے دھیرے اصغر صاحب کے پُر اسرار رویے اور نماز کے وقت اُن کے غائب ہو جانے کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چھلاوہ پچھلے سال دسمبر میں اُن پر واضح ہوا تھا اور یہ مہینہ بھی دسمبر کا ہی تھا۔ مطلب یہ کہ ابھی اُن کے معاہدے کے کچھ دن باقی تھے؟

اصغر صاحب رات بھر کے جگ راتے کے بعد سوئے ہوئے تھے۔ میں نے دن گیارہ

یہ سچ ہے کہ جب سے سعدیہ مجھ سے پچھری تھی تب سے لے کر آج تک میرے دل میں اُس کے ظالم اور امیر باپ کے لیے شدید نفرت بھری ہوئی تھی اور دن میں کئی مرتبہ خیال آنے پر میں اُس کا قتل بھی کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اُس بے چاری کی زندگی ہی تباہ کر ڈالے۔ میں نے سعدیہ کو تو فوراً نوکری پر رکھ لیا اور اُس کی نظروں میں پڑا ایک پرانی چاہت کے پھر سے جاگ اٹھنے کا پیغام بھی پڑھ لیا۔ لیکن اُس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چھلاوے پر برس پڑا۔ وہ کچھ دیر اطمینان سے میری کڑوی کیسی باتیں سنتا رہا، پھر اطمینان سے بولا۔ ”بڑے ناشکرے ہو یا۔۔۔ کیا یہ بھی تمہارے اپنے دل کی ایک چھپی ہوئی حسرت نہیں تھی کہ وہ ایک بار پھر سے کسی کچے ہوئے پھل کی طرح تمہاری آغوش میں آگرے۔۔۔ ساری زندگی اُس کے لیے آہیں بھرتے رہتے۔ وہ ٹھیک تھا، یا یہ بہتر ہے کہ اب وہ جو ہیں گھٹے تمہارے آس پاس رہے گی۔۔۔ اب بننے کی کوشش مت کرو۔۔۔ میں نے دیکھا تھا تم کس طرح بھوکے نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں لا جواب سا ہو گیا۔ ”ہاں مگر۔۔۔ اس طرح۔۔۔ میرا مطلب ہے اُس کی زندگی پر بادر کے۔۔۔“ وہ ہنسا ”ایک بات یاد رکھو۔۔۔ اس دنیا میں تمہاری آبادی بھی ممکن ہے جب تم دوسروں کی بربادی کی فکر چھوڑ دو۔۔۔ جاؤ اب اُس کے ساتھ عیش کرو۔“ میں نے غصے سے اُس کی جانب دیکھا ”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ وہ عیش کرنے کی چیز نہیں ہے۔ تم جانتے ہو میں اُس سے کچی محبت کرتا ہوں۔“ وہ پھر زور سے ہنسا ”اُف۔۔۔ یہ تم انسانوں کے چونچلے، محبت کچی ہو جھوٹی۔۔۔ تم لوگوں کی ہر محبت کا انجام آخر کار ہوس ہی ہوتا ہے۔۔۔ تم چاہو تو کچی محبت کے نام پر اپنا مقصد حاصل کر لو۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔ ہونا آخر میں وہی ہے جو ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔“ میں نے لا جواب ہو کر سر ہٹا۔ اُس کے شیطانی دماغ سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال کچھ دن کے لیے ہی سہی، لیکن میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی تھی۔۔۔ سعدیہ نے آتے ہی میرے دفتر اور میرے دل کا سارا نظام یوں سنبھالا کہ کچھ بل کے لیے میری اس ویران زندگی میں بھی بہار آ ہی گئی۔ چھلاوے کے ساتھ میرے معاہدے کو چھ مہینے گزر چکے تھے اور ابھی چھ مہینے مزید باقی تھے۔

”پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھے آپ سے بہت سے سوال کرنے ہیں۔ سارے اللہ تک کے اس سفر کے بارے میں۔ آپ کی امی سے زہرا کے بارے میں بھی بہت کچھ ہے اور میں اُس خوش نصیب کی ایک جھلک ضرور دیکھنا چاہوں گی جس کے رُخ سے منکس اُدھوپ نے پل بھر میں آپ کی کایا پلٹ دی۔ کیا دنیا میں اب بھی ایسے مقدر والے ہوتے جو اپنے جلوے میں ایسے معجزے لیے پھرتے ہیں؟ لیکن میرے سارے سوال ہمیشہ تشنہ رہتے ہیں۔ کیا آپ کے اندر کا مذہب آپ کو ان سوالوں کے جواب دینے سے روکتا ہے، یا آپ بھی مرد و عورت کی تقسیم میں پڑے رہتے ہیں؟“

”اُسے الفاظ برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ تو گویا اُس شوخ ادا اور چنپل ہنسی کے پیچھے ایک بات حساس ذہن اور گہری سوچ بھی موجود تھی۔ ”نہیں..... میرا مذہب مجھے کسی سوال کے بارے میں نہیں روکتا، نہ ہی میں عورت اور مرد کی کسی تقسیم میں ذہنی طور پر بٹا ہوا ہوں۔ سچ اتنا ہے کہ میں تو ابھی تک خود سراپا سوال ہوں۔ جواب دینے کے لیے جس کاملیت کی رات ہے میں اُسی سے کوسوں دُور ہوں ابھی۔ اور شاید یہ مختصر زندگی سوالوں میں ہی گزرے۔ پھر بھی اگر میرے پاس آپ کے لیے کوئی جواب ہوا تو میں اسے آپ کے ساتھ بانٹنے کا کام نہیں لوں گا۔“

وہ میری بات سن کر کسی چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گئی ”تو پھر میں کب تک توقع کرنا اپنے سوال پیش کرنے اور آپ کے جوابات ملنے کی..... یاد رہے کہ آپ نے ابھی خود کے مختصر ہونے کی پابندی بھی بیان کر دی ہے.....“ مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”واقعی..... یہ کلبھاڑی تو میں نے خود ہی چند لمحوں پہلے اپنے پیروں پر ماری ہے۔ لہذا اب وقت کا تعین خود ہی کر دیں تو بہتر ہوگا۔ میں حاضر ہوں ہر طرح سے۔“ اُس نے اپنی فتح لان کر دیا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے کل رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ میں جی کو بھی آج ہی آپ کی آمد کا بتا دوں گی۔ وہ خود بھی کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔“ میں دُور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”کیا آپ کے سوال اُن کی موجودگی میں اپنے اصل لفظ و اختیار کر سکیں گے..... اور کیا خود میں اُن کی موجودگی میں آپ کو جواب دینے کے قابل ہے۔“ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ”ہاں..... مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے..... آپ خان جی

بچے کے قریب درگاہ کا پانی وغیرہ بھرا اور ابھی میں گھڑوں اور صراحیوں کو انگوڑ کی بیلوں کے نیچے رکھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کرم دین اپنی لمبی سی ڈانگ لیے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ میں داخل ہوا ”سلام عبداللہ باؤ..... بڑی اور چھوٹی مالکن آئی ہیں.....“ میں چونکا۔ ”بڑی مالکن اور لاریب، یوں اچانک.....؟..... خیر تو ہے۔“ لیکن کرم دین کے جواب سے پہلے ہی وہ دونوں بھی درگاہ کے احاطے تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر دعا پڑھ لی اور خود کچھ دُور جا کر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چادر وغیرہ چڑھا سکیں۔ ان معمولات سے فارغ ہو کر بڑی مالکن میری جانب پلٹیں۔ ”بھئی یہ تو بڑی وعدہ خلافی ہوئی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ حویلی کا چکر ضرور لگاؤ گے۔ لیکن لگتا ہے تمہیں حویلی کے کینوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے.....“

میں کچھ ہڑ برا سا گیا۔ ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں یہاں درگاہ میں میرے علاوہ ایک مریض بھی موجود ہے۔ اُس کی وجہ سے بھی پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں تنہائی میں بڑا سکون ملتا ہے۔ البتہ مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے اور بہت جلد وفا بھی ہوگا۔ بس آپ کسی خاص مدت کی شرط نہ لگائیں۔ یہ میری آپ سے التجا ہے.....“ وہ میری لمبی تمہید سن کر مسکرا دیں۔ ”اپنا دفاع کرنا خوب جانتے ہو.....“ اتنے میں کرم دین نے انہیں بتایا کہ وہ پرندوں کا دانہ اور چوری تانگے سے اُتر دالایا ہے۔ بڑی مالکن نے اُسے ساری چیزیں صحن میں لانے کا کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ لاریب جو اُن سے دو قدم پیچھے کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی، آگے بڑھ آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا ”آپ کیسی ہیں.....؟..... آگے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی، یا نہیں آپ کو.....“ وہ مسکرائی ”بھی مقدمہ جاری ہے، لیکن مجھے اُمید ہے کہ خان جی مان جائیں گے.....“ وہ خان صاحب کو خان جی کہتی تھی۔ ”جی مجھے بھی یہی اُمید ہے..... اور سنا ہے کہ آپ کو اپنی بات منوانے کے بہت سے گرجے آتے ہیں.....“ میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ وہی کچی زمین سے تازہ جھرنے کے پھوٹنے جیسی آواز۔ ”سچ پوچھیں تو آپ سے مل کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوا ہے مجھے۔ میں اس سے پہلے مذہب میں اتنی طاقت اور کشش کی قائل نہیں تھی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی کھوج کرنے والے باقی

کے سامنے بندھے رہیں گے۔ چلیں یہ مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور اس بات کا یقین لے
 ہمارے گھر آئیے گا کہ میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گی.....“ کچھ ہی دیر میں یو
 مالکن بھی اپنی مصروفیت سے فارغ ہو گئیں اور رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے ایک بار
 مجھے یاد دلایا کہ اب وہ اور اُن گھرانے والے مجھے غیروں میں شمار نہیں کرتے۔ لہذا میں
 اپنے دل و دماغ میں کوئی گرہ باقی نہ رکھوں۔ وہ لاریب کو مجھ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ چکی تھی
 اس لیے اُس کی جانب دیکھ کر مسکرائیں اور مجھ سے بولیں ”تم نے میرے بلاوے کو تو برا
 خوب صورتی سے ٹال دیا پر لاریب کی دعوت رد کرو تو جانوں..... اسے بھی تمہاری طر
 لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔“ وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ مطلب انہیں پتا تھا
 لاریب مجھے کل رات حویلی مدعو کرے گی؟؟ بہر حال اب تو میں ہاں کہہ چکا تھا، لہذا اس مد
 پر زیادہ سوچ بچار سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں شام بھی ہو گئی
 پھر اصغر صاحب نے بھی مغرب سے ذرا پہلے اپنے ”حجرے“ سے باہر بھاگنا۔ مجھے عجیب
 چینی سی ہروری تھی کہ کب میں ان روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر اُن کے سامنے جا
 بیٹوں گا اور کب وہ اپنی داستان مکمل کریں گے۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ تیسری رات
 رہی تھی جب میں پورے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی نیند لے پا رہا تھا لیکن
 بھی تھکاوٹ اور نیند کے کچھ خاص آثار میرے دماغ اور جسم پر طاری نہیں ہو پائے تھے۔ خ
 خدا کر کے رات ڈھلی اور عشاء کی نماز کے بعد میں اُن کے سامنے اس بچے کی طرح آ بیٹا
 جس کی کہانی پچھلی رات آدھی رہ گئی ہو اور اُس نے پورا دن اسی رات کی آس میں گزار دیا
 کہ آنے والی رات اُسے پھر سے خوابوں کے اُسی پرانے دیس میں لے جائے گی۔ اص
 صاحب نے ایک گہری سانس لی اور سلسلہ داستان پھر سے جوڑا۔

”ہاں تو عبد اللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ سعدیہ کے آنے سے زندگی میں ایک
 خوش گوار تبدیلی تو آئی لیکن ایک اور عجیب بات بھی میں نے محسوس کی۔ جس سعدیہ کو میں اُس
 شادی سے پہلے جانتا تھا اور جس کی محبت میری زندگی کا پہلا عشق اور پہلا جنون تھا، جس کے
 لیے کبھی میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتا تھا، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مٹ
 گھنٹوں کڑی دھوپ میں، برستی بارشوں میں صبح و شام اُس کی کلاس اور گھر کے چکر لگایا کرتا تھا

ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ لوگوں کی منزل یہ دولت، یہ عیش نہیں۔۔۔۔۔ کچھ اور ہے۔۔۔۔۔
 اُس نے غصے میں میری میز پر پڑی سب ہی چیزیں الٹ دیں ”دولت۔۔۔۔۔؟ عیش و
 عشرت۔۔۔۔۔؟ تم کم طرفوں کی تان ہمیشہ انہی دو چیزوں پر آکر کیوں لوٹتی ہے؟ اور تم انسان
 جانتے کیا ہو دولت اور عیش کے بارے میں۔۔۔۔۔؟ کہاں آتا ہے تم لوگوں کو دولت کو برتنا
 اور عیش کرنا۔۔۔۔۔؟ تم لوگوں کو جب بھی ذرا مال میسر آیا تو کیا کیا؟۔۔۔۔۔ دو چار جام لٹدھا کر
 اگلے پڑ گئے، یا پھر چار بازیاں کھیل لیں اور اپنی پسند کا کوئی ایک جسم منتخب کر کے رات بیتا
 دی۔ کیا ہے تم لوگوں کی عیاشی، شراب، جوا اور عورت۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ یہی عیاشی ہے تم لوگوں
 کے نزدیک۔۔۔۔۔“

آج تک اُس نے مجھے خوب زخم لگائے تھے۔ اپنے طنز کے تیروں سے مجھے خوب چھلنی
 کیا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے اپنی ایک ضرب سے یوں تڑپے ہوئے دیکھا تو مجھے بہت
 لرزہ آیا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے تو اپنی جنت کا تصور بھی انہی چند آسائشوں سے
 وابستہ کر رکھا ہے۔ شراب، عورت، ہیرے، موتی اور جواہر۔۔۔۔۔ کم ظرف کہیں کے۔۔۔۔۔ پھر بھی تم
 دُک خود کو جنت کا حق دار سمجھتے ہو۔۔۔۔۔ اور تم لوگوں میں سے کچھ دغلے وہاں یہ سب کچھ پانے
 کے لیے چند دن یہاں کی زندگی میں ان چیزوں سے دُور بھاگتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ
 یہ چیزیں یہاں میسر ہوں، یا وہاں۔۔۔۔۔ مقصد تو ایک ہی ہوا نا۔۔۔۔۔ پھر یہ نیک اور زاہد بننے کا
 ارادہ کیا۔۔۔۔۔؟ اور یہ جو تمہارے اندر کچھ لوگ برائے نام اپنے رب کی اطاعت کا
 اھکوسلا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اپنے رب کو جانا ہی کب ہے۔۔۔۔۔؟ تم سب کسی ایک
 کی رحمت کے صدقے جی رہے ہو۔۔۔۔۔ دنیا بھی پار ہے ہو اور دین کے ٹھیکے دار بھی بنے
 پھرتے ہو۔۔۔۔۔ پتا نہیں خدا نے کیا سوچ کر تم جیسے تمزدلوں کو اس دنیا کی خلافت سونپ دی۔
 اب کہ سچ تو یہ ہے کہ انسان جیسا کم ہمت، بزدل، احسان فراموش، جھوٹا، دھوکے باز، مکار
 و فریبی اس پوری کائنات میں، اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔“

میں نے اُس کی جبین سے لطف لیتے ہوئے کہا ”بولتے رہو۔۔۔۔۔ تمہیں یوں حقیر
 انسانوں کی طرح تڑپتے اور گلے شکوے کرتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔۔۔۔۔“ اُس
 نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر سمجھ گیا کہ آج میں اُس کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ وہ جھلا

کہ آخری محبت وہی رہتی ہے جو لا حاصل ہو۔ جو حاصل ہو جائے وہ محبت تو ہو سکتی ہے، آخر
 محبت نہیں۔ میرے اندر سے رفتہ رفتہ وہ جنوں، وہ تڑپ اور کک ختم ہوتی جا رہی تھی جو کہ
 محبت نامی جذبے کا حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ سبھی جوڑے جنہیں اپنی محبت مل جاتی ہے وہ
 اسی تجربے سے گزرتے ہوں گے جس سے میں ان دنوں گزر رہا تھا؟ کیا محبت دیر۔
 دیر سے یوں چٹخ کر ٹوٹ بھی جاتی ہے جیسے خشک اور کمزور شاخیں۔۔۔۔۔؟

لیکن وہ میری محبت کو یوں چٹختے اور ترختے ہوئے دیکھ کر خوب قہقہے لگاتا اور مجھے
 دیتا کہ ”کیوں۔۔۔۔۔ میں نہ کہتا تھا کہ تم انسان کہیں تک کر نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔۔۔ نہ تمہارے جذبہ
 لافانی ہیں اور نہ تمہارا پیار۔۔۔۔۔ نہ تمہاری محبت سچی ہے نہ تم لوگوں کو آج تک نفرت کرنے کا
 ڈھنگ آیا۔۔۔۔۔ تم انسان صرف اور صرف جذباتی پتلے ہو۔۔۔۔۔ بس جس طرف کی ہوا دیکھی اُس
 طرف کے ہو لے۔۔۔۔۔ تمہاری ہر محبت ہوس کا نتیجہ ہے اور تمہاری ہر نفرت تمہاری ذاتی انا
 شائسانہ ہوتی ہے۔“ ایک دن وہ میری آفس کی الماری پر بیٹھا مجھے اسی طرح کے طنز کے
 تیروں سے چھلنی کر رہا تھا کہ میں بھی آخر کار بھڑک اٹھا ”تم ہمیشہ ہم انسانوں کی غلطی
 گنواتے رہتے ہو۔۔۔۔۔ ہمیں اس کائنات کی ارزاق ترین مخلوق ثابت کرنے کی کوشش میں لگے
 رہتے ہو۔۔۔۔۔ کبھی اپنے دامن میں بھی جھانک کر دیکھا ہے۔۔۔۔۔؟ تمہارے جدا جمد کی ایک غلطی
 نے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تمہیں۔۔۔۔۔ اور اب ابد تک تمہارا کام صرف مجھ جیسوں کو شکار
 بنانا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اگر میں نے تمہاری دوستی قبول کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سارے
 کے سارے ہی مجھ جتنے کمزور اور لاعقیدہ ہیں۔ ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر تمہارا جادو ذرا
 سا بھی نہیں چل پاتا۔“

میری بات سننے ہی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔
 ”غلط فہمی ہے تمہاری۔۔۔۔۔ تمہاری اس لاغر اور بے ایمان مخلوق میں کوئی بھی ایسا نہیں جس
 پر میرا سحر نہ چل پائے۔ تم سب موم کی وہ ناک ہو جسے میں جب چاہوں موڑ کر رکھ
 دوں۔۔۔۔۔ مجھے کبھی آزمانے کی بے وقوفی مت کرنا۔۔۔۔۔ ہار جاؤ گے۔۔۔۔۔“

مجھے بھی غصہ آ گیا ”نہیں۔۔۔۔۔ غلط فہمی مجھے نہیں۔ تمہیں ہے۔۔۔۔۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ
 دولت کے انبار لگا کر اور ہم جیسوں کو عیش و عشرت میں ڈال کر تم نے پوری بازی جیت لی

ہری گرفت اس پر مضبوط سے مضبوط تر ہو سکے اور اپنے گھر چلو..... میں ایسے تماشے ہر کسی کو نہیں دکھاتا.....“

میں اسی شش و پنج میں گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر کی جانب روانہ تھا۔ میں نے ایسی عورتوں کی اپنے ذہن میں فہرست بنانے کی کوشش کی جو زندگی کے کسی بھی دور میں کسی بھی طرح میرے لیے باعث کشش رہی ہوں لیکن اس مقام پر بھی مجھے چھلاوے کے سامنے شرمندگی ہی اٹھانی پڑی۔ اُس دن خود مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں نے آج تک کسی قدر بے رنگ زندگی گزاری تھی۔ سوائے ایک آدھ فلم ایکٹریس کے مجھے اور کوئی عورت یاد ہی نہ آئی اور اس شیطان کے چیلے نے میری ”بے ذوقی“ پر اپنا سر پیٹ لیا۔ اسی خجالت میں میں نے گھر میں قدم رکھا تو استقبال کرنے والی پہلی وہی فلم ایکٹریس تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اُسے اتنے اپنے قریب پا کر حیرت کے جھٹکے سے گرتے گرتے بچا۔ پھر جب اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور میری خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے پلٹی تو وہ سعدیہ تھی اور پھر جس نے مجھے پہلا جام پیش کیا وہ میری سہاگ رات والی میری بیوی تھی۔ لیکن جس نے میری ٹائی کھولی اور کوٹ اتار کر کھوٹی پرٹا نگا وہ شانہ تھی۔ پھر جس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور میرا سر اپنی گود میں رکھا وہ مشہور ماڈل تھی جس کے بل بورڈز میں ہمیشہ پہلے دفتر سے واپسی پر بس کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر جس نے میرا لباس تبدیل کروایا وہ کوئی اور تھی اور جس نے خواب گاہ کی بتیاں مدھم کیں وہ کوئی اور..... یوں وہ رات میری زندگی کی ایسی رات تھی جب خود مجھے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے دل میں دبی اور چھپی ہوئی بے شمار اور بے پناہ چاہتوں کے بارے میں پتا چلا..... کسی رنگین اور کتنی سنگین رات تھی وہ.....

اور پھر مجھے ایک اور حقیقت کا ادراک بھی انہی دنوں ہوا کہ عیاشی صرف ہمارے ذہن کی ایک اختراع ہے۔ ہمارے جسم کے اندر اُٹتے مختلف ہارمون اور ان مادوں کی کارستانی ہے جنہیں ہمارا ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ گویا ہم اپنے ذہن پر قابو پانا سیکھ لیں تو ہر عیاشی خود ہمارے در کی دربان بن سکتی ہے۔ شرابی کو جام کا نشہ، جواری کو اپنی بازی کی لت اور عورت کی تلاش میں بھٹکنے والوں کے لیے جسم کی لذت کا سرور..... یہ سارا کھیل ہی ذہن کا ہوتا ہے اور اگر ذہن یک سونہ ہو تو ان سب کی عیاشیوں کی انتہا بھی اُسے ایک ذرہ برابر بھی لذت نہیں دے سکتی۔

سا گیا۔ ”لغت ہو تم پر..... واقعی تم انسان بڑے چال باز ہوتے ہو، آج تم نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ چلو آج میں تمہیں اصل عیاشی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھاتا ہوں۔ کیا یاد کر گے کبھی زندگی میں ایک اصل دوست سے بھی واسطہ پڑا تھا تمہارا.....“

میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”اصل عیاشی..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“ اُس نے طنز سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں..... ایسی عیاشی جو تم جیسوں کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔ تم لوگ عورت کو ہی دنیا کی سب سے ناقابل حصول مخلوق سمجھتے ہو نا..... اور عمر بھر اُسی کے حصول کے لیے بے ایمانیاں کرتے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہو..... اور بدلے میں پاتے کیا ہو..... صرف ایک آدھ جسم..... اور پھر اُس سے بھی دو چار سال کے اندر اُوب جاتے ہو..... ساری محبت، سارا عشق خشک مٹی کی طرح جھڑ جاتا ہے اور پھر باقی ساری عمر دوسری عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہتے ہو..... کبھی کسی فلم ایکٹریس پر فدا ہوتے ہو اور کبھی کسی ماڈل کے تصور میں ہی زندگی گزار دیتے ہو۔ آج میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہیں آج تک زندگی میں ایسی جتنی عورتیں یاد ہیں جن کو تم کبھی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اُن سب کی اپنے ذہن میں ایک فہرست بنالو۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اُن سب کے ساتھ کچھ وقت گزارو گے۔ چاہے وہ ملک، یا دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہو..... کہیں کی بھی فلم اسٹار ہو، ماڈل ہو، کتنی ہی مشہور اور ناقابل حصول کیوں نہ ہو..... یا پھر چاہے کتنے ہی ہزار پردوں میں کیوں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ آج وہ تمہاری دسترس میں ہوگی.....“ میں اُس کی بات سن کر کچھ جھینپ سا گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے میں شادی شدہ اور بیٹیوں کا باپ ہوں..... اب ایسی حرکتیں مجھے زیب نہیں دیتیں۔“ اُس نے میری بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ”اُف یہ انسان..... چاہے دل میں لڈو ہی کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں..... ہونٹوں پر قلعہ اور بناوٹ کا انکار ہی رہتا ہے..... اچھا چلو تمہارے اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہوگی اصل میں تمہاری بیوی ہی..... یعنی ذہنی طور پر تم کسی بھی عورت کو برتو..... جسمانی طور پر وہ ہوگی تمہاری اپنی ہی عورت..... لہذا اب خواہ خواہ اپنے ضمیر نامی اس فضول احساس کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، جو تمہیں گناہ سے روک تو نہیں پاتا، ہاں البتہ اس کا مزہ ضرور کر کر کر دیتا ہے..... لہذا مزہ کر کر کر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو تاکہ

لیکن عبداللہ میان..... اس انسانی فطرت کا کیا کریں..... کہ ہر چیز کی زیادتی اور اس کے آسان حصول ہی ہمارے دل کو اس نعمت سے اُچاٹ کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ سو میں بھی اُدب نے لگا اور پھر انہی دنوں ایک اور مصیبت طوفان کی طرح میرے گھر میں داخل ہوئی اور اس کے در و دیوار کو لرزائی۔ میری چھوٹی بیٹی عظمیٰ نے ضد کر کے اُسی لوفز سے شادی کر لی اور میرا داماد میرے بونے بیٹے کے ساتھ اُس کے کاروبار میں شریک بن گیا۔ دونوں مل کر زمین کی خرید و فروخت کا دھندا کرنے لگے اور پھر اُن کی نظر شہر کے سب سے اہم مرکز میں ایک قیمتی پلاٹ پر پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ہر ممکن اور سرتوڑ کوشش کر لی لیکن اس پلاٹ کا مالک اپنی زمین بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ دراصل اُسے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اُس زمین پر بچوں کے لیے پارک بنانا چاہتا تھا لیکن اُن دولت کے پجاریوں کو یہ کہاں قبول تھا کہ وہ سونے جیسی زمین کسی پارک کی تعمیر کے لیے چھوڑ کر ضائع کر دی جائے۔ سو میرے بیٹے اور داماد دونوں نے اس پلاٹ کے مالک سے آخری باز بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے گھر پہنچ گئے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد بھی وہ شخص اپنی بات چڑاڑا رہا۔ بحث گرما گری میں تبدیل ہو گئی اور میرے داماد نے مشتعل ہو کر اپنے کوٹ کی جب سے پستل نکالا اور چھ کی چھ گولیاں اُس بے گناہ کے سینے میں داغ دیں۔ مالک زمین وہیں ٹھنڈا ہو گیا اور میرا داماد اور میرا بیٹا دونوں فرار ہو گئے لیکن کب تک چھتے؟ مقتول کے ورثہ بھی بہت اثر و رسوخ والے تھے اور انہوں نے عدالت سے میرے داماد اور بیٹے کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ لے کر ہی دم لیا۔ میری بیوی یہ سنتے ہی ایسی بستر پر گری کہ پھر فاج کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی۔ میرا سارا گھریوں بکھر گیا کہ پھر کبھی سمٹ نہ پایا۔ میں نے پھر اپنے اُسی دوست کی طرف مدد کے لیے دیکھا جو شاید کہیں نہ کہیں خود ہی میری اس ساری بربادی کا دھند دار تھا۔ تب اُس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اُڑا دیے کہ وہ اپنی سی ایک کوشش تو کر دیکھے گا لیکن اگر میرے بیٹے اور داماد کی سانسیں اس دنیا میں اتنی ہی لکھی ہیں تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کر پائے گا کیوں کہ وہ کسی کی جان قتل از وقت لے تو سکتا ہے لیکن کسی کی سانسیں بڑھانہیں سکتا۔ کیوں کہ کچھ چیزیں قدرت نے صرف اپنے اختیار میں ہی رکھی ہیں۔ میں اُس پر بہت برسا کہ اُس نے پہلے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب بیٹے اور داماد دونوں کی لاشیں وصول کرنے کے لیے

میں سنٹرل جیل کے باہر کھڑا تھا۔ میں نیم پاگل ہو چکا تھا اور میرے گھر میں موت کا وہ ماتم اور سناٹا چھایا کہ پھر ہم میں سے کوئی بھی مسکرا نہ سکا۔ بڑی بیٹی نے چند دن صبر کیا اور پھر وہ بھی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہ جانے کہاں نکل گئی۔ میری دولت میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس سے کہیں تیزی سے میں اپنے سارے رشتے ایک ایک کر کے کھوتا گیا۔ مجھے اس دولت، اس عیش و عشرت کی زندگی اور خود اپنے وجود سے نفرت سی ہو گئی۔ مجھے چھلاوے کی شکل بھی اب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی لیکن میں اس معاہدے کی وجہ سے معذور تھا اور پھر آخر کار اُس نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا کہ ہمارا معاہدہ ختم ہونے میں صرف دو ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں لیکن میں نے اب تک ایک بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اُس کے لیے۔ لہذا اب یا تو میں معاہدے میں ایک سال کی توسیع کر لوں، یا پھر اس کا کم از کم ایک بڑا کام ضرور سرانجام دوں۔ میں نے اُس کو صاف بتا دیا کہ میں اب اس معاہدے سے بیزار ہو چکا ہوں لہذا وہ اپنا کام بتائے تاکہ میں اُسے انجام دے کر اس دھاگے کو کاٹ دوں اور عمر بھر کے لیے اس عذاب سے اپنی گلو خلاصی کر لوں۔ اُس نے پھر مجھے احسان فراموش ہونے کا طعنہ دیا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار اُس نے وہ کام مجھے بتا دیا اور مجھے اس درگاہ پر وہ عمل سرانجام دینے کے لیے بھیج دیا جس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ تب سے لے کر میں اب تک یہیں اس درگاہ پر پڑا ہوں۔ دیکھو کہ اب کب مجھے اُس کی جانب سے آخری حکم ملتا ہے اور کب میری آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ ویسے بھی میری آزادی میں اب صرف ۲۹ دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔“

اصغر صاحب نے اپنی داستان ختم کر کے اس طرح ایک لمبا سا سانس لیا جیسے اُن کے دل پر رکھانوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ صبح کی سپیدی کے آثار نظر آرہے تھے اور دُور نیچے گاؤں کی مسجد سے صبح کی اذان کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر اصغر صاحب سے پوچھا ”لیکن وہ آخری حکم کیا ہے جس کے لیے آپ کو اس درگاہ میں بھیجا گیا ہے..... آپ کو کیا کرنا ہے یہاں.....؟“

”قتل.....“ اصغر صاحب نے دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا ”مجھے یہاں ایک قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے.....“

صرف زبانی طور پر ہی مجھے گھر کا فرد اور اپنا بیٹا نہیں کہا تھا بلکہ آج انہوں نے یوں مجھے اپنی حویلی کے زنانے میں بلوا کر اور یہ عزت دے کر عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دیا تھا۔ بڑی مالکن اور لاریب نے ویسے تو پہلے بھی کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا تھا لیکن آج میں ایک مہمان کی حیثیت سے اُن کے گھر کی خواتین کے درمیان موجود تھا جو ان علاقوں میں بہت بڑی عزت اور بڑے مان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مجھے بہت جھک محسوس ہو رہی تھی۔ یہ عزت اور یہ مان بھی تو انسان کو کہیں نہ کہیں باندھ کر رکھ دیتا ہے، اُسے بے بس کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سانپ کے زہر سے زیادہ اثر دار اور زہریلا نمک کا زہر ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے لیکن کسی کے کھائے ہوئے نمک کے زہر کا اثر ظرف والوں کے خون سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ شاید خان صاحب کے اندر بھی کوئی ایسا ہی بھرم تھا میری ذات کے لیے..... میرے ظرف کے بارے میں..... تبھی انہوں نے آج مجھے یہ مان دیا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر لاریب اور بڑی مالکن کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ گئیں۔ خان صاحب کی گفتگو جاری رہی۔ وہ ماما اور پاپا سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص طور پر ماما جنہوں نے مجھے اس راستے پر چلنے کی اجازت دی تھی اور پیا کی سادگی نے تو اُن کا دل ہی موہ لیا تھا کہ اتنا بڑا صنعت کار ہونے کے باوجود اُن میں دکھاوا اور خود پسندی نام کو بھی نہیں تھی۔

اتنے میں لاریب نے آکر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے اندر زنانے میں ایک آدھ خادمہ کے علاوہ اور کوئی لاریب اور بڑی مالکن کی مدد کے لیے موجود نہیں تھا، یا پھر بڑی مالکن نے خصوصی طور پر مجھے اپنا سمجھتے ہوئے کسی نوکر کو کھانے کی میز کے گرد نہیں آنے دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے میرے لیے نہ صرف کھانا پر دسا بلکہ ہر چیز ضد کر کے بلکہ حکم دے کر مجھے چمکائی بھی۔ سبھی کچھ بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ آدھی سے زیادہ چیزیں لاریب کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں اور پورے کھانے کے دوران اُسے یہی فکر کھائے رہی کہ کوئی چیز بد ذائقہ، یا بُری تو نہیں بنی۔ جب بھی میں کوئی نیا خوان چمکتا وہ تب تک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہتی جب تک میں وہ لقمہ نگل نہیں لیتا تھا۔ اُس کی اس ”پہرے داری“ پر مجھے ہنسی آگئی اور آخر کار مجھے اُسے کہنا پڑا ”آپ یقین کریں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی تمام چیزیں معیار سے کہیں بڑھ کر

معصوم قاتل

اصغر صاحب کی بات سن کر میں اُچھل پڑا۔ ”قتل..... لیکن کس کا.....؟“ انہوں نے لمبی سی سانس بھری ”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ اُس نے کہا ہے کہ وقت آنے پر مجھے خود پتا چل جائے گا۔ تمہیں میں نے اپنی ساری کہانی من و عن اس لیے سنا دی ہے کہ اس دنیا میں صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جس نے میرے علاوہ اس چھلاوے کا کوئی روپ دیکھا ہے.....“ یہ پے در پے حیرت کا دوسرا جان لیوا جھٹکا تھا میرے لیے..... ”میں نے چھلاوے کو دیکھا ہے؟..... کب.....؟ کہاں.....؟.....“ میں نے انہیں جھنجھوڑ ہی تو ڈالا.....

”جس شخص کو پہلے تم نے ٹرین میں اور پھر یہاں درگاہ کی چار دیواری کے باہر اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہی چھلاوہ ہے..... آج کل وہ مجھ سے اسی روپ میں ملتا ہے..... اُسے اس قسم کی شعبہ بازیاں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے..... کچھ دن تک تو وہ خود میرے ہی دفتر میں چائے والا بن کر بھی آتا رہا، کبھی بس کند کٹر، کبھی میرا شو فر، کبھی کوئی دلال، کبھی کوئی سادھو..... جانے کس کس روپ میں وہ میری راہ کاٹتا رہا ہے۔“

اصغر صاحب کی بات سن کر میں سن سارہ گیا۔ تبھی وہ پارے جیسی صفت رکھنے والا شخص مجھے اس قدر بے چین کر گیا تھا کہ میں کئی راتوں تک ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ یا خدا..... یہ کیسی دنیا تھی، کیسے اسرار تھے۔ ابھی یا قوط کا فسوس ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ یہ چھلاوہ میرے کالے نصیب کی تاریکی بڑھانے کے لیے چلا آیا تھا۔ اور پھر وہ آخر کس کے قتل کا حکم دے گا اصغر صاحب کو؟ اسی اُدھڑ بن میں سارا دن گزر گیا اور شام سر پر آگئی۔ مغرب کے فورا بعد نیچے گھاٹی میں بیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ وہ ٹھیک وقت پر مجھے لینے کے لیے آچنچا تھا۔ میں حویلی پہنچا تو خان صاحب نے بیرونی ڈیوڑھی کے باہر ہی میرا استقبال کیا اور ی محبت سے مجھے اندر والے دیوان خانے میں لے گئے جہاں میں نے پہلی مرتبہ ماما پاپا کو بٹھے دیکھا تھا۔ وہاں پہلے سے بڑی مالکن اور لاریب موجود تھیں۔ گویا خان صاحب نے

اور نہایت لذیذ ہیں۔ لیکن اگر آپ اسی طرح میرے چہرے پر ہر نئی ڈش کا ذائقہ تلاش کرتی رہیں تو مجھ سے بالکل نہیں کھایا جائے گا۔“ میری بات سن کر سبھی ہنس پڑے۔ خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ جب بھی کوئی نیا تجربہ کرتی ہے، اس کا انداز میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“ مجھی میں تو اسے کہہ دیتا ہوں کہ یہ تو زبردستی تعریف کروانے کا طریقہ ہے۔“ یوں ہی ہنستے مسکراتے کھانا ختم ہوا اور پھر ہم نے بڑے کمرے میں بیٹھ کر کشمیری چائے بھی پی لی۔ میں نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو لاریب نے جو بڑے کمرے میں ہی چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی بڑے اعتماد سے مجھ سے جاتے جاتے کہا ”ابھی رُکیے۔۔۔۔۔ میرے سوال ابھی باقی ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر لاریب کی جانب دیکھا کیا خان صاحب اور بڑی مالکن سے اُس نے پہلے ہی اجازت لے رکھی ہے؟ خان صاحب میری اندرونی کش مکش کو شاید میرے چہرے سے بھانپ چکے تھے وہ اُٹھتے ہوئے بولے ”لاریب تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ لیکن ضروری نہیں کہ تم اس کے ہر سوال کا جواب دینا چاہو۔۔۔۔۔“ مجھے اُس نے بتایا کہ تمہاری روایتی جھگ شاید تمہیں میرے سامنے کھل کر بات کرنے سے روکے۔۔۔۔۔ تم اطمینان سے بات کرو۔ میں ذرا اپنا حقہ تازہ کرواؤں اور زیادہ گہرا نے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ اس کے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے اس کی ماں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود ہے۔۔۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اور میرے دل سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ سا ہٹ گیا۔ لاریب نے خان صاحب اور اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مجھے ایک بہت بڑے امتحان سے بچا لیا تھا۔ میں جانتا تھا اس شیشے کی بنی ہوئی لڑکی کا من کاچ سے بھی زیادہ صاف اور آئینے کی طرح شفاف تھا لیکن داغ ہمیشہ ایسے ہی کورے کاچ پر جلدی لگتا ہے۔ اور میں خان صاحب، یا بڑی مالکن کے کورے من پر اپنی جانب سے ذرا سی بھی کھروچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بہت مختلف اور بہت اعلیٰ انسانوں سے برتنے کا معاملہ تھا اور میں انہیں اُن کے معیار جیسا ہی برتنا چاہتا تھا۔

لاریب جلد ہی چائے کے برتن رکھوا کر خادمہ کے ہاتھ خشک میوے کی پراتیں اُٹھائے چلی آئی۔ تب تک بڑی مالکن مجھ سے میری تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بھی مجھے بتایا کہ انہیں انٹرک شاعری سے کافی لگاؤ پیدا ہو

کا تھا اور اب بھی کبھی کبھار وہ اپنی بیاض میں کچھ لکھ لیتی ہیں۔ لاریب نے خادمہ کو پراتیں لے کر جانے کا کہا اور پھر وہ بھی بڑی مالکن کے ساتھ ہی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ ”ہاں تو اب سب سے پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو ساحر کے نام سے پکاروں، یا عبداللہ لہ کر۔۔۔۔۔ ویسے کیا یہ نام بدلنے کی رسم ادا کرنا ضروری تھا۔۔۔۔۔ مذہب کی، یا ایسی کسی اور راہ پر لے کے لیے اپنی شناخت بدلنا ضروری ہے کیا؟“ میرا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ امتحان نے پہلا بال پوچھ کر جواب کے انتظار میں اپنی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ”آپ مجھے ساحر کے نام سے بھی پکار سکتی ہیں۔ نام صرف شناخت کا ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ اب پکارنے والے پر نصر ہے کہ اُسے کس نام کی شناخت پسند ہے۔ اور رہی بات نام بدلنے کی رسم کی تو شاید جس نیت میں اپنے کسی اور جنون میں اپنا گھر چھوڑ کر اس درگاہ پر بسیرا کرنے کے لیے آیا تھا تب ری گزشتہ شناخت مجھ پر شدید طاری اور زیادہ حادی تھی ایسے میں مجھے اس نئے ماحول سے ڈرنے کے لیے مجھے ایسی ہی کسی نئی شناخت کی ضرورت تھی اور ایسے میں عبداللہ نام کی اس لی ہوئی پہچان نے مجھے بڑا سہارا دیا اور شاید یہی میرا نام بدلنے والوں کا مقصد بھی تھا۔“ وہ مطمئن سی ہو گئی۔ ”آپ نے میری الجھن تو ختم کر دی۔ اور سچ پوچھیں تو یہ بہت بڑی جھن تھی کیوں کہ بہر حال مجھ جیسوں کے لیے اپنا بچپن کا نام ہی بہت بڑی شناخت ہوتی ہے اپنا جنم نام یوں ایک جھٹکے سے بدل دینا بھی بڑی ہمت والوں کا ہی کام ہے۔۔۔۔۔ پھر آپ بے دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے یہ بھیس بدلا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے آپ کی چاہت نے اس راستے کو پای لیا جس پر چلنے کے لیے آپ کے قدم درگاہ کی برباہلی بار بڑھے تھے۔ اس سفر میں زہرانے بھی آپ کی محبت کی طاقت کے سامنے ہتھیار سا ہی دیئے۔ آپ وہ تفعہ بھی سینے پر سجائے اس راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ آپ جسموں کو نہیں ح کو فتح کرنے کے لیے اس روحانی راہ گزر کے راہی بن گئے۔۔۔۔۔ لیکن یہ سفر آخر ختم کہاں کا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح گھربار چھوڑ کر اور زہرا کو اپنا منتظر چھوڑ کر آپ ایک فرض ادا نیگی کے لیے نکل تو آئے لیکن آپ نے اپنے پیچھے بہت سے فرض اُدھورے چھوڑ دیئے۔۔۔۔۔؟“

بڑی مالکن نے سرزنش بھری نظر سے لاریب کی جانب دیکھا جیسے انہیں لاریب کے

طالب علم بنامیری خوشی ہے.....؟..... بس تو میں نے اپنی خوشی سے ایک شعبہ ہی تو اختیار کیا ہے۔ اور کیا اگر میں ڈاکٹر لیٹ، یا بزنس مینجمنٹ کے لیے ملک سے باہر جاتا اور چار پانچ سال لگا کر واپس آتا تو کیا تب میں اتنا عرصہ ان رشتوں اور ان سے وابستہ فرائض سے دور نہ رہتا؟ لیکن تب شاید یہ بھی میرے تمنوں میں مزید ایک تمنے کا اضافہ ثابت ہوتا کہ اپنے شعبے کی تکمیل کے فرض کی خاطر میں نے خونی رشتوں سے دوری کی قربانی دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ واپسی پر میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور میری سند کو جلی حروف میں میرے نام کی تختی پر کندہ کیا جاتا۔ تو پھر صرف اس راہ پر چلنے والوں پر فرائض سے بھاگنے کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید اس شعبے میں روپیہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں..... کیا صرف جس شعبے سے انسان کو لگی بندھی تنخواہ مل سکتی ہو صرف وہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔ رہی بات حلیے کی تو ہر شعبے کا اپنا ایک یونیفارم بھی ہوتا ہے جس طرح ڈاکٹر سفید کوٹ پہنتے ہیں، انجینئر سائٹ پر جاتے وقت سر پر آہنی ہیلٹ پہن لیتے ہیں، پائلٹ کاندھے پر پھول سجاتا ہے، اسی طرح اس شعبے کا بھی اپنا ہی ایک یونیفارم پہلے سے ملے ہے۔ آپ سوچیں کہ میں تھری پیس سوٹ میں مزار کا مجاور بنا کیسے لگوں گا.....؟..... بالکل اتنا ہی مضحکہ خیز جتنا اگر میں کسی بزنس ایسپائر کا نیجنگ ڈائریکٹر ہوتے ہوئے سفید کرتے پا جاوے میں صبح اٹھ کر اپنے دفتر جا پہنچوں.....؟ یہ سادہ لباس ہی میرے شعبہ کا تقاضا اور اس پر چتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف سادہ لباس ہی انسان کی روحانیت کی تکمیل کا باعث ہے۔ یہ تو ابتداء سے بھی پہلے کے چند لوازمات ہیں تہی میں نے آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ فی الحال میں صرف لباس کی تبدیلی تک ہی پہنچ پایا ہوں۔ اب رہا آپ کا آخری سوال کہ روحانیت کے اس سفر میں زہرا کی روح کو فتح کرنے کا مرحلہ کب آئے گا تو یہ فیصلہ تو میں نے اُسی پر چھوڑ دیا تھا۔ میری روح تو پہلے روز ہی اُس کی اسیر ہو گئی تھی۔ یہ فیصلہ اب زہرا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی روح کو کب میرے تصرف میں دینے پر خود کو آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ زمینی فاصلے مجھے کبھی بھی اُس سے دوری کا احساس نہیں دلا پائے۔ وہ ہر پل میرے ساتھ ہی تو ہوتی ہے۔ یہ طویل تنہائیاں اور یہ جگ راتے میں نے اُس سے باتیں کر کے ہی تو گزارے ہیں۔ ہمارا مسئلہ کبھی جسم کی قربت تو تھا نہیں..... مجھے یقین ہے کہ میری

سوالات کچھ چھ رہے ہوں۔ لاریب نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ”اگر میں الفاظ کے چناؤ میں کچھ بے احتیاطی کر رہی ہوں تو پلیز آپ.....“ میں نے اُس کی بات پوری ہونے نہیں دی۔ ”نہیں..... آپ کا پیرایہ اور الفاظ کا چناؤ بالکل درست ہے۔ نمک کو نمک اور تھوڑا تھوڑا ہی کہا جاسکتا ہے.....“ قد کہہ دینے سے اس کی تاثیر میں حلاوت شامل نہیں ہو جاتی۔ شاید یہ وہ سوالات ہیں جن کا سامنا مجھے عمر بھر کرنا ہے۔ لہجہ چاہے تلخ ہو، یا آپ جیسا شیریں..... سوالوں کا مدعا تو یہی رہے گا۔ اور میرے پاس بہر حال اپنے ہر عمل کا جواب موجود ہونا ہی چاہیے.....“

وہ دونوں دم بخود سیٹھیں میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے ہی یہ بھیس بدلا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو فی الحال میں صرف بھیس بدلنے کی حد تک ہی کامیاب ہو پایا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ خدا کو پانے کے لیے یوں بھیس بدل کر اپنا گھریا چھوڑنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں..... اُسے تو اپنی شہ رگ سے بھی قریب کہیں آس پاس تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہمیں ہمارا ضمیر ہمیشہ اس شعبے، یا اس راستے کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتا ہے جس مٹی سے اُسے اٹھایا گیا ہوتا ہے۔ مصور کو اگر آپ بڑھی لگا دیں اور بڑھی کو مصور کا کام سونپ دیں تو کیا ہوتا ہے؟ کسی موسیقار کو اینٹ گارا ڈھلائی کرنے والا مزدور بنوادیں اور کسی مزدور کو کسی نازک پیانو پر لایا بیٹھائیں تو کیا ہوگا؟..... بات کسی بھی راہ، یا حلیے کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کی اور اُسے کسی فرض کو ترک کر کے اختیار کرنے کی نہیں ہے۔ بات روح کے قرض کی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میری روح کو اس کام کے لیے جنم دیا گیا ہے اور مجھے اسی میں اپنا سکون، اپنی کاملیت دکھائی دی اور میں اس طرف چل پڑا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے اگر مجھے ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ وغیرہ بننے کا جنون ہوتا اور میں اپنے والدین کی مجھے بزنس مین بنانے کی خواہش کو رد کر کے ایسا کوئی شعبہ اختیار کر لیتا تو شاید دنیا کو اتنا عجیب نہ لگتا۔ تب شاید مجھے کچھ طرف سے داد و تحسین بھی ملتی کہ میں نے اپنا اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کر اپنے دل کی ماننے ہوئے وہ شعبہ اختیار کیا جس میں میری خوشی تھی اور میری مثالیں دی جاتیں کہ اپنے فن اور شعبے کے لیے قربانی ہو تو ایسی ہو۔ تو کیا مذہب، یا روحانیت وہ شعبہ اور وہ فن نہیں ہو سکتا جس کی راہ کا

روح کی کی ہوئی باتیں اُس تک بھی ضرور پہنچتی ہوں گی.....“

میں اپنی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔ لاریب اور بڑی مالکن بھی بہت دیر تک اپنے لفظ جوڑنے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر آخر کار میں نے ہی انہیں سہارا دیا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ آپ کے سبھی سوالوں کے جواب میں نے دے دیئے ہیں۔ پھر بھی آپ کے دل میں اگر مزید کوئی خلش ہو تو آپ پوچھ سکتی ہیں۔“ لاریب کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”نہیں..... مجھے اپنی زندگی میں اپنے کسی بھی سوال کے اتنے تسلی بخش جواب نہیں ملے..... آپ نے کوئی تشنگی چھوڑی ہی نہیں میرے واسطے..... لیکن کبھی کبھی اتنی سیرابی بھی ہم جیسوں کے لیے باعث شادی مرگ بن جاتی ہے..... میں شاید اسی وجہ سے اپنے الفاظ کھوپچکی ہوں.....“

ایسے میں بڑی مالکن نے لاریب کو سہارا دیا۔ حالانکہ مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر مزید خاموش رہنا چاہتی تھیں۔ ”تم ایک مختلف نوجوان ہو عبداللہ..... تمہاری راہ بھی مختلف ہے لیکن آج تم نے اپنی راہ کی ہر سچائی کو جس طرح کھول کر بیان کیا ہے اس نے تمہاری قدر ہمارے دلوں میں فزوں تر کر دی ہے..... تم ہمیشہ اپنے اندر اتنی حیرتیں بیک وقت کیسے چھپائے پھرتے ہو۔“ اتنے میں خان صاحب کی بروقت آمد نے مجھے اس مشکل سوال کے جواب سے بچا لیا۔ وہ مصر تھے کہ رات بہت ڈھل چکی ہے لہذا آج رات میں یہیں حویلی کے مہمان خانے میں قیام کر لوں لیکن میں نے انہیں اصغر صاحب کی طبیعت کی مجبوری بتائی تو بادل خواستہ انہیں مجھے اجازت دینی ہی پڑی۔ بشیر اپنے تانگے سمیت ڈیوڑھی میں ہی موجود تھا کیوں کہ شاید اُسے پہلے ہی وہاں نکلے رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ میں اُن سب سے رخصت ہو کر تانگے میں بیٹھا تو لاریب تب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ مجھے الوداع کہتے وقت بھی اُس کی نظریں میرے چہرے پر جانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے اُس کے اندر کی کوئی بات اُدھوری رہ گئی ہے۔

تانگا پہاڑی کے پاس آکر رُکا تو بشیر نے مجھے پیش کش کی کہ وہ میرے ساتھ درگاہ تک جانا چاہتا ہے کیونکہ سناٹا اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ”عبداللہ باؤ..... سنا ہے اس پہاڑی کے دوسری پار جنات رہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ اُدھر تک آتا ہوں۔ آخر آپ ہمارے خاص مہمان ہو.....“

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ ”کیوں تم کیا جنات کے داماد لگتے ہو جو وہ تمہیں کچھ نہیں دے..... اور پھر اُدھر پہنچنے کے بعد تمہیں بھی تو تنہا ہی بیچے آنا پڑے گا نا..... تو پھر تمہیں ڈرنے کے لیے کون آئے گا؟..... اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو ہی چھوڑنے کے لیے اڑی اُترتے چڑھتے رہیں گے اور اسی بھاگ دوڑ میں صبح ہو جائے گی.....“

بشیر ابھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”واقعی..... اکیلے اُترتے ہوئے تو مجھے بھی ڈر لگے۔ چلو پھر اللہ بیکلی.....“ بشیر نے تانگا موڑا اور میں اُس کی جلد بازی پر مسکراتا ہوا پہاڑی اُدھر پر جاتی پگ ڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ رات واقعی بہت سرد اور تاریک تھی۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک پہاڑ پر اگر موسلا دھار بارش برس رہی ہو تو اگلی پہاڑی پر دھوپ چمک رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس رات کے وقت بھی دُور کسی پہاڑ پر بار بار بجلی چمک کر اُسے کسیرے کی جش کی طرح نیلی روشنی کے جھماکوں سے منور کر رہی تھی جو اس بات کی غماری تھی کہ دوسرے اڑ کے جانب بارش برس رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی ان میں پڑ جاتی تھی۔ میں لاریب کے سوالوں پر غور کرتا ہوا اُدھر چڑھا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر ماسردی کی شدت اور میرے تیز ہانپنے جیسے سانس کی وجہ سے میرے منہ سے بھاپ نکلنے لگی ہے میں ہر سانس کے ساتھ سگریٹ کا بہت سا انگلا ہوا دھواں اُگل رہا ہوں۔ جیسے جیسے درگاہ ریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے کھرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک عقب میں ایک آہٹ سی ہوئی۔ رے بڑھتے قدم رُک گئے اور میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے پھر اُٹھائے اور پھر وہی آہٹ ہوئی۔ میں پھر رُکا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ کوئی میرے اتھ ہی رُک گیا ہے۔ لیکن کون.....؟ کیوں کہ وہاں تو دُور دُور تک صرف اندھیرے کا راجہ۔ میں نے پھر سر جھٹک کر چلنا شروع کیا اور اس بار مجھے اپنی دھونکنی جیسی چلتی سانس کے اتھ کسی اور کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ دفعۃً بجلی کا دُور کہیں ایک اور جھماکا آیا اور دائیں جانب والی چٹان کے اُدھر پر مجھے کسی اکڑوں بیٹھے ہوئے شخص کا ہیولہ سادکھا کی دیا اُس کی سرخ انگارہ آنکھیں دُور چمکتی بجلی کی منعکس روشنی میں پل بھر کو چمکیں اور پھر دوبارہ گھٹا پ اندھیرا چھا گیا۔ میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹا اور پل بھر میں میری کن پٹی سے ہوتا ہوا کان لے پیچھے سے لوتک پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن چٹان خالی پڑی

تھی۔ وہ میرا وہم تھا، یادہ وہی تھا؟ میں نے کچھ دیر وہیں رک کر سانس بحال کی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ کے احاطے تک پہنچ گیا۔ اصغر صاحب کے کمرے کی لائٹیں جل رہی تھیں اور روشنی تلکے شیشوں سے باہر محن میں جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلے آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے اتنی رات کو وہ کیوں بیدار ہیں، اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اُن کی آواز اُبھری ”آ جاؤ عبداللہ میاں..... دروازہ کھلا ہے.....“ میں اندر داخل ہو گیا۔

”آپ ابھی تک سوئے نہیں.....؟..... اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ باہر دروازے پر میں ہی ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائے ”یہاں اور کون آئے گا بھلا اس آدمی رات کے وقت؟..... وہ شیطان کا چیلہ تو اس احاطے میں آ نہیں سکتا کیونکہ بقول اُس کے یہاں مرفون نیک بزرگ کی وجہ سے اُس کی اس احاطے میں بندش ہے۔ لہذا میں نے سوچا تم ہی ہو سکتے ہو۔ کیسی رہی تمہاری دعوت؟ بھئی یہ کریم خان صاحب کی حویلی والے تو تم پر بہت مہربان لگتے ہیں۔ ذرا دھیان رکھنا، کہیں تمہارے لیے کوئی بیڑیاں نہ تیار کر رکھی ہوں.....“

میں اُن کا اشارہ سمجھ کر ہنس دیا ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... وہ جانتے ہیں میں پہلے ہی اپنا آپ بندھوا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“ پھر میں نے انہیں راستے میں ہوئے ماجرے اور اُن جلتی انگارہ آنکھوں کا سارا حال بھی سنا ڈالا۔ اصغر صاحب میری بات سن کر بے حد متشکر ہو گئے۔ ”یہ ضرور وہی ہوگا..... لیکن وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے.....؟ عبداللہ میاں تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے..... وہ بہت خطرناک مخلوق ہے.....“ میں نے کچھ سوچ کر کہا ”لیکن آپ نے اپنی پوری داستان مجھے سنائی ہے..... اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہو۔ آپ سے بھی دوستی کے لیے اُس نے پہلے آپ سے اجازت لی۔ خود کو آپ پر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی..... اور پھر اگر اُسے مجھے نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو وہ میرے جبل پور کے سفر کے دوران ٹرین میں میری بے خبری میں مجھ پر وار کر کے مجھے پہنچا سکتا تھا۔ پھر اُس کے لیے اس قدر انتظار کیوں.....؟“

”ہاں..... یہی بات تو سمجھ نہیں آرہی۔ بہر حال مجھے نہ جانے کیوں ایک دم ہی بہت فکر ہونے لگی ہے تمہاری۔“ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں محتاط رہوں گا لیکن نہ جانے کیوں میں

اندر سے بہت بے چین تھا۔ میرے لبوں پر وہ سوال آ ہی گیا جو میں اصغر صاحب سے جتے ہوئے بھی نہیں پوچھ پا رہا تھا۔ ”لیکن آپ نے کیا یہ سوچا ہے کہ وہ آپ کو کس آگ میں رکنے جا رہا ہے۔ کسی انسان کا قتل معمولی بات تو نہیں..... پوری انسانیت کا قتل ہے..... کیا پ یہ بھیانک جرم کر پائیں گے۔“ اصغر صاحب نے میری بات سن کر لمبا سا سانس لیا۔ ٹھیک کہتے ہو..... لیکن جب انسان خود ہر پل مر رہا ہو، اذیت سے اپنا آپ قتل ہوتا ہو ہوس کرتا ہو تو پھر ایسے میں ایسا ایک قتل اُسے بہت آسان لگنے لگتا ہے۔ میں یہ آخری جرم رٹنے کے بعد جس عذاب سے نجات پالوں گا اس کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔ مجھے اُس ننا ہی عذاب کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اس آخری عذاب سے گزرنا ہی گا۔ کیونکہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ یہی میرے معاہدے کی آخری شق اور آخری رٹ ہے۔“

میں اصغر صاحب کو اُسی سوچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ لہذا میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور یونہی بستر پر لیٹ کر کر وٹیں لینے لگا اور پھر بھی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ چھلاوے کے اختیارات اُس کا حد بھی مقرر ہو اور اُسے بھی اپنی کچھ خواہشات سرانجام دینے کے لیے کسی انسانی جسم کی بدورت پڑتی ہو۔ تبھی وہ اصغر صاحب سے یہ قتل کروانا چاہتا ہے؟..... لیکن کس کا قتل.....“

اور پھر تبھی میرے ذہن میں اس جان لیوا خیال کا دوسرا جھماکا ہوا۔ ”کہیں وہ مستقبل کا مجوزہ مقتول میں خود ہی تو نہیں.....؟..... اصغر صاحب کو کہیں وہ غلاوہ میرے ہی قتل کا حکم تو نہیں دینے والا.....؟..... اور کیا پتا حکم دیا بھی جا چکا ہو اور اب صرف صحیح وقت پر عمل پیرا ہونا ہی باقی نہ رہ گیا ہو.....؟“

گھاٹی میں چھوڑ آئی ہے۔ میں نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ”کیوں لا ریب بی بی..... کوئی سوال رہ گیا تھا کیا.....“

وہ بھی مسکرا دی۔ ”نہیں..... یہ تو میں نے اُسی دن بتا دیا تھا کہ آپ نے میرے سوالوں کی سر زمین کو کچھ ایسا سیراب کیا ہے کہ ہر تشنگی مٹا دی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس رات کے بعد میں خود ایک سوال بنتی جا رہی ہوں۔ ایک عجیب سی کک، ایک اُن چاہی سی بے چینی ہے۔ میری رُوح مجھے کسی طرف تک کر بیٹھنے نہیں دی رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے جسم کے پتھر میں پھر پھڑا رہی ہے۔ اس کی اُڑان جانے کس سمت کی ہے۔ آج بہت بے چین ہوئی تو یہاں درگاہ پر تنہا ہی دعا کے لیے چلی آئی۔ امی کو میں نے خود اپنے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ ویسے بھی رات سے اُن کی طبیعت کچھ بھاری سی تھی، لیکن نہ جانے کیوں میں تنہا ہی یہاں آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ خان جی کو میرا یوں کہیں تنہا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ لیکن میں نے اُن سے بھی کسی طور اجازت لے لی۔ پر اب یہاں آ کر میں پھر اُسی شش و پنج میں ہوں کہ میں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں.....؟ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا وہ اپنی بات پوری کرتے کرتے ہانپنے سی لگ گئی تھی۔ جیسے اپنے اندر چلتی کش کش کو جلد از جلد مجھ پر عیاں کرنا چاہتی ہو۔

”ایسا ہم سب کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں ہے۔ آپ نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنی آئندہ زندگی کے لیے کوئی راہ چنی ہے..... کبھی کبھی ہم سبھی اس درمیانی دور میں یہ خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ منزل کا نشان ملنے تک ایسے دور زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کے اندر کی کھوج آپ کو بے چین رکھتی ہے اور بظاہر سامنے کوئی سنگ میل تک نظر نہ آنے کی وجہ سے ہم اُکتانے لگتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے باقی سب کی طرح آپ کا بھی یہ دور عارضی اور چند روزہ ہوگا۔“ وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتی رہی۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ حویلی جلد چکر لگائے گا۔ خاں جی اور امی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“

وہ مجھ سے رخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ اُس کے جانے کے بعد اصغر صاحب اُٹھ کر میری جانب آ گئے۔ انہوں نے لا ریب کو درگاہ کے احاطے سے نکلتے دیکھ کر کہا ”یہ کریم خان صاحب کی بیٹی تھی نا..... کیا کہہ رہی تھی۔“

پھر وہی محبت

جانے وہ کیا خیال تھا کہ اُس نے میرے ذہن میں کچھ یوں جڑ پکڑی کہ میں پھر دن چڑھے تک اُسی سوچ کے تانے بانوں میں الجھا رہا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اس قدر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھے جا کر اصغر صاحب سے ہی پوچھ لینا چاہیے کہ اگر میں ہی اُس چھلاوے کا مرکز نظر ہوں تو پھر دیر کیسی؟..... لیکن نہ جانے کیوں میں ہر بار پوچھتے پوچھتے رُک جاتا۔ دو دن اسی اُدھیڑ بن میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن اصغر صاحب صبح کی کسی دھوپ سینکے کے لیے انگور کی بیلوں کے سامنے دریوں پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے نہ جانے کس سوچوں میں گم تھے، میں دُور کھڑا پرندوں کو دانہ ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ انسان کو قسمت کیا کیا روپ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں قاتل تو بہت دیکھے تھے لیکن ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا جو اگلے چند روز میں قاتل بننے جا رہا ہو۔ اتنے میں نیچے گھاٹی میں بشرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ میں چونکا کیوں کہ آج نہ تو جمعرات تھی اور نہ ہی حویلی میں سے کسی کئین کے آنے کا کوئی امکان تھا۔ میں نے درگاہ کی دیوار سے نیچے دیکھا تو لا ریب اپنے وجود کو بڑی سی کالی چادر میں لپٹے تانگے سے اُترتی دکھائی دی۔ کرم دین حسب معمول اپنی بڑی سی ڈانگ سنبھالے اپنی چھوٹی بی بی کے آگے آگے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ لا ریب.....؟ آج.....؟ یہاں.....؟ اور اس طرح اچانک.....؟..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ کچھ ہی دیر میں درگاہ کے احاطے تک پہنچ گئی اور اُس نے صحن میں کھڑے کھڑے ہی دعا کر کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب چلی آئی۔ دھوپ اور اُونچائی پر چڑھنے کی وجہ سے اُس کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے ناک کا لونگ کسی سرخ یا قوت میں جڑا کوئی نگ لگ رہا تھا۔ پسینے کی چند ننھی ننھی سی بوندیں اُس کی روشن جبین پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں بیک وقت کچھ اُلجھن، کچھ بے چینی اور کچھ حیا کا عنصر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ یہاں تک آ تو گئی ہے لیکن اپنے سارے لفظ نیچے

کی رُوح دھیرے دھیرے نکل رہی ہے..... اب دیکھو کب.....“

میں نے چلا کر اُن کی بات کاٹ دی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... وہ بہت معصوم ہے..... میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے ایسی کوئی بھی اذیت کبھی بھی اُسے پہنچے..... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ جان بوجھ کر اس آگ میں نہیں کود سکتی.....“

لیکن اصغر صاحب کا سفاک لہجہ اُسی طرح میری ساعت میں بر چھیاں گھونپتا رہا۔ ”میں نے کہا نا، اس میں تمہارا، یا اُس معصوم لڑکی کا کوئی قصور نہیں..... خطا وار تو صرف بت ہے..... ہاں..... وہی محبت کا اندھا تیر..... جس کو چلانے والے ہاتھ اور کمان سے شست اندھنے والی آنکھ اس بے رحم تقدیر کی ہوتی ہے جس پر ہمارا اختیار بھی نہیں چلتا.....“

میں اب بھی الجھن میں تھا۔

”لیکن..... لیکن آپ یہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں.....“

”کچھ باتیں جاننے کے لیے کسی خاص تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میں اس لیے بھی پُر یقین ہوں کہ پچھلے ایک سال میں میں نے چہرے پڑھنا خوب اچھی طرح سیکھا ہے۔ اس لڑکی کا چہرہ تو ویسے بھی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تم شاید اپنی آنکھوں پر اس خاندان کے احترام کی بندھی پٹی کی وجہ سے اُس کا چہرہ پڑھ نہیں سکے، یا پھر تم نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ چونکہ وہ تمہاری کہانی سے آگاہ ہے لہذا اُس کا دل تمہاری جانب مائل نہیں ہوگا۔ عبد اللہ میاں..... یہ لڑکیاں من کی بالکل کچی گریاں ہوتی ہیں۔ ذرا سے دباؤ سے چٹخ جانے والی اور پھر کبھی نہ جڑنے والی گریاں..... اس لڑکی کا کوئل من بھی کہیں نہ کہیں سے چٹخ گیا ہے..... اب اس کے دل کی نازک اور کچی گرلی کو سوکھنے اور برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا..... وہ خود بھی نہیں.....“

اصغر صاحب میرے اوپر بھلیاں گر کر واپس اندر اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔ لیکن مجھے نہ باہر کا جھوٹا گئے اور نہ ہی میں اپنے اندر چھپنے کی کوئی جگہ پارہا تھا۔ کاش انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف اور صرف اُن کا ایک اندازہ ہو اور ایسا کوئی بھی طوفان لاریب کے اندر نہ پہنچ رہا ہو۔ اُس کی ہنسی سے تو اُس کی حویلی ہی کیا پورا جبل پور ہی سدا روشن رہتا تھا۔ وہ اور اُس کی معصوم شرارتیں تو اُس کے ماں باپ کی سانسیں بڑھانے کا باعث تھیں۔ اپنی اس چھوٹی

”کچھ نہیں..... بس دعا مانگنے کے لیے آئی تھی۔“

اصغر صاحب نے میری جانب غور سے دیکھا ”کیا تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، یا جان بوجھ کر انجان بننا چاہ رہے ہو۔“

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ”میں کچھ سمجھا نہیں..... میں نے کیا محسوس نہیں کیا.....؟“ اصغر صاحب نے لاریب کی راہ گزر پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ ابھی تک درگاہ میں ہی موجود ہو، حالانکہ اُسے نکلے دیر ہو چکی تھی۔ ”یہ لڑکی تم سے محبت کرنے لگی ہے عبد اللہ میاں..... حیرت ہے تمہیں اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ کوئی اندھا بھی اس کی حالت دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُس کے دل میں تیر گزہ چکا ہے..... تمہاری محبت کا اندھا تیر.....“

میں اصغر صاحب کی بات سن کر یوں ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے انہوں نے زبان سے بات نہیں، اپنی پٹاری سے کوئی سنہولیا نکال کر میری جانب اُچھال دیا ہو۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے..... ایسا نہیں ہو سکتا..... وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔“

اصغر صاحب میری بات سن کر یوں مسکرائے جیسے کوئی کسی بچے کے منہ سے کوئی معصومانہ سی بات سن کر مسکراتا ہے۔ ”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو، اس بات سے اُس کے دل میں جنم لینے والے کسی جذبے کا کیا تعلق ہے؟ یاد رکھو..... محبت ہم بے بس انسانوں کا کچھ اسی طرح پیچھا کرتی رہتی ہے جیسے کسی گھنے اندھیرے جنگل میں چلایا ہوا کسی ظالم شکاری کا اندھا تیر اپنی زد میں آئے ہوئے کسی معصوم غزال کا پیچھا کرتا ہے۔ بد قسمتی سے ہم بھولے بھالے انسان بھی اُسی سیدھ میں بھاگنے کی کوشش کرتے جس طرح وہ بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں والا غزال بنا دائیں بائیں مڑے بس سیدھا ہی بھاگ اٹھتا ہے، لیکن تیر کی رفتار سے جیت نہیں پاتا اور آخر کار اپنی شہ رگ میں وہ تیز خنجر جیسا تیر پیوست کر دیا کر دیں کسی گہری کھائی میں گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ مرنے سے کچھ لمحے پہلے خون کا آخری تیز فوارہ اُس کی شہ رگ سے چھوٹتا ہے اور وہ غزال اپنی رُوح نکلنے کی تڑپ میں اپنے پیر پتھر ملی چٹان پر بے تاب سے رگڑتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح آج یہ لڑکی بھی اپنی ایڑھیاں رگڑنے اس پتھر ملی درگاہ پر آئی تھی۔ اُس کی شہ رگ سے گرم خون کا آخری فوارہ جاری ہو چکا ہے۔ اور اُس

خدمت میں بھی سلام عرض کرنے آ جاؤں گا..... بہر حال آپ میری جانب سے انہیں آداب ضرور کہہ دیجیے گا۔“

وہ کچھ بے چین سی تھی۔ ”آپ پھر کب آئیں گے.....؟ میرا مطلب ہے مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں..... لیکن نہ جانے جب کبھی موقع ملتا ہے تو ذہن میں سب کچھ اٹھل پٹھل سا کیوں ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے جانے کے بعد خود کو کوستی رہتی ہوں کہ آپ سے ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر پائی۔ اُس روز اتنی دُور چل کر درگاہ بھی آئی لیکن وہاں بھی بات اُدھوری ہی رہی.....“

لاریب جب بے چین سی، بار بار اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی اور اپنی نازک سی کلائی میں پڑا ہوا وہ سنہری کڑا بار بار گھما رہی تھی تو نہ جانے مجھے اس میں وہ پہلی ملاقات والی لاریب کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آئی۔ یہ تو کوئی اور لاریب تھی جس کی ہنسی کی جڑوں میں محبت کا دیمک اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اُس کے گلابی رنگت میں محبت کا نیلا زہر دھیرے دھیرے شامل ہوتا جا رہا تھا اور اُس کی نسوں میں بہتے سرخ خون میں عشق نامی زہریلے مادے کی سورج کبھی جیسی زرد رنگت کی ملاوٹ اب اُس لڑکی کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھالوں اور اُسے شہ توت کے درختوں والی اس جھرنّا بہتی سڑک کے کسی پُر سکون کنارے لے جا کر اُس سے صرف اتنا کہوں کہ ”دیکھو..... یہ زندگی ہے..... یہ تم ہو..... اپنے اندر کی اس پُر شور بہتہ جھرنے جیسی زندگی کو کسی بھی ایسے جذبے کے نام گردی مت رکھ دینا کہ تمہارے اندر بہتی جیتی جاگتی زندگی کے سوتے ہی خشک ہو جائیں۔“ لیکن میں اُسے یہ سب کہہ نہ سکا اور میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔ ”آپ جب بھی چاہیں مجھے طلب کر سکتی ہیں۔ درگاہ اتنی دُور تو نہیں..... اور پھر میں کم از کم آپ سے ہمیشہ یہی توقع رکھتا ہوں کہ آپ اپنی کسی بھی ذہنی اُلجھن کو دل میں دبائے نہیں رکھیں گی..... اور جب بھی آپ کا من چاہے گا آپ اُسے بانٹ لیں گی..... یا ابھی تک آپ نے مجھے صرف مہمانوں کی فہرست میں ہی سجا رکھا ہے.....؟“

میری بات سن کر اُس کے چہرے پر چھائے فکر کے بادل کچھ حد تک چھٹ گئے اور وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے گھنی بدلیوں کی اوٹ سے سورج نے

مالکن کی مسکراہٹ اور کلکاریاں ہی تو حویلی کے سبھی نوکروں کا خون بڑھاتی تھیں۔ ایسی زند لڑکی کو محبت کا منحوس گہن لگ جائے..... نہیں نہیں..... اس سے پہلے خود مجھے اپنا وجود لے کر یہاں سے کہیں دُور چلا جانا چاہیے..... لیکن..... میں جاؤں بھی تو کہاں..... یہ سلطان بابا بھی مجھے یہاں بھیج کر جیسے بھول ہی گئے ہیں۔ میں نے اُسی شام ساحل والی درگاہ کے نئے عبداللہ یعنی نعمان کو ایک تفصیلی خط لکھ ڈالا کہ جیسے بھی ہو وہ سلطان بابا تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اُن کا بے حد بے چینی سے یہاں جبل پور والی درگاہ پر انتظار کر رہا ہوں۔ میں وہ خط شام ہی کو پہنچے گاؤں میں پوسٹ ماسٹر صاحب کے حوالے کر آیا کہ اُسے کل کی ڈاک میں ضرور نکال دیں۔ رات بھر اسی بے کلی میں بستر کی ٹخنیں بڑھاتا رہا لیکن اس سے کہیں زیادہ ٹخنیں میری منہ زور سوچ میرے ماتھے پر ڈالتی رہی۔

کہتے ہیں خدشے اور دوسو سے حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ دھارنے لگ جاتے ہیں۔ اگلے دن خان صاحب نے بشیرے کے ہاتھ پیغام بھجوادیا کہ درگاہ کی سالانہ زکوٰۃ بٹائی کا وقت ہو چلا ہے لہذا میں سہ پہر تک آ کر اُن سے سارے پیسے، مستحقین کی فہرست اور پتے اور تقسیم کا طریقہ کار وغیرہ جمع کر تا جاؤں تاکہ اگلے دن سے یہ کام شروع کیا جاسکے۔ میں سہ پہر کو وہاں پہنچا اور ہم شام پانچ بجے تک سارا طریقہ کار طے کر چکے تھے۔ خان صاحب کے کچھ مہمان بھی آگئے تھے لہذا میں اُن سے اجازت لے کر واپسی کے لیے باہر نکل آیا۔ بشیرے کو میں نے تانگا نکالنے کا کہا۔ آج میں مردانے میں خان صاحب کے ساتھ بیرونی ڈیوڑھی کے مہمان خانے میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ لہذا ایک بار جی میں آیا کہ کرم دین سے کہلو کر اندر بڑی مالکن کو سلام بھجوادوں۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خود کو روک لیا اور پلٹ کر تانگے کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی میرا ایک پاؤں تانگے کی پچھلی سیٹ کے پائیدان پر ہی تھا کہ لاریب نہایت غلٹ میں اندر سے نکل کر ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اتنی بدحواس سی تھی کہ ٹھیک طرح سے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دے پائی۔ ”آپ جا رہے ہیں.....؟ امی سے نہیں ملیں گے.....؟ میرا مطلب ہے یوں اچانک.....؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ حویلی آئے ہیں تو سب سے مل کر جائیں گے.....“

”جی خان صاحب نے کچھ کام دیئے ہیں سوچا پہلے اُن کو پنہالوں تو پھر بڑی مالکن کی

ہیں کہ ہمارے خون میں شامل ہو کر ہمارے اندر کو بھی تہس نہس کر دیں؟ ہمارے اندر کی طبعی حالت کو ہی بدل کر رکھ دیں؟ ہماری شخصیت کے رُخ پلٹ دیں؟ کیا ان جذبوں کی اپنی بھی کوئی کیسی تاثیر ہوتی ہے جو پل بھر میں ہمیں بخار میں پھنکا دیتی ہے اور سخت گرمی میں ہم سرد ہو کر لرزنے لگتے ہیں؟

اگلے دو دن اسی کش مکش میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح سویرے ڈاکے کی سائیکل کی مخصوص تھنٹی نیچے جھتی سنا دی۔ مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی کیوں کہ ابھی دو دن پہلے ہی میں نے عبداللہ میاں کو تفصیلی خط لکھا تھا لیکن اس کا جواب دو ہفتے سے پہلے ملنے کی اُمید نہیں تھی کیوں کہ اس دور دراز علاقے میں ڈاک کا نظام اس قدر تیز رفتار نہیں تھا کہ کوریئر سروس کی طرح دوسرے ہی دن ڈاک ملک کے کسی بھی کونے میں پہنچا دے۔ تو پھر یہ خط کس کا آیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاک بابو اُد پر آ پہنچا۔ خط میرا ہی تھا اور مجھ سے پہلے والے عبداللہ کی جانب سے تھا۔ اُس نے اپنی اور سلطان بابا کی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور میرے لیے خوش خبری یہ تھی کہ سلطان بابا کا کچھ دنوں میں جبل پور آنے کا ارادہ تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے نعمان کو خط لکھ کر جس خواہش کا اظہار کیا تھا قدرت نے ساحلی درگاہ پر میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ دعا قبول کر لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سلطان بابا کے آتے ہی اُن سے اجازت لے کر جبل پور سے کہیں آگے نکل جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ لاریب کے اندر کی بے چینی کوئی واضح رُخ اختیار کرے۔ مجھے اُس کی نظروں سے ادھل ہو جانا ہی بہتر لگ رہا تھا۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے زہرا بہت ٹوٹ کر یاد آئی اور مجھے لمبے سفر میں شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دراصل مجھے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سنٹرل جیل میں سکندر کی پھانسی سے لے کر یا قوط کے ہتھیار ڈالنے تک میں نے اس محبت نامی جذبے کی تباہ کاریاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور پھر میں تو خود اس منہ زور جذبے کی اندھی طاقت کا ایک چلتا پھرتا ثبوت تھا۔ لیکن میں اب یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور معصوم اس آتش جذبے کے تیزاب کی زد میں آکر اپنا آپ جھلسا ڈالے۔ لیکن بات اگر صرف ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کی ہی ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ یہاں تو ہر فیصلہ پہلے ہی سے طے شدہ اور ایک لفافے میں مہربند ہمیں ملتا تھا۔

اصغر صاحب اس روز صبح سویرے ہی اُٹھ کر کہیں نکل چکے تھے۔ جب ڈاکے نے مجھے

جھلک دکھائی ہو۔ ”نہیں..... مہمانوں کی فہرست سے تو میں کب کا آپ کو نکال چکی۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ کیا میری کبھی زہرا سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانے وہ کیسی ہوں گی.....؟ جن کی ایک جھلک نے ہی آپ کی زندگی بدل دی..... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا کوئی اپنے اندر ایسا اثر بھی رکھتا ہے کہ پل بھر میں کا یا پلٹ دے..... کیا آپ اُن سے مجھے کبھی ملوائیں گے.....“

مجھے اُس کے بھولے پن پر ہنسی آگئی۔ ”ضرور ملواؤں گا..... اور ایک بات یاد رکھیے گا کہ ہم میں سے ہر ایک کے مقدر میں ایسی ایک نظر ضرور ہوتی ہے جو ہماری کا یا پلٹ کر رکھ دے۔ اب یہ ہماری اپنی کوتاہ نظری ہے اگر ہم اپنے نصیب کی اس ایک نظر کو بھی برت نہ سکیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خود ہماری اپنی نظر بھی کسی نہ کسی اور کے لیے ویسی ہی تاثیر رکھتی ہے۔ کون جانے ہم خود کس لمحے کس کی زندگی بدل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں خود بھی اس کی خبر نہیں ہو پاتی..... شاید نظر کا یہ سارا کھیل ہی آنکھ مچولی کا ہے۔“

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ جانے وہ میرے لفظوں کے درپردہ معنی تک پہنچ سکی، یا نہیں لیکن اتنے میں اندر سے بڑی مالکن کا لاریب کے لیے بلاوہ آگیا۔ خود مجھے بھی اُس کا یوں اتنی دیر تک بیرونی ڈیوڈھی میں کھڑے رہنا کچھ بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے پلٹنے سے قبل چند لمحوں کے لیے رُکی ”آپ ٹھیک کہتے ہیں..... لیکن کیا یہ بھی ہماری بد نصیبی نہیں ہوتی کہ نظر کے اس پورے کھیل میں قدرت سارے کے سارے پتے اپنے پاس ہی رکھتی ہے..... اور خود ہم نظر کو سہنے، یا نظر ڈالنے والوں کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی ہوتی ہے..... نہ تو اپنے مقدر کی نظر کو برتنا ہمارے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی اور کے نصیب میں لکھی ہماری اپنی نظر کو ہم روک سکتے ہیں..... ہمیں ہوش تب آتا ہے جب ہم اپنا سب کچھ لٹا چکے ہوتے ہیں، یا پھر خود کسی کے مقدر کے قزاق بن کر اُسے لوٹ لیتے ہیں..... آپ کے پاس پھر کبھی وقت ہوا تو ہم اس موضوع پر دوبارہ بات ضرور کریں گے.....“ وہ خدا حافظ کہہ کر پلٹ کر چل دی۔ شیرے نے بھی تانگے کو ایڑہ لگا دی اور دُور ہوتی حویلی کے اُونچے مَرَج بھی رفتہ رفتہ دُھندلے پڑے لگے لیکن مجھے اصغر صاحب کی کبھی باتیں یاد آنے لگیں۔ مجھے ان جذبوں کی طاقت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیا یہ جذبے اتنے منہ روز بھی ہو سکتے

اے سے راہ پوچھ کر اوپر درگاہ کی پتھریلی ڈگر پر چڑھنے لگا۔ میں شش و پنج میں وہیں منڈیر پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ سرد ہوا کے تھیرے اپنے ساتھ ٹھنڈی برجیوں جیسی بوندوں کی بوندات لیے اُس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ اوپر پہنچ گیا۔ اُس نے دُور ہی سے مجھے سلام کیا اور قریب آ کر بولا۔

”جناب میرا نام حوالدار اکرم ہے۔ جبل پور پولیس تھانہ کا محرر بھی میں ہی ہوں۔“
 ”جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ پولیس کا ن درگاہ پر بھلا کیا کام؟ اُس نے اپنی بیٹ کسی۔

”آپ کا نام ہی عبد اللہ ہے۔“

”جی..... میں عبد اللہ ہوں۔“

”آپ کو میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا، نیچے کوئی خون ہو گیا ہے۔“

خون.....؟؟ اچانک ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے ساری درگاہ ہی گھوم رہی ہو۔ اچانک ہی مجھے اصغر صاحب کی لمبی غیر حاضری اور اُن کے آخری جرم کے ارتکاب کے خیال نے آ گھیرا۔ کہیں چھلاوے کا آخری حکم حقیقت کا روپ تو نہیں دھار چکا تھا۔

خط دیا تو اُس وقت میں درگاہ میں اکیلا ہی تھا۔ لیکن آج میں نے طے کیا تھا کہ اصغر صاحب کی واپسی پر اُن سے اُن کی اس ”پراسرار“ آوارہ گردی کا راز ضرور پوچھوں گا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چھلاوہ اُن سے دن کی روشنی میں کم ہی ملتا ہے اور زیادہ تر وہ شام کے بعد ہی اُن پر واضح ہوتا ہے۔ لہذا اُن کی اس یا تر کا مقصد کچھ اور ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن اس روز وہ نہ جانے کہاں نکل گئے تھے کہ پہلے دو پہر اور پھر عصر کا وقت بھی گزر گیا لیکن اُن کی واپسی نہ ہوئی۔ عصر کے بعد آسمان پر اڑتے بادلوں نے گلے ملنا شروع کر دیا اور کچھ ہی لمحوں میں سب ہی کے درمیان سازش ہونے لگی کہ کس غریب کی کچی چھت پر برس کر اُسے ستایا جائے۔ بادلوں کے درمیان ہوتی سرگوشیاں آہستہ آہستہ بلند آواز بحث میں تبدیل ہونے لگیں اور اس گڑگڑاہٹ کی آواز نیچے ہم زمین والوں تک بھی پہنچنے لگی۔ موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے اور فی الحال اصغر صاحب کا دُور دُور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں ہلکی ہلکی بوند باندی اور تیز ہوا کے جھکڑوں نے درگاہ کے صحن میں پڑے پتوں کی چادر کو اس طرح لہرا نا شروع کیا جیسے کوئی کالی پنھان اپنی گٹھڑی میں سے رنگین کپڑوں کے تھان کھول کھول کر نمائش کے لیے ہوا میں لہرا رہا ہو۔ میں نے درگاہ کی منڈیر سے نیچے گھاٹی میں جھانکا۔ گاؤں کی طرف سے آتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ لیکن پھر دُور ہی سے کسی تانگے کے گھنگرڈوں کی جھنکار سنائی دینے لگی اور کچھ لمحوں میں ہی سواری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ بشیرے کا تانگا نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ گاؤں سے ذرا پرے ایک اور بستی میں بھی چند تانگے سواریاں لاتے لے جاتے رہتے تھے یہ شاید اُن ہی میں سے کوئی ایک تانگا ہوگا۔ میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ ضرور اصغر صاحب اسی تانگے میں آ رہے ہوں گے۔ چلو اچھا ہے۔ شام ڈھلنے سے پہلے اور اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے تھے۔ نہ جانے چند ہی دنوں میں اُن کے ساتھ کیسا عجیب سا رشتہ بن گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود مجھے بتا چکے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ارادے سے اس درگاہ پر قیام پذیر تھے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے اُن سے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا حالانکہ اُن کے اس جان لیوا ارادے کا شکار میں خود بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن میرا اطمینان عارضی ہی ثابت ہوا۔ تانگے سے کوئی اور شخص اُترا اور پھر تانگے

پہلی رہائی

لاش پر کپڑا ڈال کر اُس کا بدن چھپا دیا گیا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”تو تم ہو جبل پور کی درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو کافی کم عمر ہو.....؟..... خان صاحب سے ایک بار تمہارا ذکر سنا تھا۔ اس برستے موسم میں تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ آج صبح منہ اندھیرے یہاں ایک لاش ملی ہے۔ زخم گہرا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کوئی ذکیٹی کی واردات ہے۔ ڈاکو اسے لوٹنے کی نیت سے آیا ہوگا اور مزاحمت پر چھڑا گھونپ کر مال لوٹ کر لے گیا۔ لیکن اس شخص کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو تین چار نسلوں سے جانتے ہیں لہذا یہ بات تو پکی ہے کہ مقتول اس علاقے کا نہیں ہے۔ ہم نے بیچ نامہ تو کر لیا ہے لیکن لاش اٹھانے سے پہلے سوچا کہ ایک بار تم سے بھی شناخت کروالیں کیونکہ بہت سے لوگ درگاہ کی زیارت کے لیے دور دراز علاقوں سے بھی آتے ہیں جو سیدھے درگاہ جاتے ہیں منت مانگتے ہیں اور پھر دوسری گاڑی پکڑ کر واپس اپنے علاقے کو پلٹ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم نے اسے پہلے درگاہ پر دیکھا ہو..... اس کا باقی سامان تو لوٹ لیا گیا ہے صرف اس کے پاس یہ پھولوں کے چند ہار ملے ہیں۔ میں نے تھانے دار کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر ڈالی تو چند مکلائے ہاں پھولوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پلیٹ فارم پر لگی لکڑی کے بیچ کے پاس پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں میرے اندر ایک لمحے کے ہزاروں حصے میں کچھ چھن سے ٹوٹ سا گیا۔ جانے وہ بد قسمت پھول کس کی لحد پر بچھنے کی قسمت لے کر چلے تھے۔ کیا خریدنے والے کو یہ پتا تھا کہ یہ پھولوں کی چادر آخر کار اُسی کا نصیب ہوگی؟ لیکن پتا نہیں کیوں میں لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹانے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تھانے دار نے میری مشکل آسان کر دی اور حوالدار کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چادر کھینچ لی۔ میں نے پلکیں موندھ لیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مرنے والا واقعی درگاہ کا ایک پرانا نازار ہی تھا اور میں نے بھی ایک آدھ جمعرات کو اُسے وہاں آتے دیکھا تھا۔ میں نے سر ہلا کر تھانے دار کو تصدیق کر دی اور اپنا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ اس شخص نے درگاہ پر چندہ بھی دیا تھا اور اس کا نام پتا درگاہ کے رجسٹر میں درج تھا۔ تھانے دار نے حوالدار کو دوبارہ میرے ساتھ درگاہ تک جانے کا کہا اور ہاتھ ملا کر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے مقتول کے بارے میں مزید کوئی بات پتا چلے تو نام اور پتے کے ساتھ وہ تفصیل بھی ایک کاغذ پر درج کر

میں نے گھبرا کر حوالدار سے پوچھا ”خون..... لیکن کس کا.....؟ اور آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا ہے۔“ ”پتا نہیں جناب..... تھانے دار صاحب نے بھیجا ہے۔ جبل پور سے پچھلے اسٹیشن پر ایک لاش ملی ہے کسی پکی عمر کے شخص کی۔ یہاں گاؤں میں تو کوئی شناخت نہیں کر پایا تو تھانے دار نے یہاں بھجو دیا کہ آپ کو بھی بلا لاؤں..... شاید آپ کی شناخت کا ہودہ بندہ.....؟“

پکی عمر کے شخص کی لاش..... یا میرے خدا..... میں نے جلدی سے اپنے کمرے میں پڑی اپنی شال اپنے کاندھوں پر ڈالی اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔ سارے راستے میرے ذہن و دل میں عجیب عجیب سے دوسوے جنم لیتے رہے اور میں خدا سے اپنے خدشات کو حقیقت میں نہ بدلنے کی التجا کرتا رہا۔ ہم جبل پور گاؤں کے باہر ہی سے آگے بڑھ گئے۔ جبل پور سے پہلے قادر پور کا ریلوے اسٹیشن آتا تھا جو جبل پور سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ آدھے راستے میں ہی موسلا دھار بارش نے ہمیں آگھیرا اور ہم نیم پتہ سڑک پر دوڑتے اور کچھڑے چھینے اڑاتے تاکہ کی بچھلی نشست پر بیٹھے بارش کی بوچھاڑ سہتے ہوئے جب اسٹیشن پہنچے تو مغرب کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پینڈو میکس کے بڑے بڑے لیپ روشن کر دیئے گئے تھے جن کی پیلی روشنی میں برقی بارش کے قطرے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے آتش بازی والے کسی انار کو اندھیرے میں چلانے کے بعد اُس میں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

ایک جانب کچھ پولیس والوں اور گاؤں کے چند بڑے بوڑھوں کا ہجوم سا لگا ہوا تھا۔ پولیس والے لمبے لمبے خاکی گرم اور کوٹوں میں ملبوس تھے اور ایک سپاہی کسی افسر کے لیے چھتری تانے کھڑا تھا۔ شاید یہی قادر پور کا تھانے دار تھا۔ ہم دونوں بھی اُسی کی جانب بڑھ گئے۔ ہمیں اپنی جانب آتے دیکھ کر بھیڑیوں جیسے چیونٹیوں کا کوئی جم گھٹا پانی کی تیز لہ اپنے درمیان سے گزرتے پا کر چاروں جانب چھٹ جاتا ہے۔ نیچے پلیٹ فارم کی زمین پر ک

جانے اور لاش کی شناخت تک کے تمام مراحل سنا دیئے۔ وہ بھی حیران سے رہ گئے۔
 ”اوہ..... یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے..... جانے وہ بے چارہ کون تھا.....“ وہ بولتے بولتے اچانک چپ سے ہو گئے۔ ”ٹھہرو..... کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ خون میں نے کیا ہے.....؟..... یقین مانو اس جرم میں میرا کوئی عمل دخل نہیں..... میں تو اسٹیشن کی طرف گیا بھی نہیں.....“

مجھے اُن کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ دیے بھی آج تک انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پتا نہیں کیسے ٹھیک اُسی وقت میرے دل میں بہت دنوں کی چھپی بات میرے لبوں پر آگئی۔ ”کیا آپ کو چھلاوے نے اُس شخص کا نام نہیں بتایا جس کو وہ آپ کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہے..... کہیں وہ میں تو نہیں.....؟“

اب اُچھلنے کی باری اصغر صاحب کی تھی ”کیا.....؟..... نہیں نہیں..... باخدا ایسا کچھ نہیں..... دیے تو اُس نے مجھے اُس شخص کا نام نہیں بتایا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اُس کا خاتمہ مجھے درگاہ سے باہر کسی مقام پر کرنا ہوگا۔ اُس کا ٹھکانہ یہ درگاہ نہیں ہوگی..... اور یقین کرو کہ اگر مجھے یہ پتا چلتا کہ مجھے اپنی آزادی کے لیے تمہاری جان لینی ہوگی تو میں اُسی بل خود اپنی جان لے لیتا۔ میں بہت بڑا گناہ گار صحیح..... لیکن کچھ گناہ.....“

میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ دل پر نہ لیں میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا، اگر کبھی میری اس لا حاصل زندگی سے آپ کی آزادی حاصل ہوتی نظر آئی تو آپ کو کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔“

انہوں نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں..... لیکن تم فکر نہ کرو..... میری آزادی میں اب کم وقت رہ گیا ہے..... میں نے بہت عذاب ناک قید کاٹ لی..... اس بیڑیاں کھلنے کا وقت قریب ہے۔“

جانے اُس لمحے میں چاہ کر بھی اُن سے یہ کیوں نہیں کہہ سکا کہ کسی کے خون کے بدلے جھینگی آزادی بھلا انہیں کیا آزاد کر پائے گی؟ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک قید سے نکل کر کسی دوسرے اور بڑے زندان میں داخلے کی تیاری کر رہے ہوں۔

ساری رات ان ہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا تو

کے حوالدار کے حوالے کر دوں۔ میں اور حوالدار جب دوبارہ درگاہ پہنچے تو رات پوری طرح شام کی گردن میں اپنے تاریک پنچے گاڑھ چکی تھی۔ اندھیرے میں پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے پھر سے وہی کسی نادیدہ ہستی کے اپنے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا احساس ہوا۔ لیکن میں حوالدار کی وجہ سے سر جھٹک کر اوپر چڑھتا گیا۔ درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر اصغر صاحب کے کمرے کی جانب اٹھی۔ اُن کے کمرے کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ میں نے حوالدار کو تمام تفصیلات ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور اُسے رخصت کر کے فوراً اصغر صاحب کے کمرے کی جانب لپکا۔

اصغر صاحب کافی غڈ حال سے لگ رہے تھے۔ جیسے دن بھر کافی مشقت کاٹی ہو انہوں نے۔ میں نے اُن سے شکایت کی ”کہاں چلے گئے تھے آپ یوں بناتائے.....؟..... آپ جانتے ہیں میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا.....“

اصغر صاحب مسکرائے ”معاف کرنا عبداللہ..... بس اچانک کام ہی کچھ ایسا پڑ گیا تھا۔ اس لیے بناتائے صبح سویرے مجھے نکلنا پڑ گیا..... میں نے اتنی صبح تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”لیکن آپ گئے کہاں تھے۔“
 اصغر صاحب نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ”کہیں نہیں..... جبل پور سے آگے ایک اور اسٹیشن ہے..... قادر پور..... بس وہیں تک گیا تھا کسی شخص سے ملنا تھا پر وہ ملا نہیں.....“

میں قادر پور کا نام سن کر زور سے چونکا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات اصغر صاحب نے بھی محسوس کر لیے۔ ”کیوں کیا ہوا..... تم اتنے حیران اور ایک دم ہی پریشان کیوں ہو گئے ہو.....؟ سب خیر تو ہے نا.....“

میں نے مشکوک نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے قادر پور کے لیے نکلے تھے اور صبح سویرے ہی قادر پور کے ریلوے پلیٹ فارم پر ایک قتل ہو گیا..... کہیں یہ قتل.....؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا۔ اصغر صاحب نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”کیا ہوا.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟“

میں نے انہیں شام کی ساری داستان، حوالدار کے آنے سے لے کر میرے قادر پور

فج جانا..... دعا آپ نے ہی کرنی ہے۔ خان صاحب کی گاڑی آپ کو لینے آ جائے گی۔ میں ب تک لکڑیاں اور مٹی کا تیل وغیرہ حویلی پہنچا آؤں۔ بس آپ تیار رہیے گا۔“ بشیرا جیسے چھپ چھپ کرتا آیا تھا ویسے ہی سڑ سڑ کرتا اور بھیگتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے اُسے بہت کہا کہ رگاہ کی چھتری لیتا جائے لیکن اُس نے یہ کہہ کر مجھے لا جواب کر دیا کہ ”اوداؤ۔۔۔ ان بارش کے قطروں سے چٹنا نہیں چاہیے۔۔۔ یہ تو رب ہماری رُوح کو دھونے کے لیے آسمان سے رساتا ہے۔۔۔“

اصغر صاحب چپ چاپ کھڑے ہماری ساری باتیں سنتے رہے۔ بشیرے کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”دیکھا۔۔۔ میں نے کہا تھا نا۔۔۔؟“

وہ نازک لڑکی محبت نامی اس زہریلے ناگ کا پہلا وار ہی برداشت نہیں کر پائی۔ زہر اس نیزی سے اُس کی کول نسوں میں پھیل رہا تھا کہ وہ نڈھال ہو کر بستر سے لگ چکی تھی۔ اور کیسی تم ظریفی تھی کہ اُس کے مندل ہونے کی دعا کے لیے بھی اُسی کو طلب کیا جا رہا تھا جو خود اُن رنوں کا باعث تھا۔ گویا قاتل کو ہی مسیحا کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ کوئی بھی بہانہ کر کے حویلی نہ جاؤں لیکن اصغر صاحب شاید میری سوچیں ہی پڑھ رہے تھے۔ وہ بول پڑے۔ ”تمہیں جانا چاہیے۔۔۔ تنہی اُس کا زخم اور تنہی مرہم ہو۔۔۔ نہیں جاؤ گے تو زخم اور گہرا ہو جائے گا۔ ہاں البتہ چلے جاؤ گے تو زخم تو لگے گا لیکن ساتھ ہی کچھ مرہم بھی دے آؤ گے۔۔۔ سو میرا مشورہ یہی ہے کہ چلے جاؤ۔۔۔ اور کوشش کرنا کہ زخم کے مقابلے میں مرہم زیادہ بانٹ پاؤ۔۔۔“

”لیکن کیسے۔۔۔؟“ میں چلا اٹھا۔۔۔ اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔۔؟ آخر اُس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اُس کی ہنسی کیوں چھین لی گئی۔۔۔؟ یہ زخم اُس کا مقدر کیوں بن گئے ہیں؟۔۔۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔۔۔“

”جب تم پر تقدیر کا وار ہوا تھا تب تمہارا کیا قصور تھا؟ تم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ تمہارے مقدر میں ہی عشق کا وہ کاری وار کیوں لکھ دیا گیا تھا جس نے ایک پل میں ہی تمہاری دنیا بدل دی؟ ان سب سوالوں کے جواب میں تمہارے پاس۔۔۔؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ کسی کا کوئی

رات بھر مینہ چھا جوں برس رہا تھا اور اس وقت بھی موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اُوپر والی پہاڑی کی چوٹی سے بارش کا پانی بہت سے پرناٹوں کی صورت میں نشیب کی جانب بہہ رہا تھا اور فضا میں صرف اس بہتے پانی کا ہی شور نمایاں تھا۔ شاید دنیا کی بہترین موسیقی اسی شفاف پانی کے بہنے کی آواز میں کہیں مضمحل ہوتی ہے۔ میں کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا پانی کی باتیں سنتا رہا۔ جو مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دنیا میں سب کچھ خراب ہونے کے باوجود اب بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے بچا کر رکھی ہیں۔ یہ آسمان، یہ بادل، یہ راستے، یہ ہوا۔۔۔ اور یہ برستی بارش کی بوندیں۔۔۔ بہت کچھ باقی ہے ابھی یہ بے زار جیون بتانے کے لیے۔۔۔

درگاہ کے کچے صحن میں بارش کا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ میں نے پاس رکھی ایک پرانی اخبار کی کشتی بنائی اور اس پانی میں چھوڑ دی۔ ایک پل میں ہی میں اپنے بچپن کے بارش کے پانی اور کاغذ کی کشتی کے کھیل کی یاد میں ایسا کھویا کہ تیز بارش کی بوندوں نے میرا وہ کاغذی سفینہ کب بھگو کر ڈبو دیا، مجھے اس کی بھی خبر نہ ہو سکی۔ باہر کی آہٹ کی آواز نے جب تک مجھے چونکا یا تب تک میری کشتی پوری طرح بھیگ کر کھل چکی تھی اور اب پانی میں صرف اخبار کا ہی وہ ٹکڑا بھرا رہا تھا جس سے میں نے وہ کشتی بنائی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتھا۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے وہ آنسو بھی جو بچپن میں یوں اپنی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر میری آنکھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ آنے والا بشیرا تھا، جو اُوپر آتے آتے پوری طرح بھیگ کر اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”خیر تو ہے بشیرے۔۔۔ اتنی صبح۔۔۔ ایسے۔۔۔؟“

اتنے میں اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بشیرے نے جلدی سے میرے بڑھائے ہوئے خشک تولیے سے اپنا سر خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ”خیر نہیں ہے جناب۔۔۔ کل شام سے لاریب بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات شدید بخار میں ترپتی رہی ہیں۔۔۔ خان صاحب نے آج صدمے اور نیاز کی دیکیں چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بھی دعا کے لیے بلوایا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد نیاز بانٹنی ہے۔ آپ اس سے پہلے ہی

ہاں..... یہ محبت ایک سرطان کی صورت میں تو ہمارے سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ تو پھر جسم کے باقی سرطان کی طرح ہم ہسپتال جا کر اپنے جسم کے اس کینسر کو کیوں نہیں باہر نکلا سکتے؟ کیوں باقی ناسوروں کی طرح کٹوا کر نہیں پھینک سکتے.....؟

کچھ ہی دیر میں ساری دیکھیں تیار ہو گئیں۔ حویلی کے بیرونی احاطے میں ہی شامیانے لگا کر اور ان کی چھتوں پر بڑی بڑی پلاسٹک کی شیٹس ڈال کر کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور دور دراز کے علاقوں میں بھی نیاز بانٹنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام نے دیگوں کے کھلنے پر ہر دیگ میں سے کچھ چاول اور زردہ وغیرہ لے کر اس پر دعا پڑھ کر دم کیا۔ خان صاحب نے خصوصی طور پر مجھ سے بھی دعا کروائی اور پھر سب دیکھیں گاؤں کے لوگوں اور دیگر غربا میں بانٹ دی گئیں۔ عصر کے وقت تک ہم اس فریضے سے مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔ اس اثناء میں اندر سے بڑی مالکن کا دو تین بار پیغام آچکا تھا کہ میں ذرا فارغ ہو چکوں تو اُن سے اندر آ کر مل لوں۔ تیسری بار جب کرم دین اندر سے پیغام لے کر آیا تو خان صاحب نے میری جانب دیکھا اور ہلکے سے مکائے۔

”عبداللہ میاں..... تم اندر مل آؤ اُن سے..... ورنہ یہ پیغام آتے ہی رہیں گے۔ میں بھی بس ان سب کو پٹا کر آتا ہوں..... چائے ہم بڑے کمرے میں ہی پیتیں گے۔ جلدی نکلنے کی نہ کرنا۔“

میری کوشش یہی تھی کہ میں اور خان صاحب اکٹھے ہی اندر جائیں لیکن آخر کار مجھے اکیلے ہی حویلی کی دوسری ڈیوڑھی پار کرنا پڑی۔ بڑی مالکن سامنے والے برآمدے میں ہی مویٹے کی باڑھ کے پیچھے والے حصے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکیں۔ اُن سے پتا چلا کہ لاریب کا بخار اب بھی دیا ہی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

”عبداللہ..... تم لاریب سے ملو گے نہیں..... دیکھو گے نہیں کہ میرا وہ پھول کیسے مکلا سا گیا ہے..... میری وہ بیٹا اپنی ساری باتیں، اپنی تمام چپکار کیسے بھول گئی ہے..... مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اُس کی تسلی کے لیے وہ لفظ ضرور موجود ہوں گے جو اُس کے جلتے وجود کو جلا بخش سکتے ہیں۔ اُسے تم ہی سمجھا سکتے ہو کہ..... کہ.....“

قصور نہیں ہوتا، لیکن بعض سزائیں بنا کسی جرم کے بھی تو بھگتنا پڑتی ہیں۔ ہم تو اس دنیا میں آئے ہی بھگتنے کے لیے ہیں۔ سو جب تک ایک بھی سانس باقی ہے، بھگتتے ہی رہیں گے۔“

اصغر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ محبت کسی ناکردہ گناہ کی سزا ہی تو تھی۔ یہ سزا ملتی بھی دونوں کو تھی۔ جس نے محبت کی وہ تو خطا وار ٹھہرتا ہی ہے، یہاں تو اُسے بھی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ جس سے دوسرے کو محبت ہو جاتی ہے..... محبت ہمیشہ دوا ایسے لوگوں کے درمیان ہی کیوں وارد ہوتی ہے جن کا ملن دنیا کے ناممکنات میں سے ایک ہوتا ہے؟..... کیا صرف ”لا حاصل“ کا نام ہی عشق ہے؟ اور جو حاصل ہو جائے وہ محبت نہیں..... کیا ”حاصل“ کا درجہ عشق سے گر کر صرف ایک کامیابی کی طمانیت ہی رہ جاتا ہے.....؟

میں ظہر سے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام ہی بھول چکی تھی۔ خان صاحب بیرونی ڈیوڑھی میں ہی چادر کی چھتوں والے سائبان کے نیچے اپنی نگرانی میں دس بارہ دیکھیں پکوائی کے بعد انگاروں پر چڑھوا رہے تھے۔ مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکے۔ ”اچھا ہوا تم جلدی آ گئے عبداللہ میاں..... میری تو پریشانی میں مت ہی ماری گئی ہے۔ شہر سے ڈاکٹر نی بھی بلوائی گئی ہے لیکن اُسے بھی بخار نہ اُترنے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی..... وہ میرے ہاتھ کا چھالا ہے..... میں اُسے اتنی اذیت میں نہیں دیکھ سکتا..... ساری رات وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہڈیاں بولتی رہی ہے۔ کہیں یہ کوئی سائے وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے.....؟“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت تو خود سب سے بڑا آسیب ہے۔ لیکن اس معصوم لڑکی کو تو شاید ابھی تک یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اُس پر محبت نامی اس عفریت کا سایہ اپنے پنجے گاڑ رہا ہے۔ اگر اصغر صاحب مجھے پہلے یہ خبر دار نہ کر چکے ہوتے شاید مجھے خود بھی اس حقیقت کا ادراک بہت دیر میں ہوتا۔ حیرت ہے ان بڑے بڑے سائنس دانوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے صدیاں لگا کر ہر بیماری کا علاج دریافت کر لیا تھا۔ انسان ترقی کرتے کرتے اب چاند پر اپنی کالونیاں بنانے کا سوچ رہا ہے، لیکن محبت نامی اس بیماری کا کوئی علاج کیوں نہیں دریافت کر پائے تھے۔ کیوں ہمارے خون میں موجود ان زہریلے مادوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے تھے جو ہماری اس پہلی نظر کے مرکب سے مل کر اس عشق نامی ناسور کا باعث بن جاتے تھے۔

زور نصیبوں کے لکھے پر چل نہیں پاتا.....“ میں چپ رہا اور اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا لاریب کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک خادمہ پہلے ہی اُس کے سرہانے بیٹھی اُس کا سردار رہی تھی۔ باہر بارش اور بادلوں کی وجہ سے کمرے میں ملگجاسا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور مجھے چاروں طرف کتابوں کے ریک اور شیلٹ بھرے پڑے نظر آئے۔ غالب، میر، درد، اقبال، فراز..... وہ..... تو گویا اُس نے اپنی رُوح کے قتل کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ شاعری ہی تو اپنے اثر سے ہمارے اندر کے بند دروازے کھلتی جاتی ہے۔ اور پھر ہم خود ہی اپنے دل کے اندر گھس آنے والے در انداز جذبوں کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔

لاریب آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔ ایک گرم لحاف نے اُسے ڈھک رکھا تھا اور اُس کے چہرے پر برسوں کی پیلاہٹ اور زردی نمایاں تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے چہرے کے نور سے جو ایک ہالہ سا بنتا تھا وہ غیر مرئی ہالہ آج بھی اپنا سفید نور بکھیر رہا تھا۔ بڑی مالکن نے لاریب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خادمہ اُٹھ کر باہر نکل چکی تھی۔ ”لاریب..... دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے.....“

آہٹ سن کر لاریب نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا اور اُس نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بڑی مالکن نے جلدی سے اُسے سہارا دے کر اُس کے لیے نیچے کا ٹیک بنا دیا۔ وہ اب بھی ہڑبوائی ہوئی سی تھی۔ اُس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بال باندھنے کی کوشش کی۔

”ارے آپ.....؟ یہاں؟..... کتنی خوشگوار حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ میں بتا نہیں سکتی.....“ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ کے سرخی میں بدلنے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ مجھے پھر ان جذبوں کی طاقت پر رشک آیا۔ سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے طبیب تو خود ہمارے اندر ان جذبوں کی صورت میں پل رہے ہوتے ہیں، پھر نہ جانے کیوں ہم ان بیرونی ویدوں کے پیچھے دوڑے پھرتے ہیں؟

میں نے پاس پڑی کرسی کھینچ لی اور بیٹھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے..... اگر غالب کو پڑھتی ہیں تو پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُس نے بیمار ہونے کے لیے کسی تیماردار کے نہ ہونے کی شرط بھی لگا رکھی ہے۔

بڑی مالکن بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ شاید وہ اپنے الفاظ کھو بیٹھی تھیں۔ لیکن اُن کی اس خاموشی نے بھی سب کچھ کہہ ڈالا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا گویا انہیں بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس فسانے کی خبر ہو چکی تھی، یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود لاریب کے منہ سے ہذیبانی کیفیت میں کچھ نکل گیا ہو۔ میں کچھ دیر متذبذب میں رہا۔ خود میرے لفظ بھی کہاں میرے اختیار میں تھے۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میرا اُس سے ملنا ٹھیک ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں..... آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“

”ہاں..... میں سمجھ رہی ہوں..... لیکن تمہارے علاوہ کوئی اور مسیحا بھی تو نہیں..... ابھی اُس کا گھاؤ بہت تازہ ہے اور اُسے شاید خود بھی اس جان لیوا جذبے کا پوری طرح ادراک نہیں ہے جو اُس کے اندر پل رہا ہے۔ خدا کے لیے اُسے روک دو۔ اُس کے معصوم اور چھوٹے جذبے کو بکھرنے سے پہلے ہی کسی طرح پلٹ دو..... یہ ہم سب پر تمہارا کتنا بڑا احسان ہوگا یہ تم نہیں جانتے.....“ بولتے بولتے اُن کی آواز بھرا سی گئی اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ میں سر جھکائے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتبار کے بھرم پر پورا اتر سکوں۔ آپ کہیں تو میں آج ہی ہمیشہ کے لیے بنا کسی کو کچھ بتائے یہاں سے اتنی دُور چلا جاؤں گا جہاں کسی کو کبھی میری کوئی خبر نہیں مل پائے گی..... کاش میں کبھی جبل پور نہ آتا..... میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں.....“

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو..... میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنے شفاف ہو..... اور پھر تمہارے دُور جانے سے لاریب کے اندر جنم لیتا جذبہ بھی تو دُور نہیں چلا جائے گا۔ آج مجھے یہ کہنے میں بھی ذرا سی عار محسوس نہیں ہوتی کہ اگر تمہارا من پہلے ہی سے زہرا سے نہ بندھا ہوتا تو میں کسی بھی طرح تمہیں تم سے لاریب کے لیے مانگ لیتی۔ کیوں کہ وہ صرف میری بیٹی ہی نہیں میری سب سے عزیز از جان سہیلی بھی ہے۔ اور میں اپنی سہیلی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہوں۔ پل پل مرنی رہتی ہوں۔ اور مجھے اپنی دوست کی ہر پسند پر ہمیشہ فخر رہا ہے..... اور آج بھی مجھے اُس کے انتخاب پر رشک آرہا ہے..... کاش یہ انتخاب ہی اُس کا مقدر بھی ہوتا..... لیکن کیا کریں کہ ہمارا

اور میں خود اپنے آپ کو بھی ایسے ہی کسی جذبے کے تحت بہتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں اور یہ عزت ہر پل مجھے اپنے اندر پلتی اور بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنے اندر ہوتی ان تبدیلیوں کا سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی رُوح کے آخری ریشے تک کسی اور کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ، یا باقی دنیا میرے اندر پلتے اس الوہی جذبے کو کچھ غلط نہ سمجھ لیں۔ کسی عام رشتے کا نام نہ دے دیں۔“

وہ سر جھکائے بولتی رہی۔ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ آج پہلی بار اُس نے اتنا کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی اور باہر کھڑکی سے تیز بارش کی گرتی بوندوں کا شور میری اور اُس کی رُوح کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔

جب کہ آپ تو یہاں پورا ایک میلہ سجائے بیٹھی ہیں اپنے بیمار داروں کا..... حتیٰ کہ مجھے بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر ہی ڈالا۔“

میری بات سن کر وہ اختیار کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ وہ جھرتا پھر سے پُر شور آواز کے ساتھ بہہ کر نکلا اور پوری حویلی کے در و دیوار پر چھا گیا۔ بڑی مالکن غور سے اپنی سہیلی کو دیکھتی رہیں اور اُن کی آنکھیں غیر محسوس طور پر بھیگتی رہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی بہانے سے اب تک پونچھتی ہی آتیں تھیں۔ وہ ہنس کر بولی۔

”بس یہیں میں غالب سے اتفاق نہیں کرتی۔ بھلا ایسے بیمار پڑنے کا فائدہ ہی کیا کہ کوئی آس پاس بیمار داری اور خُرخے اٹھانے کے لیے موجود ہی نہ ہو۔ جناب ہم تو اپنے ساتھ ہی سبھی کو بیمار کرنے کے قائل ہیں یعنی پڑیے گر بیمار..... تو سب ہوں آس پاس بیمار..... کیوں ٹھیک ہے نا.....“

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی بیماری بھول کر ہمارے ساتھ بحث کر رہی تھی۔ بڑی مالکن نے درمیان میں چائے کا انتظام کروانے کے لیے کچھ دیر کی مہلت مانگی اور میں اور لاریب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ میں نے غور سے اُس پری کی جانب دیکھا۔

”آپ کے ماں باپ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ آپ سے زیادہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کے ارد گرد گدگد کے لوگ رہتے ہیں..... جن کی خاطر آپ کو خود اپنے اندر کا شیشہ بہت سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ ورنہ یقین جالیے آپ سے پہلے ان افسوسناک رشتوں کو کچھ ہو جائے گا..... آپ کو اس خزانے کی حفاظت بھی کرنی ہوگی.....“

وہ میری بات سن کر چونک سی گئی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں..... میں اپنی سی پوری کوشش بھی کرتی ہوں لیکن نہ جانے کچھ دن سے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے..... میرا خود اپنے اوپر سے اختیار گھٹتا جا رہا ہے..... میں آپ سے چھپاؤں گی نہیں..... شاید آپ کو سن کر بُرا بھی لگے لیکن پتا نہیں کیوں جس دن سے آپ کی امی سے مجھے آپ کی کہانی کے بارے میں پتا چلا ہے میں تب سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر لمحہ آپ ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ مجھے آپ کے جذبے کی طاقت اور سچائی پر رشک آتا ہے

”میری ہر دعائیں آپ تا عمر شامل رہیں گی۔“

اتنے میں دروازے کی جانب سے آہٹ بلند ہوئی اور خان صاحب بڑی مالکن کے ساتھ کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں خادمہ نے چائے بھی اُسی کمرے میں ٹرائی پر سجادی۔ میں نے چائے ختم کر کے خان صاحب سے اجازت چاہی۔ بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ کر دعا دی۔ میں نے لاریب کو خدا حافظ کہا اور خان صاحب کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے رخصت کرنے سے پہلے انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے زور سے بھیج کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”آج نہ جانے کیوں تم جیسے ایک بیٹے کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“ میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ ”آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟..... کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں.....؟“ انہوں نے اپنی نم پلکیں پونچھیں ”ہاں..... واقعی آج تم نے ایک بیٹے سے زیادہ بڑھ کر بیٹے کا حق ادا کیا ہے۔ ایک بیٹی کے باپ کو اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے ہوگا.....“ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا اور پھر وہ چھپا نہیں پائے کہ وہ میری اور لاریب کی ساری گفتگو سن چکے ہیں۔ دراصل باہر کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر وہ واپس آئے تب انہوں نے لاریب کے کمرے کا رخ کیا۔ ٹھیک اُسی وقت بڑی مالکن جو چائے کے لیے کمرے سے نکل چکی تھیں انہیں لاریب کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر روک لیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن پھر دروازے کے قریب ہونے کی وجہ سے خود اُن کے کان بھی ہماری باتوں کی جانب لگ گئے اور پھر ہر بات انہیں سمجھ میں آتی گئی۔ شاید بڑی مالکن اُس وقت کمرے سے جان بوجھ کر باہر نکلی تھیں تاکہ اُن کی دوست اُن کی سہیلی بنا کسی جھگ کے اپنے دل کی بات مجھ سے کر سکے۔ شاید یہ اُن کا مجھ پر حد سے گزرا ہوا مان بھی تھا اور اسی مان کا بھرم خان صاحب نے بھی بڑی مالکن کی بات مان کر رکھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے یہ سب بتاتے ہوئے اُن کے اندر کے شفیق باپ کو کس دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لہذا اب اسی مان کے آئینے کا بھرم رکھنا میرا بھی فرض ہو گیا تھا۔ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

”آپ بے فکر رہیں لاریب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی..... آپ بہت خوش قسمت ہیں خان صاحب کہ آپ کو خدا نے لاریب جیسی بیٹی دی ہے..... اور ایسے امنول تحفوں کی حفاظت

دوسری منت

پھر آخر کار میں نے ہی خاموشی توڑی۔

”آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں، یا آپ کے ارد گرد بسنے والا کوئی بھی ذی روح کبھی بھی آپ کے کسی بھی جذبے کو غلط ہونے کا الزام دینے کا سوچ بھی سکتا ہے۔ ہم سب آپ کے اندر کے شفاف اور کول جذبوں کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں جس کے وہ حق دار ہیں۔ اور آپ کی سچائی تو آپ کے اندر چلتی اُس جنگ سے اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی شدت نے آپ کو یوں بستر پر لا پھینکا ہے۔ یقین جانیئے ہم سب کے دلوں میں آپ کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ بس میری آپ سے اتنی درخواست ہے کہ ایسے ہر جذبے کو اپنی طاقت بنا لیں۔ اُسے اپنے اندر خود پر حاوی ہو کر آپ کو کمزور نہ کرنے دیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بہت مشکل کام ہے لیکن آپ جیسی سچی، شفاف اور کول من کی لڑکی سے میں ہر معجزے کی امید رکھتا ہوں.....“

وہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ ”میں نے کہا تھا نا..... آپ کو اپنے لفظوں پر خوب اختیار حاصل ہے..... خوب چن کر یہ خزانہ استعمال کرتے ہیں آپ۔“ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”چلیں..... آج آپ سے یہ وعدہ بھی رہا کہ میں اپنے اندر کی اس جنگ پر قابو پانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ لیکن آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی جنگیں جیتنے کے لیے ہم کمزور انسانوں کے پاس کوئی ہتھیار، کوئی آلہ نہیں ہوتا۔ تبھی عام طور پر ہماری شکست ہوتی ہے اور ان جذبوں کی جیت..... آپ خود بھی تو ابتدا میں ایک ایسی ہی جنگ ہار چکے ہیں..... دعا کیجیے گا کہ خدا مجھے بھی آپ جیسا ظرف عطا کرے..... میں بھی اتنی ہی ثابت قدم اور چٹان جیسی مضبوط بن سکوں کہ میرے اندر چلتے طوفان میری ظاہری ہیئت کو بگاڑ نہ سکیں اور آس پاس کے لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو سکے..... بولیں..... دعا کریں گے نا میرے لیے.....؟“

بھی کرنا پڑے۔ چاہے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن انہیں اس آخری جرم سے روکنا میری آخری خواہش بنتی جا رہی تھی۔

کاش اس وقت سلطان بابا وہاں ہوتے تو میں خود کو اس قدر تنہا محسوس نہ کرتا۔ اس رات میں نے دو خط لکھے..... پہلا زہرا اور دوسرا عبداللہ کے نام اور صبح ہوتے ہی دونوں خط نیچے گاؤں کے پوسٹ ماسٹر کو مزید پیسوں اور اس درخواست اور تاکید کے ساتھ پکڑا آیا کہ اسے کسی بھی طرح شام سے پہلے کسی بڑے اسٹیشن سے فوری ڈاک، یا کوریئر کے حوالے کروادیں کیوں کہ اگلی شام تک ان خطوط کا اپنی منزل تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اسی وقت صبح نوبت والی گاڑی سے یہ دونوں خط شہر بھیج دیں گے جہاں سے انہیں اُن کا کوئی ماتحت، یا دوست کو سیر کر دے گا۔ میں نے پوسٹ آفس سے ہی زہرا کے گھر فون کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دو دن سے برستی بارش نے ٹیلی فون کی سبھی لائنیں تھس نہس کر رکھی تھیں۔ میں اب صرف یہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ میرے دونوں خطوط وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ اُس دن بھی بارش نے رُکنے کا نام نہیں لیا اور شام تک بادل اپنا رونا روتے رہے۔ عصر کے بعد کرم دین اور بشیرا آئے۔ بڑی مالکن نے اُن کے ہاتھ خاص اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کی مٹھائی اور چنے کی دال کا حلہ ناریل کی قاشوں میں بھر کر بھیجا تھا۔ اصغر صاحب اپنی مسکراتی اور معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ میں نے نظر بچا کر کرم دین کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ذرا دُور لے جا کر اُس سے اُس کی چھوٹی مالکن کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ کرم دین فوراً ہی اُداس ہو گیا۔ ”اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے جی..... شام تک طبیعت کچھ سنبھلی تھی پھر رات کو دوبارہ بخار چڑھ گیا۔ آپ دعا کریں جی کہ وہ جلد بھلی چنگی ہو جائیں..... ہم سب تو اُن کی ہنسی اور اُن کی ڈانٹ پر ہی زندہ ہیں.....“ میں نے کرم دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی ”فکرت کرو..... جوڑی اتنے بہت سے لوگوں کی زندگی کا باعث ہو اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ بشیرا اور کرم دین زیادہ دیر بٹھہرے نہیں اور چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد اصغر صاحب نے شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”کیا بات ہے میاں.....؟ بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے..... خوش نصیب ہو.....“ میں بھی اُن کی اس شرارت پر مسکرا پڑا۔ ویسے بھی انہیں جب سے اپنی آزادی کی خبر ملی تھی تب سے وہ

دینے والا خود کرتا ہے..... اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ رشتے صرف خون ہی نہیں بناتا..... بلکہ کبھی کبھی تو خون سے بنے رشتے صرف ایک مجبوری بن کر ہمارے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اصل رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہم خود اپنی مرضی سے بناتے اور چنتے ہیں..... جیسا کہ میرا آپ سے، بڑی مالکن سے اور لاریب سے رشتہ ہے..... جو ہم سب نے خود چننا ہے اور ہم سب ہی اس رشتے کی بے حد عزت کرتے ہیں..... اسے جان سے عزیز جانتے ہیں۔“ میں انہیں گلے لگا کر درگاہ کے لیے پلٹ گیا۔ وہ دیر تک وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے گاڑی کو دُور جاتا دیکھتے رہے۔ میرا دل اُس وقت شدت سے بس یہی ایک دعا کر رہا تھا کہ ”اے میرے خدا اس مجبور باپ کے سامنے میری لاج رہ جائے اور وہ خود اپنی ذات کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ اُن کے اندر کا باپ کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہو.....“

قدرت نے دنیا میں جتنے بھی رشتے بنائے ہیں اُن میں سب سے مجبور رشتہ شاید باپ کا ہی بنایا گیا ہے، خاص طور پر اگر یہ رشتہ ایک بیٹی سے شدید محبت کرنے والے ایک وضع دار باپ کا ہو، تب اس مجبوری اور بے کسی کی حدیں لامحدود ہوتی ہیں۔ میں جب درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری جانب بڑھے۔

”کہاں رہ گئے تھے۔ بڑی دیر لگا دی۔“

میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا ”خیریت.....؟“

”ہاں..... مجھے میرے مقتول کی اطلاع مل گئی ہے۔ اگلی جمعرات کو بچھلی پہاڑی کی طرف سے آتی ہوئی گاؤں کی کچی سڑک پر مجھے اُس کا ایک خاص مقام پر انتظار کرنا ہوگا اور اُسے وہیں ختم کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کرنا ہوگا۔“

اصغر صاحب کی بات سن کر میرا دل جیسے ایک لمحے میں ہی ڈوب سا گیا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں ہی پُر جوش سے ساری تفصیلات بتاتے رہے کہ کیسے آج چھلاوے نے انہیں درگاہ کے باہر بلوا کر وہ ساری تفصیلات اُن کے حوالے کی تھیں۔ وہ بہت خوش تھے کہ آخر کار اُن کی آزادی کا دن بھی آ ہی گیا تھا۔ بس چند دن ہی تو رہ گئے تھے۔ لیکن تبھی میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں اُن کے ہاتھوں سے یہ گناہ کبیرہ سرزد ہونے نہیں دوں گا، چاہے مجھے اس کے لیے کچھ

پھر اچانک ہی جیسے مجھے ہوش سا آ گیا۔ ”لیکن آپ یہاں تک اکیلے..... میرا مطلب ہے.....“ ”نہیں میں اکیلی بھلا یہاں تک کیسے پہنچی، امی اور ڈرائیور نیچے گاڑی میں ہیں۔ امی کے گھٹنے اتنی چڑھائی کے متحمل نہیں ہو سکتے.....“ میں جلدی سے اصغر صاحب سے اجازت لینے کے لیے اُن کی جانب بڑھا۔ وہ پہلے ہی سے حیران کھڑے تھے۔

”یہ پری کون ہے عبداللہ میاں۔“

”یہی ہے میری منت..... میری دعا..... اس کو مانگا تھا میں نے خدا سے لاریب کا درد کم کرنے کے لیے۔ زہرا کی اماں نیچے میرا انتظار کر رہی ہیں..... میں انہیں حویلی چھوڑ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔“ وہ یوں ہی حیرت زدہ کھڑے رہ گئے۔ میں زہرا کو لیے نیچا پہنچا تو اُس کی امی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جانے اس لمحے مجھے اُن پر اتنا پیار کیوں آ گیا کہ میں سلام کرتے ہی اُن کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی بالکل میری امی جیسی ہی تو تھیں۔ اپنی اولاد کے لیے ہر وقت ہر مشکل میں ساتھ دینے کے لیے تیار، ہر خوشی ہر غم میں اُس کے ساتھ اور شریک سفر..... آج بھی وہ میری ایک پکار پر زہرا کے ساتھ یہاں اتنی دُور آ پہنچیں تھیں۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہلکے سے میرا سر تھپتھا کر مجھے خاموش کروا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس بار باقاعدہ زہرا کے ابا سے اجازت لے کر اُسے یہاں تک لائی ہیں۔ وہ خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر نے اُن کی بیماری کی وجہ سے انہیں کار کے اتنے لمبے سفر سے منع کر رکھا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی دعاؤں کے ساتھ اپنے خصوصی محافظ اور ڈرائیور کے ساتھ زہرا اور امی کو بھجوایا تھا۔

میں جب زہرا کی گاڑی میں حویلی پہنچا تو خان صاحب اور بوی مالکن اتنی دُور سے آئے خاص مہمانوں کو اپنے درمیان پا کر نہال ہی تو ہو گئے۔ وہ سب غائبانہ طور پر زہرا کو پہلے ہی سے جانتے تھے اور اُسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے خط لکھ کر زہرا کو لاریب کے بارے میں سبھی کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس معصوم لڑکی کی مسیبتی کے لیے مجھے اُس کی شدید ضرورت ہے۔ میری اپنی ایک غرض بھی اس درخواست میں پنہاں تھی۔ میں جمعرات سے پہلے ایک بار زہرا سے ملنا چاہتا تھا کیوں کہ جمعرات کے دن میں نے اصغر صاحب کو اس بھیا تک جرم سے روکنے کے لیے خود اس شکار گاہ میں پہنچنے کا فیصلہ کر

بہت خوش رہنے لگے تھے۔ سارا دن کچھ نہ کچھ گنگنا تے رہتے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”کیسی ہے وہ.....؟“

گویا انہیں خبر ہو گئی تھی کہ میں کرم دین سے کیا بات کر رہا تھا۔ ”وہ ٹھیک نہیں ہے..... ایک منت مانگی ہے میں نے بھی آپ کی طرح..... دعا کریں کہ اُس کے لیے مانگی گئی میری وہ منت بھی قبول ہو جائے.....“

اور پھر خط بھیجنے کے تیسرے دن یعنی بدھ کی سہ پہر میری منت قبول ہو ہی گئی۔ اُس روز آسمان صبح سے صاف ہو چکا تھا اور چمکتی دھوپ میں ہر دھلا منظر جگمگا رہا تھا۔ اسی خیرہ کرتی دھوپ کی نرم کرنوں کے درمیان درگاہ کے احاطے میں میری قسمت کا سورج تب جگمگایا جب میں تھک کر مایوس ہونے کو تھا۔ اصغر صاحب بھی درگاہ کے صحن میں انگوروں کی بیل کی جانب چلتے پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ پہلے اُنہی کی نظر درگاہ کے دوازے کی جانب اُٹھی اور پھر میں نے اُن کی حیران نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خود بھی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ہاں..... وہ وہی تھی..... اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ، اُسی شاہانہ جلال کے ساتھ، اُسی کالے نقاب میں، اُسی طرح پاپنوں پر تیرتی راج ہنسی کی طرح چل کر آتے ہوئے..... ہاں وہ زہرا ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی..... میں نے خط لکھ کر اُسے بلا تو لیا تھا اور مجھے یقین بھی تھا کہ وہ میری پکار پر وہاں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچے گی بھی ضرور..... لیکن اس کے باوجود بھی میں اُسے یوں اپنے سامنے پا کر اس طرح گم سم کھڑا تھا جیسے اب بھی وہ کوئی خواب ہی ہو..... میرا سب سے حسین خواب..... وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں.....“

آپ نے ہی تو بلایا تھا.....“

”ہاں..... لیکن آپ یہاں تک پہنچ بھی گئی ہیں..... مجھے اس کا یقین تو ہو جانے دیں.....“

میری بات سن کر اُس کی آنکھوں میں شرارت کی لہر تیر گئی۔

”آپ کہیں اور ہم نہ آئیں..... ایسے تو حالات نہیں.....“

”آپ بے فکر رہیں..... میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے مجھ پر کئے ہوئے اعتماد کا بھرم رکھ سکوں.....“

میں مسکرا کر جانے کے لیے پلٹا تو اُس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔
”ساحر.....“

میں نے رُک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ بھیگی پلکیں لیے کھڑی تھی۔
”مجھے آپ پر فخر ہے..... آپ میرا مان ہیں.....“

میں کچھ بھی تو نہیں بول پایا۔ بس اگلے ہی لمحے خود میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب دو آنسو میری آنکھوں سے نکلے اور پھسل کر میرے گالوں تک آ پہنچے۔ پل بھر میں ہی اس دل بر نے میرے سات جنوں کی ریاضت، میری ساری مشقت، ساری محنت کا معاوضہ اپنے پگھڑی لبوں سے دو لفظ بول کر ادا کر دیا تھا۔ کیا اس حقیر زندگی کو کسی دیوی کے چرنوں کی بھیئت چڑھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بل ہو سکتا تھا۔ کیا اس لمحے کے بعد بھی جینے کی کوئی اور وجہ باقی رہ جاتی تھی؟..... ہم دونوں بھی کتنے عجیب تھے، زمانے میں چھڑنے والے ایک دوسرے کو رو کر وداع کرتے ہیں..... جب کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں اس لیے آنسو تھے کہ ہم ایک دوسرے کو رفتہ رفتہ پار ہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ مزید ایک پل بھی وہاں رُک نہیں پائی اور جلدی سے اپنی پلکوں کی شبنم اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹتی ہوئی وہاں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کو وہاں موجود نہ پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں اُن کا منصوبہ بدل تو نہیں گیا۔ انہوں نے تو جمعرات کا بتایا تھا مجھے۔ پر کہیں انہوں نے ایک دن پہلے ہی اپنا جرم سرانجام دینے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا۔ خدا نے زہرا کو یہاں تک پہنچا کر میری ایک دعا تو پوری کر دی تھی لیکن میری دوسری دعا۔ میرا دوسرا خط میں نے عبداللہ کے نام لکھا تھا کہ کسی بھی طرح سلطان بابا کو جمعرات سے پہلے جبل پور والی درگاہ پہنچنے کا پیغام دے، پتا نہیں اس خط کا کیا بنا؟

میں کچھ دیر وہیں درگاہ میں اصغر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر بے چین ہو کر درگاہ سے باہر نکل آیا۔ مجھے اصغر صاحب نے پچھلے پہاڑ کی اس پگ ڈنڈی کا بتایا تھا جہاں بنی ہوئی

لیا تھا جہاں انہیں اپنا آخری جرم سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس متوقع مقتول کی جگہ خود لینے کا ارادہ کیا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں کسی بھی طرح اُن کو اس آخری گناہ سے روک سکوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بات صرف اصغر صاحب کی نہیں ہے۔ میرا واسطہ وہاں اس انجانی مخلوق سے بھی پڑ سکتا تھا اور ضروری نہیں تھا کہ میں زندہ وہاں سے واپس آ پاتا۔ لیکن یہ جو تو مجھے کھیلنا ہی تھا اور اس آخری بازی سے پہلے میں اپنی زندگی کے سرمائے سے آخری بار مل لینا چاہتا تھا۔ ماما اور پاپا کو میں نے اس لیے خیر نہیں کی تھی کہ میں آخری لمحوں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ البتہ زہرا کو میں نے اصغر صاحب، یا چھلاوے کی اس داستان کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُسے بس لاریب کی بیماری کا ہی پتا تھا اور یہ کہ میں نے اُسے محبت کے گھاؤ کے آخری مرہم کے طور پر جبل پور بلوایا ہے۔ ساری عورتیں ذرا سی دیر میں ہی آپس میں یوں گھل مل چکی تھیں جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ اندر زنانے کی جانب سے اُن سب کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں یہاں مردانے میں مجھ اور خان صاحب تک بھی آرہی تھی۔ خان صاحب کو بھی شاید کچھ سمجھ آ رہا تھا کہ میں نے زہرا کو وہاں کیوں بلوایا ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”عبداللہ میاں..... اور کتنے احسان کرو گے مجھ پر.....؟..... اُس دن تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ لاریب جیسا ہیرا میرے پاس ہے۔ تو آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس روئے زمین پر تم سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہیں، جس کے پاس بیک وقت اتنے انمول رشتے موجود ہیں اور اُن میں زہرا جیسا گمینہ بھی شامل ہے۔

میں نے درگاہ واپسی سے پہلے زہرا کو کچھ دیر کے لیے اندرونی ڈیوڑھی میں بلوایا تھا تاکہ اُسے یہ بتا سکوں کہ شاید میں شام کو حویلی نہ آ سکوں کیوں کہ مجھے درگاہ کے چند ضروری کام پنہانے ہیں۔ وہ کچھ ہی دیر میں وہاں آ گئی..... وہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔

”کیوں بھی ساحر صاحب..... اور کہاں کہاں اپنا سحر بکھیرا ہے آپ نے۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ سلطان بابا کا ہاتھ بٹاتے ہوں گے لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور ہے۔“

میں مسکرا دیا۔ ”یہ میرا سحر نہیں..... بس آپ سے ہوئی ایک ملاقات کا اثر ہے۔“ میں نے جلدی جلدی اُسے ساری بات سمجھا دی۔ زہرا غور سے میری بات سنتی رہی۔

ایک ٹوٹی پھوٹی متروکہ سی ایک عمارت کے کھنڈر اب بھی موجود تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں کوئی مسافر خانہ، یا ستانے کے لیے کوئی قیام گاہ رہی ہوگی۔ اصغر صاحب نے اسی کھنڈر میں وہ خون کرنا تھا۔ میں بے قراری میں اُس مسافر خانے کے کھنڈر کی جانب ہی چل پڑا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کھنڈر یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور شام کا اندھیرا اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے میرا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ لیکن میرے اندر کی بے قراری میرے قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ پھر اچانک دو کوس کے فاصلے پر پہنچتے ہی ایک موڑ پر مجھے اصغر صاحب کا دور گھاٹی میں ہیولہ ساد کھائی دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے درگاہ کی جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کر کے سکون کی ایک لمبی سی سانس لی۔ لیکن پل بھر میں ہی میری وہی سانس میرے حلق میں انگ گئی۔ اصغر صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا جسے وہ آس پاس کی چٹانوں پر تیز کرنے کے سے انداز میں رگڑتے چلے آ رہے تھے۔ تو کیا انہوں نے خون کر دیا تھا.....

خوابوں کا بیویاری

اتنے میں اصغر صاحب کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی، وہ کچھ ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں بھاگتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔“ وہ حیران سے تھے۔ ”بتایا تو تھا تمہیں کل جمعرات ہے نا۔ میں ذرا کھنڈر تک گیا تھا۔ کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے..... لیکن تم اس ڈھلتی شام میں کہاں چل دیئے۔“

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گویا میرا شک غلط تھا۔ میں نے انہیں ٹال دیا۔ ”کہیں نہیں..... بس آپ درگاہ میں نہیں تھے تو پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ چلیں واپس چلتے ہیں.....“ میں انہیں ساتھ لیے واپس درگاہ آ گیا۔ انہیں اگلی شام سے پہلے کھنڈر پہنچنا تھا اور کھنڈر میں اُس شخص کا انتظار کرنا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے اُن سے بھی پہلے درگاہ سے نکل کر اس کھنڈر والے راستے پر کسی ایسی جگہ مورچہ لگانا تھا جہاں سے اُس آنے والے شخص پر بھی نگاہ رکھ سکتا اور اُسے وہاں سے پلٹا کر مجھے خود کھنڈر بھی پہنچنا تھا۔ ساری رات اسی اُدھڑ بن میں گزر گئی۔ صبح کرم دین خان صاحب کا پیغام لے کر آیا کہ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر مجھے حویلی بلوایا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہرا کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا، جس پر اُس کی جاں فزا تحریر میں صرف دو سطریں تحریر تھیں کہ

”دل پر نگے دار کافی گہرے اور کاری ہوتے ہیں..... لیکن مطمئن رہیے آپ کا بھیجا ہوا مسیحا بھی کچھ کم مشاق نہیں..... وہ اپنا زخم آزمائیں ہم اپنا مرہم آزمائیں گے.....“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں نے اُسی رقعے پر یہ شعر لکھ دیا۔

اُٹھتی رہتی ہے ایک گرد مجھ میں

کون پھرتا ہے در بدر مجھ میں

مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی

وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

میں نے رُقعہ کرم دین کے حوالے کیا اور اُس سے کہا کہ آج میری جانب سے خان صاحب اور مہمانوں سے معذرت کر لے کیونکہ مجھے ایک بہت ضروری کام سے درگاہ سے باہر جانا ہے لہذا آج دیر ہو جائے گی۔ زندگی رہی تو فارغ ہوتے ہی خود حویلی حاضر ہو جاؤں گا۔ پتا نہیں سب کو فردا فردا سلام دیتے ہوئے میری آواز کیوں بھرا سی گئی۔ کرم دین پلٹ کر چل دیا۔ اصغر صاحب اپنے کمرے میں جانے کن تیار یوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس روز قدرت نے بھی میرے ساتھ کھیلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ شاید دوپہر سے پہلے ہی گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپنا شروع کر دیا اور ظہر سے پہلے وہی موسلا دھار جھری شروع ہو گئی جو پچھلے ایک ہفتے سے جبل پور کے پہاڑوں کو نہلا رہی تھی۔ میں نے اصغر صاحب سے بہانہ کیا کہ حویلی سے میرے لیے بلا دیا ہے لہذا میرا جانا ضروری ہے۔ البتہ میں شام ہونے سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے ”جاؤ میاں جاؤ..... حویلی میں ایک نہیں دو دو پریاں جس شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں اُس کا دل بھلا ہم بوڑھوں کے ساتھ کہاں لگے گا۔ جاؤ مل آؤ..... آج جب تم لوگوں کے تب تک میں بھی آزاد ہو چکا ہوں گا.....“ بس دعا کرنا کہ آخری لمحے میرے قدم لڑکھڑانہ جائیں..... بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں کتنا بڑا گناہ گار رہی کیوں نہ سہی..... لیکن قتل پھر بھی مجھ سے آج تک سرزد نہیں ہوا.....“

میں نے انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے دل میں سوچا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آج بھی میں انہیں قاتل نہیں بننے دوں گا۔ میں جب درگاہ سے باہر نکلا تو اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر نہ نکل آئیں میں نے پہلے پہاڑی سے نیچے سیدھے سڑک کا ہی رُخ کیا۔ جب کہ کھنڈر تک پہنچنے کے لیے مجھے اوپر کی جانب جانا چاہیے تھا کیونکہ کھنڈر سڑک سے بالکل مخالف سمت میں درگاہ کی پچھلی چوٹی کے پیچھے والی پگ ڈنڈی کی راہ اختیار کرنے سے آتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں کچھ دُور سڑک پر جا کر پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ اصغر صاحب کی نظر میں آئے بنا کھنڈر کی ڈگری تک پہنچ جاؤں لیکن بُرا ہو اس طوفانی بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا جس نے دن کے وقت بھی گہری شام سی کر رکھی تھی۔ مجھ سے اندازے میں کچھ چوک ہو گئی اور جس وقت میں گرتے پڑتے دوبارہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا اُس وقت عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ سرد ہوا

نے میرا وجود برف کر دیا تھا اور بارش کی بوندیں میرے جسم میں ہزاروں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ دُور سے کھنڈر کے آثار نظر آئے تو میرے قدم مزید تیز ہو گئے۔ جانے وہ مسافر کہیں بارش سے چھپتے ہوئے مجھ سے پہلے ہی کھنڈر میں پناہ نہ لے چکا ہو.....؟..... ایسے میں اسے میں کس طرح سمجھا پاؤں گا کہ اُس کا وہاں کھنڈر میں بیٹھ کر بارش رُکنے کا انتظار اُس کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے..... یا خدا..... مجھے اُس سے پہلے کھنڈر پہنچا دے۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تب بھی یہی دعا میرے لبوں پر جاری تھی۔ لیکن شاید وہ دن میری دعائیں رد ہونے کا دن تھا۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تبھی مجھے گیلی لکڑیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دُھوئیں نے کسی ذی رُوح کی موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ دُھوئیں کی چادر کے پار کوئی شخص گیلی لکڑیاں جمع کیے انہیں جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لکڑیاں سلگ کر آگ پکڑ چکی تھیں لیکن گیلی اور نم ہونے کی وجہ سے بے حد دُھواں پھینک رہی تھیں۔ اس دُھوئیں کے نیلے مرغولوں کے جھنڈ میں سے اُس شخص نے سر اٹھایا۔ میرے قدم وہیں جے کے جے رہ گئے۔ آسمان پر بجلی زور سے گڑکی اور مجھے یوں لگا کہ یہ بجلی قدرت نے براہ راست مجھ پر ہی گرائی ہے۔ میرے سامنے سلطان بابا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ”واللہ ساحر میاں..... یہ تم ہی ہونا..... میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا..... جیسے ہی تمہارا پیغام ملا میں چل پڑا تھا۔ لیکن راستے میں بس خراب ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ رات بھر سے پہلے تو اب یہ بس ٹھیک ہوگی نہیں تو کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ لیکن بھلا قدرت اپنا زور دکھانے سے کب چوکتی ہے..... سو دیکھو..... راستے میں اس بوچھاڑ نے آگھیرا اور یہاں اس کھنڈر میں پناہ لینی پڑی.....“ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا ”لیکن تم یہاں کیسے ساحر میاں..... بھئی مان گئے تمہارے الہام کو.....“

سلطان بابا مسکرائے۔ مجھے پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے سلطان بابا سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔ یہ قدرت میرے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اصغر صاحب کو اس کھنڈر میں کسی ایک شخص کا قتل کرنا تھا اور ستم ظریفی دیکھئے کہ اس ممکنہ قاتل کو اپنا پیغام بھیج کر اس کھنڈر تک بلوانے والا کوئی اور نہیں، میں خود تھا..... اور میں نے بلایا بھی کس کو

بابا ہیں۔ انہیں میں نے ہی درگاہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ نہیں جس کا آپ کو انتظار ہے۔۔۔۔۔“ اصغر صاحب کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔ اندھیرے میں بجلی زور سے چمکی اور کھنڈر کی منڈیر پر میں نے تلکے اندھیرے میں وہی دو آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں۔ وہی شخص منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جسے میں اس سے پہلے ٹرین اور پھر درگاہ کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ وہی ہے جس کا آج خاتمہ ہونا اٹل ہے۔ دیر مت کرو اصغر۔۔۔۔۔ تمہارا شکار تمہارے سامنے ہے۔ اس لڑکے کی پرواہ نہ کرو۔۔۔۔۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔۔۔ آگے بڑھ کر وار کرو۔۔۔۔۔ تمہاری آزادی تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔“ میں جلدی سے آگے بڑھ کر سلطان بابا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”خبردار۔۔۔۔۔ ان کی جانب بڑھتی ہر چیز کو پہلے مجھے پار کرنا ہوگا۔“

وہ زور سے چلایا ”دیر مت کرو اصغر۔۔۔۔۔ اس لڑکے کو بھی رات سے صاف کر دو۔۔۔۔۔ خس کم جہاں پاک۔۔۔۔۔“

سلطان بابا سکون سے اپنی جگہ پر کھڑے اپنی مخصوص تسبیح گھمار رہے تھے، وہ مجھے ہٹا کر میرے سامنے آگئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

”جس کی جان کا سودا طے کیا جا رہا ہے کوئی اُسے بھی تو بتائے کہ مول کیا لگا ہے؟ مجھے کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

چھلا وہ جو اب کو دوسری منڈیر پر بیٹھا غصے سے ہمیں گھور رہا تھا، چلا کر نفرت سے بولا۔ ”زیادہ بھولے نہ بنو۔۔۔۔۔ تم خوب جانتے ہو کہ تمہاری اور میری دشمنی تو ازل سے ہے۔۔۔۔۔ صدیوں سے تم میرا راستہ کاٹتے آئے ہو۔ کبھی مذہب کی صورت میں، کبھی نیکی کی صورت میں، کبھی اچھائی کی صورت میں۔ آغاز سے ہی تم نے میرا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔ لیکن آج میں تمہاری سانسیں بند کر کے یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔ آج میری وہ پہلی جیت ہوگی جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔“

سلطان بابا کے لہجے میں اب بھی ٹھہراؤ تھا۔ ”تم صدیوں کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔ جب کہ میں تو ایک عام انسان ہوں جس کی عمر فقط چند سال ہے، پھر تم کس سے اب تک لڑتے آ

تھا۔۔۔۔۔؟ اپنے محسن، اپنے رہبر۔۔۔۔۔ اپنے پیر کامل کو۔۔۔۔۔ یہ مقدر کا میرے ساتھ ایک بھیاں مذاق نہیں تو اور کیا تھا۔۔۔۔۔؟ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں سلطان بابا سے کیا کہوں۔ میرے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ”آپ یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔ یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے۔۔۔۔۔ کوئی شخص آپ کی جان کے درپے ہے۔۔۔۔۔“

”کیا کہہ رہے ہو میاں۔۔۔۔۔ بھلا ہم درویشوں کی جان لے کر کسی کو کیا ملے گا۔۔۔۔۔“

میں زچ سا ہو گیا۔ ”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں یہاں آپ کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میرا پیغام آپ تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔ میں تو یہاں اس اجنبی شخص کو بچانے کے لیے آیا تھا جسے یہاں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔“ میں نے جلدی جلدی انہیں اپنے جبل پور آنے سے لے کر آج تک کی ہر بات بتادی کہ کس طرح چھلا وہ اصغر صاحب کی آزادی کے بدلے اُن سے یہاں کسی کے قتل کا وعدہ لے بیٹھا ہے اور اصغر صاحب اب یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ سلطان بابا نے اطمینان سے میری ساری بات سنی اور سکون سے بولے۔ ”ٹھیک ہے ساحر میاں۔۔۔۔۔ اگر میری آخری سانس یہیں لکھی ہے تو پھر اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آنے دو تم اپنے اس چھلاوے کو۔۔۔۔۔ میں بھی تو دیکھوں کہ۔۔۔۔۔“

ابھی سلطان بابا کی بات اُن کے منہ میں ہی تھی کہ اچانک پیچھے سے کوئی زور سے چلایا ”عبداللہ۔۔۔۔۔“

میں گھبرا کر پلٹا تو دھلتی شام کے سائے میں میں نے اصغر صاحب کو وحشت بھرے انداز میں ہاتھ میں وہی چاقو لیے کھڑے دیکھا۔ یہ اصغر صاحب اُس درگاہ والے نرم خواصغر صاحب سے قطعی مختلف تھے اور اُن کی آنکھوں سے میں نے غصے کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ وہ پھر سے گرے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ جگہ آج کسی کا قتل بننے والی ہے۔ پھر بھی تم یہاں چلے آئے۔۔۔۔۔ بڑی حماقت کی تم نے۔۔۔۔۔ اب بھی وقت ہے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“

میں اُن کی جانب سے پلٹا۔ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ میرے سلطان

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔
 ”پاگل مت بنو اصغر..... اس شخص کی چکنی چیزیں باتوں میں مت آنا..... یہ جادوگر ہے.....
 تمہاری تباہی کے درپے ہے..... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں ہی تمہارا واحد دوست
 ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟..... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو
 تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔
 اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ..... جاؤ اس کے سینے میں یہ
 چاقو گھونپ دو..... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو..... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا
 ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا..... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔“

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور
 انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا
 کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم
 بڑھا دیئے کہ ”میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اسی میں میری
 نجات ہے۔“ چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہری اٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا
 کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی
 آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

”ٹھیک ہے..... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو.....
 لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے..... کیا اگلے جہاں میں تمہارا بھی اس عفریت
 کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے..... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اسے تم جیسے معصوم
 انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اکساتا ہے۔“ اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تنگی سے
 ہنسنے ”معصوم.....؟ اور میں.....؟..... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی
 حرمت خراب نہ کرتے..... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ اگلے
 جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید
 زندگی ہی آرام سے کٹ جائے۔“

سلطان بابا گرجے ”کتنا جی لو گے مزید تم..... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

ہے ہو۔ ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا.....“

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے
 فرات سے ہونٹ سکڑے۔

”نہیں تم وہی ہو..... بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ
 جسم سے کیا لینا دینا..... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا..... ہمیشہ کے لیے..... اصغر تم
 ہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ
 گے۔ کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے..... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... یاد
 لکھو..... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم
 مسلط رہوں گا..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے..... ساری
 زندگی تڑپتے اور سکتے ہوئے گزر جائے گی۔ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے
 گی.....“

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے
 لگے، میں زور سے چلایا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... رُک جائیں۔“ چھلاوے نے غصے اور
 نرسرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر
 نے جکڑ لیا ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم
 بے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔
 اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے
 ؟ اور پھر اگر یہ اسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ
 د آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اسے تمہارے کمزور انسانی
 رد و دس کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے
 سامنے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے..... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر
 تھوڑا سوچ لو..... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے..... میں کہیں بھاگا نہیں
 رہا..... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔“

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔
 ’پاگل مت بنو اصغر..... اس شخص کی چکنی چیزیں باتوں میں مت آنا..... یہ جادوگر ہے.....
 نہاری تباہی کے درپے ہے..... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں میں ہی تمہارا واحد دوست
 ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟..... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو
 تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔
 اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ..... جاؤ اس کے سینے میں یہ
 چاقو گھونپ دو..... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو..... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا
 ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا..... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔“

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور
 نہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا
 کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم
 بڑھا دیئے کہ ”میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اسی میں میری
 نجات ہے۔“ چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہری اٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا
 کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی
 آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

”ٹھیک ہے..... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو.....
 لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے..... کیا اگلے جہاں میں تمہارا بھی اس عفریت
 کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے..... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اسے تم جیسے معصوم
 انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اکساتا ہے۔“ اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تنگی سے
 ہنسے ”معصوم.....؟ اور میں.....؟..... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی
 حرمت خراب نہ کرتے..... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ اگلے
 جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید
 زندگی ہی آرام سے کٹ جائے.....“

سلطان بابا گرے ”کتنا جی لوگے مزید تم..... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

رہے ہو۔ ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا.....“

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے
 نفرت سے ہونٹ سکڑے۔

”نہیں تم وہی ہو..... بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ
 جسم سے کیا لینا دینا..... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا..... ہمیشہ کے لیے..... اصغر تم
 وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ
 گے۔ کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے..... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... یاد
 رکھو..... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم
 پر مسلط رہوں گا..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے..... ساری
 زندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے گی۔ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے
 گی.....“

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے
 لگے، میں زور سے چلایا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... رک جائیں۔“ چھلاوے نے غصے اور
 نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر
 نے جکڑ لیا ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم
 جیسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔
 اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے
 گا؟ اور پھر اگر یہ اسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ
 خود آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اسے تمہارے کمزور انسانی
 بازوؤں کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے
 بہانے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے..... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر
 لو..... تھوڑا سوچ لو..... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے..... میں کہیں بھاگا نہیں
 جا رہا..... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔“

طرح کاٹا کہ خود اُن کی گردن سے بھی خون کا ایک تیز فوارہ سا نکلا جس نے سامنے کھڑے سلطان بابا کو رنگ ڈالا۔ اصغر صاحب نے سلطان بابا کے سینے میں چاقو گھونپنے کے بجائے اپنے ہی گلے میں پڑے سرخ دھاگے کو کاٹ ڈالا تھا۔ اُن کا وار چھٹلتا ہوا پڑا اور چونکہ دھاگا گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا تھا لہذا چاقو نے دھاگے کی کسی ہوئی ڈور تک پہنچنے سے پہلے اُن کے گلے کی جلد کو کاٹ ڈالا۔ دفعۃً بجلی زور سے کڑکی اور پھر فضا میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور میں نے اس گھپ اندھیرے میں برستی بوجھاڑ کے پس منظر میں اُن دوسرے جلتی آنکھوں کو رفتہ رفتہ معدوم ہوتے ہوا دیکھا۔ ایسے جیسے کوئی دو جلتے ہوئے شدید تیز انگاروں پر پانی کی ہلکی ہلکی بوندیں گرا کر انہیں دھیرے دھیرے بجھا دے۔ میں ابھی تک انہی آنکھوں کے سحر میں تھا کہ سلطان بابا کی زوردار آواز نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ”ساحرمیاں..... جلدی کرو..... ابھی جان باقی ہے..... اسے کسی ہسپتال تک پہنچانا ہوگا.....“ میں ایک دم سے جیسے ہوش میں آ گیا۔ اصغر صاحب زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے گلے سے بھل بھل خون نکل کر پانی کے قطروں کے ساتھ مل کر نیچے کچھڑ میں مل رہا تھا۔ سلطان بابا نے جلدی سے اپنے کاندھے پر پڑی چادر کو پھاڑا اور ایک پٹی سی بنا کر اصغر صاحب کے زخم پر خوب کس کر مضبوطی سے باندھ دی۔ قریب ہی کچھڑ میں لت پت پڑے اُس سرخ دھاگے کو انہوں نے اس بجھتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جو انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے کھنڈر میں روشن کر رکھی تھی۔ دھاگا جل کر یوں تڑخا جیسے کوئی جڑی بوٹی آگ میں جلی ہو۔ میں نے اصغر صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور ہم دونوں تیزی سے کھنڈر سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتی کچی سڑک کی جانب دوڑ پڑے۔ مجھے دِل لگا جیسے اصغر صاحب کے گلے سے نپکتے ہوئے خون کے قطرے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
 پر اس میں ہوا نقصان بڑا
 کچھ بخت میں ڈھیروں کا لک تھی
 کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
 راکھ لیے جھولی میں
 اور سر پہ ساہوکار کھڑا

سے ہی کئے گی؟..... اور ہاں..... ایک گناہ اب بھی ایسا ہے جو تم نے اب تک نہیں کیا..... قتل..... کیا کسی معصوم انسان کے قتل کا بوجھ اپنے سر پر لے کر تم واقعی سکون کی زندگی جی پاؤ گے؟..... کیا ضروری ہے کہ تم یہ آخری گناہ بھی اپنے کھاتے میں لکھوا کر ہی اُوپر جاؤ..... توبہ اور معافی کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔ تمہارے گناہوں کا کوئی شمار کوئی حد ہو سکتی ہے لیکن اُس کی رحمت بے شمار اور لامحدود ہے..... اب بھی وقت ہے..... تمہاری سانسیں ابھی باقی ہیں..... ان کے ختم ہونے سے پہلے اُس کے دربار میں ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگ لو..... مجھے یقین ہے وہ تمہیں معاف کر دے گا..... اور تمہارے پاس تو کفارہ ادا کرنے کا بھی موقع ہے..... سچے دل سے توبہ کر کے اس بدی کے ہر کارے کی بات ماننے سے انکار کر دو..... شاید تمہیں قدرت نے آج اِس مقام پر اسی لیے پہنچا دیا ہے کہ تم اپنی گناہوں بھری زندگی کا خود خاتمہ کر لو۔“

بارش کی بوجھاڑ تیز ہو چکی تھی اور بجلی اب یوں کڑک کڑک کر اُرد گرد گر رہی تھی جیسے آج اُسے بھی اپنے کسی شکار کی تلاش ہو۔ اصغر صاحب کا اُٹھتا ہوا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے پھر درمیان میں رُک گیا۔ چھلاوہ زچ ہو کر غصے میں پاگل ہو چکا تھا اور سلطان بابا کی گفتگو کے دوران وہ درجنوں بار اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہو گیا تھا وہ چلا کر بولا۔

”بس بہت ہو چکا یہ کھیل..... اصغر تم اس کا خاتمہ کرتے ہو، یا میں اپنے اسی سرخ دھاگے کو تمہارے گلے کا پھندا بنا ڈالوں ہمیشہ کے لیے..... میں اب پل بھر بھی انتظار نہیں کروں گا واپس پلٹنے میں..... مار ڈالو اسے..... گھونپ ڈالو اس کے سینے میں یہ چاقو..... ابھی..... میں کہتا ہوں ابھی.....“ اصغر صاحب جو شاید اس قتل کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ انہوں نے چھلاوے کی دھاڑ سے ڈر کر چاقو والا ہاتھ یوں فضا میں بلند کیا جیسے وہ اس بحث کے دوران ہزار بار ٹوٹ کر بکھر چکے ہوں۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اصغر صاحب کے ہاتھ میں پکڑے چاقو کا پھل دُور کہیں گرتی بجلی کی روشنی سے پل پھر کے لیے جگمگایا اور پھر فضا میں سلطان بابا کی آواز گونجی ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ.....“ اصغر صاحب کا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا میرے منہ سے ”نہیں“ کی چیخ نکل گئی۔ اصغر صاحب کے تیزی سے نیچے آتے چاقو کے تیز پھل نے اُن کی گردن میں پڑے دھاگے کو اس

خواب مرتے نہیں

جب بستی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سرنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ زخمی خواب تھے آنکھوں میں
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا

آخر کار تیسرے دن امصر صاحب کو ہوش آ ہی گیا۔ ہم اُس طوفانی رات میں انہیں کس طرح لے کر پہلے گاؤں کے ہسپتال اور پھر خان صاحب کی گاڑی میں قریبی ضلع کے بڑے ہسپتال تک پہنچے یہ ایک الگ اور لمبی داستان تھی۔ پہلے تو ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا، لیکن پھر نہ جانے یہ اُن کے اندر کے جینے کی لگن تھی، یا پھر واقعی اُن کا کفارہ ساتویں آسمان پر قبولیت کا شرف پا گیا تھا۔ ہماری دعائیں رنگ لے آئیں اور امصر صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے چند گھنٹے تو ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری تھے۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس ہسپتال تک کیسے پہنچے۔ پھر دھیرے دھیرے انہیں اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی۔ سلطان بابا نے اُن کی اس کیفیت کی ایک بہت حیرت انگیزی وجہ بھی بیان کی کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد امصر صاحب کو چھلاوے کے ساتھ گزرا ایک سال صرف چند لمحوں کا خواب لگا، یا انہیں کچھ بھی یاد نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہمارے زمینی وقت کے محور سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ”زمینی وقت سے کیا مراد ہے آپ کی.....؟ کیا مختلف زمانوں کے لیے وقت کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں؟“ سلطان بابا نے گہری سی سانس لی۔ ”فی الحال تو یہ صرف ایک پیمانی ہی ہے..... اور سائنس بھی کہیں نہ کہیں اس پیمانی کی کھوج میں ہے۔ لیکن نوری سال (Light Year) اور وقت میں سفر کا تصور اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ ہم زمین پر جس وقت کے پیمانے میں زندہ ہیں اس کے علاوہ وقت کے مزید پیمانے بھی ضرور موجود ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہماری گھڑی، پل، منٹ، گھنٹے اور سیکنڈز بھی ان زمانوں کے وقت کے پیمانوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ مثلاً ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ امصر صاحب نے اُس مخلوق کے زیر اثر جو پورا ایک سال گزرا وہ ہماری دنیا کا صرف ایک منٹ، یا چند سیکنڈ ہی ہوں۔ مثلاً ہم خواب میں اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی زندگی کے تمام مناظر دیکھ کر بھی جب اُٹھتے ہیں، تو ہماری پوری نیند میں اس دیکھے گئے

اُسی طرح کے کسی خواب کے زیر اثر رہے ہوں لیکن بہر حال یہ بات طے ہے کہ اصغر صاحب کا واسطہ واقعی ایک شیطانی مخلوق سے قائم تھا..... اس مخلوق کے اثرات اور اس کے وقت اور دیگر پیمانوں کا تو اب تب ہی پتا چلے گا جب اصغر صاحب کو مکمل ہوش آئے گا.....“

اور پھر دھیرے دھیرے اصغر صاحب کو مکمل ہوش آ ہی گیا اور ساتھ ہی انہیں بچھلی ساری باتیں بھی یاد آ گئیں۔ انہیں واقعی اپنا پچھلا گزرا پورا سال ایک خواب ہی لگ رہا تھا لیکن وہ سب خواب نہیں تھا۔ انہوں نے جب ہسپتال کے نمبر سے اپنے نئے گھر کا نمبر ملایا تو وہاں سے واقعی اُن کے نوکر نے ہی فون اٹھایا لیکن اُس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اصغر صاحب جانے سے پہلے اس قدر دیوالیہ ہو چکے تھے کہ اُن کے تمام کاروبار، گھر اور روپیہ پیسہ گردی ہو چکا تھا اور تین دن پہلے اس رہن کی میعاد ختم ہونے کے بعد بینک اور باقی سود خود جن سے قرضہ لیا گیا تھا، وہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب اصغر صاحب نے اپنے گلے میں بڑا دھاگا کاٹ ڈالا تھا۔ گویا عین اُس لمحے جب اصغر صاحب اپنا گردی رکھا ہوا ایمان واپس پارہے تھے، ٹھیک اُسی وقت اُس رہن رکھے ایمان کے بدلے پائی ہوئی سلطنت کو وہ کھورہے تھے۔ چھلا وہ اپنی دی ہوئی دنیاوی آسائشوں کو تخت و تاراج کر رہا تھا اور آج ٹھیک ایک سال بعد مالی طور پر اصغر صاحب وہیں کھڑے تھے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ البتہ رشتوں کے معاملے میں انہوں نے صرف اور صرف کھوایا ہی تھا۔ اُن کا سارا خاندان برباد ہو چکا تھا اور اُس ایمان فروشی کی قیمت اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے بدلے انہیں ساری عمر چکانا تھی۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ بظاہر اُن کے اس عروج و زوال کی کہانی کا اسکرپٹ پوری طرح مکمل کر رکھا تھا اُس چھلاوے نے۔ عام لوگوں کے لیے یہ معاملہ بہت سیدھا سا دھا تھا۔ ایک عام جوئیر کلرک جو اپنے دو کمروں کے چھوٹے فلیٹ میں عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا، ایک دن اُس کا پانچ کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آتا ہے اور وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس پیسے کو اسٹیٹ اور پرائیویٹ کے کاروبار میں لگااتا ہے۔ قسمت یہاں بھی اُس کا ساتھ دیتی ہے اور اُس کا زمین کے لین دین کا کاروبار دن دوئی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہے اور وہ ایک بہت بڑی بزنس ایمپائر کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن اُس کا بیٹا اور داماد قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر پھانسی تک جا پہنچتے ہیں اور

خواب کا اصل دورانیہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ مطلب خواب میں وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور سالوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ گویا خواب کے وقت کا پیمانہ جاگتی حالت کے پیمانے سے یک سر مختلف ہے..... اسی طرح کسی زمانے کے وقت کا پیمانہ ہمارے زمانے کے بالکل الٹ بھی ہو سکتا ہے..... یعنی ہم یہاں زمین پر جس وقت کو سالوں میں پورا کر پاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ کسی زمانے کا ایک بل ہی ہو..... یہ سب کہیں نہ کہیں میٹافزکس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہی سارے وہ اسرار ہیں جن کی کھوج کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔“

میری اُلجھن ابھی تک قائم تھی۔ ”لیکن اصغر صاحب کے معاملے میں صرف وہی تو اس وقت کے پیمانے میں شامل نہیں تھے، اُن کے ساتھ اُن کی بیوی، بچے، دوست، دشمن، باہر کی دنیا اور دفتر والے سیکڑوں لوگ شامل تھے، جن سے پورا سال اصغر صاحب کا تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ ہم اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ اصغر صاحب ایک خواب کی حالت میں اس چھلاوے کی دنیا کے وقت کے پیمانے کے زیر اثر اپنا پورا سال گزار کر یہاں تک پہنچے ہیں تو پھر باقی لوگوں کی کیفیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر اُن کے آخری تیس دن تو خود میرے ساتھ درگاہ پر ہی گزرے ہیں اور آخری دن کے چند گھنٹے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس وقت کے پیمانے میں شامل تھے..... اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“ سلطان بابا ابھی تک اُسی گہری سوچ میں تھے۔ ”اسی لیے میں نے کہا نا کہ ابھی تک یہ ایک پہیلی ہی ہے اور پھر تم بھول رہے ہو کہ انسان جب نیند میں چلتا ہے تو اُس کے ارد گرد کا زمانہ جاگ ہی رہا ہوتا ہے اور پوری طرح اپنے حواس میں ہوتا ہے۔ اگر اصغر صاحب نیند میں تھے تو ہم بھی اُن کے خواب کے چند کردار بن کر اُن کے ساتھ چلتے رہے۔ اس سے اُن کی خوابیدہ حالت کا کیا تعلق.....؟“ ”چلیں مان لیا کہ اصغر صاحب خواب کی کیفیت میں ہی تھے، لیکن پھر اس چھلاوے کی وہ شبیہ.....؟ اُس کی وہ دو جلتی ہوئی آنکھیں.....؟ جو میں نے اور پھر آپ نے بھی خود دیکھیں ہیں..... اُس کی آپ کیا توجیہ پیش کریں گے.....؟“

سلطان بابا میری تکرار سن کر مسکرا دیئے۔ انہوں نے توصیفی نظر سے میری جانب دیکھا ”ہاں..... یہ البتہ مکمل سوال ہے۔ جس کی توجیہ کی ضرورت ہے..... تمہیں یاد ہے کہ یا قوط نے رُباب کو تمہیں زہرا کے روپ میں دکھایا تھا؟..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بار ہم دونوں ہی

اُسی زمین پر بیٹھ دیا تھا جہاں سے وہ ترقی اور دولت کی خواہش لے کر اُٹھے تھے۔ پوری طرح حالت سنبھلنے کے بعد انہوں نے مجھے اور سلطان بابا کو بتایا کہ جس وقت انہوں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تھا اُس وقت تک اُن کا صرف اور واحد ارادہ وہ چاقو سلطان بابا کے عین سینے میں اُن کے دل کے اندر گاڑ دینے کا ہی تھا، لیکن جیسے ہی اُن کا ہاتھ بلند ہوا اور سلطان بابا کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا کلماتی کلمہ ادا ہوا تو پل بھر میں ہی جانے اُن کے اندر سب کچھ ٹپٹ کیسے ہو گیا اور انہوں نے خود اپنی شررگ پر ہی وار کر دیا۔ بقول اُن کے اگر خنجر اٹھانے سے پہلے ہی اُن کا ارادہ دھاگا کاٹ دینے کا ہوتا تو وہ ہاتھ کو سر سے بلند ہی نہ کرتے اور سیدھے اپنی گردن کی جانب لے جا کر دھاگا کاٹ ڈالتے۔ اور اس صورت میں شاید اُن کی گردن بھی اس قدر نہ کٹتی جتنی اس طرح اُوپر سے وار کرنے کی صورت میں کٹی۔ اپنی جانب سے تو وہ اپنا خاتمہ کر ہی چکے تھے، لیکن قدرت کو ابھی اُن کی زندگی، یا یوں کہہ لیں کہ اُن کا امتحان مزید مقصود تھا لہذا تین دن زندگی اور موت کی بازی کھیلنے کے بعد وہ پھر سے زندگی کی جانب پلٹ آئے۔ سلطان بابا نے اُن کی پوری بات سن کر سر اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور دیر سے بولے ”بے شک! اللہ کے کلمے میں بڑی طاقت ہے۔ کاش ہم سب اس کلمے کی اصل طاقت اور اثر سے پوری طرح واقف ہوتے تو کسی اور اسم اعظم کی تلاش میں یوں در بدر نہ پھٹکتے۔ جو کچھ بھی ہے اسی کلمے میں پنہاں ہے۔“

میں اصغر صاحب کی بے ہوشی کے وقفے میں تین دن تک سلطان بابا کے ساتھ ہی بنا پلک جھپکائے ہسپتال میں اصغر صاحب کے سر ہانے بیٹھا رہا تھا۔ اُن کی طبیعت کچھ سنبھلی تو سلطان بابا نے اصرار کر کے مجھے حویلی کی خبر لینے کے لیے گاؤں بھیجا کہ زہرا اور اُس کی ماں صرف میرے بلاوے پر اتنی دُور آئے ہوئے تھے لہذا مجھے اُن کی دل جوئی کے لیے ہی سہی، پر حویلی کا ایک چکر ضرور لگا آنا چاہیے۔ حالانکہ جب ہم اصغر صاحب کو کریم خان صاحب کی موٹر میں ضلع کے بڑے ہسپتال کے لیے لے کر نکل رہے تھے تب میں نے بڑی مالکن کے ذریعے زہرا کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ ”پریشانی کچھ ایسی ہے کہ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔“ اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں جن اعلیٰ ظرف لوگوں کے درمیان زہرا اور اُس کی ماں کو چھوڑے جا رہا تھا وہ اپنا سب کچھ لٹا دیں گے لیکن کبھی اپنے مہمانوں کے شیشہ دل پر کوئی بھی خراش نہیں آنے دیں

یہاں سے اُس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ بیوی، بیٹے کی موت کی خبر سن کر ہوش و ہواس کھو بیٹھی ہے۔ بیٹی بیوہ ہو جاتی ہے۔ دوسری بیٹی کسی غمزدے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور وہ کروڑ پتی بیٹے اور داماد کو پھانسی سے بچانے کے چکر میں اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اپنی ساری جائیداد گروی رکھ کر سود پر بازار سے قرضہ اٹھاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مقدر اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ بیٹا پھانسی چڑھ جاتا ہے اور وہ شخص دیوالیہ ہو کر ایک دن دنیا کی نظروں میں گھر سے بھاگ کر کہیں چھپ جاتا ہے اور اسی اثناء میں بینک اور سود پر پیسہ دینے والے مدت ختم ہونے کے بعد اُس کے گھر، جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ شخص پھر سے غربت کے اُسی گڑھے میں جا گرتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے یہ بس اتنی ہی اور سیدی سادھی سی کہانی تھی۔ آس پاس کے لوگ اصغر صاحب کی بد قسمتی پر کچھ دیر کے لیے بحث کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ چند ہفتوں کے بعد یہ کہانی بھی اُن کے ذہنوں سے مٹ جائے گی۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ اصغر صاحب کے اس عروج اور زوال کی داستان کے پیچھے ”چھلاوے“ نامی کسی مخلوق کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مارڈن سائنسی دور میں کس کے پاس فرصت ہے ایسی طلسماتی داستانوں پر یقین کرنے کی؟..... میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور عجیب سا خیال آیا، ہمارے آس پاس جانے کتنے لکھ پتی کنگے اور جانے کتنے کنگے راتوں رات لکھ پتی بن جاتے ہیں..... کون جانے ان کامیابیوں اور بربادیوں کے پیچھے بھی کسی اُن دیکھے ”چھلاوے“ کا ہاتھ ہی نہ ہوتا ہو؟ ہم اپنی کامیابیوں کی راہ پر اپنی بے ایمانی اور ایمان فروشی کے ایسے ہی گھوڑے پر سرپٹ دوڑتے جاتے ہیں اور اپنی ہر فتح کو اپنی حکمت اور اپنی منصوبہ بندی کا مرہون منت مان کر جیت کے نشے میں ہر سہرا اپنے سر باندھتے ہوئے یہ بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ کہیں یہ ”بے ایمان“ کامیابیاں، قدرت کی کسی ڈھیل کا نتیجہ تو نہیں.....؟ کہیں کوئی ”چھلاوہ“ ہمارے ارد گرد اپنا جال تو نہیں بن رہا؟ ایک ایسا جال جس کی ڈوریاں خود ہماری ایمان فروشی کے دھاگوں سے بنی ہوئی ہیں اور جب بھی ذرا ہمارے اندر ایمان جاگا وہ چھلاوہ ہمارے قدموں تلے سے زمین کھینچ کر پھر سے ہمیں بے دست و پا کر دے گا.....

ٹھیک اُسی طرح جیسے اُس نے آج پل بھر میں اصغر صاحب کو آسمان سے اُٹھا کر پھر سے

میں لمبوس اور سر پر دھانی رنگ کی اودھنی لیے ہوئے۔ وہ نور کا ایک ایسا ہالہ لگ رہی تھی جس کے اندر ذرا سی ہلدی کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ شاید یہ اس شدید بخار اور بیماری کا اثر تھا جو اُس کے بلج چہرے پر پھیلنے چند دنوں کے دوران اپنا رنگ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی ستارہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ میں نے سلام کے بعد اُس سے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھنے سے پہلے اُس کی طبیعت کا پوچھا، وہ دھیرے سے مسکائی ”آپ نے طیب ہی ایسا بھیجا تھا کہ بیماری کو نہ کہتے ہی بنی..... اتنے اچھے لوگ بیک وقت اپنے اُس پاس کیسے جمع کیے رکھتے ہیں آپ.....؟..... میں تو ہر بار کھودیتی ہوں۔“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، جانے یہ بات اُس نے کسی رو میں کہی تھی، یا واقعی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا بھی خوب جانتی ہیں۔ ہتھیلی پر نام لکھ لکھ کر پلکوں سے مناتی رہتی ہیں۔ لیکن آنکھ کے پردے تک وہ تحریر آنے نہیں دیتیں۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو لاریب نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں کسی معنی کی تقریب میں بڑی مالکن کو بطور لڑکی کی سرپرست دعوت تھی۔ لہذا وہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ زہرا اور اُس کی ماں کو بھی تبدیلی کی غرض سے لے گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میں اور لاریب بالکل ہی خاموش کھڑے رہے۔ جیسے ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی ہو، یا ہم دونوں ہی جیسے اُس مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں خاموشی خود ہر بات کہہ دیتی ہے۔ اور زبان، لفظ اور باتیں سب بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ میں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ ”مجھے آپ سے معذرت کرنا تھی.....“ میں چونک کر پلٹا ”معذرت..... لیکن کس بات کی.....“ اُس نے اپنی پلکوں کی جھالگرالی۔ ”میں انجانے میں آپ کو اپنے زخموں میں الجھا بیٹھی..... آپ تو خود شدید گھائل ہیں..... آپ کے تو اپنے زخموں سے ابھی خون رستا بند نہیں ہوا..... آپ کی امی نے آپ کی اور زہرا کی کہانی اتنی تفصیل سے نہیں سنائی تھی۔ اگر میری زہرا سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید آپ کے داغوں پر پڑا یہ پردہ میرے سامنے کبھی اٹھ نہ پاتا۔ آپ تو ہر حد سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے آج تک محبت کو جیتنے اور لوگوں کو محبت میں ہارتے ہوئے ہی دیکھا تھا..... لیکن آپ نے محبت کو جیت کر دکھا دیا..... زمانے کی ہر رسم، محبت کی ہر شرط، مجبوری کا ہر دعویٰ آپ کے سامنے فقط ریت کی ایک دیوار ہی تو ثابت ہوا۔ آپ نے دنیا کو بتا

گئے۔ لیکن خود اُن کے اپنے گھر میں اُن کے اپنے دل کا ایک ککڑا بھی تو مضمل تھا، زخمی تھا، بے کل تھا..... جانے وہ اُس موسم کے پروں والی پری کی اس آنچ سے حفاظت کیسے کر پائے ہوں گے؟ وہ تو اتنی نازک تھی کہ بادلوں سے چھنی ایک ہلکی سی کرن بھی اُس کا اندر پگھلا سکتی تھی۔ پھر جانے یہ تین دن کا سورج اُس پر کیسے برسا ہوگا؟ ہاں البتہ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ میں زہرا نام کا جو اُبر اُس نازنین کے پہرے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا وہ خود اپنے وجود پر لاریب کے حصے کی ہر تپش برداشت کر لے گا لیکن اُس کا کوئل من کبھی پگھلنے نہیں دے گا۔ انہی سوچوں میں گم جب میں ضلع سے صبح کی پہلی ٹرین لے کر دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے جبل پور اسٹیشن پر اُترا اور حویلی پہنچا تو سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ بیرونی ڈیوڑھی میں کرم دین نے مجھے آتے دیکھا تو اندر اطلاع کرنے کے لیے دوڑ گیا۔ اور کچھ ہی پل میں اُلٹے قدموں لوٹا کہ مجھے اندر بلایا گیا ہے۔ حالانکہ میں درجنوں بار یہ ڈیوڑھی پار کر کے حویلی کے اندر جا چکا تھا لیکن آج بھی میرے قدموں میں وہی جھجک اور وہی ہچکچاہٹ تھی جو پہلی بار یہ دلیہز پار کرتے ہوئے موجود تھی۔

اندر زنانے والے حصے کے برآمدے کو بڑی بڑی چکوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ شاید یہ اہتمام سخت گرمیوں کے موسم کے لیے کیا گیا ہو تاکہ دوپہر کی تپتی دھوپ کی تپش کو روکا جا سکے۔ لیکن اس سرا کی نرم دھوپ والی سہ پہر میں بھی ان لکڑی کی کھلے تنکوں والی چکوں کا یوں ڈھلکا رہنا ضرور کسی خاص وجہ سے ہی ہو سکتا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ اہتمام زہرا اور اُس کی امی کی وجہ سے کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ بہر حال وہ دونوں حویلی کے آبائی نوکروں کے سامنے بھی یوں آزادانہ پھرنے میں کچھ جھجک ضرور محسوس کرتی ہوں گی۔

باہر سے چھن کر آنے والی دھوپ چمک کے تنکوں کے درمیان سے کچھ ایسے زاویے سے برآمدے کے چمکیلے سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہی تھی کہ نیچے فرش پر بھی دھوپ کے تنکوں کی ایک ”چمک“ سی گچھی گئی تھی۔ ایک عجیب سا مثیلا اُجالا پھیلا ہوا تھا اس طویل برآمدے میں۔ لہذا میری آنکھوں کو کچھ پل لگے اس مللجی روشنی سے نظریں ملانے میں۔ برآمدے کے آخر میں موہیتے کی لمبی لمبی بیلوں کے سامنے کوئی پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر وہ وجود پلٹا۔ میری آنکھیں تب تک اس مدہم روشنی سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ لاریب تھی، سفید کرتے پا جاے

سیکھ لیا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ میں نے ہر درد پر عبور حاصل کر لیا ہے لیکن اتنا وعدہ آپ سے ضرور کرتی ہوں کہ میرے اندر اس جذبے سے جو بھی تبدیلی آئے گی، وہ اس اعزاز کی حرمت کی تحقیر کا باعث کبھی نہیں بنے گی۔ میں ہمیشہ سر اٹھا کر جیوں گی تاکہ میری وجہ سے کبھی محبت کا سر جھکنے نہ پائے..... بس مجھے ہر قدم پر آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی کہ میں ابھی بہت کمزور ہوں اور میرے ظرف کا پیالہ بھی ابھی اتنا گہرا نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے ٹھیک طرح سے ٹوٹنا بھی نہیں آتا جب کہ مجھ سے خود ہی اپنے ریزے سمیٹنے کی اُمید بھی باندھی جا چکی ہے۔ دعا کریں کہ میں ثابت قدم رہ سکوں.....“ وہ چپ ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے لفظ بھی اُسی کے پاس رہ گئے ہیں۔ گویا قدرت نے ایک بار پھر کوہ کن کے ہاتھ ایک چھوٹا سا تیشہ تھا کر اُسے زندگی کے پتھر۔ لیے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ میں اُس نازک سی لڑکی کے الفاظ اور اُن سے پیدا شدہ مدوجزر پر غور کرتا رہا۔ یہ محبت بھی کتنی بڑی اُستاد ہوتی ہے۔ نہ جانے چند دنوں میں ہی یہ ہم معصوم انسانوں کو اتنے سبق کیسے دے جاتی ہے؟ ہم خود بخود اتنی مشکل بولی کیسے بولنے لگ جاتے ہیں؟ کل تک ہر بات انہی مذاق میں اُڑا دینے والی اور ہر پل زندگی کا رس نچوڑنے والی لاریب کو بھی تو یہ بولی اُسی ”عشق“ نامی اتلیق کی ہی سکھائی ہوئی تھی۔ سچ کہ محبت صدیوں کا سفر لکھوں میں طے کرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ ایک پل میں جواں، رعنا اور حسین دلوں کی رگوں سے زندگی اور نسوں سے خون نچوڑ کر انہیں ضعیف تر کر دیتی ہے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا کہ ”میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں۔“ پھر مجھ سے وہاں رُکا نہیں گیا۔ باہر جاتے وقت کرم دین سے یہ بھی پتا چلا کہ بڑی مالکن لوگ تو اب رات دیر سے ہی لوٹیں گے۔ میں درگاہ پہنچا تو ہماری چار روزہ غیر حاضری کے دوران درگاہ کا صحن خزاں رسیدہ پہلے اور زرد پتوں کی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ انگوڑی خشک بیللیں اُداں ہو کر میری راہ دیکھتے دیکھتے منڈیر تک بڑھ آئی تھیں اور چشمے کے رخ اور تازہ پانی کا جھرنایو نہی بہتے بہتے انہیں اپنی جھنکار سے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس خاموشی اور سکوت سے مہبوت سا ہو گیا۔ کیا جنت کا سکون اس ماحول سے کچھ سوا ہوگا؟

شام ڈھلے ایک اور خوش گوار حیرت سلطان بابا اور امیر صاحب کے روپ میں درگاہ کی

دیا کہ جو عشق میں جی نہیں سکتے وہ پہلے ہی سے مرے ہوتے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں ہوں کہ وہ ذہن میں اُن کی ترتیب جوڑتے جوڑتے اپنے لفظ ہی بھلا بیٹھی ہو۔ لاریب نے اپنے دھونکی جیسے چلتے سانس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جانے یہ جذبوں کی بھول بھلیاں ہم کمزور انسانوں کے ساتھ ایسے گھناؤنے کھیل کیوں کھیلتی ہیں کہ ہم کچھ کہتے ہیں تو رُسا ہوتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں تو لفظوں کے یہ ڈنک ہمیں اندر ہی اندر ڈستے رہتے ہیں۔ اور آخر کار چپ کا یہ ناسور ہماری جان لے کر ہی رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے اس وقت وہ کالج کا پیکر بھی دو چارتھی۔ میں نے کھنکار کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ ”اپنی اپنی تقدیر کی بات ہے..... میری ہمیشہ یہی وعار ہے گی کہ قدرت آپ کی راہ میں کانٹوں کی کچھی ہر راہ کو گلوں سے بھر دے.....“

اُس نے اپنی پلکیں اٹھائیں ”پھولوں کی خواہش تو میں نے بھی کبھی نہیں کی..... اور پھر ان راہوں کے چناؤ کا انتخاب خود ہمارے بس میں ہوتا ہی کب ہے کہ ہم کلیوں، یا کانٹوں کے فرق کو دھیان میں رکھتے ہوئے کسی راستے کو چن کر اپنا پہلا قدم وہاں رکھیں..... ہمیں تو پتا ہی تب چلتا ہے جب ہمارے پاؤں چھل چکے ہوتے ہیں.....“

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی پاؤں کے چھالوں کی دُہائی دے رہی تھی۔ میں اب اُس گل اندام کو یہ کیسے سمجھاتا کہ یہ تو وہ راہ ہے جہاں پیر کے چھالے گننے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ میرے مقدرمیں تو یہ خار ازل سے لکھ دیئے گئے تھے مگر وہ اپنی گلابوں جیسی کوئل جلد لیے اس خارزار کی طرف کیوں بڑھی چلی آ رہی تھی؟ اُس کے جگر ناتواں کے لیے تو یہاں کا صرف ایک زہریلا کاٹنا ہی کافی تھا۔ میں سر جھکائے جانے ایسی کتنی سوچوں سے لڑتا رہا۔ پر شاید وہ بھی سوچ پڑھنے کا ہنر جانتی تھی۔ جس کا ثبوت اُس کے اگلے جملے نے دے دیا۔

”لیکن آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیے گا۔ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے کہ یہ وہ بازی ہے جو ہمارے جیتی جاسکتی ہے۔ یہ وہ ملن ہے جو جدائی کے بنا مکمل نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کھو کر ہی پایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ بستی ہے جو اُڑ کر ہی بستی ہے۔ یہ وہ جیون ہے جو خود کو مار کر ہی جیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ سرد سکون ہے جس کی ٹھنڈک انگاروں پر چل کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے..... تو میں نے بھی ان چند دنوں میں اُس عجائب خانے کو برتنے کا کچھ نہ کچھ ڈھنگ

خوب مسیحا کی ہے..... جس کا اندازہ مجھے کل ہی اُس سے ملاقات میں ہو گیا تھا۔“

زہرا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف اُسے اتنا ہی بتایا تھا کہ ہم تو خود ابھی تک ایک دوسرے کی کھوج میں ہی تھے۔ اور یہی سچ بھی ہے ساحر..... میں نے آپ کو ریزہ ریزہ چن کر اور پل پل میں پایا ہے..... اور ابھی تو میں صرف آپ کے وجود کی پرچھائی تک ہی پہنچی ہوں..... اور ابھی تک ہر نیا دن مجھے آپ کی رُوح کے ایک نئے رخ، ایک نئے زاویے سے متعارف کر دوارہا ہے۔ ہر روز میری رُوح ایک نئے ساحر سے ملتی ہے۔ اتنا عرصہ دُور رہنے کے باوجود بھی یہ ملاقات ہر لمحہ، ہر پل جاری رہتی تھی..... میں نے تو لاریب سے صرف اتنا ہی کہا کہ اگر وہ بھی میری اس کھوج میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی..... کہ یہ تلاش ہی کچھ ایسی ہے کہ شاید تنہا میرا اس پر نہ تو حق ہے اور نہ ہی اختیار.....“

میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف زہرا ہی اعلیٰ ظرفی کا یہ جوا کھیلنے کی جرأت کر سکتی ہے۔

میں نے زہرا سے پوچھا ”تو پھر لاریب نے کیا جواب دیا.....؟“

”وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو دے سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ جذبوں پر اختیار کی ماہر تو نہیں، لیکن وہ اس کھوج پر صرف اور صرف میرا حق اور اختیار مانتی ہے۔ اُسے اس بات پر بھی بے حد شرمندگی تھی کہ اُس کے منہ زور جذبے کی بے پناہ طاقت نے اُس کی ظاہری حالت پر اس قدر اثر ڈالا کہ آپ تک اُس کی خبر پہنچ گئی اور آپ کو پریشانی میں مجھے یہاں بلوانا پڑا..... لیکن بقول لاریب کہ یہ اُس کی درپردہ شدید خواہش کی تکمیل بھی تھی کہ میری اور اُس کی کبھی ملاقات ہو سکے.....“ میں چپ چاپ اور دم سادھے اُس شہزادی کی کہانی سننا رہا۔ ہاں زہرا اک شہزادی ہی تو تھی جس کا راج پاٹ میرے دل کی سلطنت پر چلتا تھا۔ یہ دل بھی تو ایک بادشاہ کی طرح ہی اپنی سلطنت کا قبضہ کسی ایک کو ہی دیتا ہے۔ خود ہی اپنا سویرم رچاتا ہے اور پھر جس کسی کے گلے میں یہ اپنے پیار کی مالا ڈال دیتا ہے اُسی کے ساتھ جنموں کے بندھن باندھ لیتا ہے۔ میری مالا بھی اُسی دن زہرا کے گلے میں ڈل گئی تھی جس دن میں نے پہلی بار اُسے درگاہ پر دیکھا تھا۔ لیکن اُس پہلے دن والی زہرا اور آج میرے سامنے کھڑی

دیرانی کم کرنے کا سبب بن گئی۔ سلطان بابا نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اصغر صاحب کے بے حد اصرار پر کہ وہ دوائیں اور آرام کا سلسلہ درگاہ پر بھی جاری رکھ سکتے ہیں انہیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن صرف اس شرط اور وعدے پر کہ وہ اگلا ایک ہفتہ مسلسل آرام کریں گے اور زخم بھر جانے کے بعد ہی روزمرہ کے کاموں میں حصہ لے سکیں گے۔ اصغر صاحب کی نیت یہی تھی کہ اب وہ باقی ماندہ زندگی یہیں اسی درگاہ میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے کاٹ دیں لیکن سلطان بابا نے انہیں پھر سے اپنے گھر لوٹ جانے کی تلقین کر رکھی تھی۔ وہ اصغر صاحب کو پہلے ہی چھ کلمے اور ایمان مفصل اور ایمان مجمل پڑھوا کر اُن کے ایمان کی تجدید کروا چکے تھے۔ سلطان بابا کے بقول اصغر صاحب کا اصل امتحان اور کفارہ جبل پور سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ انہوں نے اصغر صاحب کو یہ بھی بتایا کہ شروع کے چند مہینے اُن پر بے حد سخت گزریں گے کیوں کہ مٹنی تو تیس اب انہیں چین سے جینے نہیں دیں گی۔ لیکن انہیں ہر حال میں ثابت قدم رہ کر سختی اور ہر مشکل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی میں اُن کی نجات ہے کہ وہ اب آخری سانس تک مذہب کا دامن سختی سے تھامے رہیں۔ اصغر صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

اگلی صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ ہفتے بھر کی جھڑی کے بعد سورج نکلا تو جیسے ہر چیز پر نگے گہن کو پھر سے چمکا گیا۔ روشن اور چمکیلی صبحیں بھی تو زندگی بڑھانے کا سبب ہوتی ہیں۔ میں بھی اس صبح کی چمکیلی کرنوں کو انگور کی بیلوں کے چھت سے چھن کر آتے اور نیچے بہتے نالے کے پانی سے آنکھ چھو لی کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کو بھونپو بجا۔ اصغر صاحب اور سلطان بابا ابھی اندر اپنے کمرے میں ہی تھے۔ پھر چند لمحوں بعد ہی وہ نسیم سحر کی طرح بہتی اور جیسے پانیوں پر چلتی ہوئی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ زہرا آج اکیلے ہی آئی تھی۔ ضرور اُسے لاریب نے میری درگاہ پر واپسی کی اطلاع دے دی ہوگی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

”آپ کے گھائل کے زخم بھرنے تک میں خود ہی نڈھال ہو کر نہ گر پڑوں..... بہت بڑے امتحان میں ڈال گئے تھے آپ مجھے۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ ”وارکاری تھا..... تو مسیحا بھی اتنا ہی اعلیٰ ظرف چاہیے تھا جتنی زخم کی گہرائی تھی..... کہ اس بیماری کا مرہم بھی تو صرف ظرف کا پیانا ہی ہوتا ہے..... اور آپ نے

زہرا نے مجھے خاموش پا کر اپنی نظریں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ”یہ کیا.....؟ آپ رو رہے ہیں ساحر..... اب تو منزل سامنے ہے..... بہت قریب..... خدا کے لیے خود کو یوں آزدہ نہ کریں..... میری رُوح کا آخری ریشہ تک آپ کا مقروض ہے..... کبھی میں نے آپ کو رُوح کا قبضہ ملنے تک کے انتظار کا کہا تھا..... آج میں آپ سے کہتی ہوں کہ میری رُوح خود آپ کی منتظر ہے..... آ کر اپنی ملکیت کا قبضہ لے لیں..... جب آپ کا جی چاہے..... میری رُوح پلکیں بچائے آپ کو آپ کا انتظار کرتی ملے گی.....“

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ آنسو خود میری منزل کو سامنے دیکھ کر اُس کے استقبال کے لیے ہی تو بہہ نکلے تھے۔

اتنے میں سلطان بابا بھی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بہت سی دعائیں دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے زہرا کو دیکھ کر کہنے لگے ”تمہارا یہ قیدی اب جلد تمہارے حوالے کر دیا جائے گا کہ اس کا جنوں تو دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لیکن دھیان سے بیڑیاں ڈالنا اس کے اندر کی کھوج کسی کروٹ چین نہیں پاتی.....“

زہرا جو مسکراتے ہوئے سر جھکائے سلطان بابا کی بات سن رہی تھی، اُس کے چہرے پر حیا کے کئی گلابی سائے پل بھر میں ہی گزر گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں پائی اور ہم سے رُخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ درگاہ کی منڈیر کے پاس رُک کر اُس نے پیچھے مڑ کر مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ کیا کچھ نہیں تھا صرف اُس ایک نظر میں، جانے کتنی صدیوں کا ٹھہراؤ، جانے کتنے جنم کی ایک طمانیت.....

زہرا کے جانے کے بعد وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ایسا میرے ساتھ ہمیشہ ہوا تھا۔ وہ جب جب میرے سامنے آئی تھی، میرے لیے جیسے وقت تھم سا گیا تھا اور جیسے ہی وہ منظر سے اوجھل ہوئی، وقت جیسے پھر اپنی رفتار چل پڑتا تھا۔ تیسرے دن سلطان بابا نے جبل پور سے کوچ کا اعلان کر دیا کیوں کہ یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کل شام جو اس سال کی آخری شام بھی تھی، ہمیں جبل پور سے رُخصت ہو جانا تھا۔ لیکن کہاں؟ ہمیشہ کی طرح نہ میں نے سلطان بابا سے کچھ پوچھا نہ انہوں نے کوئی وضاحت کی۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہو چلا تھا کہ شاید اس

س راج کماری کے دل میں کتنا فرق تھا۔ تب وہ سراپا سنگ تھی اور آج موم کی ایک گڑیا..... راج پہلی بار اُس نے یوں کھل کر خود اپنی رُوح پر میری سپردگی قبول کی تھی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ کتنی بار میری رُوح نکلے نکلے رہ گئی۔ کتنی بار میرے قدموں نے لہو لہان ہو کر راستے میں ہی سپردالنے کی دہائی دے ڈالی۔ کتنے ہی بار میری کوئل رُوح سا یوں چبھے کہ پھر اندر ہی ٹوٹ کر عمر بھر کا ناسور بن گئے..... کتنی بار اس شدید تپتے صحرا میں سا یوں جاں بلب ہو کر گھٹنوں کے بل گرا کہ سورج کی تپش اور جھین سے میری جان میری قتی آنکھوں کے راستے بہتے بہتے خشک ہو کر بے جان ہو گئی۔ لیکن میں چلتا ہی رہا..... ایک باب کو اپنا نشان منزل بنائے..... اور آخر کار آج میں نے یہ صحرا پار کر ہی لیا تھا۔ میرے منے اب ایک وسیع سمندر تھا اور میری جان میرے کئے پھٹے بوسیدہ جسم کے ساتھ میرے گھائک ہونٹوں پر آن لگی تھی۔ لیکن کیا اپنی جان اس جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی گھڑی ہو سکتی تھی.....؟ میں نے آخر کار محبت کا وہ قلعہ فتح کر ہی لیا تھا۔ کی فسیل تک پہنچنے کی آرزو میں ہی لاکھوں دم توڑ دیتے ہیں..... اور صدیوں کی ریاضت بعد کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا اگر اس قلعے کے آس پاس پہنچ بھی جائے تو عشق کا وہ بیت، وہ دیو جو اس قلعے کی حفاظت پر معمور ہے، جس کی ہزار آنکھیں اور ہزاروں ہاتھ سا ہیں، وہ پل بھر میں ہی اُس زخموں سے چور عاشق کو آگے بڑھ کر اپنے ایک ہی ڈنک دو حصوں میں تقسیم کر کے اُس کی رُوح قبض کر لیتا ہے۔ لیکن ساحر نے آج عبداللہ کے پاس میں اُس محبت کے قلعے پر اپنا جھنڈا لہرا ہی دیا تھا اور اس قلعے میں قید پری آج میرے نے خود کو سپرد کرنے کے لیے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس شہزادی کے لبوں پر ایک دھیمی ن تھی اور اس کی ستارہ پلکیں لرز رہی تھیں۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ایک سہ سالہ رُخو اپنی فتح پر آج رو پڑا تھا۔ یہ ہزاروں زخموں سے چور اُس کے بدن سے اٹھتی درد کی ٹیسوں کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، اُسے ان اُن گنت کاٹ کے داغوں اور کئی پھٹی جلد کا کوئی غم تھا جو اب تا عراسِ معر کے ملے تمغوں کی صورت میں اُس کے چہرے اور جسم کی نشانی بنے رہیں گے۔ یہ آنسو تو کچھ کہانی بیان کر رہے تھے کہ ہم بہت زیادہ ہنستے ہنستے بھی تو رو پڑتے ہیں۔

ہی بیٹھی۔ زہرا کی امی نے بڑی مشکل سے بڑی مالکن اور لاریب کو باہر تک آنے سے روکے رکھا کہ خواہ مخواہ سب کا من الوداعی سے مزید اُداس اور بوجھل ہوگا۔ البتہ یہ وعدہ وہ بڑی مالکن سے لینا نہیں بھولیں کہ وہ جلد ہی لاریب کو لے کر شہر اُن کے ہاں چند دن ٹھہرنے آئیں گی۔ آخر کار حویلی سے وداع ہونے کا وہ جاں کسل لمحہ بھی آ ہی گیا۔ سلطان بابا نے فردا فردا سبھی کو دعا دی۔ زہرا اور اُس کی امی نم پلکوں کے ساتھ خان صاحب کے خاندان سے مل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ میں نے بشرے کو گلے لگاتے ہوئے دھیرے سے اُس کے کان میں کہا۔ ”عبداللہ کی آمد کی خبر مجھے ضرور دینا۔“ بشرے نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ کرم دین اور جمالے وغیرہ سے ملتا ہوا میں بڑی مالکن تک پہنچا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ ”ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟“ میں نے اُن کا اپنے سر پر رکھا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”میں اپنی آنکھیں یہیں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب دل چاہے ان میں جھانک کر مجھے بلا لیجیے گا۔“ میں مزید اُن کی لرزتی پلکوں سے نظر نہیں ملا پایا اور سب سے آخر میں گم صم صی کھڑی لاریب کی طرف بڑھ گیا۔ ”مجھے رخصت نہیں کریں گی؟“ وہ جیسے پل بھر میں ہی کسی اور دنیا سے واپس آ گئی۔ ”پہلے میں آپ کے ہونے کا کامل یقین تو خود کو ہو جانے دوں۔۔۔۔۔ رخصت تو بہت بعد کا مرحلہ ہے۔۔۔۔۔ آپ کے لفظوں کا مرہم سدا میرے ساتھ رہے گا۔۔۔۔۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو۔“ میں پلٹ کر خان صاحب کی گاڑی کی طرف چل دیا جہاں سلطان بابا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑیاں حویلی سے باہر نکلیں تو میں نے بڑی مالکن اور لاریب کی جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے جبل پور کو ایک عجیب سی اُداسی میں گھرتے ہوئے محسوس کیا۔ ہم اسٹیشن پہنچے تو گاڑی پہلے ہی لگ چکی تھی۔ خان صاحب نے لپکتے جھپکتے نوکروں کی مدد سے ہمارا برائے نام سامان بوگی میں منتقل کر دیا۔ زہرا اور اُس کی امی بھی ہمیں وداع کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ یہاں سے ایک بار پھر میرے اور زہرا کے راستے عارضی طور پر جدا ہو رہے تھے۔ پھر وہی الوداع۔۔۔۔۔ پھر وہی کسک اور تڑپ۔۔۔۔۔ مجھے ہر بار یہ الوداع اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح لگتا تھا جس کے نیچے کٹنے کے لیے سجائے گئے عاشق کا سر کٹ تو جائے، پر دھڑ سے پوری طرح علیحدہ نہ ہونے پائے اور اس بے کس اور مجبور عاشق کی جان تڑپ تڑپ کر اور نکلتے نکلتے یوں نکلے کہ اُس کے پیٹھ پیچھے

مرتبہ یہ میرا اور سلطان بابا کا آخری مشترکہ سفر ہوگا۔ ادھر ہماری روائگی کا سن کر زہرا کی امی نے بھی رخت سفر باندھنے کا ارادہ کر لیا کیوں کہ انہیں بھی ہفتہ بھر سے زائد ہو چکا تھا اور وہاں شہر میں زہرا کے ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

آخر کار ہماری روائگی کا دن بھی آن پہنچا۔ جاتی خزاں کی شامیں ویسے بھی بہت اُداس ہوتی ہیں لیکن دسمبر کی وہ آخری شام اُداسی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا درد اور کسک بھی اپنے اندر پنہاں لے کر اُترتی تھی۔ ہمیں پہلے درگاہ سے خان صاحب کی حویلی اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن جانا تھا کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ زہرا کی گاڑی بھی خان صاحب کی گاڑی سمیت ہمیں اسٹیشن چھوڑنے جائے گی کیوں کہ وہاں تک جبل پور سے نکلنے کا راستہ سانجھا تھا۔ درگاہ سے پہلے میں اصغر صاحب کو وداع کہنے لگا تو وہ مجھے گلے لگا کر بھرا سے گئے۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں تھکتے پھکتے خود میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سلطان بابا نے ہم دونوں کو دلاسا دیا اور اصغر صاحب سے بولے ”یہ آنسو بہتے رہنے چاہئیں، من ہلکا اور زرخیز رہتا ہے۔۔۔۔۔ یہ خشک ہو جائیں تو دل کی زمین بھی خنجر ہو جاتی ہے، یہ آنسو ہی ہماری آنکھ کا وضو ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ سو آنکھوں کو پاک کرتے رہنا ہوگا، کفارہ ادا ہوتے رہنا چاہیے۔“ اصغر صاحب نے آخری بار مجھے گلے لگایا ”عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ میں تمہیں اپنا دوست کہوں، بیٹا کہوں، محسن کہوں، یار بہر۔۔۔۔۔ ایک ساتھ کتنے رشتوں کا خزانہ دیئے جا رہے ہو تم مجھے۔۔۔۔۔ کیسے لوٹا پاؤں گا میں یہ سب۔“ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”اپنا بھی کہتے ہیں اور واپس لوٹانے کی بات بھی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اپنوں میں سودے بازی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ آپ جب اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو مجھے اطلاع ضرور کیجیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔۔ نصیب میں ہوا تو میں بہت جلد آپ سے آ کر ملوں گا۔“

ہم نیچے گاؤں میں پہنچے تو حویلی کے سبھی ملازمین اُداس سے گیٹ کے باہر ہی سفر کی تیاریوں میں مصروف نظر آئے۔ بشرے، کرم دین اور جمالے نے خاص طور پر مجھے گلے لگایا اور سلطان بابا سے دعا لی۔

وہاں حویلی کے اندر بیرونی ڈیوڑھی کے پاس بڑی مالکن اور لاریب افسردہ سی زہرا کی گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ لاریب تو زہرا کو گلے لگا کر وداع کرتے وقت اپنی آنکھیں چھلکا

اب اس سے پہلے کہ سانس نکلے
وہی لکیریں، وہی ستارے
میری ہتھیلی میں قید کر دو
یہ آخری شب کے آخری پل
کوئی بڑا اختتام کر دو
یہ زندگی بھی تمام کر دو
سنود سمبر.....
اُسے پکارو.....
اُسے ملا دو.....

ہاشم ندیم

بندھے ہاتھوں اور پیروں کی سخت مٹکیں جان کنی کے عالم میں اُس کے جسم کے ریشوں میں
کھسکتی جائیں لیکن ہاتھوں کی بندش کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے تڑپ بھی نہ سکے اور بندھے
پیر اُسے ٹھیک طرح سے ایڑیاں رگڑنے کا موقع بھی نہ دیں۔ کچھ ایسا ہی حال اُس وقت میرا
بھی تھا۔ خان صاحب نے رخصت کرنے سے پہلے زور سے بھیج کر مجھے گلے لگایا اور دوبارہ
جبل پور آنے کا وعدہ لیا۔ زہرا کی امی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی ”ہم سب
تمہارے منتظر رہیں گے..... اس بار دیر نہ کرنا بیٹا.....“ آخر میں وہ پری زاد ایک بڑی سی کالی
چادر میں اپنے گلاب رُخ چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ میرے وداع کے انتظار میں کھڑی
تھی۔ اُس کی جھکی نظر ابھی ”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ میں نے خود کو مجتمع کیا۔ ”میں آپ کو
آپ کے ہر انتظار کی حد سے پہلے آ کر ملوں گا..... اب مجھے وداع کر دیں.....“ اُس نے پھر
اپنی نظر جھکا لی..... سب مدہم پڑ گیا۔ ”کچھ الوداع رخصت کرنے کے لیے نہیں..... اگلی
ملاقات کی پیشگی خوش آمدید کہنے کے لیے ہوتے ہیں، سو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ خوش
آمدید.....“ میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا ”خوش آمدید۔“ ٹرین کی آخری سیٹی بھی بج چکی
تھی۔ سلطان بابا نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ٹرین نے
ایک ہچکولا لیا اور دھیرے دھیرے پلٹ فارم سے نکلنے لگی۔ پلٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں
نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا لیکن زہرا کا ہاتھ یونہی ہوا میں جیسے معلق ہی رہ گیا۔ ٹرین کے سامنے
سے ہٹتے ہی دُور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی ایک آخری کرن تیزی سے زہرا کی
جانب لپکی اور میں نے بہت دُور سے بھی اُس کی آنکھ میں نمی کی چمک لہراتے دیکھی۔ شاید یہ
جبل پور کے سورج کا مجھے اور زہرا کو آخری سلام تھا۔ پلٹ فارم سے دھوپ اور اسٹیشن سے
گاڑی دُور ہوتی جا رہی تھی۔ سورج میرے دل سے بولا

سنود سمبر

اُسے پکارو

اُسے بلا دو

اُسے ملا دو

اب اس سے پہلے کہ سال گزرے

عبدالله II

PDFBOOKSFREE.PK

www.pdfbooksfree.pk

ہاشم ندی

فہرست

۷	عبداللہ
۹	جبروت
۱۶	دوسرا سورج
۲۳	خواب اور سراب
۳۰	لا حاصل کی کھوج
۳۸	روح کا عکس
۴۶	دشمن زندہ رہے
۵۴	دل سے دھواں اُٹھتا ہے
۶۳	نفس اور جبر
۷۱	کبھی ہم بھی خوبصورت تھے
۸۰	اک نئی جنگ
۸۹	معصوم سے معصومیت تک
۹۶	پہلا کفارہ
۱۰۴	دھانی
۱۱۲	لفظ گر
۱۲۱	میرا ہر لفظ تمہارا ہے
۱۲۹	لفظ رُوٹھ جاتے ہیں
۱۳۷	تم بھول جاؤ گے
۱۴۶	شائیسار
۱۵۳	قاتل

عبداللہ

عبداللہ کے پہلے حصے، 29 اقساط کا خلاصہ

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کاررہیس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری دس زہرا کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ لیکن زہرا کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اُسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک پہنچ لاتا ہے، جہاں اُس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو عبداللہ کے استاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں الجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اُکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کر لے تو کوئی اس دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرا کسی اور کی نہیں خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھاٹل ہے۔ لیکن عبداللہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرا کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آہیٹا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ”عبداللہ“ کی شناخت ملتی ہے۔

سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرا بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے۔ لہذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے لیکن اپنا سب

۱۶۰	قص اور جنوں
۱۶۷	لہو کا لباس
۱۷۴	آدھا چہرہ
۱۸۰	رُوپ بہرُوپ
۱۸۷	ہم زاد
۱۹۴	آدھا جنوں، آدھا فراق
۲۰۱	گلابی دھند
۲۰۸	”ہوش والوں کو خبر کیا“
۲۱۴	کا سا بلانکا
۲۲۱	”ایک محبت اور سبھی“
۲۲۸	آخری محبت
۲۳۵	”من کی دیوار“
۲۴۲	پہلی قیامت
۲۴۹	21 دسمبر 2012ء
۲۵۶	صیہونی
۲۶۳	آخری میما
۲۷۰	مناظرہ
۲۷۸	ایک اور عبداللہ
۲۸۵	جائشیں
۲۹۲	فریفتہ
۳۰۰	”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“
۳۰۸	”دوسرا رقیب“
۳۱۶	تار شکبوت
۳۲۳	دُھند لے اُجالے، اُجلے اندھیرے
۳۳۲	”بھی کسی کو کھل جہاں نہیں ملتا“

کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخر کار ساحر کے والدین اس کی بیٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ رُوح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس بار اُس کی منزل درگاہ نہیں بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دُور دراز کی سینٹرل جیل ہے جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح ملے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود کبھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے۔ نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رُباب کی حویلی بنتی ہے جہاں باقوت نامی ایک جن زادہ رُباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو نکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رُباب باقوت کے پختل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جیل پور روانہ کر دیتے ہیں جہاں راستے میں زہرا کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست برد سے نکل آتی ہے لیکن خود جیل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارا، لاریب عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرا کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید پیار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرا کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرا کو جیل پور طلب کر لیتا ہے۔ لیکن خود زہرا اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرا کی سچائی اور اس جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرا عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی رُوح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جیل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

جبروت

میری آوارگی میں کچھ ڈھل ہے تمہارا بھی محسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو فریضے بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دو پہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے گولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور سالوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے جیسے کوئی صدیوں کا چھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے۔ گرم لُؤ کے تھپڑے چروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگو یا اور سرد چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں مسکرا کر نال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید ”لُؤ“ تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھوکے بھلا مجھ سے کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔ گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اُڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی دے کی پٹری بھی جگہ جگہ ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے ٹرین کی رفتار اب کافی مدہم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قات نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے نہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگوایا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُؤ کے گرم تھپڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا وہ جلدی سے دوبارہ اپنی کاچھڑ کاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اُپر سرک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص بیلیوں کی مدد سے ٹرین رکوا کر ریت ہٹانا پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک کسرتی ریت اور بدلنے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ آفتق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشیں گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیاسلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیاسلائی سی جلادی تھی۔ جواب تیزی سے آفتق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آغچ پہنچا کر سارے فلک کو جلادینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے چٹکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دیرے دیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا ”چلو میاں..... ہماری منزل آگئی ہے۔“

میں اپنے خیالات کی ردوٹھنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لائین کی کمزوری روشنی کھڑکی کے گلیجے شیشوں سے چھن کر باہر آرہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نمائش کو دوبار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے ”آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے۔“

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سنائے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور کھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا بیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خد وخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

”کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر ممکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلتا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلنے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔“ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ ”نہیں..... ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں۔“ سلطان بابا نے میرا کندھا چھتپایا اور آگے بڑھ گئے۔

میں اپنے خیالات کی ردوٹھنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لائین کی کمزوری روشنی کھڑکی کے گلیجے شیشوں سے چھن کر باہر آرہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نمائش کو دوبار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے ”آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے۔“

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سنائے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور کھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا بیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خد وخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

”کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر ممکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلتا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلنے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔“ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ ”نہیں..... ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں۔“ سلطان بابا نے میرا کندھا چھتپایا اور آگے بڑھ گئے۔

دیرانی سے کیا رشتہ ہے؟“ آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبد اللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرا ہی میرا مقصد تھی تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا۔ پھر زہرا کے بعد وہ کون سا مقصد تھا جو مجھے ان دیرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے باجماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ آن دیکھی دیا سلائی سنگلی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرے بھر سے گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں..... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے۔ دیر سے مسکائے ”بھئی یہاں کی ہر چیز میں جنہیں اس ریت کا ازیلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کال گڑھ والے اب اس ریتلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں مک، مرغ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں جنہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔“ ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتا صرف اس لیے چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دلی یا بدلیسی کارن فلیکس ہوتا تو سارا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے انجان موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے..... کس کو خبر؟

تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قلعہ ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آب حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا۔ قصبے میں نوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں۔ جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درس قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے یوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ لہذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ ”آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعہ داروں کا اسرار مجھے سمجھ نہیں آیا۔“ میرا سوال سننے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ”عبد اللہ میاں..... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے۔ وہاں کا بڑا قلعہ دار۔ سارا علاقہ کا پتا ہے جبروت کے نام سے.....“ ”جبروت.....؟ یہ کیسا نام ہے.....؟“ ”نام تو ماں باپ نے شاید جاہر رکھا تھا، جو پیار سے جبروہ اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔“ جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔ کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوٹوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر ایک برائے نام سی تھانہ نما عمارت میں پارچہ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تھا لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے سارے مقدمے اُسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی اُن فیصلہ کرتا تھا۔ اُس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی، ناگرہ تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری غمزدہ سمیت پھر سے وہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھنے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ سارا قصبہ جبروت کے دیئے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے طے نال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا

سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز ابھری ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سوتا ہے۔“ میں اُچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلق کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسب معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اسی سوچ و بچار میں شام بھی وصل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات تاروں بھرا آجکل لیے ہمارے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا ”اب تم بھی ذرا کرنا کو عبد اللہ میاں..... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔“ لیکن میری جبر آٹکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور جس سے پریشان ہو کر میں حمار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر جھیلے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر سُکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرا کا تارا تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے حمار کے صحن کے باہر میں نے کسی کے پھولوں بھرے آجکل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس دیرانے میں آدمی رات کو اس حمار تک بھی آ پہنچی، کیوں؟؟؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدو خال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جیب نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمبے بھر کو صحرائی جانب بنی، جہاں دو تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جھلکاتی ہوئی حمار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگٹ نکالنے کھڑی تھی تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو اتاد کچھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈل کی ولیز جیپیں ہی تھیں جو اب بالکل حمار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غزانے کی آواز گونجی۔ جیب سے کوئی کوڈر نیچے اُتر آ اور اُس نے بھاگ کر بچھلی جیب کا دروازہ کھولا۔ ایک دروازہ بھولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیب کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں لہذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دروازہ شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ اچانک جبروت کے عقب سے ایک خون خوار کتا میری جانب لپکا۔

خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تہ بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہوئے خون خوار کتے تھے۔ جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد بچپن ہی میں ماں کو گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرہ اور نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اُس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی جب تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی بیوی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس کتنی کو تین کرنے میں جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی بیٹھے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ”انہونی“ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ”قدرت کے لکھے“ کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ لیکن چار کی کتنی پورہ کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُدب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظام کرنے لگتا۔ ہاں البتہ اس کی دل چسپی اگر سدا کی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑی نما کتوں کا دیکھ بھال اور نشو و نما۔ سنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکر کو کوہ انگوٹھ بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹھہرا کر کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پتا ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زد عام تھا۔ کہنے والے کہتے تھے جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اُسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہر شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اُسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہذا اپنے دشمنوں کو مروانے پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس اس جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ طرم کو کال گڑھ کا پتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہو۔ سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سر پٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد جبروت کے خون خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گونج ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی روح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ لہذا اُسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہ چل رہا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم

کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے اُلٹے قدم لوٹ گئے۔

رفنہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا۔ جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کی دوسری جانب تو نہیں آپہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا۔ ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا اُن جان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کئے۔ تسبیح پھیر رہے تھے۔ میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ”کیوں میاں..... کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔“

جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہ راست لو سے بچنے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی چھوٹی ہوئی کھڑکی کے اوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چٹن اور چند پڑے کی کتریں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے چلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ”ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے ارد گرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں.....؟ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہرگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا امیر ایسی ہی کسی دیران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے.....؟“ انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ ”اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنی شہرگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ہی ایک نشانی ہے۔ بس اتنا ضرور یاد رہے..... یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانئیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کنو اب کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہتا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔“ میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ”لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دُور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلا اس میں کہیں نہ کہیں ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ

دوسرا سورج

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غراہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی ”ناں..... کالے!!“ اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زخمی ہونے کے لیے تیار اور اپنے خوں خوار جڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ”کون ہو تم..... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“ ”عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔“ جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ”اوہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟“ ”وہ آرام کر رہے ہیں..... بے سفر کی تھکن ہے۔“ جبروت نے لمبا سا ہنکارا بھرا ”ہوں..... اور جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رُک گیا ”ہیڈ ماسٹر سے کہنا کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوادے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“ جبروت لے لے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں ہڑ بڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ”کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟“ سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ”بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔“ وہ در پردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔ میں نے اکرام صاحب کو ساری تفصیل بتادی جسے سن کر اُن کے ماتھے پر بڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری مائیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دبا میں رہ کر مجھ سے بیراجھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔“ سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اٹھایا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑ بڑائے۔ ”اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟“

”نہیں۔ ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا۔ اگر میرا پوچھیں تو کہیں گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔“ اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے

صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا تو ان کرب ناک چنوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اُونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں بیٹھ رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا۔ اُس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گھلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ رینچھ اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جھول رہا تھا اور جبروت کے اٹھ خون خوار کتے چاروں طرف سے اُس بیڑیوں میں جکڑے قیدی رینچھ پر حملے کر رہے تھے۔ رینچھ کے جسم سے لپٹے کتے اُسے بھنبھوڑ رہے تھے اور گھائل رینچھ کا زخم زخم بدن خون کا فورارہ بنا ہوا تھا، لیکن رینچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے زخموں سے عجیب سی خرخرہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی ٹیکل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے رینچھ کو انتہائی حد تک خطر ناک کر دیا تھا۔ اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت برہانے کے لیے انہیں چلا چلا کر ہشکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بے کف کی طرح اس کی رال بھی فرط جوش سے بار بار پک رہی تھی۔ جب کوئی کتا رینچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر رینچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر رینچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے بچے کے پیچھے بڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور اُن کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ اُن پر غرانا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اُکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دُور ہانک دیتے تھے۔ ان میں وہ کتا بھی شامل تھا جسے جبروت نے رات ”کالے“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً رینچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اُسے رینچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ رینچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر کر دی اور میں نے اتنی دُور کھڑے ہونے کے باوجود اس کا نچھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹختے اور پھر ٹوٹ کر تڑکنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گر گئے

یہاں چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی اثناء میں رینچھ کا بچہ پوری قوت سے لہرایا اور ”کالا“ ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جاگرا اور گرتے ہی بے سُدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ”مرنے دے اس مردار کو۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو۔۔۔۔۔“ آٹھ میں سے دو

ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔“ میں نے چونک کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دُور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے در پہنچے داہوتے چلے گئے۔ ہاں! سچ ہی تو تھا۔ اس سارے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی۔ ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ ایک دم ہی میرے رونگھٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنا بھی پڑی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلاو کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا۔ میں نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ”لیکن کیوں۔۔۔۔۔ اس بے اختیاری کی منزل سے گزرتا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل۔۔۔۔۔؟“ ”سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ آ جائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔“ جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھوڑک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں اُلجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا جب بستی کے بچی اینٹوں والے بازار میں اُونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ بازار کے بچوں کے بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید و فروخت جاری تھی۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بڈل پھاڑ پھاڑ کر گاؤں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اُتروائے جا رہے تھے۔ سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے بیچ ایک کاریگر سامنے بٹ میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پچھلے گا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روٹی دھن رہا تھا اور فضا میں اُڑتے اُون اور روٹی کے ننھے گولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے کدھر پر ایک ماشکی پرانی سی مشین میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اُون دھننے والے کے اوزار کی دھن دھن، اُونٹوں کی جرس، بھینر بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے چلتے الاؤ کی دھونکی اور ماشکی کے آوازے۔۔۔۔۔ سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیویدیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام

مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بندھی اور ون کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیوں میاں..... کچھ سمجھ میں آیا یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معنی کی ایک کڑی ہی تھی۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“ ”بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا۔ اور آٹھ جانب ہے لپکے وہ حملہ آور وہ مجبوریاں، جرم گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے جو ہم ساری عمر جھیلے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب سے اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کے ناک میں ڈلی نکیل ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت میں بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیاری کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔“ مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معنی بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ”بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے۔ لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ ہیبتناک نہیں دکھائی دے تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کافسوں بڑا گمراہ ہوتا ہے۔“

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اوجلا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ سے ہی میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوائے دوش پر مجھے دُور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا دواہم ہی سمجھتا رہا لیکن پھر سلطان بابا کی کبھی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”ہاں..... واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔“ لیکن یہ بدھ لے تو لگا تا اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے جہاں سے آواز آرہی تھی۔ قریب پہنچنے پر آہٹ کی آواز سننے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی جیسی سے آواز میں بولا ”نوری..... تم ہو.....؟“ میں ٹیلا پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے۔ میں صحرا کے مزار کا

کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جروت نے جھولنے اور ڈمگاتے ریچھ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولکے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلا تھاپ سننے ہی ادھر سے کتوں میں جیسے بجلی کی لہری کو گونگی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سینے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہرا تا ریچھ روشن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈی ایٹر (Gladiator) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اتار دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے زخروں میں اپنے خونی جہزے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے زخروں سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشاخیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھو تھنی اور نکیل والے حصے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ گلیڈی ایٹر ہار چکا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشاخیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جُش بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخر بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔ ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گر ا اور گرد کا ایک طوفان اٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولکے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشاخی آگے بڑھ بڑھ کر جروت کو مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکڑے کا منہ کھولا اور ایک شاندار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راش دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آئے، چادل اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جروت اس ہنگامے کی وجہ میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پڑمرہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پُرتم آنکھیں اور اس کا ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم سم میٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنادی تھی کہ میں کیوں اتنا کم صم سا واپس لوٹا ہوں۔

خواب اور سراب

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ”وہ..... لڑکی.....“ سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا یہی وہ چند لمحے تھے جب میری توجہ اُس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی۔ لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اُن دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تم بھی اس صحرا کے چکر میں آگئے نا۔ معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ نمرانہ مانو تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں.....؟“

”تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔ لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دوسرے اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔“ اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ”اچھا.....؟؟؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔“ میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دہرایا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سارنگ، ماتھے پر بندیا..... تم کہو تو ایسی دودرجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوالوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟“ میں سانول کی بات سن کر مجھے میں پڑ گیا۔ ”خاص نشانی.....؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟“ سانول نوری کا نام سنتے ہی کچھ ہٹسا سا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پھر وہ شرما کر بولا۔ ”نہیں جی..... وہ نوری نہیں ہو سکتی..... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اُس کا نام پکار بیٹھتا ہوں۔ وہ بھلا اس دیرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار پہرے لگے رہتے ہیں۔“ میں نے شرم سے لباتے سانول کو چھیڑا۔ ”اوہ..... تو یہ بات ہے۔ پر یہ نوری ہے کون؟“ ”نوری میری منگ ہے جی! بیسیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری اُن ہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اُس نے۔ پھر اُس کے باپ نے گھر بٹھالیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دُور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔“ سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اُس کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا

نیا خدمت گار ہوں تم کون ہو.....؟“ چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ”اوہ..... میں کچھ اور سمجھا تھا۔ نیچے آ جاؤ۔ میرا نام سانول ہے۔ میں یہی کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔“ لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروا دیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا ”تم بانسری اچھی بجالیتے ہو۔ لیکن اتنی دُور دیرانے میں اور یوں آدھی رات کو.....“ اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کر لوں۔ پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ ”مجاور بن کر کیا کرو گے؟ مجاور تو بانسری بھی نہیں بجاسکتے۔“ وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ پر تم مجھے کچھ دوسری قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں۔ تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔“ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا جو میرے ذاتی کلکیشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی اہل ڈیز سے میرے کمرے کے شیف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب، ڈسکو ہر جگہ ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہنچکپایا۔ ”اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا۔“ نہیں نہیں۔ تم بجاؤ۔ مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اُس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اُس کی نظریں بانسری بجاتے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن، اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ دار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ گونجا۔ ”اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سرا ہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے۔“ انہیں سوچوں میں گم میں سانول کی بانسری کی مدھرتان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دُور اُسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں..... وہی تھی..... بڑا سا پلو۔ میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلا ہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ”یا اللہ خیر..... کیا ہو گیا.....؟“

پلوں پر بٹھانے والے سچا ہو کر سرفراز کرنے لگتے ہیں۔ نہ جانے یہ محبت ہمیشہ ہمارے ارد گرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسہ کیوں اور کیسے کر لیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اُس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحرا میں اُس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے نیچے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اُسی وسیع و عریض اور لقی و دق صحرا کے بیچوں بیچ کھڑا پایا۔ سوانیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی چلتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر اُن میں ایک کتا اُچھل کر میرے زرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں..... یا اللہ..... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب.....؟ سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ”خواب تقدیر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے تو آنے والے دنوں میں یہ صحرا تمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا۔ نہ صرف تمہارے لیے بلکہ خود میرے لیے بھی..... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔“

نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی ردوشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رد رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے۔ لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے ابھرنے لگی تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اٹھنا ہی پڑا اور پھر میں چلتی ریت میں پیر دھنسائے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ”کالا“ پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے رچھنے نے

وہ بیٹی کو رخصت نہیں کریں گے۔ لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سودور سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی اُن دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لاسکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقع پر جبروت کی بیخباتی ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرض چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے نئے قرض کی گھڑی اپنے شانوں پر ڈالے قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے تاکہ باپ بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا سارا قرض اسی سال چکاتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے۔ لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اُس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوری کو سات پردوں میں زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا کیوں کہ نوری پر اُس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی۔ اُس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی کیوں کہ جبروت کے حواری اور گرگے آوارہ کتوں کی طرح سارا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے ساتھ اُس کی منگنی طے ہوئی تھی وہ ویسے بھی دہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اُسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندہ اُس کا قصور وار نہیں۔ یہ سارا قصور تو اُس محبت کا ہے جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیوں، درد اور لا حاصل پن کی جھن لے کر آتی ہے۔ جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لا حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اُس کی قربت کی دو گھڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا..... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبور یوں، پریشانیوں، دور یوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دوا ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکار ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے اکھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرانے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طعنے میں بدل جاتی ہے۔ کل تک

پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اچھال کر جھوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے صحرا میں بھیجا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے پہنچا۔ کتے کا جسم بڑی طرح زخمی تھا اور پچھ کے خون خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بڑی طر سے اڈھیر دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھوکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے نکلتی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اٹھا لیا جس کی تہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر پڑائے تو اُس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تاب سے اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کا اصل گہرائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگا دیتا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار کے بنے طاق کے اندر سے پاجامے اٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹے یا رکوٹے ہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں کالے کے زخم کے اوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں اُسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چنا خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی ٹنگنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا۔ لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ بے زبانی..... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی ایک لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز کر دینے والے..... اور اگر ہمارا زندگی سے یہ لفظ نکال دیئے جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جبر شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو۔ کالے نے اپنے جسم کو تو لا اور تقریباً گھسنے ہوا۔ ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے۔ لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی میں بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اونچے نیچے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھرا نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اڑتے گرم گولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا تو اکرام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دہ چلی تھی، لہذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹول ٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے

لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اُردو نہیں بول سکتی تھی۔ سو بوڑھے ہی کو اُس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا دعائوٹی پھوٹی اُردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے رحمان گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن وہ اور اُس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ ریلوے سٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور دی کہ انہوں نے اُس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانائے نے ہی پال پوس کر اُسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی خدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رکتے تھے۔ بقول اُس کے اُسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اُس کی سیکنے کی خوشبو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن ابھی تک اُن کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اُس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کا کارہ پولیس بھی چند دن کی دیکھا ہے کی دودھوں کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کر دیا تھا کہ کون روز اندان دو خطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سیکنے کے نانائے نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہر کارے اُس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کتے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو بلکان کرتا۔ لیکن سیکنے کی نانی نے علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُسے اب بھی اُمید تھی کہ اُس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اُسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑ گڑایا۔ ”میری لگائی ٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، مگر انہیں انٹا۔ پر یہ کہتی ہے کہ اُسے روزانہ کئی مینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سیکنے اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سیکنے دوزر دوزر سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے.....“ میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی اہیلوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑ گڑا رہا تھا۔ ”آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی..... ہم بہت

مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دُور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔“ بوڑھے بولتے بولتے بھرا سا گلیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھرا بھول کر پلو سے اُس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا دو مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلا سادے رہے تھے، حالانکہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان دلا سا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم ہی میرادل بھرا آیا اور میں نے وہاں سے اُٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اسے میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی۔ آنے والا سانول تھا، جو دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اُس سے پوچھا۔ ”خیر تو ہے..... کہیں نوری کے لیے کو منت مانگتے تو نہیں آئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”منتوں سے اگر پیار ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا دیران نہ ہوتا جتنا.....“ ”واہ..... بڑی بات کہہ دی تم نے۔ کہو کیسے آئے؟“ سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اُسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اُس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ نہ نہ مانیں بقول سانول نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اُستاد ہیڈ نام اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اُس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اُس سے پوچھا۔ ”جہاں اُس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔“ سانول بھی ہنس دیا۔ ”اُس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے پنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو کیا نیاز بانٹا کرتے تھے۔“ یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ”معاونت عشق“ کے جرم میں اُس کا پورا ساتھ دوں گا۔ سانول کو پریشان دیکھ کر میں بھی سوچتا رہا کہ یہ پیارا اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کاٹنے کیوں لے کر ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر بیٹھنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا تو وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لیے۔ اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنا پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار محبت کا جذبہ ہماری رگوں سے سارا خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری رُوح کے کشتوں کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ ”واہ یہ بے چارے یہاں بھی آپہنچے.....؟“ ”تم جانتے ہو انہیں.....؟“ کال گڑھ میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا

پہلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکت پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواہی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپ چاپ چھان مارا لیکن ان دنوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو اُن کا کچھ نشان تو ملتا؟“ جاتے جاتے سانول ایک بار پھر باپورا منصوبہ دھرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ میں بھی اکر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سیکنے کے نانائانی کو تسلی دی کہ انشاء اللہ جلد اُن کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے پڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے گر گئی لیکن اُسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے اس قدر رنجو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی۔ پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار پڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز جگولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی پڑے سمیٹنا شروع کر دیئے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کپڑے کیا تھے، چند کتہیں ہی تھیں۔ بڑھوانے ایک زمانہ دوپٹے کو ڈور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اُس جانب بڑھا، جہاں مزار کے صحن میں اُس کے کپڑے کے ایک جھاڑ میں وہ دو پٹا لٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اڑتے ذروں نے اُس پاس سب ہی کچھ ہندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے دئے۔ یہ..... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اُس انجان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ لڑکی تو تھا..... لیکن یہ دوپٹا..... یہاں کیسے.....؟ میں نے جلدی سے کپڑے کپڑا علیحدہ کیا اور اسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبواہٹ دیکھ کر گھبراے گئے۔ میں نے جڑی سے پوچھا، ”یہ کپڑے کس کے ہیں؟“ اکرام صاحب نے جواب دینے کے لئے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ہماری سیکنے کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اُس نے اپنی بد نصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لے بھرتی ہے جی۔ کہتی ہے اس میں سے اُسے اپنی لاڈلی کی خوشبو آتی ہے۔“ میرے ذہن میں بیک وقت نے کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جو انجان لڑکی رات کے اندھیرے میں اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سیکنے ہی تھی۔

لاحاصل کی کھوج

پرے سانول کو لے لے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زور دار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ”چھوٹے پیر جی..... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔“ اُس کی اس ”چھوٹے پیر جی“ کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا اور اُس کے چہرے پر بیک وقت حیا، شرم اور کچھ غصے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ”سعادت مندی“ کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اُس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُر سکون نظر آنے والی نوری کسی سمندر کے بے چین مدوجز کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد وری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب نوری کے ماں باپ کی زبان پر ہی چڑھ گیا تھا اور وہ رخصت ہوتے وقت تک مجھے ”چھوٹے پیر“ کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کا گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتقد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی منت صرف نوری کی اک نظر ہے۔ لیکن اس پیکر حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر پچھی ریت ہی کو نہار نے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اُس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پرشورہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اس کے حصے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لیے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔ اُس ایک نظر میں۔ حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک لوداع..... تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گی۔ لیکن مجھے یہ بھی پتا نہ کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح بست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اسی ایک نظر کی کک اور تڑپ کے اثر میں لڑ جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ محبت ہر حال میں ایک دودھاری تلواری تو ثابت ہوتی ہے۔ نہ تو جہان کی کاشی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ جلا کر رکھ دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی کک کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز گولے اور ریت کا طوفان لارا کھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک لمحے ہی کا سبکے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاسترہ وجود کو لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی تو میں نے انہیں سیکہ کے دوپٹے والی

میرادل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر اُن دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سیکہ کو دیکھا ہے لیکن نہ جانے وہ کوا سا احساس تھا جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چا سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سیکہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بنا پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے نو کا تو میں۔ جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی۔ شاید جمعرات کی ہ سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک کچی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جھجھکتی سی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پٹو نکالے اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری..... واقعی سانول! تڑپ اور بے چینی بلا وجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی ساد میں کس قدر کشش ہوتی ہے۔ کچھ سراپے خود سراپا ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کبھی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا اُس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سیکلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اُس کے گھر چلی جائے۔ اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں۔ جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور میں نے دُور صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے

دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیاں انداز میں بولا ”میری ایک بات مانو گے اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“ مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔ ”کیوں.....؟ ایسا کیا ہے اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ۔ کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔“ سانول نے بات ٹالنے کی بہتری کوشش کی، لیکن میرے معمم ارادے کے آگے اُسے ہار ماننا پڑی۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل وہاں گئے بھی تھے۔“ سانول بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے نوکا ”تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے؟“ سانول نے گہری سانس لی ”پیرل کو اُس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ یہاں اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ”خدا کے لیے یہ پہیلیاں بھجواند کر اور مجھے پوری بات بتاؤ۔“ سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کبھی کبھی مجھے تم وہ نہیں لگتے جو تم ہو..... لیکن پتا نہیں پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتا ہوں۔“

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اُس نے دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا سنتا رہا۔ سانول کے مطابق وہ اور پیرل اُس رات گھر والوں سے چھپ کر قریبی قصبے میں نوٹکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اپنی پرانی دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے تو بستی کی مشرقی سمت جہاں صحرا میں کچے گھر ڈور ڈور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی بجی چار دیواری کی آڑ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اُس کا دست ڈر کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ بالکل ختم ہوئی تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لئے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا بوڑھا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سیکڑی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر تنک دینا شروع کر دی۔ اسی تلاش میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک کھوجی ہے، لہذا انہوں نے اپنی نوایں کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو نوکا۔ ”یہ کھوجی کیا ہوتا ہے.....؟“ سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا تمہیں کھوجی کا نہیں پتا۔ یہ تو بڑے گنی لوگ دتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن اُن کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ دتا ہے جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا

ساری بات بتائی کہ اسی چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میرا بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ”گویا وہ صرف ایک سراب ہی نہ تھی۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈمگانے پائیں۔ دیسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا دے چکی۔ اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔“

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور ہمیشہ کی طرح چپ ہی رہا کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اب میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غراہٹ سنائی دی مجھے اندازہ تھا کہ ”کالا“ بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار پر چار دیواری ہی کا رخ کیا کرتے گا کیوں کہ اس نے پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ”دیس نکالے“ کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ وہ اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پمارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ رو کے چند کلوے نلگے کے بعد کالا وہیں پیر پیر کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آگئی تھی کہ وہ مزار کی دیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لے ہوا کے دوش بکھری۔ اُس کی تان میں جو درد آج تھا۔ اُسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید شیلے نے کہا تھا ”ہمارے سب سے پیٹھے نفے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔“ آج سانول بانسری بھی شیلے کے اس قول کو جابج ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے ہونٹوں سے بانسری لی۔ میں نے قریب جا کر اُسے چھیڑا۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک تمہاری دھن کو اتنی زندگی دے گی۔ ورنہ اُس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر غمخیز کی التجا ضرور کرتا۔“ سانول پھسکی ہی مسکراہٹ ساتھ بولا ”میں ہر لمحہ اُسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کبھی اُس کی ایک آدھ جھلک پالیتا ہوں پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ.....“ ”پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر۔ پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ اس مرتبہ سانول کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ مگر کامقد ر صرف کانٹے ہو ہیں، مگلاب نہیں۔

میں ابھی تک سیکڑے کے بھید میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سیکڑے ہی تھی۔ لیکن اس بار سانول عمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی انگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر ادھر

نے باہر ہی روک دیا۔ سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ کھوجی نے اپنے کرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور اُن سے مچھ کی کچی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ مچھ میں اترنے سے پہلے اُس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنائشان والے اُونی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد مچھ کی ریتیلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔ میں حیرت زدہ سا سانول سے فکڑ پڑنے اُٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام مچھ اور پھر دونوں کچے کسروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سیکنے کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا۔ پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں کھرچا کہ ڈوری کے دونوں سرے کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگلیوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں ابھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور مچھ سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ”کیا تمہاری نواسی بانئیس سے جوئیں سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔“ بوڑھے سے پہلے بڑھیا چلا اُٹھی ”ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اترتے وقت اُس کے پاؤں میں موج آگئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی۔ لیکن تمہیں کیسا پتا؟“ کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ”اس مچھ میں اور کسروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بانئیس تیس سالہ نوجوان لڑکی جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بو جھنٹیں ڈال سکتی، موجود تھی۔ لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہو سکتا ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہر حال ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے۔ اب رات سر پر ہے۔ لہذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اُٹھانا شروع کریں گے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سیکنے کس طرف گئی ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزاردیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ رات میں دیے بھی کھوجی نشان نہیں اُٹھا پائے گا۔

اُن کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اُس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے کیوں کہ کھوجی نے مچھ میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو کریداکہ اُسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی روح کو گھسیٹا گیا تھا وہ سیکنے ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چونکہ گھسٹنے وقت بھی لڑکی اپنے

ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حیات تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بو کھونج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ زمین پر پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ پر پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔ عورت کا ہے تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی۔ حتیٰ کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالے تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص کیے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال و حال اور رہن بہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہر حال یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمبے کے لیے سیکنے کو بھی بھلا بیٹھا۔ پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سیکنے کے نانائانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لیے آن پہنچے۔ اُن کی گریہ و زاری سے کھوجی کا دل پہنچ گیا اور اُس نے حامی بھری۔ اگلے دن طے یہ پتا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سیکنے اور اُس کے شوہر کے پیر کے نشان اُٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا۔ لیکن کھوج اور نشان اُٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن چوں کہ صحرا کے بچوں کا تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پہلے بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جسنے نہیں دیتی تھی اوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت۔ نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اُس کا دوست پیرل اور سیکنے کے نانائانی بھی کھوجی کے ہمراہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے ہستی میں داخل ہو رہے تھے۔ سیکنے کی نالی بار بار سیکنے کی چادر کو جومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی اُن کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سیکنے کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن اس بار اُس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے گر ڈک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ کھٹی کھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن آدھی کچی چادر دیواری کے پار آگن کی ویرانی اور شاننا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مچھ سے پرے لکڑی کی بلیوں والے چھت کے برآمدے میں کھٹنے والے اندر کے کسروں کے دروازے بھی ادھک ہلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھپٹا چھار ہوا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر مچھ میں داخل ہو گیا۔ لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا ”اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول۔ مچھ کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی نشان باقی ہو۔“ سانول کے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں

کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لائینن تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ”اس وقت کون ہے بھی؟“ دفعتاً اُس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ”تم؟؟“

دائیں پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پارہی تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر جب وہ صحن میں گر پڑی تھی تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش کش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی اُن ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا۔ جو اس نے نانائانی کو دکھائے بغیر ہی اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اُسے اگلی صبح کھل ہی جاتا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ”پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....“ لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اُسے تجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ”اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا مونسا سانا لاہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینے کے بد نصیب نانائانی کھوجی کے بند درہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا تو پیرل اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کر دیا کہ بڑے شہر میں اُس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہذا اُسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینے کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سر دروے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا۔ البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ و زاری سے تنگ آ کر وہ دگھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اُس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھانسنے کے بعد حتیٰ اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے اُس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے لہذا اب یہاں سکینے کی تلاش لا حاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔“ سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اُسے خود بھی اس نامکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔

”لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا۔ تم نے اُس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔“ سانول نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”کھوجی نے اُس دن کے بعد سے اپنے لب کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔“ ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں؟“ سانول میری بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ”اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو، عبد اللہ۔“ ”میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے۔ چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔“

روح کا عکس

دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہے..... آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اُوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور اُن کی مدد کریں لیکن آج آپ نے اپنے فرض اور کام سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ختم نہ کر دے۔“ میں بات ختم کر کے واپسی کے لیے پلٹا تو کھوجی بیچانی انداز میں چلایا۔ ”نہیں میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی..... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آ جاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ پر اُسے اگر کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا.....“ سانول نے حیرت سے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اسی امید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جی کچھ برف پگھلے۔ ہر فرض شناس کارِ مگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تملکار بول اٹھا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کمزور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بد نصیب اور لاچار بوڑھوں پر ترس نہیں آتا جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی چلتی ریت چھانٹتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر پٹا۔ ”تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ اگر میرے سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے بیٹے کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن.....“ کھوجی کچھ بولنے بولتے چپ ہو گیا۔ پھر لمبی سی سانس لے کر بولا، ”اچھا غور سے سنو..... میں اگلی صبح اُس مکان کے باہر نشان اٹھانے کا کٹا گیا تھا۔ نشان اٹھانے کا بہترین وقت صبحِ شبنم اور کمرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے جب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچتے تھے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسنا گیا تھا اور پھر اُسے کسی اُونٹ پر لا دوایا گیا تھا۔ بس اس جگہ سے اُسے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم بھی سمجھ ہی گئے ہو گے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے اس پردہ میں کیا کر لیتے۔ اسی لیے میں چپ رہا اور بس.....“ میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اُس اُونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں۔ آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟“ کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ”وہ ایک نہیں تین اُونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی ہڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں.....؟“ ”ہاں..... اُس دن تھیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ہستی کے بازار میں دیکھا تھا تم مزار کے نئے مجاور ہوتا..... لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“ اب سانول نے بات سنبھالی۔ ”ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔“ میں اسے یہاں لے آیا۔ ”کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ”خدائی خدمت گاری“ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لیکن وہ چپ رہا اور بادل خواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور سانول صحن میں بڑی جھلنگ سی چارپائی کی پائنتی پر ٹپک گیا۔ باہر گلی میں اکاؤنٹ نمازیوں کے کھنکھارنے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ”آپ سکیزن کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لائین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دانت پیس کر بولا۔ ”اچھا..... تو یہ تمہاری شرارت ہے، بد معاش لڑکے۔ اسی لیے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سامنے سے دُور بھجا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے..... میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔“ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ”سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکیزن کو صحرا میں دیکھا ہے۔“

یہ دوسرا دھماکا تھا جو عین کھوجی کے سر پر کسی بم کی طرح پھٹا۔ ”کیا.....؟ تم نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے۔ مگر کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم مجھ سے اس کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو۔ جا کر اُسی سے پوچھ لو نا۔“ میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں جس سے مجھے اُس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے۔ لیکن شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“ کھوجی غصے سے پھر گیا۔ ”کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔“ کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعا پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو کھوجی

”جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔“ اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو پوری کائنات ہمیں خدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے۔ ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں براہ کرد دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دوسانس لینے دیتی تھے۔ جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جڈائی کا زہر پلا ڈھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں۔ وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اُس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرائیں کسی کارپوز چر کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔“ مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ”کالا“ بھی مزار کے باہر آکر مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اُس کا رخم دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اُس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ میں اُس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد میں پھر اس دیران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کروں میں بنی ایک گننام قبر کے اوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ ادھر ادھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم سم بیٹھا دیکھ کر میری طرف آگئے۔ ”کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو نکال بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ”آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کبیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔“ سلطان بابا مسکرا دیئے۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کسی کو خدا اس آئے تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو عبد اللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فزرا نگہی؟ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔ ”بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ”کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ..... نہیں۔ بس اُس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔“ سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید اُس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لیے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔“

تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔ ”مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔“ تو پھر آپ نے یہ بات سیکینے گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔“ کھوجی نے بے بسی سے سرچٹا۔ ”کیسے بتانا، انوکھ کنڈگان کو کچھ جلی شام ہی ہمارا ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اُس مکان کے سامنے سیکینے کے نشان اٹھا رہا تھا، تب ہی وہ اندھیرے دو تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پٹپٹے۔ اُن کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خور آلود کپڑے تھے جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ بھڑا دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکت پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اُسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اندر کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے آ گیا۔“

کھوجی اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ م سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج۔ کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مز اُبھنیں سمیٹ لائے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات تک کی تمام روداد انہیں سنادی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سیکینے کا معاملہ کسی قبائلی ریشہ داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر انہوں ان ہونیاں عام تھیں۔ لیکن اُسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے بھانے سے سیکینے کے تالی نام کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اُن کے بقول سیکینے بہت پہلے ہی اپنے شوہر جیم بخش منسوب تھی اور بنا کسی اُلجھن کے اُن کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید اُلجھتے جا رہے تھے اور ہر جانہ سے میرا راستہ ایک بندگی میں آکر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلنے کو لے دو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچ چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سوا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اُسے دیکھ کر چونک گیا۔ ”خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے.....؟“ سانول نے سرچٹا۔ یہ لوگ مجھے سکا سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتہ کے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اُسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی تاکہ سال بھر میں اپنی بیٹی رخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میرا بانی کا ہر ساز تو اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر ذہن اسی ایک کے لیے۔ میں تو مر جاؤں گا اُس سے ڈ جا کر..... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھ جائے گی۔“ میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم ادھیڑتے دیکھتا رہا۔ ال کیسٹ میں پاؤلو نے غلط لکھا ہے۔

میں اپنی ساتوں کا کیا کرتا.....؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر ایک تفصیل مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دُور کوئی پھر رو رہا تھا۔ اُونٹوں کے کوبانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دُور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُونٹ خرخرارہے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے ریت پر پڑنے والے اُونٹوں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پھرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نثارے پر چوٹ کی آواز تیز ہو گئی۔ ریت کا ایک طوفان سا اٹھا اور میں اُسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بنتا گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔ جیسے لوگ مجھ سے فاصلہ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں لیکن بری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دُور پھیلتا ہوا دیران صحرائی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دُور تک کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا..... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر دُور آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان ختم کیا تھا۔ لیکن میرے اندر اٹھا دفان کی ریت کے جلتے بگوئے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا.....؟

برے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا رخو سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ خُرا کیا حد تھی میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو نئے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ ہر اکی رُوح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان دیرانیوں کی خاک کیوں مان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ نئے کب سے تہجد کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے محن میں نکلے اور مجھے یوں گم سم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں بے چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ ا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، اُن کے سامنے اُگل دیئے اور قافلے کا راجہ احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے۔ لیکن انہیں اس بات کا ساں ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو اُن کا لہجہ تھا ہوا سا تھا۔ ”میں تم کو کس دور سے گزر رہا ہوں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ رستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہو۔ لیکن قصر سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمارے لیے اپنی اُڑان بھی اُونچی رکھنی پڑتی

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا
وہ ایک مشت غبار ہوں
پڑے فاتحہ کوئی آئے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قافلے میں کیا بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص میرے لیے یہ سطرین کہی ہوں گی۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسے ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرائی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی۔ لیکن آج اُس کی تان میں کچھ عجیب ہی کک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز اور ہماری تانیں بھی اُسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم جس زدہ رات مجھ کی کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سینکڑی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اُسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرائیوں کی نظریں گاڑنا بیٹھا تھا جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ چھاڑ کر کوئی معجزہ رُومنا ہونے والا ہو۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میرا آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرا مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تب ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے نکل کر آئی۔ شاید اُونٹوں کا کوئی قافلہ صحرائے گزر رہا تھا۔ ہاں..... یہ قافلہ کی بجتی جس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اُونٹوں کے گلے میں بندی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرائیں قافلے صبح اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ مسافر شب کو اُٹھتے ہیں..... جو جانا دُور ہوتا ہے.....“

یہ کیا..... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی اور مجھے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ مزار سے باہر کھلے صحرائیں ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دُور دُور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

خج انسانی خدو خال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سیکنہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے.....؟“

”ہاں..... ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سیکنہ ہو۔ لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے اچھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں ریلوے اسٹیشن پر اُس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا بلا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن اطمینان رکھو جلد یا بدیر تم اس ہولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔

رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی لہر زندہ رہ سکتی ہے تو پھر ماضی کی دیر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی لہ ہو۔ اور قدرت نے ہی تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ تانت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی سن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں ”جب جو جو ہوتا ہے..... جب تب سو سو ہوتا ہے.....“ سلطان بابا ابات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی مخصوص جگہ گم سم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے پر رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل نہ بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات بکھیر دیے۔ میں گھبرا کر چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چوٹے تو مجھے اسانگا۔ مطلب یہ صرف میرا واہمہ نہیں تھا۔ آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین کرنے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اُسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر رہا نرسی بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اُس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھسنے جا رہے۔ دُور سے میں نے اس اُونچے نیلے پرفجر کے جھپٹے میں کسی عورت کا بیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف لڑچر رہی تھی اور اپنی مخصوص زبان میں کسی مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ نیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رکنے لگی۔ یہ وہی ٹیلا تھا جہاں سال گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

ہے۔ جان جو حکم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے ابھی تمہیں ایسے مزید عذاب جھیلنے ہوں گے۔“ میں دو چلا اٹھا۔ ”لیکن میں ہی کیوں.....؟“ وہ مسکرائے۔ ”میں نے کہا تھا..... کچھ چٹاؤ قدرت صرف اپنے میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چٹا۔ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ تو ار تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحے یہ سب ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دُور تک چلے آئے ہو۔ کوئی ایسا ہیں جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور پنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اٹھا سکے اور کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چھتے ہوئے آج اس مقام تک ہو۔ اتنا زور ابھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رخصت کرے گا۔ نے بے بسی سے سر پٹا۔ ”آپ جانتے ہیں۔ واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خ ہے۔ لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع ق کئے بیٹھی ہے۔“ انہوں نے میرا کندھا دیا۔ ”اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔ آزمانے والے پر چھوڑ دو۔“ میں نے تھک کر ہتھیرا ڈال دیے۔ ”لیکن یہ بھرے پرے قافلے کی صدا نہیں کیا ماجرا تھا.....؟“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”صحرا کا اپنا فوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو۔ جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی ایسے صحرا اور دیرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو، یعنی ایسے مادے سے کہ جس کے اندر سے روشنی بنا کر اُترے گزر جائے تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانو سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اُن کی دنیا کی آوازیں سنیں ہیں تو اس کا ما ہے خاص اس لمحے میں قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے اُن غیر مرئی صدا بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی اُن کی د فریکوئنسی سے جدا ہے۔ لہذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ کچھ خاص لوگ ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری د کہ دو جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔“

میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ ”اگر تصویر کا ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے تو پھر اس کا مطلب کہ سیکنہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے۔ کیوں کہ میں نے اُس کی واضح تصویر دیکھی ہے۔ دھندلی

دشمن زندہ رہے

پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اُس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولا دی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی ٹکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت تو سانول کا ہوش میں آ جانا ہی اُس کے پیاروں کے لیے غنیمت تھا۔ سانول کی دیگر گوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اُسے فی الحال بستر سے اٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لیے اٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رکنے کا اشارہ کیا۔ عبادت کے لیے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے تو اُس نے دھیرے سے پوچھا ”وہ اُٹھی تھی.....؟“ مجھے اُس کی حالت سے زیادہ اُس کے سوال پر ہنسی آ گئی۔ ”کہیں اُسے بلانے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟“ میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ ”اُسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کا ندھوں سے اُتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔“ پھر اُس نے صحرائی زبان میں ایک مصرعہ پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ ”عاشق چاہے جیسا بھی درد اٹھالے۔ کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھالے، دنیا والے اُس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے۔ تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو تو اس سے داد پاسکے۔“ میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قلعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ..... صرف لفظ اور لہجہ ہی رہتا ہے۔ باقی ہر کک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، جھپٹ اور کک کی وحدت۔ رُوح کو آری سے دھوون میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ طرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف مول کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام ”محبت“ کیوں نہیں رکھ دیتے؟

سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ لہجہ ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی ٹپکتی رہی ہے۔ اگرچہ مردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے اتنے قریب نہ آ سکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اُس کے لیے چھین آنکھوں اور بے تاب رُوح کو سانول کے سر ہانے ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی بار سے پرے اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سمیری بات سنتا نہ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اُس کی حالت مزید ہیچانی سی ہو گئی۔ دیواروں سے پار

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اگر عمر کی چوڑاھن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے کچھ آچکے تھے۔ نیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تو اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے ہی صحرا کی جانب لپکے تھے۔ جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ جب اور سلطان بابا اُسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اُس گوالے کی نظر ہم پر پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جروت کے قلعے میں دیکھ چکا تو پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے نو، سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے اُنڈیل دیں، لیکن فی ا سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگو ہٹکھٹکھا چھٹا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور اُن کے پیچھے کا باپ ہڑبڑاتے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال ”کیا ہوا؟..... کیسے ہوا۔ کس نے کیا.....؟“ اور وہی ایک جواب کہ ”اللہ جانے.....؟“ کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عورتوں اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی سانول کے باپ کو سلام کرتا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو وہ صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر جا چکا تھا اور اُس کے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نوری اور نوری خود سراپا دعائی اُسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی۔ اس اثناء میں، سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سر ہانے موجود تھا۔ جب اُس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھیا ہوئی مقام قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اُس رات بھی حسب معمول اپنی مخصوص

بول پڑے۔ ”چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کو ہو آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیر تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اُس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ”بڑے اور چھوٹے پیر صاحب“ کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے درختے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے اُس اِس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دُور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی میرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی تو کال گڑھ میں بننے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا در پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ داروں کی منت کر کے ان سے مزید کچھ رخص لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت جہاں پانی ملنے کی کچھ امید ہے، وہاں پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یک سرہ رد کر دیا۔ ایسی بارہا کوششیں پہلے ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعی لا حاصل، صرف وقت کے بیاں ہی کا باعث ہوگی۔ اچانک کوئی کسی کو نے سے بولا ”تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔ اب اور کوئی چارہ نہیں۔“ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی خواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے ”اگر آپ سب یہی مشورہ ہے تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں رکھی بستی کے مرد نماز استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔“ سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ آہستہ اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی۔ اس سے میں صرف اتنا ہی لمبہ اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنائستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جھگڑا اس کی ناراضی کا سبب

جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن دیوار کا دوسرا نام ہی زکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لیے، نہ جذبول کے لیے۔

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سیکڑے کو اٹھالے جانے والے چار نقارہ پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سیکڑے کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معرہ تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے ”تمہارا دوست آیا تھا۔ میں نے اُسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اُسے تمہارا عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔“ وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے ”ہاں..... ایسا ممکن ہے..... سانول کو ہم اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔“ میں نے اُس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا۔ ”کیا دشمنی بھی خالص اور ناخالص کے پیمانے پر تو لی جاتی ہے۔“ دشمن بھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے.....؟“ انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر بھونک ماری۔ ”سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے اتنی تو شاید یہ دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ”کون سا قول.....؟“ سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور تو دہرایا ”دشمن زندہ رہے۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ برآمدے کے قریب رک کر وہ میری جانب چلے۔ ”لیکن یاد رہے..... یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔“ سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور ہم ہمیشہ کی طرح اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت و ترین انسان جذبول میں شمار کرتا تھا لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ رہے تھے، سلطان بابا۔ ”دشمن زندہ رہے۔“ جانے یہ قول دعا تھا یا بدوعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں سا رات کالے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی ہمیشہ کی طرح کسی اُن ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوچھی کہ خود

سے اٹھ بیٹھا۔ صحرا میں بادل، کتنا عجیب تضاد! میز لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اُس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا اور آپ ایک اُن ہوتی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔“ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارا اکیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔“ سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح ڈھل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی برسی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلت رنگ بننے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا سادہ بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے کہ اُن کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر اُلٹ دی کہ ”میں نے اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اُس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب ل کر کھو جو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟“ یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تھلا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اُسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت اور عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا جب میں اُس سے ملنے اُس کے گھر پہنچا تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سر ہانے بٹھالیا۔ اُس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اُس کے باپ نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلا ہوا تھا لیکن فی الحال اُس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اُس پر حملہ ہوا ہے بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اُس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی وہ سانول کی مزاح پر سی کے لیے اُس کے گھر آیا تھا۔ مطلب میرا شک ٹھیک تھا کہ اُن نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سیکنے کے انخوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے میرے خدشات دو چند کر دیے تھے۔ لیکن میں اُسے اپنی پریشانی بتا کر مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر کال کے پاس بیٹھنے کے بعد اٹھنے لگا تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اُس کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آئے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ

بن سکتا ہے، لہذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد و عورتوں کے وہاں سے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہر حال عصر سے کچھ پہلے بستی۔ مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ مجھے اُسی دن راستے میں سلطان بابا۔ بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نماز استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان بابا سے بار در خواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامعہ کے امام کا حق ہے۔ بلا خرامام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رخصت ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ سورج اب اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی بدلی تو کیا کسی مٹی یا ریت کے گبولے کے آگے بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی وہاں حسب معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لا پرواہ ہو گئے تھے، خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوند سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بلا ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسار میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اٹھ کر آسمان کو دیکھا۔ میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر آج یقین اور بے یقینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدمی رات قریب جب مجھے پہلی چمکی آئی تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا۔ لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی تو نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے سارے بچے کاغذ اور پلاسٹک چٹائیاں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک

نولے میں سے تو نہیں تھے لیکن ان کے تئیر بھی اس وقت کچھ دیسے ہی تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اُسی طرح اپنی جگہ جمجھد ہو گیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے رقد بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر میں ہی میرے سر سے لر کر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دوران یہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پاؤں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک سکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنالیا تھا اور باقی دو بھی اُسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے۔ تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے۔ ہم انسانوں کی طرح کسی کج بخشی یا نکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی۔ شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سالہکا کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے۔ جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ تب تو تب ہے جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہم سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم ظرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلا طے کر کے جیسے ہی نیچے اترا تو میرے پاؤں جیسے ریت پر گر کر رہ گئے۔ مزار کے باہر روت کی جیب کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟؟

کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے..... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل میں کر شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی الٹ پلٹ چاتے ہیں ہمارے اندر کے ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہذا میں کل پھر آؤں گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چادل بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا تو چ عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں، جھکا کر سلام کر کے آگے بڑھنے لگا تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ”شالا چھوٹا، جیوے.....“ کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی میٹھی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں اور خدمت کی میٹھی۔ مجھے ممایا د آگئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرا عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز ابھری۔ ”چھوٹے پیر جی.....!!“ میں ٹھٹھک کر ہا اور حیرت زدہ برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹنے ہوئے دیکھا۔ اُس نے بھی علاقے ا ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اُس کے وجود کی لرزش اتنی دُور سے بھی محسوس کر سکتا تھا باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں اور اُس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اُس نے بچ روک تو لیا تھا، پر خود اُس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھار کر اُنے متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑاسی گئی۔ ”وہ جی..... چھوٹے پیر جی.....“ آپ اس سے کہیں ناکہ وہ شہر چلا جائے یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔“ مجھے نوری ا تشویش کا اندازہ تھا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔ میں سانول سے بات کر دوں گا۔“ میں بات ختم کر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی، بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیکن مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے گاڑی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسہ تھا، جس نے نوری آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے یہاں سے دُور چلا جائے۔ دشمن اگر اُن جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی ک چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اُونچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ غراہٹ رُک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی۔ لیکن کالا ہوتا تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں

دل سے دھواں اٹھتا ہے

مہر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں اواز نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا تھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُسے جبروت کے رات والے پیغام کی زوداد سنائی جسے سن کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”اوہ..... یہ تو بہت فکر کی بات ہے۔ پھر بڑے پیر صاحب نے انہیں کیا جواب دیا۔“ ”وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کال گزھ آئے ہیں اُسے پورا کیے بنا وہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔“ سانول نے مجھے سے پھر وہی سوال کیا۔ ”لیکن ایسا کیا مقصد ہے اُن کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟“ میں نے لمبی سی سانس لی۔ ”یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں اُن سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اُن ہی کو دے رکھا ہے میں نے۔ لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اسی میں تمہارے اپنوں کی فوٹی ہے۔“ سانول نے تنک کر سر پٹا۔ ”جانتے ہو میں ایک پل کے لیے بھی اُس سے دور نہیں جاسکتا۔ اس کے بنا تو میری بامسری سے بھی سر نہیں نکلتا۔“ ”اور اگر تمہاری ذہن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب.....؟“ سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتادی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہو گیا۔ ”وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں وہ بھی زمانے کے ماتھل گئی ہے۔“ میں نے سانول کو ڈانٹا۔ ”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ تب ہی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو۔ تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔“ سوچو وہ بھی تمہاری جدائی ہی اتنی ہی پریشان ہوگی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم نا کچھ احساس کرو۔“ سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھٹنہ بھر کی بحث کے بعد اُس نے تھکا ہوا ڈال دیئے اور میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ”آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے ہر جانے کی ہامی بھری ہے۔“ سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سر ہو گیا ہے۔ اُس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔ بھی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔“ سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول اور اُس کا باپ بھی مسکرا دیئے۔ مزار سے نکلنے ہوئے سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ”لیکن مری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا اور یہ ملاقات کل شام ہی ہو

مجھے جبروت کی جب مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا میں اُسی کے زیر اثر تقریباً دوڑ۔ ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لے لے لے لے اٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالتا ہوا چیپ میں سوار ہو گیا جہاں ڈائریوسیت ایک دو محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گ رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانس لے لے اُن کی جانب بڑھا۔ ”یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“ ”دھکا نہ آئے تھے..... لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں.....“ میں مزید الجھ گیا۔ ”پوری بات بتائیں.....“ سلطان بابا اٹھ کھڑے ہوئے ”جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اُس کا سکھ چلتا ہے، لہذا آئندہ کوئی اجتماع کرنے سے پہلے اُس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔“ میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ”تو آپ نے کیا جواب دیا؟“ وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزرا ہی مانگ کر ہوتا ہے۔“ گویا انہیں سانول کا سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ٹیل جنگ بچ چکا ہے اور اب جلد یا بہ ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ لیکن میری قسمت میں آر کہاں..... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی میری جگہ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے۔ کہ ہیں پرانے زمانوں میں کا بن اور جادوگران تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کر۔ تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تار اکھوجتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا۔ گردش میں سدا رہتے ہوں انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جکد نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کہ دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا۔ جلدی سے اٹھ کر مزار منڈیر سے باہر جھانکا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا بھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا اُس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سناٹا شروع کر دیا کہ وہ۔ لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دوبار

شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ”کوکلا چھپا کی“ کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنسا تا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریر بگولے نے کہا ”جانتے ہو وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں؟“ ”ہاں.....“ میں جانتا ہوں۔ سب ہی پھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے۔ کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے.....“ سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دُور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دُور بھیجے کی جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جُدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر رُوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرا کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اُسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ بل بھر کی ہی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند بل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سبیلی کے ساتھ ٹیلے سے اُتر کر سبیتی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم سم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اسے آنسو کی چمک، میں ڈوبے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دُور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھنگی پٹلیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع..... ایک اور عذاب جو سانول اور نوری کی جُدائی کی صورت میں میری رُوح کو قہقہہ پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اُس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے قدموں کے نشان گئے تھے۔ میں نے اُس کی تنہائی میں دُخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اُس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اُس کی رُوح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چھنے، ان سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے لہجہ سے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بہت مضطرب لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ دماغی مل کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جُدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک بے سہ ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ لیکن اگلی صبح میرے بعد اصرار کے باوجود اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اُسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول ک کے وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح دیر سے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اُس کی گاڑی دوپہر کی تھی۔ میں خود اُسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ ل کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ چٹا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے ”ارے..... یہ کیا؟“ ”تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ۔ میں

گی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلو اور۔ باقی انتظام میں خود کدو لالو گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ پیٹھ پائی تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے کل عصر کے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کا لے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میر روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دُور کالے کی پشت پر، میں نے اُس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اُوپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اُس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آکر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر دُور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اُتر آئے۔

اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلنے دیکھ کر اُس کے ماں باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے پہلے سے باہر نکلنے ہوئے اُس سے پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟“ سانول زور سے ہنس پڑا ”نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اُس کی سکا کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں جو آج شام اُسے مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔“ میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ”تو کیا؟“ مان گئی۔ اُس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں.....؟“ سانول مسکرایا ”نہیں..... جواب تو کوئی نہیں آیا اگر کی طرف سے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔“ میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ”تمہیں اتنا یقین کیسے ہے۔“ سانول اپنی ہی دُھن میں گن گن تھا۔ ”ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی.....“ ”میرے زور سے چونکا..... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا“ سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی محبوب کو بھی گھر سے نکال کر اس ویران تپتے صحرا میں ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے.....؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا ہے تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھ چلا آتا ہے.....؟ اور پھر میں نے دُور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڈھنی کو سانول کے کا یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سبیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بظاہر ٹیلے پر اُگی اب خاص جنگلی بوٹی چھنے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محبت بھی ہمیں بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی ”بہانے باز“ ہوتی ہے۔ میں مزار کی منڈ پر قریب ہی رُک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اُس کی سبیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی اور ہنسی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈ پر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوانے ریت کے

ناید کہیں سے یہ کپڑا اٹھالایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھونک کر باہر بلارہا تھا۔ ارے یہ تو میرا ہی رہا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی اگنی سے اڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا، لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جروت کے سب ہی پالتو کتے انتہائی حد تک مدھائے ہوئے اور اپنی حیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اودہ..... تو پھر ضرور کالے نے گرتے سامبرے جسم کی پاس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ گرتا یہاں اٹھالایا۔ کہتے ہیں کہ کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر زہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی ظاہر بھی دیکھ لیا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی نب دوڑا۔ ایک ہمہی امید نے میرے اندر جیسے بجلیاں ہی بھردی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک سیکڑے کی اودھنی پڑی تھی، جو آج اُس کی ثانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سیکڑہ اُسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی ہے تو شاید کالا اُس کے دوپٹے میں بسی خوشبو کو پا کر اُس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اودھنی لے کر اسی مارے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس بھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف بوم کر اس کو سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں اس اودھنی والی کی تلاش ہے۔ لا اودھنی سونگھنے کر پھر سے میرے ارد گرد چکر لگانے لگا۔ شاید اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے در زمین سے اٹھا کر اُس کا ایک گولا سا بتایا اور اُسے دُور صحرا میں اُچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب جا کر بھاگنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر راکی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش ہو کر میری نسلوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے نئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لا اودھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اُس کے نقش قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رخ نی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی ان گلیوں میں دھول اُڑا رہے تھے۔ کالا بناڑ کے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب لے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک اُن جانی قوت کے زیر اثر کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں لے کے قدم ایک جگہ جم سے گئے اور اُس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ رہا تھا، وہ جروت کے قلعے کی چادر دیوار کی تھی۔ مطلب ند دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی ہ جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھری کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھادوں یا اس میں نقب لگا کر اس فی قلعے کے اندر گھس کر سیکڑہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے۔

روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے اُسے چھیڑا۔ ”اچھا تو گویا خط میں بھی اُسی کی باتیں..... میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے خط لکھا کر دے گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟“ سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ”اگر میرا خط اُس تک پہنچ پاز تو یقین کر دو میں اُسے ہر خط میں عبد اللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کر دیا ہے کہ تم سے اُسے میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اُسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتا ہے۔ میں ڈاک بابو سے بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔“ میں نے سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ نگر نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر اُن کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔

سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور دشت دو چندی ہو گئی تھی۔ دل پھر سے ہوکنے لگا تھا۔

گاہے دل سے دھواں اٹھتا ہے

ابھی رہتا ہے اس مکان میں کوئی

اگلے روز سیکڑہ کے بوڑھے نانا ثانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میر کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب اُن کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا سیکڑہ کی اودھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اُسی کے اطمینان کی خاطر اُس سے کہا کہ وہ سیکڑہ کی پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے۔ ضرور سیکڑہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سیکڑہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پور کرے اور ٹھیک اُسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ”یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے دے.....“

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اُس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آیا تھا تاکہ اُس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی غرابٹوں کی آواز بھی باہر سے بلند ہونے لگیں۔ لیکن خلاف معمول ”کالا“ مزار کے سامنے آ کر بھونکنے لگا۔ اُس نے پہلے بھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تو اُتر سے آتی آواز نہڑکی تو مجبوراً مجھے اٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اُس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی تو میں چونک کر آگے بڑھا۔

بلکہ شاید ٹھیک اُس لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دو صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر اٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سیکنہ کی چادر دیکھ کر کچھ چوکنے "کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے بھر؟" میں نے انہیں ساری زوداد سنا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی "لگتا ہے کوئی بڑا کام سر پر ہے..... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔" انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور میں یہی سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سیکنہ واقعی جبروت کے قلعے میں کہیں قید ہے تو اُسے نکالنے کے لیے پوری فوج د ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس سوچ میں غم نہیں ہوئی کہ جانے کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا، میرے ماتھے سے بہتا پسینہ شپ شپ مزار کے محکم میں بھیجی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکے پر میں جتنی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا لیکن ابھی میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب نوری کے والد اور کسی دوسرے بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن سب کے چہرے سستے ہوئے تھے اور ماتھے پر شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ۔ لیکن آج اُن کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر مشکل کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا "جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔" میرے ہاتھ میں اکرام صاحب دینے کے لیے پکڑا پانی کا گلاس چھوٹے چھوٹے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ "لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی ہے نوری سانول کی منگیت ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لیے گیا ہے، پھر یہ سب کچھ....." میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر رو ہوا تھا کہ اس نے اسے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سانس لے کر بولے۔ "کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول پڑھا کر شہر زرخشت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوری سانول کے گھر والوں نے اُس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی۔ کی تو ممکن بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے۔ ہاں بستی والے اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے لیکن کسی کی نیت ہی اگر بُری ہو تو پھر اس کا کیا علاج.....؟"

میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اُس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔

جی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اُس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوتی اور نہ ہی کبھی بستی میں سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کندھانے کی ہمت کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی پیری کی طرف پتھر آتا تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا "سانول کے باپ کا کیا کہنا ہے؟" وہ بے چارہ کیا کہے گا۔ "اُس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا ہوتا ہے، صرف بددعا اور کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے بیٹے کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے۔ لہذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول تک نہیں نہ پہنچے۔ کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا اس کے کاندھے ہمیشہ کے لیے سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس چلتی لوکی سائیں سائیں اور ریت کے بگولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس ہمیں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے پاس سانول کا پتا نہیں تھا اور اُس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا۔ وہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح ہلچل مچھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرائی دیا۔ "آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟" ان نینوں بزرگوں کے سر اندامت سے جھک گئے۔ "کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا کرنے آئے ہیں۔ آپ در اسیجیے کہ اللہ ہمیں اس طرح ظالم شخص کے قہر سے بچالے۔" سلطان بابا کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ "یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔ خدا بھی اُن کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔" تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کی زوچیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ بے بس کوئی اور نہ ہو۔" سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے "ٹھیک ہے..... اگر ساری بستی کی زوچ

غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی سرانجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ..... مجھے جہ کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔“ سلطان بابا نے پاؤں اپنی کمر میں ڈالے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ”یہ آپ کب رہے ہیں؟“

قفس اور جبر

اکرام صاحب نے جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف قہیل تھا لہذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اُن کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رُک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ”میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں لہذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے لہذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا غلام سے بھی بدتر ہے۔“ کچھ دیر کے لیے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اڑتی پیلوں اور کال گڑھ کے تاریخی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سگے نہیں لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“ تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی۔ لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رُکتے دیکھا تو اُن سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول محلے کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیو ہیکل چوٹی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات

اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں
 تھر تھر کے اشکوں کی کہانی سناری تھیں۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی ”چھوٹے پیر جی..... آپ کسی طرح سانول کو
 باغ کروادیں ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گی۔“ گویا اُس نے مجھ سے وہی مانگ لیا جس کی توقع میں اُس
 کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا تو اُس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مزارا سا
 ہندو میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر
 نے کا پتا درج تھا۔ لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے
 پر ہنسکتا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ
 لگڑھ سے نکل پڑے۔ جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے لیکن
 غان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی
 ف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے غلامیں گھور رہا تھا۔ میں نے اُسے پکارا تو
 سٹ پٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟“ میرا سوال سنتے ہی اُس کے چہرے کا
 اُڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلک رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی۔ کال گڑھ سے
 ریلوے لگانے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے۔ پھر میری سات نسلیں بھی یہاں دو بارہ
 اچا ہیں تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“ ”سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی
 ازنگی..... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی
 رہے گی تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹا اور پھر آدھے
 ٹٹے کے طویل وقفے کے بعد اُس نے نظر اٹھائی تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا
 ب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے
 نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اُونٹوں کے قافلے کی ہمراہی میں آج شام اُس کی
 ناکے پاس کسی دوسرے بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہمراہ رات دس بجے
 پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ
 آں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے
 دوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچنے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لیے
 اُٹھ جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ساتھ ہی
 مانے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کا شرف اور پایا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاط
 سے الگ کاغذ پر لکھ کر دوں گا تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون نمبر آتے ہی اُن سے بات کر سکے۔
 مانے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اُسے ہمت دلائی اور انہیں رخصت کیا تاکہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“

محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں راہ
 میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....“
 دربان کی جھاڑن کر جمع میں کمیوں کی جھنجھناہٹ جیسا ایک شور مگنجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہ
 گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ”مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اُسے اطلاع آ
 کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔“ دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا۔ اُسے شاید اس لہجہ اور اس بے با
 کی عادت نہیں تھی۔ ”مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اُسی سے ملتا ہے جس سے اُس کی مرضی ہ
 ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپسی ہوگی۔
 لوگوں کو اگر ملنا بھی ہے تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا پھر آنا.....“ دربان اپنی بات ختم کر کے نگوشت
 منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دلچسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی لہذا لوگ بھی ادا
 ادھر جھننے لگے۔ بہر حال ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اُسے
 اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اُس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے
 اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ لہذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے
 سے رخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آ
 اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ منٹے تک نوری کو
 کہیں روپوش ہو جائیں تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا۔ لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال
 رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی ط
 انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں
 قدر سوچ رہا تھا اتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد جنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید
 اسی پھندے کی کھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سہمی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجے میں پھنسا پھنسانے پ
 کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اُسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جا
 آتے دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اُسے بھی سراپ ہی سمجھتا رہا لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار
 دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم
 ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس
 مزار کے صحن میں صرف میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لوکی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد نو
 ہوئے لہجے میں کہا، یہ بدنصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ اب
 اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آ

کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے ان دونوں کو آج سہ پہر کے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھستے قدموں کی چاپ.....

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکزی بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بُری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار جب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے باؤم کو۔ اچانک ہی صحرائیں جیب کے زوردار انجن کی فراٹے بھرتی آواز یوں گونجی کہ ہم تینوں ہی اُچھل کر رہ گئے۔ جیب کسی قریبی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چند ہیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدے قہقہے ابھرے اور جیب میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی..... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔“ وہ سب لوگ پھر سے ہنسے اور ایک ہیولا جیب سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا۔ جروت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، مجھ سے زیادہ ہوش و حواس میں ثابت ہوا۔ جروت نے پہلے ہی نوری کے گرد پھراٹھا رکھا تھا اور اُسے شاید مزار سے شروع ہوئی اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پڑ سکے اور میں نے یہ موقع اُسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیب کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھر پور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ”کیوں پیر جی، تم اسے بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔“ وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیب میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اُس کے باپ کے چہرے پہلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بُری تھی۔ مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظور نظر نہ ہوتی تو شاید وہ اُس سے مزید بدتمیزی کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکلیں البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیب قلعے میں داخل ہوئی تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ کی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند مہتمروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمرؤں کی قطاریں۔ پھر اوپری منزل میں روشنی

کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی لیکن واپس پلٹنے سے پہلے شکرگزاری کے بول بولنے کی کوشش میں رو ہنسی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارا احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یا ب ہو جاتے ہیں۔ یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین نعت بھی ان کے احاطے کے لیے ناکافی ہو جاتی ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر صرف اتنا ہی بولے۔ ”ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین ہی تنگ ہو گئی ہے تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو ضرور کرو۔“

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس کہ اپنا گھراں چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔ شاید اس مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگ ڈنڈی پر پہنچا تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھے بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے نہ رہی تھی۔ اُجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی اپنی شناخت کو دوسروں سے اوجھل رکھنا اُجالا کبھی کبھی کس انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی اسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر حملہ لگا کرنے اور سجانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر زور و مان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہہ کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ پر ہی کوئی چھتری تان دوں تاکہ چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب ا مقدر کے سورج پر تاننے کے لیے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو دُور ٹیلے سے پرے نوری اور اُس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اُس کے کپڑوں کی ایک گھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگا اور لمبا گھونگٹ نکالے وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد در بعد اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے تو نوری کا سانس بُرا پھول چکا تھا لیکن اپنے باپ کے خوف سے اپنی اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی اس چوہے کا گھریا راستہ تھا، لیکن اب میرے مجبور یہ تھی کہ اپنے بندہ ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے نیچے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے۔ لہذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا جب ”جبر“ کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں۔ نہ صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے۔ ہماری روح اور ہمارے اندر کوئی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے، روح کی وہ بندش کسی عالیشان محل میں کواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں اٹھنے لگی تھیں۔ اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھونکی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی جسم کو کس کرتی ہوئی موجودگی میں ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ ایسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی تو دوسرا بھی رد عمل ظاہر کرنے کا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ روسونے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر اُن دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے اُن اُن دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند بڈا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بنی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک ابھری ہوئی اینٹ کی اوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ”شکریہ دوست تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانس مزید لکھی ہیں تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا۔“ وہ دونوں غلام مجھے دھکیلے ہوئے اسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکیوں جیسی جھنڈا ہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندر سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں

ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ”لے آئے ہو انہیں۔ بند کردو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔“ اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اوپر سے بوڑھا چلا یا۔ ”لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔“ نوری چلائی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیتوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈبٹی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی۔ لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اُس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہمارا تدبیروں سے ایک چال، ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں گلوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں افقی رخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرف ہماری ناشکری پر ہم سے رُوٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اس جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشتے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلاخیاں سی جلتی ہوئی نظر آئی۔ میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سردی لہر جھوڑ گئی۔ یہ کی جہاز ی ساز کے چوہے کی ”آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی اور چوہا اُن میں سرفہرست تھے۔ کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اچانک وہ زور سے دھاڑا ”تو تم ہو عبد اللہ..... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ دینے کی بات ہے تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگالے جانے کی کوشش کرنے والا یا کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوچا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ پکر..... لڑکی کی رضا مندی بھی شامل تھی، تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اُسے درغلا یا تھا.....؟“ مجھے بس سنا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دُور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ”میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔“ میری بات سنتے ہی جہت کے منہ سے غصے کے مارے کف پہنے لگا۔ اُسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے پلایا ”سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھی میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو..... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں۔ ضرور اس کا باپ بھی نہارے بہکاوے میں آگیا ہوگا۔ بہر حال لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو.....“ اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی ”کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے۔ تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف.....“ جبروت چونک کر پلٹا۔ یہ آج کی دوسری انہونی تھی کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا ”اودہ.....“ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سجان اللہ..... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے۔ پھر نہ کہنا کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔“ جبروت نے داد طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت جہوم کی خاموشی سے چڑسا گیا۔ اُسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بننا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں مہرت کی مثال نہ بناتا تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کمزور اور بے بس بوڑھے کے

سے کھپا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اور سب ہی لوگ اُسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے جیسے رچھ کے تمارے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہری تھی۔ البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اٹھا اور لوگوں کے بچے ایک رستہ سامنا گیا۔ مجھے میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل اٹنے لگا۔ اکرم اور دونے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رُعب دار آواز میں سارے جہوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسرے جانب آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو..... ”کیسے ہو عبد اللہ میاں؟“ میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلکا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر زیر لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے اُن کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بیٹی پلکوں کا اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا.....

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتے سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر اچالے میں بچے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور تہر بھری نظر میرے چہرے پر آکر ٹھہر گئی۔ میری نظر اُس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اُس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ ”خوف“ کا واسطہ دراصل ”پوشیدگی“ سے ہوتا ہے۔ جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھودتی ہے۔ اور شاید ٹھیک اُسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کو نے میں بھی سر اٹھا رہا تھا۔ اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث اُس کا خوف، اُس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہذا اُس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔“ افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکتے۔ لہذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو درغلا کر بھاگالے جانے کا مجرم سمجھتی ہے۔ لیکن اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلنے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے۔“ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور حلق تر کر کے بولا ”میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پراقتی لڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے۔“ جبروت کے ماتھے پر ٹٹلیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی، اور اُس کے والد اور دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیئے۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کر دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل کرے تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔“ سارے جہوم کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی غلاؤں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں میں التجا بھی کی کہ میں جبروت سے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ”اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے لتا ہے تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے۔“ بزرگوں نے سر بیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام لردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ البتہ دوسری راہ داری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے وہ کسی درجہ لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھڑیوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کرا بھی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن لنگھی نہیں تھا۔ البتہ اوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھا اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھڑی کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزرنے کے لیے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی ناخول والا نہیں تھا لہذا سخت لکڑی کا بھدرا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھڑی میں آدھی ت جیسا گھناؤں اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مھرے کانوں میں

ہاتھوں لگتی۔ لہذا اُسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ”لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکتے تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری انگلی سات سٹیلیں یاد رکھیں بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔“ سارے مجمع کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہو گئی۔ یہ اُن سب کے لیے بھی انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زہا بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگا تار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے سب بولے ”عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اُس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا اور اپنے باپ کے ساتھ شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی ہے۔ اسے شہر جانے دو۔“ جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔۔ بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی ستا چست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اُس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکا رہا ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو تو وہ بھی بیان کر کوشش کروں گا تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔“ کارندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اُسے داد سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”ہاں۔۔۔۔۔۔ ایک خواہش اور ہے میری، اگر پورہ سکوت ہو۔ مجھے اس بزرگ جوڑے کی نو اسی سیکڑ کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید در بدر اور خوار نہ کرو۔“ جب ہنسنے ہنسنے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اُس نے اپنی تہ بھری نگاہ سلطان بابا کی اٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان نکل کر اُن کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں اطراف اس طرح ہٹے جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ د۔ لوگوں کی آخری قطار میں سیکڑ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا تو وہ بھی اُسی وقت اُن کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل! میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید پیش کے عالم میں چلایا۔ ”بس! بہت سن لی تمہاری، بکواس! تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارا وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اُن کون ہے۔“

”نہیں یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا اُن کا اتنا صرف ایک ہی ہے۔“ سلطان بابا نے آسمان کی جانب اُٹھائی۔ ”اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو۔ تو بہ کرلو۔ اُس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہاری سانس چل رہی ہے لہذا وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لو۔“ جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لبریز ہو چکا تھا۔ تک کسی نے اُس کے سامنے یوں سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اُسے ہماری آنکھوں سے اپنا غم مفقود دکھائی دے رہا تھا جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ”خوف“ تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور

بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ”یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔“ تو کیا میری اس فانی جسم سے رخصتی کا وقت بھی قریب آچکا ہے۔ لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا اچانک دیوار کے اُپ والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سنائی دی۔ پہلے تو میرے اُسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا۔ ”کوئی ہے؟“ تو میں چونک کر کہہ ہو گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو.....؟“ دوسری جانب سے آواز آئی ”شش..... آہستہ بولو۔ جبروت کے کتے نے اگر تمہاری آواز سن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قید تہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھڑی بدل دے۔ ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے کسی سے بات کرنے کے لیے۔“ مجھے حیرت ہوئی ”لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے.....؟“ ”میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لاپھٹک لایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سائیس ہار چکے ہیں۔“ اچانک دُور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا ”کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔“ وہ بولا بھی تھا، دیوار سے دُور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا ٹھوس ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نیچے، درز سے اندر کھسکا دیا۔ اور زور سے ہنسا ”کھانا کھا لو جو ان اکل نہیں صحرا بھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔“ پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی ”لے بھائی خانو! بھی عیش کر۔ پھر نہ کہنا یاد اور یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔“ جواب میں خانو نے شاید یاد رہی بندے کو کوئی دی۔ آواز مہم تھی، لیکن یاد کے قہقہے مجھے راہ داری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر کا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو اُجالے ہمارے اندر اُتر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھناؤنا پ اندھیرا ہو۔ سو میں بھی باہر تاریکی سے منہ پھیر کر بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اُجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں گزر گئے۔ پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز اُبھری۔ ”عبداللہ تم جاگ رہے ہو.....؟“ مجھے اُس کا سوال ہنس آگئی۔ ”تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس آرام دہ کمرے کی مسہری پر ٹیک لگائے اپنے غلاموں کا انتظار کرتے سو گیا ہوں؟“ دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ اُبھری ہوگی۔ ہی وہ بولا ”زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آچھنے؟“ میں نے مختصر اُپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے خند لہجے میں بولا ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔“

اب سبھی بھی اُس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس ورنڈے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے انجانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں۔ اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آنے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔“ خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے بہن میں ایک کوندالپا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی۔ ”سنو خانو! کیا تم سیکنہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسے بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا.....؟“ میری بات سنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لیے سنا سنا چھا گیا اور پھر خانو کی بیچانی سی آواز سنائی دی۔ ”تم سیکنہ کو کیسے جانتے ہو..... خدا کے لیے بتاؤ۔ پچھلے پانچ مہینوں سے مجھے اُس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے وہ برے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اُس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہارا اُس رُک سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔“ خانو کا ہجماں اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوئی آواز آس پاس کے پہرے داروں کی ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی شکل سے میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا تو اُس نے میرے دھیرے سیکنہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنی شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے باں سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے ٹھہری تھی۔ شاید انجن ٹل ہو گیا تھا۔ گرمی اور جس سے گھبرا کر لوگ پلٹ فارم پر اُتر آئے۔ نامی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہوگا۔ کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی۔ رہا گ کا سرخ جوڑا ابھی تن پر موجود تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس تپت پلٹ فارم پر موجود تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی لہجہ کوئی اچھا ”شکار“ ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اُس دن خانو بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ اسی اثناء میں پلٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا تھی گی اور لڑکا پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ لڑکے کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلٹ فارم پر گاڑی کے

ملی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اُس
 نظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ جورات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اُس سے
 ہٹا کر وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور کیسے کہاں ہے.....؟“ خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ
 زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم بخش نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل
 ہوئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ
 اکر وہ تو خود اپنی سیکین کو تلاش کر رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعہ دار کی عدالت کا
 ازہ کھٹکنا یا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ
 اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اُس پر خادمہ کے کمرے میں
 دتی نئے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحر پار کرنے کی سزا سنائی گئی۔ البتہ اُس وقت جبروت کا
 رعام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اُس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سیکین کو اُس رات بستی کی
 نی ست ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اُسے خانو اور اکرم اٹھالائے
 آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحر پار نہیں کر سکا۔ سیکین اُس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی
 ، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اُسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف
 بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے
 بھی جبروت کے قاتل پنچوں کے دباؤ کا شکار قرار دیا۔ بہر حال سیکین مر گئی..... خانو پُچ ہو کر ہانپنے لگ
 اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سیکین ہی نہیں مری، کال گڑھ
 ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس
 آتی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو
 زور سے رورہا تھا۔ ”جس دن سے سیکین مری ہے، میں ایک لمحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے
 رہا میرے سس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں
 مانتا۔ ابھی تو شادی کا پرندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تیلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں
 پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کٹی خواہشیں
 مٹیں۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔“ خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے
 جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اُس کی شبیہ اُس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی
 سا کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی
 تہ کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحر مجھے
 لولی کا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ

تین گھنٹے کے اس غیر متوقع شاپ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اُس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگرم
 تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور جس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور پل
 کر ہی رہ گئی۔ اُس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اُس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین
 عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جکشن سے دوسرا انجن منگوا لیا گیا ہے لیکن کال
 پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ گھنٹے لگا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شہ
 ناکام و نامراد بنانا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً
 اور موڈ بانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اُن کے ساتھ بستی تک چل کر پانی
 کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ
 نوبیا ہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔ اکرم نے فوراً پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے تو اپنی بیوی
 ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی یہیں اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم
 اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لیے پانی اور کچھ پھل
 لے کر واپس آجائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لیے راضی ہو ہی گیا اور اپنی
 کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سیکین کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔
 نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر
 تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب سے بھلا آدمی دکھائی
 دیے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لیے اس ذہنیاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسا قطعی مشکل ثابت نہیں
 خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لیے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے
 ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سیکین کو لیے سیدھا کال
 کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے ”کارنائے“
 اطلاع دینے چلا گیا۔ سیکین اور رحیم بخش کے لیے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ
 تھی۔ اُس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے لہذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے
 خادمہ نے اُسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لیے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب
 آئے گا، تب تک اُسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران کچھ
 پھولوں والی اور دھنی کی بہت تعریف کی۔ سیکین نے اُسے بتایا کہ یہ چادر اُس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھا چا
 بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سیکین کی شادی کے لیے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سیکین جب
 یہاں سے دوبارہ گزرے اُس کے لیے بھی ایسی چادر ضرور بنوائی لائے۔ سیکین نے بھی وعدہ کر لیا۔ اُن عا
 گیوں میں رحیم بخش اور سیکین نے کھانا کھایا اور خادمہ برتن لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش کی

اُن کی لاڈلی سیکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا ”کیا تمہیں سیکینہ کی قبر کا کچھ اتنا پتا معلوم ہے۔ اُس کے درياء کو اور کچھ نہیں تو اُس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے تو شاید اُن بد نصیبوں کو کچھ قرار مل سکے۔“ خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا ”یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں باقاعدہ کوئی قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سیکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا گیا تھا۔“ ”کیا.....؟“ لفظ تھے کہ انکارے..... میری سانسیں رُکنے لگیں۔ ”اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں۔ یہ بہت ضروری ہے خانو.....“ خانو نے اپنا سر پیٹا ”ارے ہاں..... یہی تو جگہ تھی۔ اسی برآمدے میں دائیں جانب سے ساتویں کوٹھڑی تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھڑی ہی میں اُسے دفنایا تھا ہم نے۔“ خانو کی بات سنتے ہی میں چکر اکر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رُک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اونڈھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر داہنی طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سیکینہ اسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

کہہ سکا۔ پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ ”سنو عبداللہ..... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری بات ہیں۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا اور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دُور نہ جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ اس سے پہلے کتنے معصوموں کا لہو ہی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو تو تم اس صحرا اور کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بظاہر اس تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جاں بخشی گی۔ یہ درست نہیں۔ اول تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھٹنے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی نا کا ہے۔ لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے تو وہاں اُسے اکرم اپنا انتظار کرنا ہوا۔ پندرہ منٹ تک لگا تار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا۔ کتے تمہاری جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ اُن کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالکا گا۔ وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے۔ سڑک تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے۔ کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا.....“ میں نے حیرت سے دہرایا ”کیکڑا.....؟“ ”ہاں مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیئت کی گاڑی چلتی ہے، یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی پناہ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھنا..... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پیچھے دنوں یہاں بارش ہوئی قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جو ہرل جائے لیکن ہوشیار رہنا دو گھن زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ ترکر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاسر بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا۔ اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا کہ دوڑتے وقت سانس منہ کی بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جو کر نیٹے میں اُڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے لیکن تلوؤں کی جلد پو جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رد مال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر لیتا۔ اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ دوڑ۔ ہی جیتی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے.....“ خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سیکینہ کے بوڑھے نانائانی کا دھیان ستارہ تھا۔ اُج کہ میں دوبارہ اُن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں ورنہ میں انہیں کیسے

اک نئی جنگ

مانے جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویے کا نام ہے، جو ذہنوں کو سخر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ رُوحوں کا تو پتا نہیں، پر سموں کو خیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزا تا تھا۔ یہ سارا تماشا اُس نے اپنے جنون کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا دست، کاشف لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے گئے تھے تو ہمیں پکا ڈلی کے علاقے میں ایک عجیب لب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے دیکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنا لین ریش (Adrenaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود بے مادے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے۔ مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تفریح رچرچے سے گزر چکے ہوتے ہیں، اُن کے لیے زندگی ایک بے کیف سامعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں بچہ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔ دلی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالتور لے ایک جیبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے دھوکے کو اپنے ہتھوں کے ذریعے اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور ال کے باسی بن جاتے ہیں۔ لیکن اس ایڈرنا لین ریش (Adrenaline Rush) کا یہ جان لیوا نشہ باقی منشوں کا سر تاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں ڈھکیل کر اس قضا کو بل پل اپنی رگوں میں اترتا ہوا سوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت نالایع ہی کسی نئے شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اُسے مجھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اڑتے دیکھ کر پہچانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی وہ اُس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اُس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی بوٹی کر کے اُس کے خون آلود کپڑے اپنے جڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف ہیجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک رابر (Jack The Ripper)۔ کبھی فرینکلنسن (Frankinstine) اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور سنے ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی ل بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے۔ سگے کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی برہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ”ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اُس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ گئے۔ میں اُس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اُس کے مدفن پر اپنے پا پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آئیں بلند ہوئیں تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ”میں جارہا ہوں دوست۔ اگر تم سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔“ تم بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے۔ خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی وہ ”رب را تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں بٹھا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں م تھے۔ جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اُس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑ پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تین ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ”جب تک ہماری ایک سانس باقی ہے، موت زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے۔ یہ دنیا صرف ابتدا ہے۔ انتہا کا سفر اس سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے با گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زاوراہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آف کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ”جیتے رہو۔“ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں لاڈ لے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اُٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اُس کی شفاف پانی میں تیرتی نظر آرہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہ شعبہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریح طبع کے لیے کھیلتا ہے۔ پھر چاہے وہ رحیم اور سیکینہ کا معا نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی حجت کے بھی۔ مجھے اور رحیم کو دوپ میں ختم کروا سکتا تھا۔ بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُپ پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا تو ضرور اس کے پیچھے کا اثر و رسوخ شامل ہوگا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانون

وقت ہے اگر تم اپنے جرم کا اقرار کر لو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جاسکتی ہے، جی.....“ جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تھیک تھی۔ میں نے چند لمحے اُس کی جانب غور سے دیکھا۔ ”اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی تو تمہارا یہ کھیل اور وارہ جائے گا۔ پھر شاید میں نہیں تو کوئی اور اس جڑ بھینٹ چڑھ جائے کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے کیوں کہ صرف اسی صورت تمہارے بھڑکتی یہ لہو کی پیاس شاید کچھ دنوں کے لیے بجھ جائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔“ وہ کچھ دیر میری جانب عجیب سے دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ”یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر ہر خواہ تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روئے گز گزاتے اور بیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لیے ایک باوقار مور ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست میں جائے گا۔“ جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی اور میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غزاتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جڑواں رال نکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزرا گیا تاکہ وہ میرے جسم کی بو کو اپنے دماغ کے خلیو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے، اپنا جسم اُن کے جڑواں کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھٹا ہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید میرے اندر وہ ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت چلتی دھوپ میں آتماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اُس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرے متوقع خون بہنے سے تھی جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اُس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کا بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا ”اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے شرط صرف اتنی ہی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں اور ہاں بے فکر رہو یہ سدا ہوئے ہیں لہذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟“ میں نے ”ہاں“ کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔ پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہ تھا لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جوتے اتارے، ایک لمحے کے یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں نغصے نئے انکارے میرے کتوں سے ہوتے ہوئے، خون کے اندر سرایت آچکے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے کتوں کے بعد دیکر اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ

سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا ”یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔“ میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیئے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چپختے لگے۔ سانس دھونکی کی طرح چلنے، چلنے میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تاکہ حلق میں لگی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے لیکن پہلے ہی سانس میں اُڑتی ریت کے گبولے سے ہزاروں دڑے کسی خاردار تاریکی طرح میرے گلے سے ہوتے ہوئے سانس کی نالی میں انک گئے اور مجھے زوردار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے نکلانی ”منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔“ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پانچواں ٹیلا پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے کتوں میں پہلے منٹ میں جوتے اتارے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھال پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کھلے زخموں کے ساتھ نمک کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کھلے منہ والوں زخموں سے، خون میں مل کر اسے جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس خُش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھینے لگا۔ مجھے اپنے سامنے نکلنے والی فاصلے پر ٹھانٹیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلایا ”براہ راست سورج کو نہ دیکھنا.....“ لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظریں قبر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں اسی سورج کی جلتی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے دئے نیلے سے نیچے جا کر۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک درمیان سے دھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری جیس جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیئے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے گی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں نیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں نیلے سے ٹیلا یا بائیں.....؟ شاید دائیں.....؟ نہیں نہیں بائیں جانب، لیکن..... شاید دائیں.....؟ میں سر پٹ دوڑتا تھا لیکن میرا ذہن جیسے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلا ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک مٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اُوپر چڑھا تو میرے ذہن نے

میکائی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب..... اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مڑ گیا۔ شدید سے میرا حال ہو رہا تھا۔ بس ایک بوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پھر مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے۔ اچانک میری نظر دوسرا صحرا میں چمکتے ایک سنگے پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں جگمگا رہا تھا لیکن یہ طلائی سنگہ یہاں.....؟ اور پھر وہ جگمگا تا سنگہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے..... یہ تو لوہے کی ایک سی پرات تھی۔ نہیں۔ اودہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جو ہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جو ہڑ، بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہ راست وہاں نہیں پہنچ پاری تھی۔ کیا وہ اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرش بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت تو آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سینٹا شروع تھیں۔ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جو ہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا مگد لے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جو ہڑ کیا، میں پورا دیا بھی ایک ہی گھونٹ پی جانا چاہتا تھا۔ ”خبردار..... گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔“ میں نے نہ ”نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی کر جاؤں۔“ اس وقت مجھے اور اک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسون مڑ خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چوس چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کپٹی پر پڑی ہوئی نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا۔ ”نہیں عبداللہ، نہیں۔ یہ نہیں موت ہے۔“ دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی موٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کونوں ابھی تک جو ہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جو تک میری ہتھیلی کی جلد ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری جو تک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب خون چوسنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جو تک پانی بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی لیکن ہتھیلی والی سرمئی جو تک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی رہی اور درد، جلن اور جھپن کی ایک کیشلی لہر میری انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا ٹیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم چلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جو تک نازک اور لچیلی سی چمکیلی جلد سے شدید تپتی ریت کمرائی تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگہ پر کوئی پانی کا پھیٹا مار دے۔ جو تک تڑپ کھڑا چھل اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے زومال نکال کر پانی میں بھگوایا اور اسے اپنے خشک چھتے ہونٹوں سے لگا

رے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسر آئی تو ان کی حالت مزید خراب ہو گئی اور خون کی پتلی سی چند برس زومال کی سطح پر ابھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بیچکا زومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اسے بھگو اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینی لگیں۔ ہاں..... یہ وہی بھونکتے کتوں، دوڑنے اور غزانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے۔ میں اٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر نہ آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ جاتا تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم کو کا رخ بھی اسی سمت تھا، اس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ لہذا ان تک میرے جسم کی بو پہنچنے پہنچنے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن اب خود ہی اپنی زوج دھیرے دھیرے میرے اندر سے سر کننا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے انہ کی بار طے نہ کیے ہوتے تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا۔ کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکاٹس کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ”دوڑ“ مل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے ریت کے گبولوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار تے دیکھا۔ میرا خشک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ گلولوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے لٹا پالی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے لیکن اس کی غزا انہیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر نہ کا وقت نہیں تھا۔ میری ابھی سانسیں خود ایک غزاہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے بھی تو ایک زندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا زندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں اللہ یا سارا نہیں..... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک خونی عفریت کا نا تھا۔ پھر کے دور کے انسان کی تمام جہتیں ایک دم ہی میرے اندر انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب تے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور قتال کر سکتا۔ غزا انہیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھوپ کی آوازیں میرے حواس مغلط کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی ہمتا جو کئے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دہلی ایک خشک ٹہنی زلی پر میری نظر پڑی اور میں اُسے اٹھانے کے لیے جھکا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں ما ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ جھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی لیکن اس اثنا میں پہلا دشمن میرے سر اچکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے دوڑتے ہوئے بناڑ کے مجھ پر قد بھری اور ٹھیک لے لے لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشا نہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں برا اختیار کی طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتنے کوہ چھڑی کتنی زور سے لگی

ہی پھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گردہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے جھپٹے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جاگ رہی تھی لہذا اب مجھے اپنے غلہ بازوں ہی پر بھروسہ کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خوشی پنچے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں سر جھرمکنیں۔ اس کی غزاٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوٹھنی سے بہتی رال کا دھارام میری ہائیں آنکھ کے اُپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبروں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکے دانت عین میری شہرگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظریں جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت ترپو۔ اپنی جان مجھے سوپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا۔“ میرے اندر کا درندہ غزایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں۔“ اچانک ہی مجھے اس بے بس رچھ کے پیترے یاد آ گئے۔ وہ رچھ اس طرح کے کئی عفریتوں۔ ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے زرخے کو ان کتوں کے جبروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب اسے سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہرگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ اس کی مستقل غزاٹ اور سانس کی خراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ مفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدمی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید اثر سائب کی پھینکا اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو دخل ہو رہے تھے اور اس کے پنچے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا گرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نے فوراً اُسے تنہم سے علیحدہ کیا اور اپنے کچھ کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہرگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب تک دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی

میں پھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گردہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے جھپٹے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جاگ رہی تھی لہذا اب مجھے اپنے غلہ بازوں ہی پر بھروسہ کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خوشی پنچے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں سر جھرمکنیں۔ اس کی غزاٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوٹھنی سے بہتی رال کا دھارام میری ہائیں آنکھ کے اُپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبروں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکے دانت عین میری شہرگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظریں جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت ترپو۔ اپنی جان مجھے سوپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا۔“ میرے اندر کا درندہ غزایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں۔“ اچانک ہی مجھے اس بے بس رچھ کے پیترے یاد آ گئے۔ وہ رچھ اس طرح کے کئی عفریتوں۔ ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے زرخے کو ان کتوں کے جبروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب اسے سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہرگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ اس کی مستقل غزاٹ اور سانس کی خراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ مفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدمی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید اثر سائب کی پھینکا اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو دخل ہو رہے تھے اور اس کے پنچے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا گرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نے فوراً اُسے تنہم سے علیحدہ کیا اور اپنے کچھ کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہرگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب تک دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی

معصوم سے معصومیت تک

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رتق جا گئی۔ باقی تین دشمن بھی کچھ فاصلے پر تھے لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آرہی تھیں۔ ماننے والے تین دشمنوں نے پسترا بدل کر جھ پرچھنے کی کوشش کی لیکن کالا اور اس کے گروہ کے باقی دو جانباز ب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید ہرے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس رنی لڑائی کے گر جانتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے۔ پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور دشمنوں سے پہلو ہاتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے نکلے ہیر میں ہاتھ کی انگلی جتنا ایک کاٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اوپر سے نکل گیا۔ میں اسی قدم لڑکھڑا لڑکھڑا اور پاؤں جیسے شل ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں سے ٹکدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیچے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو لہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت روئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی چھپلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں۔ پھر پہلے تین کا دشمن گروہ میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبرے سے اڑ کیا لیکن میرے گلے میں بندھی قمیض کے چیتھڑوں کی وجہ سے اس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب ٹٹ پائے۔ لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا۔ تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ کالے کا ایک ساتھی جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اُسے سرغنہ نے ایک زوردار پنچہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن ب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا تو بہت دُور کالی تارکول کی رُک کی باریک دھاگے کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اترتے ہوئے آخری مرتبہ بچے نظر ڈالی تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ”ہم نے اپنا نمک حلال کر دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت.....“ اچانک میرے پیروں کو نیچے کسی نرم اور لمبی سطح کا احساس

آنکھیں پھر سے چندھیا گئیں۔ غزائیں اب باقاعدہ جینوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلڑا کروٹ لی اور حتی الامکان سر اٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوائی سے میری جانہ اڑ کر آتی تھا کو اچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، دشمن کو ہوائی میں دبوچ لینے والا ”کالا“ تو وہ اور اس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں تول رہے تھے، غزائے تھے، دھماکا رہے تھے۔ میں کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ دشمنوں کا سرغنہ بولا ”تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو۔ اس لیے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جا ہمارے راستے سے..... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تم بھی مالک تھا۔“ کالا جواباً بولا ”نہیں..... وہ کبھی میرا مالک تھا لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ.....“ سرغنہ بھونکا ”بس..... بہت ہو چکا.....“ ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرانے انسان کے چکر میں اپنا پرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک ماں لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں ان کے لیے اپنے ساتھ اپنے ان دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طر سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں..... ہٹ جاؤ.....“ کالے نے جسم تولا..... ”اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدار اور احسان فراموش بن کر نہیں..... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔“ اتنے میں دُور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ”اچھا تو پھر ٹھیک ہے..... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ.....“

موتی۔ دشمن کی اپنی شرک سے خون کا ایک نوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے اٹلتے تار کول کو رنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز ابھری جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا ”اللہ اکبر“ اور دوسرے فار کی آواز آئی۔ مجھ پر جھلاٹ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور دشمن کی بغض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرف پلکوں کے بوجھ سے بوجھ ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظرات آپس میں ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے اُس نے مجھ سے کہا ہو ”الوداع“ دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔“ لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں۔ آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی مصیبت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور زور کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کامیاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا نسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ میٹھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ مجھے اس سڑک پر پڑے ان خزی لمحوں میں ایک عجیب سا اور اک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر لسنے والے ہر ذی روح کا سفر بس ”معصوم“ سے مصیبت تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مار تھا سے ایک اصطلاح ہمیشہ سنتا تھا ”Back to the Innocence“، لیکن ”معصومیت کی طرف واپسی“ کی اس اصطلاح کا مطلب مجھے اس روز سمجھ میں آیا۔ ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی ادیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنادے اور تمام عمر مذہب نامائی کو شش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ”معصومیت سے مصیبت تک“ کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ اور ایہ ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کول روح نکلیں ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے تسخیر اس تکلیف جسم کے پنجرے اس نورانی بیوے کے لالچنا لکھن ہو جاتا۔ کیا میری روح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا۔ آنکھیں کھلنے میں اتنی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک رے کانوں میں آواز گونجی ”اٹھ گیا بھئی جوانا! شاباشے۔“ میں نے چونک کر دہائی طرف آواز کی جانب بھاڑ، رنجرز کا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ..... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا ٹھکانوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ”اگر یہ رک جھیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے.....“ میں ایک جھٹکے سے ٹکر بیٹھ گیا۔ میرے سارے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ سپاہی جلدی سے اٹھ کر میرے قریب

ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دور دیکھ رہا تھا سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس کٹوے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اُسی سڑک تسلسل تھی لیکن یہ کلواریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ خانو کی آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی۔ ”اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ تم نے آدمی جنگ جیت لی۔“ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال پکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے اُسی رفتار میرے تعاقب میں آرہے تھے بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پیچھے پھروں کی بچی کبھی سانسیر تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پیچھے پھروں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشا سر انجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آ کی جانب اٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا۔ پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آ کی جانب کیوں اٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ کیا وہ صرف آسمان پر ہی بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اٹھی نظر نے بھی اُسی لمحے مجھے میری ایمانی کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور میں کسی مدھوش سے نوش کی ط لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، کچی سڑک پر چاروں شانے چٹ پڑا تھا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے جھل کر سیاہ ہو تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چور تھا کہ اب دوڑتی، غزاتی، رال پکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفائی زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دے ہیں، ایذا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیواور جیبے دو کے اصولوں بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اس دوڑ میں لاکھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح نڈھال ہو کر گر پڑا موت اپنے خونی جڑے اُن کی شرک میں پیوست کرنے لگے تو اُن سے بس ایک ہی سوال پوچھوں ”کیا بے وفائی زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟“ میرے دشمن بس اب چند گز ہی دور تھے میں نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے اُن میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گردا گردا خوشی سے ہوکتے ہوئے سنا۔ انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج اُن کے سامنے سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اُس کے خونی جڑے کو ایک خاص زاویے پر رکھتے اور کے چار لمبے نوکیلے دانٹوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلنے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اس قاتل جلت خاص نشانہ میری شرک ہی تھی۔ میرے دل نے کہا ”خوش آمدید“ اور ٹھیک اُسی لمحے فضا میں فار کی ایک آ

ہے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج پکستان صاحب سے شفقت ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیب میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیب روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کو در کچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شیر محمد خود را نیوٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ کچھ گھنٹے قبل یہی قاتل صحرا میری سانس گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیب میں گزرتے ہوئے سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیب ریت کے ٹیلوں سے اتنی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک ٹیلا اترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا ”روکو..... جیب روکو.....“ حوالدار نے چونک کر جلدی سے ایک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا، اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر اُن کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے غائب میں وہ نظارہ دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر ادھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے ننگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدوجہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار زہر سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔“ ہری آواز بدشکل نکلی ”نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی ہے۔“ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر دوڑوں۔ حوالدار میری حالت کچھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو نثارہ کیا اور خود بھی جیب کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اٹھالایا اور کچھ ہی دیر میں وہ بگہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلام پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو دل ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں جوان! تم اپنے دشمنوں کو کبھی یوں پڑا رہے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں اتنے ہی لہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ جب کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے تو میں نے ایک جیب کے ہولے کو تیزی سے واپس پلٹتے بھاگا۔ لیکن شام کے جھپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح نکلوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں اُن کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دُور سے پولیس کی جیپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی تکیاں قریب آتی نظر آرہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جم غیر ایک ایس پی اور ڈی

آگیا۔ ”اوئے آرام سے جوان آرام سے۔ پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر..... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں تو سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دُور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان کو دوڑتے دیکھا۔ واہ بھی..... عجب دوڑ تھی وہ بھی..... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوڑ کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے۔ ٹھیک لمحے پر اپنی بندوڑ اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، اور بندوڑ پر لگے دُور بینی نشانے پر کبھی بھروسہ نہیں رہا۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلائی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری کانپ جاتی تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سننا پڑتیں۔“ حوالدار زور سے ہنسا ”وزیرا، وزیرا! پانچ سال کا بیٹا ہے.....“ میں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ ”مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے..... تمہاری دیوانہ وار دوڑ سے ہی پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریبی یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ وہ وہ پہلے آ کر تمہیں ضروری انجیکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے لیکن اس نے جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ویسے یہ ماجرا کیا تھا.....؟“ میر جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے کھولے میری بات سنتا رہا اور اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آسکتی میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ”کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔“ ہاں جی! نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔“ اُس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اٹھا کر دو تین اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پوچھا میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آڈ پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اٹھایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی جھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تقا کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو اُن کے لہجے فکر مند کے ساتھ ساتھ روایتی پولیس والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صاحب

نوری بھی اپنے باپ سمیت محن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایات دینے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا تھا..... تم کا میاب واپس لوٹو گے.....“ آواز سنتے ہی میں نے چوک کر اُسے دیکھا، وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا ماہو گیا۔ ”یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا فائدہ چھان مارا ہے لیکن.....“ خانو چلا یا ”ٹھہرو! وہ ضرور بابا کو قلعے کی اُس خفیہ سرنگ کے ذریعے لے جانے کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جانتی ہے.....“ ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ نالغ کیے بنا کچھ سپاہیوں کو خانو کے ساتھ اُس سرنگ کا پتا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے روک دیا گیا۔ ”آپ رُک جائیں..... وہاں خطرہ ہو سکتا ہے.....“ میرے بس میں ہوتا تو سب سے آگے بھاگ کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اُس کی تنہا کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ”سرنگ مل گئی ہے صاحب۔ وہاں ایک بڑھاوندھے منہ پڑا ہے.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ایس پی کی قیادت میں وہاں آپہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی عہد دہایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور اور ”مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے استاد سے ملنے ضرور تمہارے ساتھ۔“ میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اُس سے کہا ”جب تم وزیرے کی بات سے فون پر بات کرو تو اُسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے.....“ جیب میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے فون پر بات کر ڈال کر بڑھ گیا۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میرے معلومات مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنالیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فوج اچھی طرح ذہن نشین کر دئیے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طرز نکلنے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے جب کہ ایس صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی لیے کال گڑھ داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری ساری گنتی اٹنی کر ہے۔ ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان بھی نہیں ہو گا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دورخ سے نکلنے کے راستے اور گر تار دے گا اور میں اُس کے جانبازوں کو کالے اور اُس کے دوستوں کی مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی پر بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے کیوں یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہو گا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر اتنی پہنچ رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامند کر کے گئے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا لیکن اس کی تمام توقعات برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گیا اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی لیکن آدھے گھنٹے کے اندر قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اُس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زندان سے برآمد ہوئے لیکن میری نظر سلطان بابا کی تلاش میں جھک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کھڑی میں خود جھانک کر دیکھا لیکن ان کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے پھڑوں کے لیے رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا لیکن خود جبروت جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اُس کے دو مزید خاص ہر کاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں نہ لگیں۔ کہیں اُس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

پہلا کفارہ

ایسا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ
ن سیکنے کے نانا تانی کو دیکھا تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود مجھے ہی تلاش کر رہے
تھے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس وہی ایک تھا۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔
پایک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے
ری جانب بڑھا ”تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا.....؟“ ہاں۔ اور اسی لیے میں نے خود
لیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ”سلطانی گواہ“ بنانے کا
مدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے گہرنا کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس
لے لیے تیار ہوں۔ بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔“ میں
نے فور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا
ن کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بلو، منظور ہے؟“ خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا
پے۔ ”تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے؟“ میں نے اُسے دُور
فرے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ”یہ بوڑھا اور بوڑھیا اُسی سیکنے کے نانا اور تانی ہیں، جو اسی
نے کی کھولی نہرسات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سیکنے کی قبر دکھاؤ اور اس بوڑھیا
لے ٹانوں پر پڑی وہ آدمی بٹھی ہوئی پھولوں والی چادر اُس بد نصیب کی قبر پر ڈال دو۔“ خانو کے چہرے کا
لٹ پٹا بڑھ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اُس کے قدموں تلے کوئی کچھونکل آیا ہو۔ ”نہیں نہیں!
مے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن.....“ ”لیکن کیا؟ ابھی تو تم دعویٰ
رہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے۔ پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے
ن کیوں جلنے لگے.....؟“ وہ بے بسی سے تپملایا ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں اُن کا سامنا کیسے کروں
؟“ میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ”تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے۔ کیوں کہ
ہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر
ن گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟“ خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سیکنے کے
رگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے اُن کی جانب دھکیل دیا۔ بوڑھیا اپنے آس پاس سے
زرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی
ن اُن کی سیکنے کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے اُس
ے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے اُن دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔
ن کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دُور سے بھی نظر آرہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو
نا زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں

اُس سپاہی کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آگرے گا۔ میں تو
کر آگے بڑھا تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی
غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سُرنگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے
فاصلے پر مجھے اندر جاتی بیڑھیاں نظر آگئیں، جو بظاہر کسی نہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبر
جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں
ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے
کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے۔ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا ہنگامہ سا تھا۔ ام
تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں سے آرہی تھی۔ میں نارنج کی روشنی میں بنے دائر
سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ ہوش و جا
سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی اُن کے
پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو
کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب
سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا تو عقدہ کھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر
میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بظاہر ٹھنک اور تھکن
علاوہ کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں
بڑے اسپتال میں مکمل طبی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی
سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں
دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر
البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی
میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار اُن کا ہاتھ مجھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حد تک
ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے تصدیق کر دی۔ ”ہاں..... کچھ بخار سا تو ہے۔
اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔“ میں نے اُن سے جبروت کے بارے میں پوچھا تو انہوں

لڑکھڑاتے اور ڈر لگاتے جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کز درو انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط کیوں سمجھتی ہے؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اتر جاتے ہیں۔ نہ کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے۔ میں وہیں گم گم سر بابا کے سر ہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بد نصیبیوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ میں نے سیکینہ کے نانائانی کی آس سدا کے لیے تو ذکر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا اگر میں انہیں اُن کی آخری چند سالوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ اُن کی لاڈلی نواسی گم شدہ، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں بہت سے انسان اپنی ساری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ ”وہ مجھے چھوڑ گئی، وفا نہ تھی۔ وہ واپس لوٹا ہے تو پھر میرا ہی ہوگا۔“ ”یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے۔“ یا زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہی جی لیں۔“ تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا تو ایسا کیا گناہ لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں ہے۔ انتظار تو خود پل پل وار ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی اصلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید اُن کی چلیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے اُن پر جھکا ”اب آپ..... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہوا کیا تھا؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ”ابھی تک بہت جلد باز ہو۔“ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پولہ لے کر قلعے کے دروازے پر آپہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیب نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آرہی ہیں، تو اُس نے سب حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اُس کے در پردہ ہم لیکن حسب معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پولہ دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قفل پڑا پایا۔ جبروت کے پا تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گزھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے سلطان بابا کو طلب کیا کہ اُن سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے، گاڑیوں کی آوازیں قریب آتے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جا نے اپنے ہر کاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلط

دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت آہ نکال چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے اُن کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آہ بڑھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص اڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس نہ خانے کی دیواروں میں چھپے، اس سرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے ہیں، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصر ایکسینہ کے بارے میں بتایا تب تک اندر سے سیکینہ کے نڈھال نانائانی کو کچھ لوگ سہارا دیئے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی، تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروادی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت نڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے کپکن کو دھلو کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج ہمیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں۔ قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارہ بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی، تو بستی کے سب ہی لیکن غم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سیکینہ کی آخری رسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا بھی اسی حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سیکینہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے۔ البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروادیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اُن دیکھے تعلق کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے نیچے ادھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شہادت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے فعل ہوتی ہوگی اور مجھے سیکینہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اُس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا۔ گویا وہ عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہ اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا رُوح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل انجان اور نئے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی ساری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا چہرہ مل بھی جاتا ہے۔ تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی رُوح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں الجھتا ہی چلا

سے وارلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے عارضی صحرائیں قائم کردہ کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جوان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا تھا، آج ایک بے جان لاش کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار تو اُس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی تو ان کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا ”انا للہ و انا الیہ راجعون.....“ وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلنے ہی پہلے سانول اور پھر اُس کا باپ کے یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کا باپ بھی شرمندہ سا بیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے چپ کر دیا۔ سانول کے باپ نے ساری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس سارے معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھپے، تو ان کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے زخمت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروادوں تا کہ اُن کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آپہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کرنا ہے تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں سارے کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آجائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھا تا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھر کی دیواروں کی منڈیر پر دیئے جلا دیئے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلو کر انہیں مانع لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھنٹوں کے نشان والی قمیضیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اوپر تک چڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے کوکے۔ جانے انکارسوں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتہ ہوگا۔

گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں۔ ضرور میرا اور سیکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بظاہر انجان ہونے کے باوجود انجان نہیں تھی۔ میرا سارا دن اسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجو دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گڑھ آجائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ”شاباشے جوانا شاباشے“ کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیب میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا۔ وہ اُن کی سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ اُس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیئے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کر دالیے جائیں۔ تب تک اُس نے سلطان بابا کو بستی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو زخمت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ ہی میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آکر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھنک رہی تھی۔ جبروت اور اُس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی ریجنرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اُس کا مقدر تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سیکینہ کا قتل نہ اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اُس کے چند گناہ دھوبھی ڈالتی، لیکن اُس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لیا تھا۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں بل بل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اُس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اُس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تہیہ کا جاری ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجائے اور پھر مکمل خاموشی..... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس

نہیں پائی، لیکن ان کے الپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے موالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہہ لگا رہے تھے۔ صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، سب ہی اُس جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی نظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بیک وقت بھلا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے رنگ بیک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لگائی ”جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے۔“ سب زور سے ہنسے۔ دوسری دلی نے تان چھیڑی۔ ”مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے۔“ اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرے دانیوں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں۔“ سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس عورتی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں۔۔۔۔۔ ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب علم، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبراہٹ سے اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اُردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی تہ ہوئی ہے اور اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل مبر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا۔ لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

اسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی ڈرتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ”خوشی“ نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ہی زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھنٹوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے بڑ ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل سرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے بے سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے۔ پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا۔ لیکن اس کے برعکس ”غم“ ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرز پر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے۔ خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جب کہ غم کا کاڑ ایک دائمی چھن، کاٹ اور جلن لیے دل کے اندر ہی چوست ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ”الوداع“ لکھوا کرتی ہے۔ اُسے کیوں اٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہمارا چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر بڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ”جاؤ مل آؤ، اس دو گھڑی کی ساتھی سے میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔“ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔“ سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شراپے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر سے قریب پہنچا تو دورو سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ”کہ آج سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے کہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“ لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو۔۔۔۔۔ یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ شاید تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔“ عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑا والیوں کا جواب تھا ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں۔۔۔۔۔ بستی میں ایک ہی چھیل چھیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرائیں جمع ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ خدا کرے آج اس زور آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آجائے۔“ سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور نپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے تم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان

دھانی

شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے، کیونو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھانی میں ساری تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اُس وقت میری ساری توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لاشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچاؤں اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آگیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوئے۔ پتا تم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا۔ اُس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گاڑی کو ڈانٹا کہ ”کتنی بار منع کیا، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔“

میں سلطان بابا کو انہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبال کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ وہ چیک کرے کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اُس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پاپا نے اتنے پیسے بھیج دیئے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کہ ”اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے۔“ اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحا بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے حوش و حواس میں تھے۔ اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خواہ خواہ انہیں اتنے مہینے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں۔ بقول اُن کے وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور اُن کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرتا بھی کسی مجھ سے کم نہیں تھا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس سارے ہنگامے میں شام ہو چکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر نپھرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آگھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں چاہتا تھا لیکن اسپتال کے اصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی۔ لیکن کسی مریض کو بنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہو جاتی ہے۔ لہذا طے یہ ہوا کہ ہم دودو کی ٹولیوں میں اُونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے اُونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلہ گاڑی بھی لگادی جاتی تھی۔ لیکن اس وہ پیسے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں لہذا ہمیں اُونٹوں کے مضبوط قدموں انھار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اُونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جارہے تھے۔ سلطان میرے ساتھ تھے۔ سانول اور اُس کا باپ ایک اُونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک سانے تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اُونٹوں پر توڑے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہا ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سیکنے کے پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو..... ”الوداع.....“

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے۔ مگر جس وقت میں نے دُور صحرا میں ریلوے کی اجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی نیالی سی گیس جتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچنے کا غائبہ لے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹہ ہے، اس لیے ابھی کال گرھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بیچھے، لکڑی کے تختے نما دیا۔ نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم، افسردہ تھیں۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے واپس جانے پر آمادہ کیا۔ سینڈ کلاس کے ڈبے میں بھڑکے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب بزر رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں قریب مزید کوئی اُن ہوئی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے سے پلیٹ فارم کو چھوا تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے ماما پاپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجے

ایک بزرگ جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دباۓ بوکھلائے ہوئے سے وہ دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس سے پوچھنے لگے۔ ”کیا عبداللہ صاحب کا بیٹی ہے۔ میرا نام شیخ امتیاز ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا۔ اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا نام نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔ میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے آگیا اور انہیں سلام کیا۔ ”جی..... میرا نام عبداللہ ہے۔“ وہ مجھے دیکھ کر کچھ ہلکے اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر جوشی سے ملنے لگے۔ ”اوہ! معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔ نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت نام تھی۔“ میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیا رٹنی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت قریب تھے اور تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عازری سے سلطان سے درخواست کی کہ اُن کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے اُن کا شکریہ ادا کیا یہاں تک آگئے، یہی اُن کے لیے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا تو نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے لیکن چہرے کے تاثرات گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے اُن کی حیرت بجاتی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہیں سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جارہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے نہیں تسلی دے میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا رہیں۔ شیخ صاحب جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ساری بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ”آپ نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں! صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔“ سلطان بابا میرے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کتر رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد ہے۔ کسی اور کے کمر پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا تب بھی مجھے گھر کی پابندیال مہا پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکتی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مزرعت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے با بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بند دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی۔ اور شاید وہ آوارہ گرد سا حراب بھی مجھ سے چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں کہیں بھی آز

۱۰۷

دیں کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی بے ہچکچاہٹ جان گئے مسکرا کر بولے ”بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے رد کہیں اور ٹھہر جانا۔ کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار زور دھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میرے شہر میں اُس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا.....؟“

ان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے تو اُن کی بی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ لا اور کچھ دیر میں ہم اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا اپنے تعارف بھی کر دیا۔ اُن کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا۔ اُس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ سبھی چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چاہ اُن کی گفتگو سن رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دلچسپی پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات نے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی میں اُن کا گھر بھی آگیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرائیں گزرنے کے تنازعہ زیادہ بڑھ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لوکی جگہ گاڑی سے اترتے ہی ہلکی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھپتھاہا لیا۔ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات لھانے کے لیے میرے پسند پوچھی تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو وہی میری پسند ہوگا۔ میں نوکروں کے پیچھے ناک کی طرف بڑھنے لگا تو انہیں کچھ یاد آیا ”ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے یار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت سے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں۔ اُمید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے تمہارا دھوکہ فریش ہو جاؤ..... ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے۔“ میں انیکسی پہنچا تو بنگلہ کا ایک پورا حصہ ان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغچہ بھی اسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے عدالے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آرہی تھی۔ گھر کافی ادھ اور اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی محسوس کا

احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تار یک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، مگر ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود بنا رہے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پنگے من کو بھلانے کی ہوتی ہے۔ اور ہم سے جو کوئی بھلا دے گا مگر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انیکسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیونو جوان نے اٹھ کر یہ کیا۔ ”ہیلو! مجھے شہر یار کہتے ہیں۔“ میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ ”میں عبداللہ ہوں۔ مسکرایا.....“ ”عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں۔ یعنی اللہ کے بندے۔“ شیخ صاحب زور سے ہنسے ”ارے؟ بات کا بُرا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھینا ہی شہر یار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو پھہرے۔ آج کل اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔“ میں بھی دیر سے مسکرایا ”پھر ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔“ اُن دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع ایک لمحے کے لیے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا چچ منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ میں ہاتھ بنانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک لکھنے کی بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہر یار کو مختصر سلطان بابا کے بار دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رخصت ہو کر آرام کے گئے۔ میں اور شہر یار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا کر بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انیکسی کا موجود بائیسچے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قمقے لگے تھے۔ لہذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا۔ میری توجہ ابھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے پڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اٹھا۔ مگر چونکہ رات کے ساڑھے بارہ بجتے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال گیا اور کسی اُن جانے دوسو کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا۔ ”جی.....“ ”دوسرے خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا“ ”جی فرمائیے“ ”دوسرے جانب سے ایک نازک سے نہ ابھری۔ جی آپ کون؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔“ ”دوسرے جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی تھا۔ میں گہرے سانس لے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ کھٹنی دوبارہ بجی۔ جی میں آیا کہ ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ

ہائے اس فون کی دوسرے لائن کہاں تھی۔ اس طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا۔ میں نے دوبارہ ریسیور اٹھالیا۔ دوسرے جانب وہی آواز تھی ”جی..... شہر یار.....؟“ ”اوہ تو یہ شہر یار کے لیے تھا۔ میں نے جواب دیا“ ”نہیں..... شہر یار صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔“ ”رے جانب پھر وہی جلتی ریت بجا۔“ ”اوہ..... معاف کیجئے گا۔ آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون دیں اور اس بار کھٹنی بجے تو آپ نہ اٹھائیے گا۔“ ”شہر یار خود اٹھالیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دوا کیس ٹیبلٹ“ ”میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد کھٹنی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید ری جانب سے شہر یار نے فون اٹھالیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے دہی کھٹن نے لگی، حالانکہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خشکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ رہا تھا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہر یار نے اندر جھانکا ”وہی تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود زہی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔ مجھے بھی نیند نہیں آرہی اور تمہاری نیند شاید اس فون کی بجتی کھٹنی نے اُڑا دی ہے۔“ میں خوش دلی سے مسکرایا ”نہیں! میری نیند ازل سے اُڑی ہوئی۔ شاید میرے اندر ہی کوئی کھٹنی لگی ہوئی ہے۔ اندر آ جاؤ۔“ ”شہر یار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ مال لیا“ ”واہ، خوب کہی۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹر ہی دکتے ہو۔“ میں کرائل گیا اُلٹا شہر یار سے سوال کر دیا ”تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ“ ”شہر یار نے ایک لمبی سی سانس لی“ ”اب کیا بتاؤں؟ پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا ہوں۔“ ”کیوں..... خیریت.....؟“ ”ہاں فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڑی نے مجھے یہاں کسی اور دے کے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انگل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم انتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڑی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا کہ چونکہ ابھی تک کوئی مہ جیں میری نظروں میں سمائی نہیں، لہذا اس چناؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اسی گھر شروع کر دوں۔ اور یہیں سے میری الجھن کا آغاز ہوتا ہے۔“ ”میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔“ ”اس میں الجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو۔ اور پھر دونوں میں سے مادل کو بھائے اُس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو نہ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو ڈیڑی کو اطلاع کر دیتا۔“ ”شہر یار نے پھر ایک آہ بھری ”یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی مانے۔ کیا کہوں کہ وہ میری غزل ہے یا خیال کی رُبا، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر“ ”میں مسکرایا۔“ ”تو پھر الجھن کیا ہے۔ پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آ کر تمہارے اُس کا ہاتھ مانگ لیں۔“ ”شہر یار جلدی سے بولا۔“ ”وہ ہے ہی ایسی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اُسی کی کئی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اُس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، لٹریچر تو جیسے وہ سارے کا سارا گھول کر لی چکی

جس نے تمہارے راتوں کی نیند اڑادی ہے۔“ شہر یار نے سر کھجایا۔ معاً تو حل کرتا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہو جائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہو جاتی ہے۔ شہر یار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ لہذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہوئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلنے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے۔ البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہر یار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک اُن کے تمام ضروری معائنے بھی ہو گئے۔ جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی تو انہوں نے منع کر دیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہو آؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں اُن کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہر یار اور اُن کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگا دی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع نفل کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا۔ ”عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحبزادی ہیں، شاہانہ۔ ہماری شانی۔“ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، ٹامیں مانگ نکالے سانولی سلونی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہماری جانب آگئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل لٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پا جامہ پہنے لمبی سی چٹیا بنائے۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا۔ ”اور بھئی۔“ یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحبزادی۔۔۔۔۔۔ دھانی۔۔۔۔۔۔“

ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر وہ بات نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔۔ لیکن صرف فون پر۔۔۔۔۔۔ جیسے ہی وہ سامنے ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اُس کی۔“ تو کیا اُسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے اُن کے ہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔۔۔۔۔۔؟ شہر یار مسکرا دیا ”ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مہمان ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں۔ لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اُن تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی تو میرے کان وہ سب کچھ لیے ترستے ہی رہے جو میں فون پر اُس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونو بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی مجھے شہر یار کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اُس نے شکوہ کیا ”ہاں تم! بھی ہنس لو۔ اپنی صورت حال ہی کچھ ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھٹلی اڑاتے ہیں۔“ میں نے اُسے چھیڑا ”تم خواہ خواہ کہانی کی تلاش یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔ ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے۔ یار نے قریب پڑا کٹن اپنے سر کے پیچھے رکھا“ ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آگیا۔ مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے غور سے شہر یار کی جانب دیکھا ”ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی“ کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں۔“ مسکرایا ”ہم بھی لکھاری ہیں۔ میاں چلتے پھرتے بہت کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ فون جس کا ہمیں تم نے بھر رکھا ہے۔“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا ”اچھا۔۔۔۔۔۔؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ نے۔“ شہر یار میرے جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی میز پر زیادہ تر انا لائن اور چائینز ڈشز موجود تھیں۔ تم نے چھری کاٹنے کا استعمال حتی الامکان کم سے کم کیا لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھا بھی باسانی بتا سکتا تھا ہے کہ تم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہو۔“ میں نے حیرت سے شہر یار کی طرف دیکھا کمال کا مشاہدہ تھا اُس کا۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اُس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اُدی۔“ واہ بھئی۔۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم۔۔۔۔۔۔ متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ شہر یار زور سے ہنسا۔ ”تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی“ میں بھی ہنس پڑا۔ ”چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معے کا کیا کر

لفظ گر

لیکن یاد رہے..... جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ ٹپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا کوئی نہ کوئی انہونی ضرور پیش آئی۔ میرے لبوں سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ ”آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفا یابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟“ وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے لیے، تمہارے لیے بلکہ سب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں۔ اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو..... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی صحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں لہذا نتائج کی پرواہ ہمیشہ اُسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے..... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا کرنے کی تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدود کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھوٹنے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، شے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں۔ اب ان اعضا کے ساتھ جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود رُوح کے نکلنے کا نام ہے جو نکلنے نکلنے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے۔ اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویے کی وجہ سے بآسانی اتنی عمر کا سنز بھی طے کر لیتے ہیں، جب کہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی رُوح علیحدہ ہو کر نکل جاتی ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں..... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری رُوح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔“ میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار میرے ذہن کے درپچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا۔ جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ اُنکھ میں اُلجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ”اسی لیے ہمارے معاشرے میں

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے تو شاید میں کبھی انہیں سگی نہیں نہیں مانتا۔ ان کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا۔ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں تو کچھ دن ان سہ ساتھ ہمیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک دوں گا۔ شہر یار کی ساری توجہ شاہانہ پر تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا اُٹھا تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اُٹھ تھے۔ شہر یار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا تو سلطان کمرے میں تین چار سینئر ڈاکٹروں کا جھگڑا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ مجھ صدیوں جیسا بھاری گزرا۔ پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر مسکرایا۔ ”اوہ ہاں..... ڈونٹ وری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔“ اُن کی بات میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لیے دوا اور اُس کے تیمار داروں کے لیے مسکراہٹ سے اور بھلا کیا سوغات ہوگی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی۔ بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اور اس لمحے یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔

سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ”میں نے کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی رہائی ان ڈاکٹروں کی مرضی ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بروز نئی محبتیں تراشیں گے مجھے یہاں روکنے کے لیے.....“ مجھے اُن کی ”رہاؤ اصطلاح پر ہنسی آگئی۔“ ہاں..... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے! انہیں حلال بھی تو کرتا ہے۔“ میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیئے۔ ”ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پور!

عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی دینی اور نیادی معمولات کا بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دہی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دہائیاں شروع ہو چکی بہتر ہے کہ اب اوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا۔ یہ کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری رُوح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ رُوح کا ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری رُوح کو ہمارا یہ جسم چھوڑ دے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس رُوح اور جسم کی دائمی جدائی کا باعث جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اُسے روزِ حشر سے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا۔ اسی لیے ہمیں دنیا کے لیے اُسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔ ”سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے لیکن میرا ذہن حسب معمول کچھ نئے سوالوں میں الجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم رُوح صرف ہمارے گئے گناہوں کی سزا بھگتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ”ذہن“ کا رستائیوں کا شاخسانہ ہے.....؟

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آکر مجھے کل والی بات کی یاد دہانی کروائی کہ تیار داروں کو رات گزار کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آپہنچے اور پندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے راہ میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جانا کیوں اُن کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا۔ اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بہر حال انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھپانے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچالیا کیوں اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو اُن کا چھوٹا بیٹا دھار کا ر پورج سے ذرا پرے اپنی ڈی ٹی ایس بیوی باپ کی ریس چیک کرنے کے لیے اس کے پچھلے پیسے کو اسٹینڈ کے ذریعے اُونچا کر کے ہائیڈرو لک جیک لگا رہا تھا۔ سارے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلائی میں کھو کر خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند لمحوں میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہرال کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بانیکس کھول کر اسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے لمحوں کی

کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ملنے پر یادیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر رہی رہتا۔ پھر شام کو جب پایا گھر واپس آتے تو اُن کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جبران بھرتا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ زکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ”کیوں عبد اللہ سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اُس نے ہائیڈرو لک تیل کی لمبی گلاس نما کچی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پیسے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے اسٹیمپلٹر چھوڑ دیا لیکن پہلے اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی کچی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ ”جب تک پہلے مکمل طور پر زک نہ جائے اور بایک کا انجن ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا۔ ورنہ یہ آئل صرف پیسے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا۔ پھر کئی دن تک بایک بار بار چوک ہوتی رہے گی.....“ وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میرے بات سن رہا تھا۔ پھر اُس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اوہ! تو یہی وجہ تھی کہ بایک پوری ریس نہیں اٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام سمجھ کر تیل دیئے جا رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اُسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف پلٹے لگا اور اپنی بایک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اُس کے ڈیڈ نے اُسے یہ بایک لے کر دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہدایتی کتابچہ (Manual Guide) نہیں ملا۔ کیوں کہ بایک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے۔ لیکن آج شہر یار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا لیکن کھانے لگنے تک شہر یار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹا..... ”عبد اللہ بھائی کیا آپ مولوی ہیں؟“ شیخ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ہاں۔ لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔“ وقار اور شہر یار بھی مسکرا دیئے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ”آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو اُن کی یاد نہیں آتی؟“ شیخ صاحب نے اُسے ڈانٹا۔ ”وقار! یہ کیا بدتمیز سی ہے؟“ میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ”کوئی بات نہیں اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں اور مجھے اُن کی یاد بھی بہت آتی ہے۔“ تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اُن کی بہت یاد آتی ہے کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے

ایک رات بھی دور نہیں رہ سکتا۔“ ”رہ تو میں بھی نہیں سکتا، پر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے نا۔ البتہ جب کہ والے بہت یاد آتے ہیں تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔“ وقار زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے، آپ روتے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔“ ”تو کیا ہوا۔ بڑے روتے نہیں کیا؟“ ”میر تو سمجھتا ہوں بڑوں کو چاہئے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح اُن کا دل کبھی خور نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔“ اب ڈی صاحب اور شہر یار بھی ہماری اس ”معصوم“ بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل کی ایک اور شک زبان سے اُگل دیا۔ ”آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یار اپنا گھریا چھوڑ کر اسے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔“ ”شیخ صاحب کے ہاتھ کاٹنا چھوٹ گیا۔ شہر یار نے بھی چونک کر اُپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ”وقار یوہر مائنڈ یوہر اوار برنس۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ”تم انتہا پسندی کے کہتے ہو۔“ ”وقار کچھ ہچکچایا۔ ”دیکھا لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”دیکھا پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہر یار کو پریشان ہوگی۔ بالکل اسی طرح، جیسے تمہارے ڈی ٹی ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے تو لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے تم کسی زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں صرف مذہب سے وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویے کا نام ہے۔ تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن سکتے ہو۔ شہر یار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے تیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں۔ لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں کچھ سیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اُسے پریشان کرنا نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے ان مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت ڈر کا بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خودعبادت میں بھی ایسی اعتدال کو مد نظر رکھنے کا حکم ہے۔ تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جاسکتا ہے۔“

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے خود ہی دعا

ہے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اُس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ”نہیں عبداللہ بھائی۔ میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کترا تا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔“ شیخ صاحب کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ تھکی۔ شہر یار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے شہر یار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ ”ٹھیک ہے جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا۔ تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“ نماز کے بعد میں شہر یار کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے اُدھ جلتے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگا تار سگریٹ نوش ہو گے۔“ شہر یار نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ”نہیں۔ ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر الجھ جائے تو پھر یہ ٹکٹنیں ہی میرے سوچوں کی رُک ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔“ ”مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ کڑوا دھواں تم جیسے لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جاؤ کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے ہیں؟“ ”شہر یار زور سے ہنسا۔ ”پتا نہیں، وہ ہو سکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں اُن کا بھی دم گھونٹا ہو تو خیال باہر ٹپکنے لگے ہوں۔ کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیٹے۔۔۔۔۔؟“ ”مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا۔“ ”کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال انک گیا ہے، تمہارے اندر جسے اس دھواں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ ”شہر یار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شہر یار نے جلدی سے فون اُٹھالیا۔ دوسرے جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہر یار نے جواب کے بعد کہا ”زہے نصیب۔۔۔۔۔ کیسے آج کون سا امتحان لیس گی ہمارا۔۔۔۔۔؟“ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن شہر یار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھالیا۔ ”مجھے اُن کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہر یار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔“ دوسری جانب کی بات سن کر شہر یار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا تھا۔“ فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”کافی چلے گی۔۔۔۔۔؟“ ”نہیں! میری کفین سے کچھ زیادہ غبی نہیں۔“ ”تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔“ ”شہر یار کسی

اور حرکتی ہوئی۔ سارا گھر اُسی کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی نہ ہی کسی کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے اس مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوبصورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرمان برار تھے البتہ۔ گھر کا سارا انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اُس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اُسے خوش آمدید کہا۔ لیکن..... جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو سکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی رنگ نمنے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انکسی میں وہ اُس کی دوسری رات تھی، جب فون کی کھٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اُس نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ یہ کوئی بھی اُس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ وہی سے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے اُن کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپاؤ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اُس کی گھنیری پلکوں کے چھپے چھپا ہوا تھا۔ لیکن شہریار نے مزید کئی دن لیے ات والی اُس آواز کو اُس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اُس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچے گا۔ کامیاب ہو گیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہزادی کچھ ایسی ہی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی ان ملائم لفظوں اور کوئل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اُس کی باتوں میں اندلیتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اُسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اُس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ اُڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا۔ پہلی مرتبہ اُس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی سائے پرباغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں ایک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسرے گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اُسے لانا تھا۔ لیکن شہریار کے نقشہ کان شانی کے لبوں سے کچھ نئی آرزوئی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ”ہوں ہاں“ کر کے شہریار کی باتوں کا اب دیتی رہی۔ اسی بات نے شہریار کو الجھا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ درپردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنے مامندی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش مانتا۔ کیوں کہ اگلے ماہ اُس کے گھر والے باقاعدہ اس پری زرخ کو شہریار کے لیے مانگنے آرہے تھے اور شاید

گہری الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں تم سے ہر الجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ہم رائزر ویلے بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا بن جاتا ہے۔“ میں نے غور سے اُس کی طر دیکھا۔ ”تم کچھ الجھے ہوئے سے لگتے ہو؟“ ”ہاں..... ایک عجیب سی بات ہے شاید میرا وہم ہی ہو لیکن نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے۔ سامنے آنے پر وہ کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم و حیا کے زمرے میں تو لتا رہا، لیکن آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا تو وہ بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔“

میں غور سے اُس کی بات سن رہا۔ ”تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوڑا ہوئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں ملاق ہو۔ ہو سکتا ہے اُ۔ خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے ”تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔ تو ہو سکتا ہے۔ اُسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہو۔ ہوں۔“ شہریار اب بھی بے چین تھا۔ ”ہاں! ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اُسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور اُن سے بنے اُ چھوئے خیالات ہی میری بکزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کر ہے.....؟“ یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا؟“ ”پوچھا تھا۔ اُسی نے بھی کم و بیش وہی تمہارا جواب دہرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔“

اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ اُن کا بڑا بیٹا ام اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش و نگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا دقا اپنی مرحومہ ماں کے حسن اور رنگ و روپ سے جڑے ہوئے تھے۔ اسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قدر مختلف تھے۔ لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر شیخ صاحب کی تمام اولاد بڑے بے حد اکیلا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں۔ البتہ شانی کے مقابلے میں دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اُس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اُس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوئی گئی دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کالر، پینسلین، پھر کالج بیک اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھک چوڑیاں، ہیر بنڈیا پھر پرس..... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر بھر کی کٹلری، پردوں اور صوفوں کی کراکیم حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پرنسکون، ٹمہری ہوئی اور ساکت تھی۔ البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی

شہر یار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہر یار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہر یار نے غالباً پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو رکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میرا ہر لفظ تمہارا ہے

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ”جی.....؟“ وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھٹک کر دوبارہ بولی ”میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں۔“ میں سنبھل چکا تھا ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ ابھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ”وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔“ مجھے حیرت ہوئی ”جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“ وہ کچھ ہچکچائی ”تمہید تو میں نے باندھ دی ہے۔ اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں۔“ چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر ابھری ”آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی۔ نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”یقین کریں وہ بات تو بس فونی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔“ ”شکر ہے۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر اُن کو دیکھ آئیں۔“ ”جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔“ پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔ ”شان! جھجکے ہوئے بولی“ دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے ہم اُن کی ذرہ برابر شکلی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ مجھے ہنسی آگئی۔ تو گویا یہ ساری گفتگو شیخ صاحب کی ناراضگی دور کرنے کے لیے تھی۔ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔“ میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے ساتھ اس پتھر ملی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

ہسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں سب جین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی۔ اُس نے مسکرا کر تسلیم کر لی۔ ”ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بہت کم ہے۔“ میری پریشانی دور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ”لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اُن کی فائل کھولی اور آسان لفظوں

میں شہر یار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دیر دیر سے گھر کرنے لگا تھا۔ شہر یار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں نکلی؟ دھانی بھی تو اُسی گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہمارا نظر ہمیشہ روشن اور اُبلے چہروں ہی میں کیوں اُلجھتی ہے۔ یہ خوبصورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظریہ منحصر ہوتی ہے تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلا جھٹک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ و ش کی پوری پلکیں مگرنے سے پہلے ہی اُس کے لیے زانو ہو چکا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور ہلکے دھندلے بنا ڈالے۔ اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی تو ہمارا نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا۔ کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفا آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا۔ میں۔ یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہر یار خود اُٹھالے گا۔ گھنٹی لگا تا رہتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہوگئی۔ شاید شہر یار اُٹھالیا تھا پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہر یار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے پتھوں بیچ جمائیاں لیتا کھڑا آیا۔ ”عبداللہ فون اُٹھاؤ..... تمہارے لیے کال ہے۔“ میں چونک گیا۔ ”میرا فون..... اس وقت.....“ شہر یار پلٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے فون اُٹھایا ”جی کون ہے.....؟“ دوسری جانب کچھ خاموشی کے آواز ابھری۔ ”جی..... میں دھانی بول رہی ہوں.....“

میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ اُن کے داہنی جانب آخری پسیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جھک کر بیروں تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرتا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دہا شریانوں میں خون کی روانی میں ایک لمحے کی زکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ زکاوٹ خون سے بنے ریت کے ذرے سے بھی باریک لوٹھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوٹھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اسے قہراً اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے تو اسے طب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھو فی الحال تو کسی ایسے چپکے یا بننے والے لوٹھڑے سے بچے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں۔ تو بس فی الحال ہماری اتنی ہی جنگ ہے، ان کی بیماری کے اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔“ ڈاکٹر۔ مستند تجربے کا رکی طرح مجھے تسلی دی۔ لیکن اُس کی باتیں سننے کے بعد میرا ہاسپٹالین بھی جاتا رہا۔ واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی سختی پر بکھری سیانی کو غور سے پڑھا ”تم بھی آگے ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانس باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور سانس پوری ہوئی تو ان ڈاکٹروں کی ساری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے گی۔ پھر اس جھیلے میں کیوں پڑتے ہو؟“ میں نے انہیں غور سے دیکھا ”میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرہ دعا ہے۔ یہ بھی تو اُمید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے۔ لہذا آپ دوا کی دعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے تو میرا کی یہ دعا آپ کی نسون میں بہتے خون کے غلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی۔ تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اس کو مایوس نہ کرنا۔“ میں نہم کتنی دیر تک ہوتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سننے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا تو اُن کی بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا ”ارے..... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار نہ کی؟“ انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”نہیں۔ یہ آنسو بھی اُس کی شکرگزاری کے ہیں۔ آج پہلا عبد اللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں استاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جتنے خوش رہو۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے۔ میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔“ میں بہت دیر اُن کے سر ہانے بیٹھا

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے اُن کا کاندھا ہلا کر نماز کے لیے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے کچھ آئینے اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہریار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ غلام بابا اُن سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے، بی بی زہرا تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور اُن خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں اُن کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیئے تھے۔ جب شیخ صاحب نے شہریار کا اُن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ وہ بہت جلد اُن کی فرزندگی میں آنے والا ہے تو سلطان بابا مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا ”کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے“ شہریار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا ”جی..... وہ..... مطلب ہے.....“ ہم سب شہریار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ”جیتے رہو ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو تو پانچ وقت اُس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند ہو خود کو“ شہریار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی اُن کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمرہ اُن کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا، ڈاکٹر نے پریز کی باندی بتا کر اُن سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب گھر کا دوسرا ڈرائیو جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی مایوس نہ تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ لہذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ شہریار بے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر فی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلاف دل شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہریار کو جھپٹا۔ ”عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اس کے برعکس کیوں ہے؟“ شہریار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری لہجے میں کہا، ”دل بھی جل گیا ہوگا۔ کریدتے ہو راکھ، آخر یہ جتو کیا ہے..... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے۔ اب راکھ کریدنے سے تمہیں بھی کچھ مل نہ ہوگا اسے دوست۔“ میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارا ہوٹل کی ذیلی راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کے میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب نے بھی لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند

بتادیں۔“ کچھ ہی دیر میں مستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک کچا موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشیں دھنیں چھیڑ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی دھنیں ارد گرد پھرتے پھرتے کیڑے میں ڈال دیتے جو فوراً اُسے پیانٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ پیارے مسکرا کر اپنا سر ملاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ دھن بجاتے ہوئے اُس کی انگلیاں پیانوں کی لمبی سفید ٹھکرک رہی ہوتیں تو اُس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اٹھتی رہتیں۔ سچ ہے کہ ہر ہنرمند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال سیلون کی لکڑی سے بنایا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران کبھی تنہائی میں بجاتے تھے۔ اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے پیانٹ بہت ہنرمند اور سلجھ ہوئے لوگ لگتے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جھرا اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کا ارد گرد روشنی کا انتظام اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدہم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے وہ سب درمیان ہوتے ہوئے بھی تخیلے میں ہے، اور شاید تخیلے و تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور بنائے ہوئے تھا۔ صاحب حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیت ادا کرتے ہیں، ورنہ کہ یہی ذائقہ ہر دسترخوان پر ان کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف دھنوں فرمائش شروع کر دی۔ پیانٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہذا اب اُس کی پورا ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پپا اسٹیو ونڈر کے اسی نغمے کی دھن بہت شہرہ بجاتے تھے ”ہیلو..... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری محمور آنکھوں اور گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دلربا..... کہ میں انجان ہوں..... میں ابھی ان ہی لفظوں کے ظلم سے شروع کروں..... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ پیانٹ نے دھن سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اُس نے چٹ بھیجی، ”لا پرواہ سرگوشیاں (less whispers)..... میری بہترین دوست ہیں..... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ بوجھ قدم بننا تال کے ہیں.....“ بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارج مائیکل، ویم اور ماڈرن ٹالک پرائے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک سٹریٹ ہوائز اور برٹنی سپیرز کے نئے نغموں کی دھنوں پر کیا آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مسکراتے رہے، جیسے اُن کا کیا اٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے ڈھلتی رات کاٹوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے۔

اور دینی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خاموشی
متمثل نہیں ہو سکتی۔“ شانی اور دھانی بہت غور سے شہر یار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری
متوجہ تھے۔ اُن سے شہر یار کی خاموشی کا لبا و تقہ برداشت نہیں ہو سکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ”تمہارا
کہانی کا عنوان کیا ہے؟“ شہر یار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی..... ”میرا ہر لفظ تمہارا ہے، لیکن میری
کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجئے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر کے لیے خاموشی
خاموشی طاری رہی۔ پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ”انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جگہ
بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور محبت ادائیگی کے لیے
شدہ ہے۔ لہذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کرنا
گئے۔ کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی
سدا بہار رہتی ہے۔ لہذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زندگی
واپس لے آنا چاہیے۔“ شہر یار نے مجھ پر نظر ڈالی ”اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔“ میں شہر یار سے ایسے ہی
کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔
لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی طبیعت
کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو برتنا پڑتا ہے۔ ورنہ
ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی روح کا باعث
ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکس
ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔“

کہانی کا انجام ملے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ رات
بھی شہر یار خاموش رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے وہ اچانک ہی کسی خیال
سے باہر آیا۔ ”آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.....؟“ میں سمجھ گیا کہ
اشارہ کس جانب ہے۔ ”نہیں..... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پایہ
چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی
لفظوں کا روپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اُس کی لغت ہے۔“ شہر یار نے
نظروں سے میری جانب دیکھا ”اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے
مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پرکھ لی؟“ ”نہیں..... اس میں ایسی کوئی خاموشی
نہیں۔ تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت
بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی

بھی تو نہیں..... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر
لکھنے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام
ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گرہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں خاص ماہر نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ جو
جانتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔“ شہر یار کہیں اور کھویا ہوا تھا ”تو پھر وہ مجھ سے
ان دنوں پچھنوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تھپیلے اور جلوت کا ہے؟“ میں نے غور سے شہر یار کو
دیکھا۔ اُس کی زبان پر وہی بات آکر زک گئی تھی، جو خود کہیں دُور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اُنکی ہوئی
تھی۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیے۔ ”ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم
مطلوبہ گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کرب تک اسی طرح جاری
رہا ہے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے۔“ اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟“ شہر یار کو جیسے ایک جھکا سا
نہاں وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ”اُس کی گفتگو اُس وقت تک مکمل تھی، جب تک میں نے شانی
کا آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔“ میں اور شہر یار ایک ہی
تہ پر پہنچ رہے تھے۔ شہر یار کی شیخ صاحب کی کوشی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک کھلا راز تھا اور دوسری
تہی سے شہر یار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہر یار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم
راز کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدھوش کیا کہ وہ
آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی
دھانی دونوں کے چروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہر یار کی الجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی
بل کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اُس روز فون پر
تک کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر شہر یار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر
ام کھائی دے ہی گیا، لہذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہر یار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہر یار نے اُسی
تہ کو سنی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اُس کے دل میں اٹھل پھٹھل چار ہی تھی اور اُس نے فون کرنے
کا آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہر یار کا شوق
وقت بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن ساعتیں تشہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر ایک
کے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پاسکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہر یار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب
تک زیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح
مکمل شہر یار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہر یار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ۔ لیکن شہر یار
خود اس میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تاوقتیکہ اُس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں
ملیں۔ پھر شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہر یار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا

لفظ روتھ جاتے ہیں

وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہریار نے وہ بات عرض کی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی روتھ روتھ دی۔ شہریار نے انجکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُر دی ”سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اقتدار گئے راستے کا تصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر کھتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ لیکن میں یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ جا کر فون اٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ہوگی۔“ میں شہریار کا شانہ سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ نہ بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی سے ہی کھلی۔ دوسری جانب کونسی کا خانساں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلاف معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا تو اُسے اُٹھائی۔ لہذا اُس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ باہر نکلا تو شہریار پہلے ہی سنے باہر کھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے غلام کیا گھور رہا تھا۔ میرے اُٹھنے کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا عبد اللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہے۔ ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع نہ کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سنہرے خوابوں اور کول جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔“

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چوکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی انہونی ہو۔ ٹھیک اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہلو تہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اُس کی جانب بڑھا ”تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟“ ”نہیں۔“ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں روپوں کے رفرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں سے اتنی دیر لگی۔ حالانکہ اس کی اپنی نیت ہی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی۔ اور پھر جب شہریار کی پسندانہ دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی۔ کیونکہ دھانی کے بقول اُس کے شہریار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے۔ جب کہ ان کی پہلی نظری میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار غلوں کا امیر ہے۔ اُس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نوسوں میں خون نہیں، لفظ رواں ما۔ اُس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جس نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر شہریار کی انگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند بیٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے اُن دونوں کو زکریا کیسے نکلتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک ہی تھیں۔ لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی بول کر رہیں رکھ سکی۔ وہ دوا انسان، جن کے درمیان محبت بڑھ جاتی ہے، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے یو کی شارٹ ویو، میڈیم لہریں فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لاگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر چڑے نہ پکڑ نہیں پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے دائرہ کار مختلف۔ محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا رین کر اُس انسان کی زندگی میں اُجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے طے بنا دینا

کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں یہ اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فیصد رشتے بزرگوں مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں۔ ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو ہمیز دیتا ہے، لیکن شہر یار کا ستا ہوا چہرہ اور اُس کی سرخ آنکھیں رہی تھیں کہ اُس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اُسی لہر میں نمود تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہر یار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ”پھر تم نے شانی کیا کہا؟“ ”میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بذا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے کیا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اُسے بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں۔ جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آرہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اُسے متاثر ہوں۔“ مجھے شہر یار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوا۔ ”تمہیں اُسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اگر اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھی گئے تو اُن کے داغ جگمگاتے رہیں گے۔“ شہر یار الجھا ہوا تھا۔ ”میں بہت دباؤ میں تھا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ کہہ گیا۔“ ”دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہوا صل فاتح کون ہوتا ہے۔ وہ جوش دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اُس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے۔ اور“ چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹے ہیں کہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہر یار۔“ وہ چڑسا گیا ”تو تم چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔“ ”نہیں۔ یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری۔ تم پہلے ہی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی۔ ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد انہی اُن کہے لفظوں کی صورت میں کاٹنا بن کر خود ہمارے دل ہی میں رہے گا۔ لہذا ہم اپنے دل کے بولی اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر دے

ہیں۔ اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس سارے عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کک اور بد قسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے ششے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے لیے وہ شیش پچکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کبھی واپس نہیں ملتے۔ اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھودیتے ہیں، جو پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد و رجا احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔“ شہر یار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ اور دو قوتی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمہ داری دینی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمہ داری نبھانے لیا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو ایک خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بد صورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا کہ نہ تھا۔“ ”تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔ کہانی ختم کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ کھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اُسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔“ شہر یار نے لمبی سی آہ بھری۔ ”لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔“ ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مستعد نوکر تھوڑی دیر بعد چائے گرم کر کے میز پر سجاتے رہے تھے۔ میں دو گھنٹہ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ”آج اپنی کنڈی کہاں لٹکا آئے ہو میاں۔ کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔“ میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سیلٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبین کی ٹکٹیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برقی ہر بارش لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی۔ چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بوجھ زیادہ دیر سہا نہیں پاتے۔ انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرا سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے

لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اُسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور قید خانے ہمیں کیا قید کر پائے گئے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ملکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی اور موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر جارہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ڈانٹوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی کہہ نہیں پاتا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ اُن کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جاسکتا تھا صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے کیا۔ تم تینوں آج بے حد خاموش ہو۔“ وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب زبان سے بے ساختہ واڈنگلی۔ ”بھئی واہ، کیا بات کہی ہے۔ خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بوندوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ لیا ہے۔“ دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے نال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں جو ہم سے تمام گلے گلے بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کمرے کی نعمت ہو تو موسم ہم سے رُڈھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دے سکتا۔ بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔“ اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ عجب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک جگہ پر پانی کا جو ہڑ سناٹا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیجنے سے رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کی چھتری اندھیرے میں ممانکین سے مجھے ڈھونڈتے ہو وہاں نکل آئیں اور میں اُن کی انگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈونڈ کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ”کاغذی سفینوں“ کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی۔ ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینہ ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ رُڈھ جا رہا ہے۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے جو ہمیں اس

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے انہی ہی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ”لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں گیا ہے؟“ شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ”پتا نہیں، لیکن عبداللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی ہوتا ہے۔“ وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر رشتی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رجم جگم گرتی وہ پھوار باہر، ماتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انگلیسی میں دکھائی دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش نے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر شہریار کا انتظار کرتا رہا، پر وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم میں باہر لان میں جلتی سفید گول لپٹا ہوا بونڈوں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی تھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ”ہی فون شہریار کے لیے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا۔ تھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لیے ہونگی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگا تا رہے گی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اٹھا ہی لیا۔ دوسری بان دونوں سے کوئی ایک بولی۔ ”ہیلو..... جی میں عبداللہ بول رہا ہوں۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔“ راجا صاحب کچھ لمحے خاموشی چھانی رہی، پھر وہ بولی۔ ”میں دھانی بول رہی ہوں۔ مجھے دراصل آپ ہی سے کرنی ہے۔“ میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ لے رہی۔ ”عاب شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد ہے.....“ میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں۔“ ”شکریہ..... شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ فون میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں لگائی ہوئی کوبس ایک شرارت سمجھ کر معاف کر دیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقیناً جاے اس سارے معاملے میں اگر کوئی تصور وار ہے بھی، میں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اُس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے ساگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو ساری عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں، شانی کو معاف کر دیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔“ مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ بھرا سی گئی ہے۔ میں نے

اُسے تسلی دی۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ بات کچھ نازک جذبہ کی ہے۔ آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟“ جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں بھی اُن سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شہریار میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت مانتے پر تیار ہی نہیں۔“ میں بے ساختہ کہہ ”کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟“ دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے تاسف ہوا لیکن تیرکان چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیرکی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر مجھ نے تلاقی کی کوشش کی ”معاف کیجیے گا بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب پہنچ جاتے ہیں۔“ دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور ابھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ دھانی نے خود کو سنبھالا۔ ”خدا کرے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی۔ میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی ہڈی ہے۔ اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی طاقت ہے، جو شہریار کی تمام اُلجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار ہے؟ بات ختم کر کے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا وہاں نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بیٹھا چکی تھی، شاید اسی وقت جب شہریار اُس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا۔ لیکن شہریار نے جب اُس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کر دھانی اپنے اندر جھٹکے سے ٹوٹ کر کچی کچی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوبصورتی سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس اس کی واحد راز دار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اُسے بھی اس طوفان کے آواز اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں والا ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا نہیں۔ زیادہ نہ سہی پر کم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لیے علیحدہ علیحدہ جزیرے ہی مقرر کر چاہیے تھے۔ تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ انہی سوچوں میں ساری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ اگر رات کو اُسے زیادہ گئی تو وہ اُسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جا رہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہو کر اسپتال لیے نکلنے کا سوچ کر بھی انکسی کا باغیچہ پار کر رہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم گئے۔ وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اُسے سلام کیا اور جواب دینے کے وہ اچانک ہی اس اُلجھن کا شکار ہو گئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لیے ہمارے قدم سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ”شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں

میں ضرور اُس سے بات کروں گا۔“ جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔ دراصل..... ”اُسے لفظوں سے زیادہ وہ خود ابھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ”کیا شہریار نے آپ سے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟“ میں ناراضی سے زیادہ اسے ایک بے نام اُلجھن کہوں گا۔ شہریار اُن لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی لفظ ہوتے ہیں۔ ان کے من کے دروازے الفاظ کی چاتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ سارے دروازے کھول ڈالے لیکن کسی اور کو اس کے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے سے ہی واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور اندر آنے والے مہمان کے فرق کی اُلجھن کا شکار ہے۔ اُسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش کش سے ضرور باہر نکل آئے گا۔“ دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اُنٹھ نہیں پائیں۔ پھر جربہ وہ بولی تو مجھے یوں لگا کہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ”کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے کر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر اندر سے میزبان کون؟“ ”پوچھنے کے بجائے کسی اور مہمان کا نام لے کر با آواز بلند صرف اُسی کو خوش آمدید کہے تو کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔“ میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکا کر اُس دھان پان سی سانوی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے مزید کھوجا۔ ”اندر بلانے والے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جاسکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آجانے والے مہمان بھی تو اُسی حیر اور خوشی کے ساتھ لبیک کہہ جاتے ہیں۔“ اُس نے اپنی ہلکی نظر اٹھائی، درد، شکوہ، قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی کا نفوس۔ کیا کچھ نہیں تھا اُس ایک نظر میں..... ”نہیں..... کم از کم میرے معاملے میں یہ انہونی ناممکن تھی۔ میں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی لفظ ہیں۔ لیکن اُن کے دل کا راستہ بھی اُن کی نظر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر دھکیل دیا، جسے اُن کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں شانی کے لیے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربان ہو جائیں تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے۔ اور چاہے انجانے میں مل بھی، پر اب وہی شہریار کے دل کی ٹیکس ہے اور یہی اس کی خوشی ہے۔ اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لیے اپنی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔“ میں نے غور سے اُسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ ”یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو ایک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک اُن سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی ہے؟“ ”نہیں میں نے ہی اُسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اُس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل سے رائے لینی چاہیے۔ اُس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے تو پھر اُسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی

تم بھول جاؤ گے

ان دو بہنوں کے لگا تار بہتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی بات میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید مانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبیوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں ان جذبیوں، رشتوں اور گتھیوں کو اسی طرح الجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو، میں بھی ان دونوں یونی الجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں کبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ ہے۔ شہر یار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات کہ وہ دونوں بہنیں شہر یار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ۔ کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس ٹکون کے تیسرے کردار شہر یار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے لئے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کا ہر انسان مرد و عورت کی تخصیص کے بنا خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے تھے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ میں نے بعض اپنے اندر لگے ششے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں دنیائے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب تک وہ خود کی بار چوٹک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ لگے لگے ششے سے پڑتا ہے۔ کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ کہہ سکتے ہیں ”ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی.....“ یا ”بھئی میں تو بالکل ہی ’فٹو جنک‘ لہوں، بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں۔ تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے ششے میں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں غلط نظر آئے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں۔ ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد جاتے ہیں جو کبھی کسی نے ہمارے سر پر کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں۔ ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے، جو کہی کی رائے کے مطابق ہم پر تجتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ ماہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے جو ہماری

چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا۔ کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہر یار کو اپنا مان چکی تھی۔ ”دھانی کے کانپتے دھڑکے لرزش بڑھنے لگی۔ گویا معاملہ قربانی دینے کا ہے؟“ ”اُس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔“ ”اگر یہ قربانی ہی ہے تو قربانی میں اپنے جہنم ہی سے دیتی چلی آ رہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہر یار پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لیے خوب صورت خیالات اور دانش پر بیساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہو جاتا ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے۔ ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے۔ جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہر یار کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا۔ لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں..... اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہر یار میرے ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کہہ کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہو کر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ بد صورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹنے وقت تو ترازو اوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹنے وقت پیمانہ یکساں رکھا جاتا ہے۔ کیوں ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لازوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے تو زکرائے کے لیے مخصوص ہیں اور صرف روپ والوں کے لیے مخصوص ہیں۔ پھر ہم جیسوں کے لیے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ بھی چنداں نہ جلتے انکارے کچھ مدہم جگنو ہی ٹانگ دیے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی.....؟“

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی کی آنکھ سے ٹپکا اور اُس کی قدم بوی کر گیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کہ سے کھڑی ہماری ساری باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اُسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر ہلکے ہلکے کر رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔

اور سب ہمارے کسی کی اوزھنی کا آچکل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہر یار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً اُن کے سامنے دوبارہ اپنی ”رہائی“ کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ”کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”جس نے یہاں دل لگایا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا یہاں..... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں“۔

”ح“ بھی ڈاکٹر ہنسنے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہر یار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کینڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک چند ہواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھری میں مجھے ایسا لگا کہ کینڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں۔ تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا۔ نہیں کالائیں یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرخ اور بزرگ تصویر سے اڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں جیسے کوئی پرانے مکرئی دی کے چلتے چلتے رنگ اڑ جانے پر اُسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اُس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمحائی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے۔ لیکن ایک لمبک اُسی لمحے مجھے اپنی نسلوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چھین دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور ملن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب سے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے اُٹھ لیلے۔ شہر یار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن نے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر قلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری رُوح پھوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خواہ خواہ پریشان ہو سکتے۔ پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اٹھا کر اُن کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے سر پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ”کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر۔ رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟“ میں نے بات ٹالی۔ ”کچھ نہیں۔ شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں“۔

”وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔“ کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو۔ جنوں حد سے گزر نہ تو دھشت بن جاتا ہے۔“ میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہر یار سے کہا کہ کمرہ چلا جائے۔ شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن اُس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اُن کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا سلطان بابا کی آنکھ لگی چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔

دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا سفر ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک اور ڈال دیتی ہے۔ مجھے اُس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سنی اس معمولی شکل و صورت والی شہزادی کی کہانی پر یاد آ رہی تھی جس نے اپنی سلطنت کے کبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے کبھی میرا آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بچ کتنے ایسے دل چلے بھی ہوں جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوبصورتی کو مانپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں انکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چندا معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہر یار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہا کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلد سے اُس کی جانب بڑھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ ”ہاں بس ایک دوست کی طرا زک گیا تھا رات کو۔ اب بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ سوچا کچھ تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ سلطان بابا اب کیسے ہیں؟“ ”وہ بہتر ہیں۔ لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کس کو سزا دے رہے ہو۔ خود کو یا ان دونوں کو.....؟“ شہر یار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کسی کی ٹیک سے نکا دیا۔ ”بہت اُلجھ گیا ہوں میں..... سمجھ نہیں آ رہا۔“ ”کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دل دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو۔ جودل کے اندر براجمان ہے، اُس کی توقد رکرو۔“ شہر یار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں وہ کے ساتھ ہوئی ساری بات اُسے بتا دوں لیکن کسی کا بھرم نہ کھنا مقصود تھا۔ لہذا اختصار کے ساتھ ان دونوں کی پریشانی بیان کر دی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہر یار کی اُلجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے اور پھر میں اس سے کس رویے کی امید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مدد رُخ کی ایک اچھنی نظر کا شکار ہو کر سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرا کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرا بھی عام ظر صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین و قرار لٹا بیٹھتا، خود میں کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر کانا خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا قائل تھا اور خود میرا رستہ بھی تو کسی کی صراحی وار گرا کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زلف نے اُڑا رکھی تھی۔ میں بھی تو کسی کی گھیری پکلیوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا۔ پھر مجھے شہر یار سے کسی بھی گلے شکوہ کیا تھا۔ شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے۔ ہر جنوں کسی حسن کا اسیر ہے۔ ہر چاند کسی کی گلابی کا

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہریار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک ہے۔ کہیں اُن کی خدمت میں کوئی کی تو نہیں آگئی جو شہریار یوں اُکستا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہریار بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہی تھی اور بس..... چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوشگوار ہے۔ آج گزر روز جیسی پھو تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن آسمان پر آج سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ کلوڑے ”کوکلا چھا“ کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھی کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دے دے ہوتے ہیں جنہیں اللہ میاں کے وقت نیلے آسمان پر کھینے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوبصورت تصور ابھرتا تھا۔ شہریار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان ہٹانے کے لیے ادھر اُ کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی سچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پوچھی۔ ”عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی۔ کیا کبھی بیٹیاں اپنے باپ کے لیے اسی طرح کھلتی ہوں؟ ”میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں..... مثلاً ایسا شیشا بہت بڑا کرہ ہو جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں۔ برستے آسمان سے بھیکتی زائیک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سیانوا اور.....“ شانی اچانک بولی اٹھی۔ ”اور اس سیانوا پر زیبا ٹیگم ٹھیں لگتا رہی ہوں کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجاد دی.....“ شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول ہل بھر میں ہی خوشگوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوششیں رائیگاں نہیں گئی۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پوریج تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اٹھ میرے پیچھے چلی آئی۔ ”عبداللہ.....! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں۔ اور میں اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہلکی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان ہوں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔“ ”جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ جانے ان آنسوؤں صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور

پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے کیوں کہ روتا ہوا انسان اُس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔“ شانی کے چہرے پر چھایا کدھر صاف ہو گیا۔ ”آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کے کھینے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں۔ کبھی امی کو بار کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے ٹوٹ جانے پر بھی..... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر.....! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔“ میں نے ہنس کر غور سے اُس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں اُلجھا بیٹی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذباتوں کی پتنگ کو اُونچا اور زیادہ اُونچالے جانے کی خواہش چکا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہمارے شہرِ رگ پر بھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سمجھتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو کا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہریار تک اُن کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کدوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ اُلجھ گیا۔ ”میں.....؟ میرا مطلب ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا آپ نہیں سمجھتی کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر.....“ ”میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے۔ ہم اپنی غلطی پر تادم ہیں۔ لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے۔“ شاہانہ کی سنہری جبین پر اپنا عایان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ کیا کبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”آپ اطمینان رکھیے۔ میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا آپ لوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہریار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے؟ دل کی گرہیں، بات مضبوطی سے بھی لگی ہوں تو اُن کا کلام دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے۔ بعض سداقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پوری آج مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آج ہی سے اُتار دینے پر کچھ جاتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آج بس ایک بار ہی سلگانی جاسکتی ہے۔ دوسری مرتبہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔“ شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذباتوں اور رشتوں کی آج کی لڑکھائی اس لمحے میں اس کے چہرے سے کندن ہوتے لگا ہی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے اُن سے دیکھا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے

نظار میں شہریار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اُنھ کو ٹھیلنے لگے۔ ”شہریار کی اُلجھن اپنی جگہ بجا ہی..... لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی۔ شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اُس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں۔ اُس سے بس اتنا کہنا ہے کہ اُس گھر کے دروازے اُس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“ گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو واپس دیا تھا۔ میں اُن سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے پیچ بڑی آرام کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ”آگے وکیل احب! اب کیا فیصلہ لے کر آئے ہو.....؟“ ”تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا ہے۔“ ”شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اُسی کے ساتھ عمر قید سادی جائے گی۔“ شہریار نے ہنوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھرائی۔ ”منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا ریوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟“ میں نے چونک کر اُس کی نب دیکھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے کی شانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے اہر بات بھلا کر اگر شانی کو خود اُس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری اہم چرائے لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔“ ”تو تم نے کیا جواب دیا؟“ ”مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی۔ ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹی کافون آگیا اور کیسا قسم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا جو اُس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی۔“ ”کیا مطلب.....! کیا شانی نے بھی.....؟“ ”ہاں اُس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ مائے لے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں۔ اور اب چونکہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے مان کو جان چکی ہے لہذا اُس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے پسپوں کی راہ پر اپنا عمل قائم کر لے۔ اُس نے اپنے آپ کو میرے لئے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے پورے دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔“

اچانک فون کی ٹھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہو گا۔ دھانی نے سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔“ میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اٹھایا، دوسری جانب ٹی کی تھی۔ ”یہ آپ نے کیا کیا..... کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا خیر بھی اُسی مٹی سے اٹھا ہے اسے آپ کا جنم ہوا تھا۔ پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟“ دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ ”بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں شہریار کو پا بھی لیتی تو یہ اُن کے لیے

گئی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیئے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی رخصت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو تو پھر کبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان اپنے اندر بھی بیک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا تو ایک عجم خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہریار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہریار اُن سے بولا۔ ”کم ان!“ دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہریار کے سوٹ کیس پر پڑی جس میں وہ اپنا سامان رہا تھا۔ ”تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟“ ”ہاں.....! اور کوئی فیصلہ حتیٰ نہیں ہو پا رہا تھا۔“ ”تمہارے اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟“ ”انہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جاؤ۔ واپس گھر جا رہا ہوں۔ لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہوگی یا نہیں.....؟“ میں نے چونک کر کی جانب دیکھا۔ ”کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟“ ”ہاں.....! دونوں ہی سے فردافرا ہوئی، آج شام کو۔“ اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کہ شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شہریار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ شانی نے اُسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ”تم کسی نتیجے پہلے ہو تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔“ ”تم کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ اُبھری۔“ ”نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو..... مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے۔ فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں۔ تم جاؤ، اگلے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا تو کافی کنگ سجائے جا چکے تھے۔ ماحول پر طاری تھی۔ دھانی نے کافی کپس میں انڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صاحب بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہریار یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ بات سننے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اُس کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں ہمیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا ہاتھ چکے تھے۔ اور ان کے ماتھے پر غنتی شکنیں بھی دھوئیں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں جو اس وقت اُن کے ہاتھ نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کے لب کھلے۔ ”تو کیا شہریار اسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟“ ”یہ بھی وجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔“ ”شیخ صاحب نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کسی شدید کش مکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی میں جیت اُن کی دو بیٹیوں میں کسی کی ہوتی، خود اُن کی اپنی ہار جیتی تھی۔ کیوں کہ یہ راز اب اُن پر بھی عیاں چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور انجانے ہی میں سہمی پر وہ بھی اس در کے کھلے

نہ جوش دکھا توں بھل دیسیں
تیرے باجوں میں نئی جی سکی
نہ ظلم کما..... توں بھل دیسیں
دلدار مٹھا..... توں بھل دیسیں

ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ اُن کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ محبت اگر دو نقطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو ہے۔ لیکن اگر یہی محبت تینوں کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید ہم شانی کو مٹا ہی لوں۔ آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔ آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجئے گا، اُسے آپ کی باتیں جلد سمجھ آتی ہیں۔“ فون بکھ دینے پر بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہر یار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہر یار بہت بکھرا ہوا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گم واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ اُن کے ایک دشمن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی اُن کی آزر دہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسب معمول بیٹنے شہر یار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ اُن دونوں کی آنکھوں میں کبھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی۔ اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہر یار گاڑی میں بیٹھے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اُس سے پوچھا۔ ”شہر یار بھائی.....! آپ پھر کب آئیں گے ہم سب آپ کو بہت مس کر رہیں گے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں جلد آؤں گا۔“ شانی کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ مگر دھانی کو خود کو سینٹے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ ”اُسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگنا تی زبیا تہم کر کہیں گی کہ کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی۔“ سب ہنس پڑے۔ شہر یار نے شانی اور دھانی پر نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گزشتہ سے کیوں یاد آیا جس میں محبوبہ اپنے چھڑے ہوئے محبوب کو دہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ محبوب اُسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلائے۔ پر وہ جانتی ہے کہ باوقتی جواز ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جدائی کی موت ہے کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جا۔

تے کوں یاد ہوئی میں آکھیا سی
دل دار مٹھا توں بھل دیسیں
وَلْ وَلْ قرآن تے ہتھ نہ رکھ
نہ قسماں چا..... توں بھل دیسیں
کچھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر

والی اداسی۔ جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہاں ہی سے رخصت ہو جانا ہے تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں بچوں کو فردا سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی اُن سے نظر نہیں ملا پائی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہر کر بولے۔ ”جن کے من کے آئینے اتنے اُبلے ہوں، اُن کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے۔ ہم جو کھودیتے ہیں، قدرت اُس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے چن رکھتی ہے۔ بس اتنا یقین رکھنا۔“ دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی چمکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے کاٹ جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم اُن کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال کریں لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں تقریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبہ تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا دیا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیشن کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ جانے ان میں وہ کون سی لہر ہوگی جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی جس سے ذرا پرے میرے دل کے ساحلوں کی حق دار رہتی ہے۔ پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسی لہر بھی جو اس لہر کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرا کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا۔ ضرور یہاں گہاگ اُڑاتی، مسکراتی اور شریری ہنسی ہنستی ہوئی بے باک لہریں اس لالہ رخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک پہنچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ ”دل دریا، سمندروں کے گہرے۔“ لیکن زہرا کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ جلائے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری چٹلیوں کا یہ وضو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد اسٹیشن پر ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اُتار دیا جہاں کھڑی مخصوص اُونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا آخری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ اُن کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور اُن کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر تقریباً نو برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے آنے کی سنائی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ اُن کے عقب میں کھڑا اپنی حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اُسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔

شالیمار

کبھی کبھی پیار کھودینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی ہیرا ”کوہ نور“ بن جاتی ہے۔ کھویا ہوا پیار ”شالی مار“ بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالی مار بن گئی تھی۔ شہر یار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں آئے۔ اُن کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ نہ ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اُب بظاہر اُن کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میرے اندر کی چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ ٹھنڈے لیے لڑھٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن سبھی رنگ نہیں روٹھتے تھے، بلکہ تھے جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صورت بنیتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم گرم سیال مادہ دوڑ رہا ہو۔ میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھوئیں بن جاتی تھیں اور میں یوں ہاپنے لگتا تھا جیسے میرے دُور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں۔ لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو۔ کمرے میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے۔ اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا کر بیٹھ جاتا تو وہ ضرور علاج کے محضے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رکنا پڑتا اور پھر کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری رُوح کو جھلسانے کے لیے ہر دم جتے رہتے تھے۔ اور خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی بلی جائے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوشی سے رخصت ہونا تھا، اُس روز بہت سے کالے بادل ہمیں اپنے کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جانب جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برسی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اُسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے اُن کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رخصت کرنے کے دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے۔ پھر وہی الوداع، پھر وہی رنگوں کے سرے تک پھیلنے والے

ہاں کا ایک تارا ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی مثیالا اور دم ہی سہی، ایک آوارہ تارا..... نصف رات بج چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں اتنی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اُس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل ایک اور پہاڑ کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس دیرانے میں اتنی رات گئے یہ لون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ”ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے والا.....“

خبر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تھی تو پھر اٹھتے اٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے حسب معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد سلطان بابا، مرتضیٰ صاحب، نرگس اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید پس آٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ”مجھے کیا ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ شاید رات کو نیند نہ آنے کی وجہ سے۔“ ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھام لی۔ ”ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.....؟“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ”خبر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے تو اچانک چکرا کر کمرے کی پٹکٹ ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا۔“ مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوایا اور تب سے ہم سب تمہارے گھر پر ہی بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں انڈی ملی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ ساری زرداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح روزانے کی چوٹ پر ہی گر گیا تھا۔ یہاں کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں لیکن اس کے بعد سب کو راتھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتش جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لحوں کے لیے میری بصرات بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سن رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”ایک بات بتائیے..... باقی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا بچے کو شت تک بوسہ ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈ بھیر تو نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں حکیم صاحب کی بات سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ

اُس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے کبھی بچوں کی بڑھیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، ملائم، شرمیلی اور بچلی سی..... ہم تمام عمر اپنے بچپن والی رُوح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے گن: ان کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصرات سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسل: آگ بھڑ گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لبوں میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈمکا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ”کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں نے بڑی مشکل سے سلکتی سانسوں پر قابو پایا۔ ”جی.....! میں ٹھیک ہوں۔ بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے۔ کچھ دیر آرام کروں! سنبھل جاؤں گا۔“ سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ کمین نماز کے لیے جمع ہوتے ہی کبھی اپنے چلیے سے مجھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا جماعت پڑھوانے کی ذمہ داری مرتضیٰ صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی بجائے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد کبھی نمازیوں نے فردا فردا سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضیٰ صاحب کے گھر سے ہی آچکا تھا اور اشرف المرتضیٰ جواب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین تیلے لکڑی کی پلیٹوں میں سجائے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید پسینہ نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے۔ لہذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بناشت کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی جیسے کوئی ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ صاحب اپنے بیٹے سمیت رخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے کبھی دوست تیار نہ تھے۔ گھرے نیلے آسمان پر اپنی غفلت سچا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے اُن میں سے سب سے روشن اور چمکتے تارے سے زہرا کو پوچھا۔ ”کیسی ہے وہ.....؟“ تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانک کر بولا۔ ”وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام کرسی ڈالے اور تمہاری باتیں کر رہی ہے۔ تمہارا پتا پوچھ رہی ہے۔“ جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر رشک آیا۔ وہ آسمان کے چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں

میں نے تیر کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد تو گرمی اور جس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک دوڑ، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھک لگا اور پتنگ آسمان میں ڈولنے لگی۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لیے دوڑتا رہا لیکن کئی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کر آتی ہیں۔ انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور مزید اونچا اڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا ہوا؟ کٹ گئی پتنگ؟“ ”ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اونچی اڑائی تھی پر.....“ اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔ دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی۔ سوان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھلیں۔ لہذا تمہاری پتنگ وہاں چلی گئی۔“ اشرف کچھ حیران ہوا۔ ”اچھا۔ کیا بادل بھی پتنگ اڑاتے ہیں؟“ میں مسکرایا۔ ”ہاں، بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ تب ہی تو پتنگیں اُن سے باتیں کرنے کے لیے اتنا اونچا اڑتی ہیں۔“ اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دُور ہونے لگا۔ ”اچھا، پھر تو کوئی بات نہیں۔ بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دُھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ”میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا وہ مجھے ایک نئی پتنگ لا دیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“ ”یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟“ اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی اُن کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں۔ دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں۔ یہ پتنگ بھی اُسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک مرسے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں جن کی تعریف میں اشرف اس وقت زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا تو مرتضیٰ صاحب مسجد کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آواز دیں گے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بجا کر کبھی کبھی آدمی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر بچاؤں اور گھونٹے جمع کرنے آ جاتے تھے۔ لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اُسے بادل خواستہ اُٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اُوپر مسجد میں چلا آیا۔

ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جڑے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا ہی رہا لیکن اُن کے نیچے میری جلد میں بارہا پوسٹ ہوئے تھے۔ شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا اس چھو گئے ہوں۔ پر میں نے انہیں یہ بھی کہ اسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا دیکھیں کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی گئی تھی کیوں میں فوجی چوکی کے مستند اکثر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیر معائنہ رکھا تھا۔ اُن میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟“ میں ایک بار پھر الجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے کبھی رکن کتے ہی تھے اور بدھ سے کبھی کتوں نے اُسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلہ صاف کیا اور دھیرے سے بولا ”دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا۔ لہذا معائنے کی نوبت ہی نہ آئی۔“ حکیم صاحب نے تشویش بھرا لہجہ سنا کر پوچھا۔ ”اُوہ..... میں سمجھا۔“ سلطان بابا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ ”کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.....؟“ حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ”کھل بات تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی..... مختصر اُتارنا پتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود ہاں بلکہ خدا خواستہ کچھ زہریلے مادے ان کے خون میں گردش پا چکے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرض میں یہاں سے تیس میل دور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادیا جائے۔ میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے لیکن زیادہ کیجئے گا۔“ حکیم صاحب اپنی دواؤں کی ایک اور خوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اچھلنے چلانے کے بعد اپنی دواؤں کی صندوقچی اٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر بس میری میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی اُن کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ”میں آم سفر کھانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس لیے خاموش رہا۔ آپ بے فکر رہیں میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ اسی طرح رُوٹھے رہے تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔“ میرا حرج کار گر رہا وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ”بہت ضدی ہو۔ لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے۔ جب بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا انکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ”ہم منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، اُن کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں..... مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور مشرقی ساحل کی یہ مسجد..... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟“ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ”اشارے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے۔ کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھنا امید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔“ حسب معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑیں۔

قاتل

میں ہکا بکا سایوں ہی اپنی جگہ جمنا بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور خوالدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک رگڑا "کون ہو تم۔۔۔۔۔ اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟" میں عبد اللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی زی واقع مسجد میں رہتا ہوں۔ "ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا "یہ جھوٹ بول رہا ہے ب۔ لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آکر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل۔" میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے۔ اور میرے ہون کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ساری ہستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی۔ افسر کے حکم پر مجھے جھٹکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھنٹے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس لے زمین پر چوڑے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑا تر چھا جسم ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چوڑے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زور ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ تیس، چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں سے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ لگے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگتی جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند مابعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں میں جھٹکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ لپک کر میرے قریب آئے اور سے ہاتھ نٹول کر کہنے لگے "یہ جھٹکڑیاں کیسے عبد اللہ میاں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟" اتنے میں ایک سرکاری ساحل پر نمودار ہوئی اور سارے پولیس والے ہوشیار اور مودب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو راہر ہٹایا۔ "اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ۔ ایس۔ پی صاحب آرہے ہیں۔" ایس۔ پی کے قریب آتے ہی پولیس والوں نے کھٹاکٹ سلیوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری دیکھ کر بولا "ہونہ۔۔۔۔۔ تو یہ ہے وہ لڑکا؟" سلطان بابا نے کھٹاکر ایس۔ پی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "کیا کیا ہے عبد اللہ میاں نے۔۔۔۔۔ آپ نے اسے جھٹکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟" افسر نے غور سے سلطان بابا کو

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی آنکھیں تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رک سے جاتے رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سر ہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بُری طرح جل رہا تھا۔ بہت اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک ادھر ادھر سر پختار ہا پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد کہ سلطان بابا دیر سے میرے سر ہانے سے اٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارنا نمک ملا پانی میرے چہرے پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے تھیمڑے پر میں نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو سر پر حجرے کی چھت کی کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحوں میں شینا ہی گیا۔ اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھٹکے ہوئے مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر ریت میں بنا ہوا تر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا۔۔۔۔۔! میں یہاں کیسے پہنچا۔۔۔۔۔؟ ابھی رات کو تو میں اس کمرے میں ہڈیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمار ہا تھا پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا۔۔۔۔۔؟ میں ابھی جر کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک ڈور سے کچھ لوگ جہوم کی صورت میں مجھے اپنی ہا بڑھتے نظر آئے۔ ان کے بیو لے دیرے دیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہوئے تو سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ پھر ایک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی سے چلایا۔

"وہ رہا قاتل جناب۔۔۔۔۔!" پھر کوئی زور سے گرجا۔ "لپکو۔۔۔۔۔ پکڑو۔۔۔۔۔ قاتل جانے پائے۔" سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔

دیکھا ”یہ آپ کا بیٹا ہے؟“ ”بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں..... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہوں۔
 ایس۔ پی نے غور سے بابا کو دیکھا ”خوب..... اور آپ کون ہیں؟“ ”ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک
 راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں
 میاں۔“ افسر نے گہری سانس لی۔ لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے،
 بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا
 ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ
 مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟“ سلطان بابا۔
 سانس لیا ”میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔“ ایس پی نے پوچھا
 سلطان بابا کو دیکھا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا۔ لیکن آپ
 سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔“ پولیس
 نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیب کی طرف
 پڑے۔ مرتضیٰ صاحب اتنے پریشان تھے کہ ان سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے بابا
 سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے
 صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ ان کے اندر جانے کتنے طوفان اُٹ رہے ہیں لیکن وہ پولیس
 سے کچھ بول نہیں پارہے۔ جیب میں بیٹھے ہوئے میری نظر آخری بار اس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے
 داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جزا
 اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ ہستی والے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اڑاتی جیب
 سے ساحل سے دور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر وحشت لگا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی جس پر برسوں پہلے کیا گیا جا
 جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک رنگ آلود بورڈ جمول رہا تھا، جس پر
 بنغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ”پولیس تھانہ، تحصیل ماہی“ اور
 جیب تھانے کے چھانک سے اندر داخل ہو گئی۔ ایس۔ پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار
 سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب
 رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس۔ پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھے ہیں اور یہاں صرف
 کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں
 تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی میں
 واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلقی سا تھا جیسے پولیس قتل کے الزام

ہیں (Allopathy) ٹرین کی دوائی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل ایک ہوتی ہے لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ حالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی طاق میں رکھا دیا جلادیا، جو سلاخوں سے پرے طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حالات تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔ دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حالات میں باقی رہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی۔ ”یہ کیہا مقدّر لکھا کر لائے ہاں۔ کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔“ میں ان کا ہاتھ تھپتھپایا ”آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔“ اگرزائی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے نقصان نہ ہو۔“ اتنے میں سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ”لاک اپ“ میں بند کرنے کا ہو گیا ہے، لہذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حالات کی سلاخوں پر بڑا سالو ہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے ”لاک اپ“ بنادیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل ہستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھانے کے باپاس رات گزارنے کی دھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت ملی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رجن صاحب واپس جا چکے ہیں اور اب وہ صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے رہا ہٹ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھا لیا گیا تھا، لہذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا ل اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس تھا۔ میں تو وہ سب، یوانہ تھا، جو تاج کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھکھک کر دیوار کے تنہ ٹیک لگالی اور صبح سے ہوئے اب تک کے واقعات کا از سر نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک لڑیاں کچھ یوں جاتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی کرچکا تھا اور اب میرے اندر اپنی بھیڑیوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے نامی لمبے میں خود سے بچا نہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا۔ لیکن اس نے خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہذا فوراً حکیم صاحب کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے حلق میں چپکائی گئی دوائے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا۔ لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر اسے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو سلاخ پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی

اور میری نسوں میں چنگاریاں بھڑکیا۔ سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو اور پھر مجھے ڈولتے دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پہلی دیوار پر کچھ عجیب عفریت نما سائے ابھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی دیر بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دیرے دیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ یہ وقت حالات کے سنگی رسل نما چہرے پر لینا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ ایک ڈاکٹر ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آئی دھوپ کے زاویے اور رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روز قیامت جب ہم دوبارہ جائیں گے تو ہمیں یوں لگے گا جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چار سالوں سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پہل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے۔ جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا تو مجھے بالکل اسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پہل کے آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری اُٹھ بیٹھا۔ بہتر ہوں۔ بس نرسیں شدید درد ہے۔“

”ہوں..... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشار خون، واپاؤ؟“ ”جی سمجھ گیا.....“ رجن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسب معمول اُن کی انگلی درمیان سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ”تمہیں یہ بیماری کب سے ہے؟“ میں نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھائی (Tetanus) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ خدشات کے مطابق (Rabies) رہیجہر کا کیس نہ ہو۔ لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔“ حکیم صاحب کہنے کی کوشش کی جناب یہ جنوں کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے ہماری طب کی زبان میں اسے ”مگ“ بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے ہیولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اُس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ”ہاں ہاں..... یہی ساری علامت ہیں رہیجہر کی بھی۔ لیکن میں نے آج تک رہیجہر کو زندہ نہ دیکھا۔ جب کہ یہ نوجوان تو آواز گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔“ بحث طویل پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں نے سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جاسکتی ہے۔ فی الحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب

راہل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اٹھا کر واپس جا اٹھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں ہی بنا دی تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات لی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔“

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں بھی ابھریں اور کچھ لوگوں کی ذہن کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔ چلو حافظ جی..... تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور لے آیا ہوتا تو اُسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا ”مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟“ نری نے حوالات کا تالا کھولا۔ ”ریحان صاحب آئے ہیں۔“ میرے ذہن میں ایک جھٹکا ہوا..... ریحان..... اُس لڑکی کا منگیتر.....؟“ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہی شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اُس نے نہ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں ہلکے سے کھٹکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی ٹریس میں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔

وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو؟ کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میں اپنے قابو میں ہوتا تھا۔ لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اتنی رات کو اس دیرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اُس کی جان لی تھی تو کیا وہ تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کو سنہلے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اُڑ اُڑ کے میرے چہرے، ہاں اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جڑ جس قدر خاک آلود ہو، اُٹھای گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور ایک چھوٹی سی گلاسی لیے نمودار ہوا۔ ”لے بھی مولوی، چائے پی لی۔“ بھی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون پر ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دورا نے اس لڑکی کی جان لے لی۔ اب اللہ جانے سچ کیا ہے.....؟“ میں نے سنتری سے پوچھا۔ ”وہ لڑکی کو جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟“ سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چا۔ دوسری گلاسی لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ”کیا بھلا سا نام تھا اس بے ہوش کا..... ہاں..... لیلی..... لیکن نام تھا۔ سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اُسی کے مالک ریحان منگیتر بھی تھی۔ ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے وہاں شہر میں اس کی میونسپلٹیئر یاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزیر کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تھی تو ہمارے ایس بی صاحب بھی اٹل ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔“ میں نے سنتری ٹھٹھا ”لیکن وہ شہر سے اتنی دُور دیرانے میں کیا کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی تنہا۔“ چنانچہ میں۔ سنا ہے اُس کی ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے ہی دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آئے ہوں۔“ سنتری کی بات ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اُس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اُڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحبہ صاحبہ تو نہیں؟ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ”ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چلا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے۔ لیکن اُس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن سے چلتا ہے کہ اوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گھاکھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی اُسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی ہندا اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رخصتی تھی۔“ سنتری کی بات

لے آپ کو میرے ساتھ جانے وارادات تک چلنا ہوگا۔“ ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا اڑھ لکڑی کی چوکت سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکنے پر پڑی حق بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ انہی بے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اُس کی یہ حالت کردی تھی۔

اپنی کیا آواز گونجی ”آپ کے خیال میں لیلی اتنی رات گئے اس دیرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟“ ”وہ ہمارا بد تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلی اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلی کو پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی لمبی اور بجوم میں یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلی کی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہو سکتا ہے دل گھرایا ہو تو اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی مخالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا تو میں لیلی کو کہہ دیتا تھا اور وہ باسانی وہاں تک آ جاتی تھی۔ البتہ کوئی نہ آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔“ رحمن صاحب نے ہنکارا بھرا ”لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وارادات نام سے ہمیں بیک وقت دو گاڑیوں کے نمائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وی لیکسز (Lexus) جو لی کے استعمال میں تھی، اور جائے وارادات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسرے گاڑی بھی آئی تھی، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی، کار یا جپ بھی ہے۔“ ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے ”لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلی کی دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی نام وہاں آئی ہو لیکن لیلی کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر کا ہواخوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلی وہاں آتے تھے تو ہم سے پہلے ہی خاندان، کوئی جوڑا یا مچھلے نوجوان وہاں کپکپ مٹاتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھتے۔“

رحمن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ ”ہاں..... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ گاڑی لیلی کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا علمہ بستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن سے ایک تو وہ پوائنٹ بستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ ہائی کے لوگ سرشام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی جب کہ لیلی کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہر حال، فی الحال تو تمام اشارے اُسی ناک طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“

نفق اور جنوں

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے ہر اس وقت وہ نفق کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیر سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لفٹ، لکس، کوٹ اور چٹلون کی گھنٹہ کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ جیکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور ہر دوسرا پیرا بن خرید کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا موٹا جگمگا رہا تھا، لیکن اُس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی میت ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا۔ ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس تمام تراہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ لیکن شیو چہرہ، جس پر نساویت کی ناز کی یاد دہکتی تھی، کس قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے تیار ہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ”تو تم ہو عبداللہ.....“ میں چپ رہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی بیمار کی شکار ہو؟“ ”مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی متغیر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔“ ریحان کچھ کھویا کھویا سامنے تھا جیسے مدے سے اُس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ ”جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی۔“

اتنے میں باہر کسی سرکاری جپ کے ہوٹل کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس پی رحمن صاحب سے پولیس والی ٹوپی اُتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ”معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب راتے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر زکنا پڑا۔“ ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔ ”اٹس اوکے نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے۔“ ”اوہ ہاں..... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔“ میں جانتا تھا اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوع پر ملی کچھ چیزیں دکھانا تھیں۔ اُن کی شناخت اور پولیس کو مطلوب ہے۔“

لڑو بارہ زور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے بڑھنے لگی۔ وہی چنگاری میرے دماغ سے نکلی اور میرے جسم کو جھلسا گئی۔ سامنے بیٹھا مجھ پر ایک بڑے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے زلفا میں بلند کر دئے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر ف آلات لئے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولنا دیکھ، سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ دی۔ ”تم ٹھیک تو ہو..... تمہیں بخار تو نہیں رہتا، ہر وقت تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے نہ ہیں؟“ سانس لینے میں دشواری ہوتی۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں؟.....؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں ہاتھ اپنا تک؟ میں نے بشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب ہوں جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں مدہم نے لکھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی دے والے ہیولوں، بے یقینی، پرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی کی آواز آئی تھی۔ پی رحمن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ وہاں جیل لے جاسکتے ہیں۔ سینئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہ داری ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رحمن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید صرف قید یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد و ضوابط تو ہیں جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔ نے کچھ ہی کہا تھا کہ ”ہم بظاہر آزاد ہوتے ہیں، لیکن تمام عمران دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔“ صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے ”عجیب سی بات لگتی ہے لیکن سائنس اور ایلمنٹس کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم بیکٹریوں پر اپنی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج بن کر ہمارے ہاتھ لکڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا۔ یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی کائنات ہر وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے۔ جس میں اس نظام کے تحت لے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان میں کی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے

رحمن صاحب اور رحمان کمرے سے باہر نکلے۔ رحمان کی نظر مجھ سے ملی۔ مجھے اس جوان رحمان اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اُس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں چہرے پر مسندر جیسا سکوت طاری تھا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر ملنگ غصے میں اول فول بکتار ہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگوں یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ آج تو اس نے حد ہی کر مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار ایس پی صاحب کے ساتھ جائے کی طرف نکل چکا تھا۔ لہذا ملے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ ہم جھکنا وہیں سلاخوں کے پاس چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ہ بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا ”تو..... تو یہاں کہا کر رہا ہے؟“ میں گڑ بڑا سا گیا۔ ”میں..... قیدی ہوں۔“ ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”قیدی..... ہونہ۔ تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔ تو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں۔“ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے پولیس والوں کو گالیاں دینے والا مجذب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنسٹری سلاخوں سے گزرا اور ہنس کر بولا ”اس کی باتوں میں نہ آتا عبد اللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں توڑ میں ماشہ“ کتنی عجیب بات تھی۔ اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تو دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اچھل کر بالکل میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور براہ راست میری آنکھیں دیکھتے ہوئے بولا ”یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں۔ زور سے چونکا گویا اس ملنگ کو کبھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہاتھ ”سچ بتا.....؟ کیوں مارا اسے..... تو اور کتنے خون کرے گا.....؟“ میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنو ”تو کیا سمجھتا ہے..... یوں در بدر بھگنے سے تو اسے پالے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ تیرا مقدر ہی یہ سدا کا ہے۔ تو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا یہ نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو نبھانیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا صرف نام ہی عبد اللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔“ مجذب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا اندر بیک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں جانتا تھا۔ مجھے گم صم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ”تو ایسے نہیں مانے گا..... نہ مان..... کھانا تارہ بوند ٹھو کریں۔ ایک روز یونہی سولی چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خدا۔“ ملنگ

مرکب شامل ملے ہیں جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کانے کی کمر بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ انٹی ٹینیس نیچے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیا جواب تک باقی ہے۔ میرے لئے یہ میڈیکل ہسپتال میں ایک نئی دریافت ہے۔۔۔۔۔ اسے ریسیور پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہ تک نہ پہنچیں تو اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت نکل سکتا ہے۔“ میرے ذہن میں فوراً الٹنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصال منم۔۔۔۔۔ میں ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا ”میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر سمیت رحمن صاحب اب بھی اچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے مرنے کی نوعیت بتا کر اسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر ان تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا ”ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا ”تم انگریزی جانتے ہو“ میں نے اردو میں دیا ”جی کچھ شددہ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔“ میں نے اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس۔۔۔۔۔؟ رحمن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جلدی سے نفی میں سر ہلایا ”دیکھو نوجوان۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہو۔ مجھے! میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور جو جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس“

ایک چھ طیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس۔ پی صاحب کو اجازت دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگا تا معائنے کے لئے شہر کے اس بڑے اسپتال لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جب کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے جھکڑی لے کر میرے لپکے لیکن رحمن صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا ”نہیں۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ عبداللہ! گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے رہو۔“ خوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا ”بہتر جناب“ اور رحمن صاحب مجھے لیے اپنی سرکار کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگہ چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے داہنی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی ”تخصیل مائی“ کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا صاحب نے شہر سے ہستی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے

ڈرائیو اور گاڑی جیب کے پچھلے کپلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیوگ سیٹ کے ساتھ والی طرف مرمم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر اکھام ”فنا“ ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمن صاحب نے سگریٹ میں دیا۔ ڈرائیو نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری دیکھنے کا پتہ نہ لے ”اُس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو تم نے ٹھیک طرح بتایا کیوں نہیں؟“ ”آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے کی سند نہیں ہے۔“ رحمن صاحب ہنس پڑے۔ ”اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟“ ”یاد اب میں ایم اے کیا ہے میں نے۔۔۔۔۔“ وہ اچھل ہی تو پڑے۔ ”واقعی۔۔۔۔۔؟ تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔“ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے ”ابھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی“ رحمن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا لیکن تیرا ایک بار پھر کمان سے نکل چکا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔ لیکن اُسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو۔“ ”میری گزارش یہ حکم کی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک مکمل مجرم کی حیثیت میں آپ کا قیدی ہوں اور نہ بہت جگہوں پر بنا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں نا کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ رحمن صاحب نے دھواں اگلا ”وہ بزرگ بھی طرح طرح کی امور باتیں کرتے ہیں۔ بہر حال اسپتال آنے سے پہلے میں ہستی میں ہی تھا تفتیش کے برائی اُن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔“ میں نے تشکر ادا سے ان کی جانب دیکھا۔ ”شکریہ۔۔۔۔۔ آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔ رحمن صاحب ہنس کر یقیناً ہے یا الزام۔ چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج ہستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ اب تو پورے کیس کا رخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو۔ وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات کی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہے اُس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسی قسم صلبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر ہستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے نام اُس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا۔ لیکن اُسی لمحے مسجد سے اُس کے باپ کے آواز دے کر واپس بلالیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔

لہو کا لباس

بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر مٹی ہیں اور ان کے بچے نے ایک دوسرے گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے۔ جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب نے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتہ چلا۔ "ایس پی صاحب ضرور اثر بات کر رہے تھے۔ لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں تم تھے کہ جو کا گیت آپہنچا۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی سے اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان نہ جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا بد پرے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارے نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں حوالات میں آتے ہی اپنے ہم زرد سنتری سے ملنے کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا "وہ سب بچوں..... اُسے تو شام ہی کو ایس۔ پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔" آج شام جب رہا ہوا صاحب تھانے آئے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا، "جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا۔ آپ زت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔" صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ میں مایوس ہو گیا۔ نے اسماعیل سے درخواست کی "اسماعیل..... تم میرا ایک کام کرو گے؟" اسماعیل جلدی سے بولا "ہاں ضرور..... کیوں نہیں۔" "کیا تم کل صبح کہیں سے اُس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اُسے بلوا سکتے ہو؟" حافظ جی یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اُس کی باتوں میں نہ آتا۔" میں سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے مل کر دوائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسماعیل بدمعاش سا گیا "ارے ارے..... یہ کیا..... نہ عبد اللہ..... نہ..... ایسے نہیں روتے..... تم تو بہت بہادر کے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اُسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے دھوڑ کر پکڑاؤں گا۔" اب آنکھیں پونچھ لو۔" وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا اپنے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جس کو بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرا کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے مل کر زہرا کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے دل ہوش و حواس میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہوگی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی نظر سے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اُس

ابھی میں ایس۔ پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ اتر تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا "پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آگئی ہے۔ لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھر و بچیں اور خراشیں آئی ہیں اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنچوں کے نشانات تھے۔" محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک طاری ہو گیا۔ رحمن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا، اُمید کا ایک جھوٹے ہی سے بجھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنچوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

محبوب کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی کہ ”نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہوگا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق ٹھہرے گا۔“ پتا نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، اُمید کا آخری قطرہ نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لا حاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشق مجاز چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق حقیقی کی مکمل بھڑکتی آگ..... کیا میں یونہی خوا خواہ ادھر ادھر سرچک رہا تھا؟ سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے نکرانے سے روک رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جودھماکے ہوتے، اُن کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، اس درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی انگلیاں مڑ کر تقریباً پنج ہی گئیں۔ اسی اثناء میں اسٹا چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا۔

عبداللہ..... کیا یہ ہو رہا ہے تمہیں..... میں نے بمشکل اپنے لب کھولے۔ ”کچھ نہیں..... تم بس جا کر لاؤ۔“ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے۔ تم اُسے لے آؤ.....“ اسماعیل اُلٹے پاؤں بھاگا۔ میں نے تجویز کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں۔ جبرے کی انگلیوں نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ ٹکڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ دیر میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن ملنگ دوبارہ اُسے کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھوڑے چوڑے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھلا تھی۔ لیکن میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا تھا۔ اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اٹھا لیا، جسے میں نے اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل ڈھک بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا ”یہ روگ کہاں سے لگا لیا اپنی کو بابو..... ابھی تو تمہارے کھینے کھانے کے دن ہیں۔“ پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات ”ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آکر تمہیں بتاؤں یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے رہ گیا تھا، جب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ”اُس سے کبوتہ دیکھے..... مشرق کو دیکھے۔“ جانے مشرق میں کیا ہے؟ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی

دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور باقی چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس..... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس اُمید سے دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آجائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں ہسپتال کے بیمار اور غڑھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو اُن کی حالت بہتر ہو جاتی لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ”کاش“ لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ صاحب مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن سلطان بابا چپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔ آخر کار مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ”آپ کچھ کہتے کیوں نہیں..... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔“ ”کیا کہوں میاں..... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سرا جھوٹ رہا ہے۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا۔“ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتادی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر میری سانس لے کر بولے ”وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے۔ اگر اُس کا مقصد اشارہ دینا تھا تو وہ دے کر چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔“ میں چاہ رہی تھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اُس کی تنبیہ سچ ثابت ہوئی تو پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرا کو پیغام بھیجنے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں ہر اچلی سی چچی۔ پتا چلا کہ ایس بی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک اُن ہوتی تھی۔ عام حالات میں ایس بی جیسا بڑا افسر شاید مال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں انڈر سونج کی وجہ سے اس تھانے کے درو دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ ساری گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی ہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے درو دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی ہوتی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیٹل کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ نئے سونار کر کے اور بیٹل کا فیتہ سانس گھسنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بکل قلعی سے جگہ گارہے تھے اور جوتے پاش سے چپکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی جھامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رگروٹ صبح کیسے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس۔ بی صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے میں ٹھہرا دیا تھا۔ آج ایس بی کا رخ خلاف معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آکر اُڑھائے ہوئے لہجے میں بولے ”آئی جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا

خراشوں اور ناخن کے کھردھنچوں کے جوشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں سے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے بھرپور نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اُس دوسری عورت کا بتایا تھا، اُس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چونکہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہر حال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی لہذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن رحمن صاحب پُر امید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رخصت کرنے خود تھانے کے محکم تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ذرا نیوٹ کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُن کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے جھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس۔ پی کی گاڑی سے اترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا بہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے پھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رخصت ہوا وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ”پتا ہے..... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے۔ پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔“ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بد نصیب کو تو اب تمام عمر رونا تھا۔ ”اور پتا ہے..... وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا..... یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... پر طالب ملی..... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔“ میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا۔ لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدنا تو ٹھنڈا کچھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب کبھی وہاں آتا تھا تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے آس پاس عبلہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، اُن میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری

”کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔“ رحمن صاحب پشیمانی سے بولے ”عجب لڑکے ہیں بھی۔ تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم..... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔“ میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی ”کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی.....؟“ وہ چونکے ”نہیں..... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔“ لیکن میں نے تو اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ ہاں، ہاں ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے اُن سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔“ تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ رحمن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانیدار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمن صاحب بہت اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ”یقین جانیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی گیارہ حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناتا بنا دیتے۔“ میرے نہایت قابل احترام اُستاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی میں اُنہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اُنہی کی وجہ سے ہوں۔ اور آج صبح سویرے جب اُن کی کال آئی تو یقین چاہیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ سلطان بابا بولے ”آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر چرچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو شاید نصیر صاحب تک میری عرضداشت کبھی نہ جاتی۔ اس جیسے نہ جانے اور کتنے الزام کتنے کلک لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے، ہم، لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا لہذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ اُمید ہے آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے۔“ رحمن صاحب گڑبڑا کر بولے ”نہیں..... ہرگز نہیں..... یقین چاہیے، یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جھیلے تو اُسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی چمکے بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جاسکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی چمکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد و ضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔“

مرقعنی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک چمکے بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم

مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رخ بدلا اور آواز غائب ہو گئی۔ میں لپک کر جرے سے باہر نکلا۔ دُور اُسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاڑی کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دُور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے سامنے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے تلکجے سرخ اُجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگا تار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر نہیں پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کمک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ اُن کے اس کلیے کی زد سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچالی لیکن ان دردندوں کے خون خوار جڑوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اُسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مبینہ بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات شلیں حکمت ہی کے پٹھے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور جھکی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراپا..... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پہوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہ غبی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمایا، لیکن اُس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اُس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے..... کہاں.....؟ وہ بیک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میزبان جانب گھور ہی تھی۔ میری ریزھ کی ہڈوں میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کچکی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اُسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایس بی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک

آدھا چہرہ

جن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ”حیرت ہے..... اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم در بدر بھٹک رہے ہیں تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں الجھ کر اور ہر طرف بال بچا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ جب کہ سب سے اہم لیکن غیر متوقع جگہ پر ناکہ لگوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے تو وہ واپس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ لہذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔“ جن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور عورت کی شبیہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا۔ البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہر حال، جن صاحب کے نقطہ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام والوں پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں ڈور ریت پر بیٹھا تھا نے دار کو اپنے محر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ دتوے کا نقشہ پھر سے بنارہے تھے۔ تھانے دار کی آواز مجھ تک آرہی تھی۔ محر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ”میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی..... مشرق کی سمت سے..... سمجھ نہیں آتا کیا.....؟“ اور ٹھیک اُسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی۔ ہاں اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اُس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اُس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ ”جانتے ہو..... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور اکیلا کہتی ہے سائنس کی ڈائی پولر تیوری آف گر پوٹی..... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت نول ہو رہی ہے عبداللہ میاں..... جیتے رہو۔“ مجھے دعا دیتے وقت اُن کے آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں تو فوراً ہستی کے پوسٹ آفس سے مای خفیل تھانے کے نمبر

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اُسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پھر منظر میں ساحل پر پہلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں تو میں اتنی دُور سے شاید اُس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاؤں کے ارد گرد روشن ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اُس کے چہرے کی دھیمی سی لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آنے لگی تھی۔ نہ جانے اُس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میرے ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پینے کی ایک لہری دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اُسکے جانب آتے ہوئے دوڑتے وقت اپنے قدموں کی چاپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اسی آواز اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی۔ میں زور سے چیخا ”میری بات سنئے..... رک جائیے۔“ لیکن وہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فرارے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک تو میں اپنی بھول سانسوں پر قابو ہی نہیں پاسکا۔ گاڑی جا چکی تھی اور اب صرف اس کے پیروں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لپٹی نیچے گری تھی یا اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ مگر نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا تا کہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا لیکن بھلا قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا جولوہراتے وقت میرے ہاتھ میں آگیا اور میں اُسی کا سہارا لے کر زمین پر پڑ گیا۔ مجھے کبھی بھی اُونچائی کے خوف (Height Phobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا۔ لیکن آج میں نہ جانے اُونچائی کیوں جھیل نہیں پار رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اُونچی جگہ پر محلق یا پھر اُونچائی سے خود کو گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ یاد آ یا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے رسیہ کی ایک علامت ”اُونچائی کا خوف“ بھی بتائی تھی۔ میں نے آ پاس نظر دوڑائی تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکی نظر آئی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو سرخ رنگ کی ایک پتلی نوک وار ہیل تھی۔ اوہ گویا وہ ہراساں عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑا تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں جن صاحب اور اُن کی ٹیم کے ہمراہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی

ایک قدیم سامیالے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اوپر ایک چھوٹا سا رنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرم نے مجھے فنکارانہ کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اُس رات اُس عورت اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اُس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پنسل کے ذریعے اس کی صورت میں اُتار رہا تھا۔ اچانک وہ نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا اُس کے ہتھ ہی میں نے دیکھا، اُس کے پیچھے دیوار پر سینوں کی مدد سے جھولتا ہوا ملک کا ایک پرانا نقشہ ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رجیم! رحمن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی..... میں نقشے پر خیالی انگلی۔ اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جو تار تار ہوا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندالپکا۔ میں نے جلدی میں تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا اُسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اُسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑا اُس کے کیڑوں کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلنے لگیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شاخیں اس میالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھیں وہ پہلے الف اور پھر لہ تک آ کر رُک گئی تھیں یعنی اگر مکمل جوڑا جاتا تو اللہ کا لہ بنتا تھا یعنی حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ”اللہ“ کا نام بن جاتا۔ میرے داغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھ چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اُسی وقت طے ہو چکا تھا، جبکہ اللہ نام کا یہ اعزاز اس طرح کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر

ہدایت تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ بڑے بارے میں مجھے جتنا کچھ چاہتا تھا اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہذا اُس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اُس کے لیے بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پت جھڑکی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھ دوں اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اُس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرضی صاحب میرے سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے تو اشرف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو اور ہم دونوں پر آمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اُس سے پوچھا کہ کیا پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا اور میں سر ہلایا۔ ”نہیں ناں..... وہ تو صمیم صاحب کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالانکہ کہ میرے کئی مرتبہ صمیم صاحب نے اُن کو بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رکتے ہی نہیں تھے۔“ میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھا اُس رات تم نے اسی عودت کو پہاڑی پر آتے دیکھا تھا۔“ اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔“ کچھ گھنٹیاں ایک جانب سے اُلجھ رہی ہوتی ہیں تو دوسرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فون گزارش کی کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سیریز ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں ان کے درمیانی وقفے میں روز بروز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے قتل کی گتھی سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھے اُن کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمن صاحب نے چونکہ دیکھا ”لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے.....؟ بہر حال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..... اور یہی میرا ہے۔“ ”نہیں..... میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروادیں، لیکن ہماری ملاقات شام ڈھلنے کے چاہیے۔“ ریحان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں..... شاید بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اُس نے ہمارے

ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اُس کی پہنچ بھی دُور تک ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لیکن کیا یہ بہت عجیب بات ہے..... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمر مرضی ہو جائے تو اُس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔“ ”ایمر مرضی کے لیے اُس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جیسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔“ ”لیکن یہ معما کیسا ہے؟“ ”کچھ نہیں..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں۔ اور پھر آخر یہ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اُس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔“ میں نے گہری سانس لی ”مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا۔“ ”میں کچھ ڈوٹق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔“ ”اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اُس کے گھر تک پہنچا دیں مجھے اُس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“ رحمن صاحب اب بھی کچھ تجھے میں تھے۔ ”ہاں..... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..... میرا عملہ تمہیں ریحان کے کوشی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اُس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اہل پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اُس کا مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی، کے مصداق پھیلتی ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔“ ”میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رحمن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوشی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اتار کر پولیس کی جپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گتھی پر اُننگی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد غور سے انٹرکام پر کسی کی آواز ابھری ”کون ہے؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔“ فوراً جواب ملا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔“ انٹرکام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ”ہاں بولو..... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ یہ آواز میرے لیے اجنبی لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

رُوپ بہرُوپ

میں کچھ دیر تو اُس آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی میں الجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ڈراورشی سے پوچھا گیا ”نہ کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟“ ”جی..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب بات کر سکتا ہوں.....؟“ دوسری جانب سے جھنجھلاتی ہوئی تیز آواز ابھری ”میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔“ اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی ”کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟“ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ ابھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطاری چلی گئی تھی اور جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دودھیاروشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوشی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر ہر ہی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ لیکن پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا ”معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کا کیوں نہ ہو۔“ ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا ”ہاں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اسی ساحلی مسجد کے طالب ہونا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔“ ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دُور آیا ہوں اور خاص اسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹا دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ پکڑائے ”تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے اس کا براہ راست تعلق ریحان صاحب سے ہی ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آئے تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اُس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا۔ لیکن

نے مُوتے مُوتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے دیکھ لیا، حالانکہ میں نے صرف اشرف سے ہی اب تک اُس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پر اسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ اور ریحان کے ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر بشتاشی آگئی۔ ”جانتے ہو میاں..... کسی اُستاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے.....؟“ میں اُن کا منہ عاصجہ کر مسکرایا۔ ”جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میری نالائق شاگرداؤں کی اصطلاح پر وہ بھی مسکرا دیے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی اس لیے میں حتی الامکان اُن کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گر میں مجھے خود کھولنا تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگی رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول اُن کے، یہ میرے کمزور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تابناک زمین پر بہنے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریں بچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے چومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی بڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دُور نیچے آتی کو لہار کی سڑک پر سفید مر سڈیز دوڑتی ہوئی اُوپر پہاڑی کی جانب آرہی تھی۔ یہ مر سڈیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رُک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ”چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشا وہیں چل کر کر لینا۔“ سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضا مندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام

اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔“ ریحان نے اپنے لہجے کی گلی کو چھپانے کی کوشش کی۔ ”جہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ ریحان کی آواز بلند ہو گئی ”نہیں..... میں اپنے ذاتی معاملات پر ربا بند نہیں کرتا۔ بہتر ہو گا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔“ میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے..... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اسی قدر فقدان ہے تو پھر میری یہاں موجودگی بھی تم پر ہے۔“ ریحان نے مجھے آواز دی، ”سنو..... تم..... تم..... سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح ہسپتال پر قابو پا سکوں..... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔“ میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہو گا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یقین جانو، کل جب سے ہمارا پیغام ملا کہ تم لپٹی کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں ہسپتال میں آیا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جارحانہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں رہے لیکن اُس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہو گئی ہے۔ میں اپنی ساری دولت ہار چکی ہوں۔“ میں نے اس سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی بٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ اُس کے لیے یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا تھا۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔“ ریحان اپنی بات ختم کر رہا تھا۔ ”جیسے نہ جانے کتنی دُور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آگئی تھی کہ لوگ میرے لیے کد کد کر رہے ہیں۔“ ریحان نے کہا۔ ”میرے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہنے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پنپ سکے؟ محبت ہمیں اندر سے نکالتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریحان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لپٹی کی محبت نے اُس کے اندر کسی جھل پکٹ کا خزانہ نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اُسے اپنا درد اندر سے نکالنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریحان کے بالکل قریب جا کھڑا ہوں۔“ لپٹی نے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی۔ ”ریحان نے تپ کر میرے کان پر اس کی آواز سنی۔ ”میں لپٹی کے آخری لمحات کا واحد معنی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام بار کیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع کر

سے محفوظ تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوشی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوشی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوشی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنا رکھا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس جیسے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھری میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پل پار کرتے ہی دُور دُور بڑی بڑی ہز چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عرصہ مجھے نظر آیا۔ جو ریحان کے گالف والی چھتریوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھامے کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھتری کی ضرب لگا کر اُچھالا اور گیند کچھ دُور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہو گئی۔ عملے نے ستائشیں جملوں سے اپنے صاحب کی پذیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھتری عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستاں بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیئے۔ عرصہ ادھر ادھر ہو گیا اور انیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر ڈکڑ گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اُس کے سفید کراچی جوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اُس نے میز پر پڑے جوتے کے گھاس کے اوپر سے پلاسٹک کا کورا تارا۔ ”ناشتہ کرو گے؟“ ”نہیں..... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے پیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا کوئی بچا نکلا۔“ ریحان نے جوتے کے گھاس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتار دیا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ ”حب معمول کھو یا کھویا ساتھ۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔“ کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم مکمل کر بات کر سکتے ہیں۔“ ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سرد رویے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لپٹی اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے ہوئے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا تھا، لیکن عمر بھر کی پر دنی خاردار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اُس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ”آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی؟“ میں لپٹی کے آخری لمحات کا واحد معنی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام بار کیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع کر

میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے جھکالے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا لیکن یہ سب
آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی بل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بیک وقت مجھ سے
فرزا نگاہیں بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک اُن جانی روشنی بھی کسی درز سے مستقل
کر آ رہی تھی۔ میں دیر سے بولا ”لیلیٰ“ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔“
کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دُور کو
یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اُس کی حد وہیں تک تھی۔ بالکل غائب
پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں
جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی کیلے اسٹیج کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز لرز رہی تھی۔
..... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی.....“ ”یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی اُن جان عورت کو جسے
رات پہاڑی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔“ ریحان بالکل ہی چپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں کو
رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے
گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر لپٹی
جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھا
واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جس سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہاں
عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہی تھی کہ کونسا
ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی غڈ حال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی، الہام
وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور نٹوں جیسا وزنی اور ہمارے کوئل انسانی وجود پر ایسے لمحات جا
گراں اور بھاری گزرتے ہیں تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن تو زور ہا تھا۔ آج کل
رات تھی، لہذا اساتل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت سالانہ
سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آگئی تھی لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے
گرد بکھرے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب
گیا۔ ملگجا اندیر چھایا ہوا تھا۔ لوگ ادھر ادھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات پیا
تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں اُن سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دُور پہاڑی سے
جھاگ اڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرا رہتی تھی۔ جانے کتنے
بابا نے اُسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرا کو براہ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی
اُڑل کی طرح موجود تھی۔ اندیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے دھیر
سے آواز دی ”عبداللہ.....“ میں چونک کر پلا، لیکن اندیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا

کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ”عبداللہ“ عجیب سی کرخت، لیکن نسوانی
آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی
لمحے میرے سارے جسم کا خون ایک ہی بل میں میری نسلوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سرخ پلو میں چھپائے
اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں..... یہ وہی تھی، جسے اُس رات
میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی
حاش میں پولیس در بدر بھگ رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ
اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی
اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بمشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔
میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ ”تم اُس روز بھاگ کیوں گئی تھی.....؟“ وہ غرائی ”میرے پاس ان باتوں
کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دُور رہو۔ تمہارا اس معاملے
سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جاسکتی
ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیا ”تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ وہ دہلی آواز
میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو
بولی..... اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اُس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر
بوجود تھی جب وہ نیچے گرئی تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُسے نہیں مارا۔ لیکن اگر وہ میرے اور
ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اُس کی آواز میں اس قدر سفاکی تھی کہ
اب اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اُس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے
اس کی شخصیت میں کسی بڑی سی احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرائی ”میں تمہیں آج آخری بار تنبیہ کرنے
آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت چمکانے کی کوشش کی تو اگلا نمبر تمہارا ہی
لگا۔“ اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے
لیے ان کی طرف لپکیں۔ جو بچی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ بٹی تو میں
نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے
نچا۔ مجھے دُور اندیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی
اڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ
کی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اُسے پولیس کے پہرے کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اُس نے
اصل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے
مراٹے اس پوائنٹ کا رخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اُس

کی گاڑی فرمائے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اٹھتے وقت میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میرا جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

ہم زاد

اس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس بات کے کتنے رُخ ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو ایسے سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھا نہ ماہی میں ہمارے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسب معمول اُن کا چہرہ سگریٹ کے نہیں کے پار دھند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ”تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپے مارنے کا کہہ رہے لوں میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلاتا پڑتی ہیں۔ یہ اجازت ملنا تو دور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا۔“ لیکن آپ نے عرصے کی نوکری میں چند افسران بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ کی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں اُن کی اجازت دیتا ہے جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ بیتی ہو۔“ رحمن صاحب نے ایک ٹل لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ”بات تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری اُن دیکھی حدیں لیا سے مقرر ہیں۔“ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے ”ٹھیک ہے نا یہ جو ابھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسہ کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھائی بھی اسی رہا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی تر چھاپڑا تو حکام کو ناراض کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے سامنے اپنا بستر ڈالوں گا۔“ انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے ساتھ اپنا منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوایا گیا۔ رحمن صاحب نے اپنے اہمیت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کرنے کا نہ کہیں، جب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا ایوان انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجیب سا ناٹا جاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت اندازے کو مقفل پایا۔ رحمن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد انور والا۔ اندرونی جانب سے دو تین سبے ہوئے نوکر اور خدام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے

باب نے ننھے، ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا تو ڈراما ڈرامیو ریحان کو بے ہوشی کی حالت میں لے کر اس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بھلنے کا کچھ سامان لے کر ڈراما ڈرامیو کو لے کر وہاں پہنچا، وہ اس کے ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرورٹ کو لے کر لے گیا۔ اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتی تھیں کہ اُن کے صاحب کے لالے کا دل بہلا رہے۔ ان کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپا کی، ہنڈکلیا بنانا پھر ایک دوسرے کو کوئی نسل پاش اور سرفی سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی بہن کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔

باہر نکلنے کی تک دود میں تھے۔ انہیں اطمینان دلایا گیا کہ کوئی کوان سے کوئی سروکار نہیں۔ اوپر کی سڑک پر کمرے کھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو گھنگروں کی جڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ جھوٹا سا ہال تھا، جہاں طلبہ اور ہارمونیم سیتے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگا کر رخصت صاحب کے ڈرائیور، گارڈز، قحانے دار اور دیگر کے دست و پاؤں سیٹ (واکی ٹاکی) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رخصت صاحب کو اطلاع دینے کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جا رہی تھیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنا مشن ختم فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے لیکن ایس کی صاحب آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے۔ اور ہر کمرہ ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان دیا تھا۔ لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرہ بند ملا۔ رخصت صاحب نے اندر موجود فرد کو تنبیہ کی کہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز ابھری ”تھوڑا انتظار کریں۔۔۔۔۔“ کچھ دیر کے تھکے قدم گھسیٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کاسمیٹکس ادھر ادھر بکھرے پڑے کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان بچا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے مجھے وہ سرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رخصت صاحب اشارے پر عمل کے کسی فرد نے کمرے کی بجلی چلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس سڑک وجود پر پڑی۔ رخصت صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اٹھا اور پولیس کا سارا عملہ رخصت صاحب سمیت ہکا بکا رہ گیا۔ عورت کے گھیس میں ہمارے سامنے رہا تھا۔ اور اُس کی حالت نہایت اتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ رحمن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور بیانیہ اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہ سرفی ملک کے بڑے صنعت کار و ریحان منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس عورت کا پیچھا کرتے گر پڑا تھا۔ تب نیچے ریت میں مجھے سفید کرکچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں کا ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو انہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ سول میں پولیس کے عمل کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا تو کبھی اُن کی منت کرتا کہ اُسے واپس جانے دیا جائے کہ گھر میں ”ریحان“ اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

تا اور ادھر ادھر سے چرائی سُرخ اور غارہ اپنے چہرے پر ل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی دھا چہرہ اُس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ دائیں حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی، بے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے حصے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے بات کرنی ہوتی تو وہ اپنے چہرے کا بائیں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال رہتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوریاں سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر نیچے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اُسے ششے میں جھانکتی نظر آتی جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش ری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہمدرد اُسے اب اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح جب ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان ماتھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت سوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اُس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا۔ لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سر شام ہی بھاگنے کی کرتا کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اُس کی پیاری اور ریان دوست نے جوتا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر کے کین اٹھے تو تمام تجویروں اور زیورات سمیت بینک بلیٹس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور بٹری کے فیجر کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی بات تھی تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اُسے بستر پر ال دینے والا صدمہ بے وفا کی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی پنے چاہنے والے فیکٹری منیجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اُس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے بل منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے نادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو بھی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا۔ لیکن اب ریحان جوان ہو رہا تھا اور اُس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اُس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، نقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے صاحب کے اندر بستی دوا لگ شخصیات کا حال دے گئی کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا

کنول نے دو چار دن غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا لیکن جلد ہی وہ اس پر اُوب ہو گئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلی پن کی حد تک ہوتی تو بھی کنول ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی لیکن کچھ عرصے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان منیجر غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے لکھی کے چکر لگانے لگا تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی پر ایسے میں یا تو ریحان کو اوپر اُس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر لکھی کے ہجوم میں دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اس کی طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اُسے میز ہیوں سے جڑے کمرے کے نیچے والے تہ خانے میں بند کرنے کی دیتی تاکہ وہ اپنے باپ کی رات گئے واپسی پر فیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر اگر یعقوب کی اور بچیاں کہیں گئیں ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اُس کے کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سُرخ لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ راتوں آنکھوں میں کا جل بھرتا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا۔ پھر ایک دن اُسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آ گئی تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اٹھالایا اور کئی دن تک شیدز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بد قسمتی سے اُس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اُس کی ماں، نے، جڑا پر اس کٹ کی گمشدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں اس دن عروج پر تھا اور اُس نے سزا کے طور پر نئے ریحان کو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف اُس کے میں قید کر کے بخش دیا جس تہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچے جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اس تاریک تہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈرے کا پتہ نہ لگا اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد نہ ہو۔ اس تہ خانے کی دیواریں پر اُس روز اند میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب ہولے بننے اور مٹنے دیکھے کہ اُس دن اُس کی اپنی شخصیت ہی ایک بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہ خانے سے باہر کھینچ لائی۔ کی رُوح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سوتے بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہو گیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے دوست بن گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اب اس تہائی کو وہ کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اُس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آ تھی، کیوں کہ اُس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھنٹے بیٹھ کر باتیں ہی کر لیتا یا اسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بجھ جاتیں تو وہ چپکے سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سام-

تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرشام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر بچی اس عورت کے ساتھ اتنی دُور آچکا ہے کہ اب اُس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اُس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑے بچے کے ساتھ ساتھ تھکتی گئی۔ بچپن میں وہ اُس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھنٹی رُک کر بات کر لیتا تو کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا تو اُس کی رُوح کی قابض باقاعدہ اُس سے لڑتی، جھگڑتی اور دُڑھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اُس سے پوچھتا ”آج کچھ چپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا؟“ داہنا میک اپ زدہ حصہ منہ بنا کر کہتا ”تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اُس جھلمھری شائستہ کے نخرے اٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔“ ریحان اُسے مناتا ”اوہو.....“ اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹینٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ.....“ فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی ”ہاں ہاں..... تین چار ہزار کے عملے میں سے اُسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتے..... ٹھیک ہے اگر تمہیں اُس کی اتنی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُس کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“ ریحان بے بس ہو جاتا ”اوہ..... تم پھر دُڑھ گئیں۔ اچھا بابا..... پکا وعدہ..... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ جو ابائیم رضامندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ ”خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے تاکہ میں تمہیں بھوکا سوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا سستاتے ہو۔ اچھا چلو اب منہ نہ بسورو۔ اُٹھ کر کھاؤ۔“ ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا۔ لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے گئے یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اُس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اُجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں اور رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اُس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اُس کی سب سے بڑی رفتی تھی۔ لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اچھل پھٹل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے

تہی میں رکھی گئی تھی۔ لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کوئل سی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک انجان سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی رات کی راز داں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور خواہ مخواہ تو اُس کے دفتر سے سات در پرے ہی گزرا کرتی تھیں لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اُس کی جانب کھینچنے لے جا رہی تھی۔ شاید اُس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے ارد گرد پھرنے کا شائبہ ہی ریحان کو بھا گیا تھا۔ لیکن اُس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ پاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا مجبزی کہ اُس نے کمرے کا سارا کچھ توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے مرنٹ کو ارنرزم میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب و غریب شور شرابے کی دُور سے آتی آوازیں سنتے رہے، کیوں کہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا جو ایسے موقعوں پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اسی رات بھوکا سو گیا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصے کے عالم میں اُس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

جس دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کین کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کالج کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں الجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ کھویا کھویا ماہ اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت شائستہ اور نفیس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اسی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی پیچان کا سامنا کرتے کرتے بٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا ٹھیک اسی وقت لیلیٰ نے آکر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری

آدھا جنوں، آدھا فراق

سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروائے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہو گئی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی الجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا تو بالکل ہی تھکے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اُس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے پاری کو کیا پتا کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی میز پر پھلانگ کر اُس تک پہنچا ہے۔ لیلیٰ شروع میں اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی تنہائی پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اُس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام دھننے کے بعد کہیں آؤنگ کے لیے لے جانے کی ضد کرتی تھی اُس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ ماراں تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں الجھا رہتا۔ بس گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقع پر کوئی دل کی بات کیسے کی جاسکتی تھی، حالانکہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نسل قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ یاد تیار رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے۔

نہیں شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیوں کی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھر سے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور اُن تک کبھی کسی نے اُسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹر کام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف انگڑوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پوچھتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی تو مکان نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ اُمید ضرور دیا جلاتے رہتی تھی اور وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام

ریحان شدید اذیت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کوڑا پڑھلکا ہوا تھا کہ اُس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالج خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اُسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اُس کی مانتے ہی بنی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم، سہا سہا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روٹے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی جھم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اُس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سویرا ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اُس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں ماننی تھی۔ اُس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اُس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روشنی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اُس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں، دستخط کروانے کو بھی بھیجی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت ساجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کی سکتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی۔ لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی اُلجھی اُلجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے

کے بعد بہت ضروری فون بھی اینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کونٹی کی گڑبگڑ تک بھی جا پہنچی، مگر اُس کے لاکھ سرچنے پر بھی دربان نے اُسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اُنکا اگلی گڑبگڑ ریحان لیلیٰ پر بُری طرح برس پڑا کہ وہاں کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اُس کی چوکھڑا کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیمن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کر ریحان کے لاڈ اٹھائے۔ اسے اُس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اُس کا دل بہلایا اور اُس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اُس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی تو ریحان اُس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اُس نے ریحان سے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آجائے گا۔ لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اُس کے سامنے آکر ہاتھ جوڑ دیئے تو دونوں ہی مسکرا دیئے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اُس سے فراق کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے۔ لہذا ریحان اُسے رات کو کہیں مدعو کر کے ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز رازی رہنا چاہیے۔ لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا۔ اور اُجالا ہونے ہی اُسے ریحان کی رُوح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دُور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بجائے نلنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اُسے بڑھاوا دیتی، ”اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اُس سے جلد از جلد ملو اور آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اُس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہترین نہیں کہ میں پہلے ہی اُس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تھرا کر کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔“ کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اُسے لگتا کہ اُس کے اندر چلتی وہ عورت کی، ہم زاد ڈھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اُس کا حق بھی تو تھا۔ آخر وہ دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دل نادان ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ شام کے بعد ملنے کی ہائی بھری۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان خیمے کی زمین سے بندھی گر جیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہوا میں اڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اُس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑھی پہنے

بالوں میں سمجھا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں زبردستی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے نیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اُس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آچکی تھی۔ اُسے وہاں پتنگ اڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اڑائے گی اور اُسے اتنا اُونچا کر دے گی کہ اُس کی پتنگ اُس کے اور ریحان کے ملنے کے ستارے کو چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی نیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پنا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اُس نے دُور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی لیکن وہ گاڑی تو اُسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اُس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آکر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چوکی، جب دھیرے سے کسی نے اُس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلٹ کر لے کچھ دُور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ دُور گئی۔ ”جی..... آپ کون؟“ اور پھر وہ عورت قریب آگئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ ہم کرکٹی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا ہیسا کھلیے کیوں بنا رکھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ مڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر چلتی آدھی عورت اور آدھا مرد..... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سہ ہے، کیوں کہ ریحان کی دہری شخصیت اس اندھیرے میں پلٹنے والے وجود کے بنا دھوری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اُسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس نے چلا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اُس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہیں۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کو ہاتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی چہرے کے دائیں جانب لیلیٰ کی آنکھیں اور غرا کر بولی کہ ”وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اب اگر اُس نے، لکے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت بُرا ہوگا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت

نہم دیا کہ چل کر اُس عینی گواہ کو دھکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوشی آنا اور یوں بچان کے دل میں دہلی چنگاری کو ہوادے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اُس ساحلی چوٹی پر اُس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح کے گالف کے لباس ہی میں تھا وراس کا اپنا من لگن نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے کیوں کہ وہاں اُسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش کش میں وہ چلا تو لیکن اپنے سفید کمرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج ہے۔ بہر حال، یہی جوتے اُس کی گرفتاری کا سبب بن گئے۔ لیکن پولیس ابھی تک مخضے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو۔۔۔۔۔

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمن باب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گھیسر رہا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیس ہلا دی تھی۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اُس کی بات شام کے بعد انتہائی اہم بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں حصہ لے رہے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (split personality) کا کس ہے یا پھر ذہنی شخصیت کا تضاد (multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس کو اگر ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے تو پھر وہ ڈھونڈنے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ فوج ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی لرز خوف محسوس ہونے لگا۔ کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی لڑ بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمن صاحب کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے بھی اُن سے نصیحت چاہی تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر سرگیت سنگھ کا کہنا تھا، ”تم کون ہو؟“ میں اُن کا سوال نہ کر کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں۔“ آپ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں وہ جانتا چاہتا ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا۔۔۔۔۔“ میں نے اُن سے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو۔۔۔۔۔ اوروں سے کچھ سوا۔۔۔۔۔ کچھ الگ۔“ میں نے بات ٹالی ”آپ کا نام ہے۔“ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں۔ بلکہ شاید اُن سے بہت کم، بہت عام۔۔۔۔۔“ لیکن انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں ”ساری تقیثی ٹیم اس پراسرار عورت کی کھوج میں تو تھی لیکن ہم میں سے کسی کے اذکار میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہ ہوگی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے اذکار کی کارگیری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑنا

ہے۔ لہذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف نہ رخ نہ کرے۔“ لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلاتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اُس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوت ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت سے اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا نہ سکے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اُس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھک رہی تھی، اس پر چلا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اُس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش کش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اُس کی سوت نے اُسے تھپ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن جب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑھی کا پلو گہرائی کے غار میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھا آوارہ گئے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہڈیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سُسن ہو چکا تھا اور اُس کی ساری مزاحمت وہ توڑ چکی تھی۔ اس وقت اُس کی تمام ذہنیں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اُسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدمی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اُس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اُس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اُس وقت اُس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اُس رات اپنی ہم زاد سے اُس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اُس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اُونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی تب ہی اُس نے مسجد کے اُس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر نیچے جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوشی بلوایا اور عبداللہ نے جب اُسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اُس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ذوقی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروادے گا لیکن شام ہوتے ہی اُس کی روح کی قابض

گلابی دھند

مکیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں.....؟ ”کچھ دیر چپ رہا“ آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام..... کچھ لکھا کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سن کر ہی اُس کے گھر گیا تھا۔ اور نہ جانے کیوں پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے نہ محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اُس کے جوتے سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی مگنی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔“ لڑکی میں میز پر پڑے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ رحمان صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رحمان صاحب نے جلدی سے کہا ”ٹھیک ہے..... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔“ انہوں نے فون رکھ کر میری بازو دیکھا، ”ریحان اپنے حواس میں آچکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔“

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے۔ سامنے کچھ بھڑکتی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اُس کی میت لے جانی جا رہی ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقا، اور آس پاس کے چند راہ گیر کاندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے ان کا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے جتنے لوگ اُس کے جنازے کو کاندھا دینے اور اُس کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نفع خود ”انسان“ ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف درجہ میں نقصان کی صورت میں کھودیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے بھل جاتے ہیں۔ یہ بے رحم ”وقت“ کیسے ڈاکا مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے اٹھ کر چل دیتا ہے اور اُس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ رحمان صاحب کی جیب نے ایک لمبا سا موٹا ٹاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمان صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”جاؤ..... جا کر اُس سے مل لو.....“ ”آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ؟“ ”نہیں..... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا۔“ میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق چوبند سپاہی کے ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل خنجر بستہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو ال کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور اسے کمرے سے زیادہ ہیرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کی بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دُور تک بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے۔ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔ اُمٹ سن کر ریحان نے سر اٹھایا۔ لیکن یہ..... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا سورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جب کہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے،

چہرے پر برسوں کی تھکن، بال اُلٹھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے دلا ریحان کے چہرے یا لباس پر شکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے عمر بھر کی ”بے شکنی“ کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر جمارہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتدا کی ”تم آگے عبداللہ.....“ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا.....“ میں اُس کی جانب بڑھا ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے..... وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی ہے اُسے کتنا دکھ ہوتا.....“ ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ”جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں تو مجھے بننے سنورنے سے کیا فائدہ.....؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اٹھانی پڑی تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حالات میں راتیں کاٹنی پڑیں ہو سکتے تھے مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا۔“ میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا دوا ہے تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔“ ریحان تڑپ سا گیا۔ ”نہیں..... بالکل نہیں..... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چھٹنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری رُوح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے کاڑھے ہوئے ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جین پونجی نہ لپٹی۔ کاش.....“ بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہمدردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹہ رونا والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اسی کے سامنے ٹوڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میری ایک بات مانو گے ریحان.....؟“ معصوم سے بھولے بچے نے سر اٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اُس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ”جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہاری میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا..... اتنا رونا کہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اُس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں نہ آئی اس کو تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود یوگا کی راہ پر گام زن نہ رہتا۔ میں نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اُس کی ہم زاد سے اُس کی جان چھڑانے کے لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سر شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم کا ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سو رہتا ہے۔ لیکن بقول ریحان، اُسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی ناکارہ چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اُسے نیند آ جاتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند گھنٹوں بعد اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی۔ نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اُسے نیند کی دوا ترک

ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری پھلکی پھلکیں مجھ سے بہت سے لگتی رہیں مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اترتا تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے بیٹھ رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو لایا گیا، مگر معاملہ اُس کی پہنچ بے زور کا تھا۔ لہذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند بگاڑ تو دیا ہے لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سر ہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہم درد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب تھی کہ اس پوری راہ میں میں نے زہرا کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہموار تھی، برائے اللہ کی زندگی اُسی قدر دشوار اور بچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس مذہب کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہوتا ہی اصل میں خوشی ہے۔ ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسب معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانیکی انداز میں کھلیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے ان کی آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُن سے پوچھا ”آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں؟“ سلطان بابا کے نحیف ہونے پر ہلکی سی مسکان آگئی۔ ”ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے میاں اور پھر جسے عبداللہ جیسا بیمار دارمیر ہو وہ بار بار بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے؟“ میں نے منت ساجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلنے ہی میں نے رخصت صاحب کو فون کر کے کسی عمارت کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد کے باہر موجود تھے۔ ہم نے فجر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے کے بچکولوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی ہدایت کر دی۔ میں اور رخصت صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے کے لئے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں اُن کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ”ان بزرگ کو کئی قریب میں کوئی سرکی شدید چوٹ لگی ہے شاید۔“ ”جی۔۔۔۔۔ کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔“ ڈاکٹر نے سر ہلایا ”تو میرا

کردینی پڑی۔ اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ”کیا میں اُسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا۔۔۔۔۔؟“ میں جواب دیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑ گڑا کر مانگتے ہی کو دعا کہا جاتا ہے تو میں یہ مشتق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ”یا مالک۔۔۔۔۔ انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر۔۔۔۔۔“ میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے اپنے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھتی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی۔ ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیو کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعہ اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی زوجہ حالی مال کے برابر تھی، اُس نے اُسے نماز اور سورتیں یاد کروائیں تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اُسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان با وضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اُسے خود بخود سب یاد آجائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔ مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہم سانس لینا سکھاتا بھی نہیں تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اُس کی عمر پھر میں اُس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی اُمول باتیں باخفی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجب درد بھرے لہجے میں التجا کی ”پھر آؤ گے تا عبداللہ۔۔۔۔۔؟“ ”ہاں۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ اور اُس دن صرف تمہاری لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پیٹنگوں کی باتیں، دھانی آسان اور نیلی ڈور کی باتیں۔۔۔۔۔ جھاگ اُڑا۔ سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔؟“ وہ بہت خوش ہو کر بولا ”ہاں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن پکا۔۔۔۔۔ تم آؤ گے نا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ بالکل پکا۔۔۔۔۔“ میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ چھپتایا اور نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اُسے سر ہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پتکے اُس کے بوجھل پونٹوں پر پھیرنا شروع دیے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اُس کی زندگی کی سب سے بڑے سکون نیند کی رات ہوگی نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں مگر بتانیند کے

اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہوگئی ہے۔ لیکن میں حتیٰ رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں پر رپورٹ میرے پاس آجائے گی..... اللہ خیر کرے گا۔“ ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی ٹنکیاں اور بوتلیں اُن کے جسم سے چکان گئیں، جن سے انہیں شدید جڑھتی۔ رحمان صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پس کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اُڑنے پر آئے تو پر لگا کر اُڑتا ہے اور جب سر کے پر آئے تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بیج پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فٹا کر دیئے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہو گیا۔ درمیان میں دوسرے رحمن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے رحمان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے مل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک بل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمن صاحب بھی آ گئے۔ میں نے اُن سے رحمان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہو گیا اور اُن کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ اُن ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمن صاحب نے بتایا کہ رحمان اس رات بے حد پُرسکون نیند سو رہا تھا اور اُٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پُرسکون رہا۔ لیکن سہ پہر کے بعد اُس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اُسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے مگر وہ بے چینی سے ادھر ادھر سر پختار۔ شاید اُس کا وجود اندر سے جھج رہا تھا اور برسوں سے اُس کے اندر پلٹی دہری شخصیت کو جب لگا تار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اُس نے رحمان کے اعصاب اُکھڑنا شروع کر دیئے تھے۔ باہر نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر رحمان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں رحمان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً رحمان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا جنوں بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اُسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے لیکن رحمان جس گلابی دھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اُس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونگ رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی

ل کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا
میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنوں کے حتمی نتائج
کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں
ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر
صرف ایک جہاز اڑتا تھا اور بد قسمتی سے آج وہی دن تھا اور اڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے
ذوالی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ترین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار
ہو نہ جانے رجن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ
پڑا وہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اس کی روانگی
رجن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کبین مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے
پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اتار دیتا۔ بقول رجن صاحب یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل
باب چل پڑتے کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری انہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی
بلی تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا
برے ساتھ سامان سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز جس کی سات منزلیں تو زور ہی سے گئی جاسکتی
اکی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا
ملا لٹکا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے بیڑھیوں پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا
اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اسی جیسے ایک ویو ہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی
نی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رجن صاحب کے عملے نے ایبوینس
اتار کر اسٹرپچر پر لیے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے
پہلے ایک زوردار ہنکار اُبھرا اور میں نے رجن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا
ہاتھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔ میں جانتا ہوں تم نے
ملاں بابا کی حالت کے پیش نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست
پڑے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اپ بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے
مفکر مند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی
بھوکڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ جب تک
بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اُچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح
ٹاکرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔

”ہوش والوں کو خبر کیا.....“

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا تاتا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اُس جیسے نازک احساسِ دل
کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کالج کا سن رکھنے والوں کو ہر دم
پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد زورادیر کے لیے غنوں کی
چادر اوڑھی تو میں رجن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے
پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی آہڑ
چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔ ریحان گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔
ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر جلدی سے ہماری جانب سے
پنچہ موڑ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک ہی جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا
رجن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ”میری امی کب آئیں گی؟“ ”رجن صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ
لیوں پر سجائی۔ ”تمہاری امی جلد آ جائیں گی شرط یہ ہے کہ تم روگے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے۔
ریحان خوش ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے..... پکا؟“ ”رجن صاحب نے اُس کی پھلی ہوئی ہنسی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”پکا
پکا.....“ وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تیز دار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق
جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کول، کتنا
ملائم احساس والا..... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازی، دشمنیاں، حسد، برائیاں
کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان
طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے تو اسے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر
کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانہ
ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس سا ہو کار کی طرح لین دین اور فتنہ و نقصان کے پھیرے میں پڑ
رہتے ہیں لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود
اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سنگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھر کتا شعلہ
میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جا

جہاز نے جس وقت لنگر اٹھایا تھا اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں مسافر بابا کو ان کے کیمپن میں دو کھلا کر، کھیل اوڑھا کر باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اُس کی سنہری کرنوں نے افق تا افق لہروں کو اپنا سونا سونپ کے درخشاں کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے..... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جو ان معصوم کرنوں کی مانند نیچے اڑا سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو تھکھار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔ میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی رینگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھ رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا تو احرام باندھے کوئی عازمِ جہاز کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمِ جہاز کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی وہاں حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا "کہیں بہت دُور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جہاز تمہیں کھینچ نہ لے..... اس لیے نکل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔" میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ "میرے اللہ بیک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھانٹیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو تو نا میرے لیے نیا نہیں۔" "بہن خوب..... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ہم سفر ہیں۔ میں نے جہاز پر ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔" "جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضطرب ہے اُن کی۔ ہم آگ بڑی بندرگاہ پر اتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔" اُس نے باواؤ بلند کہا "انشاء اللہ۔" کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پینڈے سے ٹکرا کر فتا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آدابِ تکلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی "البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے۔ کتنے عرصے میں پہنچ جائے گا۔" اُس کے گھر.....؟؟؟ "شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن بچپنِ سالہ زندگی کا حاصل ہیں۔ تم نے جج کیا ہے.....؟؟؟" "نہیں..... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔" سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل کبھی ہوگا پائے گا یا نہیں۔" وہ ہنس دے "سب بلاؤں کی بات ہے میاں..... بلاؤ آجائے تو لحوں میں انسان کا نہ تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہ پاؤں گا۔ لیکن جب بات بننے لگی تو یوں بنی کہ جیسے بس اسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر گئی ہے۔" کافی دلچسپ انسان تھے۔ اُن کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ اُن کا مشترکہ کیمپن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے، انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے اُن کا دُور دُور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ "آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟" "میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔" دیکھا

بارہائی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔" جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ اُن کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دے۔ "ایسی کوئی بات نہیں میاں..... میں نے کہا تھا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہو گیا تھا، لہذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں۔" وہ دُور افق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اُس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا لہذا لوگ فری متا تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تھوڑا جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے جھٹتے ہاتھ اور کوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دھن گنگنا تا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیر بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے۔ لہذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آرہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکل جاتے تھے۔ حبیب فریبی چوراہے کے سنگل پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ "نوجوان....." کیا تم دلوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو؟" حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ "جی فرمائیے....." کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے....." حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اُس کا مقصد سمجھ کر سکرانے "نہیں..... پیسہ نہیں..... صرف وقت..... اور وہ بھی دس منٹ....." "لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔" "تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو۔ اُس اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام وہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے۔" حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کا دل منبج گیا۔ "ٹھیک ہے..... لیکن صرف دس منٹ..... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شوقا اہتمام کرنا ہے۔" سنگل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننے شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا "تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے.....؟" تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ "دس منٹ پورے ہونے کو گنا۔ تمہارا بہت شکر یہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیے۔ جزاک اللہ....." لیکن

صیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔ ”کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اپنا دوا
کور کرنے کے لیے زیر زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔“ بزرگ نے بنا کچھ کہے پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ
تلاوت کی۔ صیب نے گھڑی دیکھی ”اگر میں اپنے عملے کو موہاں کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں تو وہ میرے
پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر
آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سنا چاہوں گا۔“ پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی۔ لیکن
صیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شوختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کیفے میں آئے
گا اور پوری سورۃ دوبارہ سنے گا۔ وہ رات بھی آگئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی لیکن معاملہ اب بھی
وہی تھا۔ صیب کی تشنگی۔۔۔۔۔ پھر طے یہ ہوا کہ صیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں
پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ صیب نے اچکچکاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب
اور یہ پورا پیغام سننے کے لیے اُسے ان لوگوں کے ساتھ کتنا وقت بتانا ہوگا؟ کیوں کہ تین دن تو وہ کسی نہ کی
طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا ”بزرگ اللہ۔“ اور تین دن کے لیے صیب البشر اُن کے ساتھ ہوا۔
پھر تین دن اور دس دن سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد صیب گھر پہنچا تو وہ
صیب نہ تھا، جسے اُس کی گلی نمبر 128 والے لوگ جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کیفے میں
تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دُور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا ”یہاں شراب فروخت
نہیں کی جاتی۔“ زندگی کا پہرہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیئے گئے دس منٹوں نے صیب کو کچھ ایسا خراب
ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سر براہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے دنیا بھر میں گھومتے
پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن صیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اُترا اور پھر سینکڑوں
ہو کر رہ گیا۔ صیب صاحب اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ بیس برس کا جمع پانی اُن کی آنکھوں سے نکل کر
سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بقول اُن کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں
سے بلاوا آ ہی گیا تھا، جہاں جا کر وہ ماتھا ٹیک کر تب تک نہ اٹھتے، جب تک انہیں اپنے بچھلے ہر گناہ کی معافی کا
یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ پراسرار بندے جو عمر کے چوبیسویں سال میں نہ
یارک کے ایک چوراہے پر اُن سے ملے تھے وہ انہیں پہلے کیوں نہیں ملے۔۔۔۔۔؟ وہ اس کے پیارے صیب صاحبؒ
کے رونے کی جالی سے اپنی جہیں نکا کر تب تک رونا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی اب زم زم
کی طرح میٹھا نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب پھرتی
جاری ہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ٹپلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریسٹورنٹ کی گھنٹی بج چکی تھی اور
اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ صیب صاحب تیسری منزل کے
مہمان تھے، لہذا انہیں اُسی ریسٹوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ رخصت صاحب نے بتا،

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریسٹوران میں پہنچا تو کھانا لگا یا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی
دردیوں میں چاق چوبند بیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو
دو شہرہ بٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دھیمے سُروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے
ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاڈ اور انناس کی چندقاشیں رکھیں
اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار
پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک رہی تھیں، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاڈ اُن کے لباس اور پھر
زمین پر بکھر گیا۔ اُن کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے بنا میری معذرت سننے انگریزی میں مجھے
بے نقط سنا شروع کر دیں، حالانکہ غلطی بھی اُن ہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کرتے کی وجہ سے شاید وہ
مجھے بھی نیچے عملے ہی کا کوئی رکن سمجھتی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ ”جانے کہاں کہاں سے
آ جاتے ہی احمق لوگ۔ جنہیں ریسٹوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔
اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ ابھی۔۔۔۔۔“ وہ بنا دقت کے چلائے
جاری تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اٹینڈنٹ
بدعاس سی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی ”وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے۔۔۔۔۔ اُن کی حالت بگڑ رہی ہے۔۔۔۔۔“

انے جانے کس بات کا غصہ تم پر اُتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔“ میں نے کاتاف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ”آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں میں ڈاننگ ہال نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی دہاں سے نکلنا پڑا۔“ ہاں مجھے پتا چلا ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟“ ”کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیمین میرا کیمین ساتھ والا ہے۔“ اتنے میں عملے کی ایک اینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مودب انداز میں صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سوئیٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن لوبات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیمین خالی نہیں ہے، لہذا ہم معذرت خواہ۔ البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیمین فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔“ راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، جیسا آپ اب سمجھیں۔“ اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل صاحب سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیمین میں بھی گزار لیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت ہے۔“ راحیل صاحب ہچکچاہٹ سے گئے۔ ”نہیں نہیں..... کچھ انتظام ہو جائے گا، آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔“ میں نے اصرار کر کے اپنے کیمین کی چابی اُن کے حوالے کر دی۔ اور خود سلطان بابا کے کیمین میں چلا آیا۔ اُن کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ والے کیمین میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں آ رہی ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ ناہن چل رہی ہے، لہذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے درختہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب نفرت تھی۔ صبح کے بعد اُن کی نیند کچھ پرسکون ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اُسی وقت راحیل صاحب بھی نکلنے کے لیے ڈاننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ”رات میں لک بطرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ متاثرانے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے یان تمہارے معاملے پر ہی کچھ اُن بن ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنا کیمین چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے ان سے یوں چلے آئے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اُسی نوجوان کیمین میں ہوں، جسے اُس نے بھرے ہال میں سخت ستائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں سکتا۔“ انا شرمندہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیمین واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال، تمہارا شکریہ۔“ انہوں نے کیمین کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی مدد کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں اُن سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی

کاسابلانکا

یہ سنتے ہی میں اُس عورت کو چننا چلا تا چھوڑ کر اپنے کیمین کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی ٹیبلٹ کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ”کیا ماجرا ہے؟“ ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اٹھایا۔ ”عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبراتا معمول کی بات ہے، لیکن چونکہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آ رہے تھے، لہذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظام تنفس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال..... ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیمین ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً اُسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر.....“ فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اُس نے مجھے خود کار گھنٹی کار میوٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ مٹن دبا دوں تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیمین کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر کھائی۔ جانے کتنی دیر میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی لنگی میں پانی کے بلبلی بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا..... وہاں ختم..... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیمین کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اُس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔“ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں عبداللہ ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ ”وہ کچھ ہچکچایا۔“ دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈاننگ ہال میں تم پر بلا وجہ چلانے والی میری بیوی متاثر تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اُس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اُس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں درحقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ ”نہیں..... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن متاثر خود شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور

ہ بولیں ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔“ میرے اندر جیسے ایک چھٹکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری بات بھانپ گئیں۔ ”شاید میں نے تمہیں دھوکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی بات دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر وہی آداب گفتگو کی زنجیر آڑے آئی۔ ”ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی بات کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ کن کی خوش قسمتی ہے یا حرام نصیبی۔ لیکن شاید رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آلیٹ کو کانٹے سے ادھر ادھر دھکیلتی ہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ”جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی ہمارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔“ میں نے تردید مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیمین میں اُن کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر پہنچنے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے ذہن اُس پری کا تصور ابھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی۔ جانے میں اُس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ میری سانسیں تو اُس کے تصور سے ہی تھمے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اُسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمن صاحب کے ذریعے اپنے گھر واپسی کی اطلاع کروا چکا تھا اور یقیناً ملاپانے زہرا کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرگاہ میں ننگر انداز ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود وصل کی لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سوہیا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عرشے پر بھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اس آفت کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے وہ زہرا جہنم رہتی تھی، اور انتظار کی اُسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب سے نناشا کی آواز سنائی دی۔ ”کیا میں مغل ہو سکتی ہوں؟“ میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راجیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نناشائے بات شروع کی۔ ”تم نے کبھی

کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں نیچے ڈانٹنگ ہال پہنچا تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے چاکے تھے اور آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف کھڑکی کے چکے فرش پر دھبہ درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راجیل صاحب نے آواز دی۔ ”یہیں آ جاؤ نو جوان..... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے.....“ لیکن میں نے دُور ہی سے ہلا کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کے جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیر کا پیالہ رکھا۔ جب ہی میں نے نناشا کو میز سے اُٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بیس سال کی ایک دلکش خاتون تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جوفلہر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے اُن کے چہرے کے ایک زاویے سے اُن کے ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیسٹرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راجیل صاحب بھی مجھ سے اُردو میں بات کر رہے تھے لیکن نناشا کو اُردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کبھی انہیں یہ ”نا کام کوشش“ کرنے دی اور پھر دھیرے سے اُن سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں تو اب یہ کوشش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی غار سے بولیں۔ ”اوہ..... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راجیل نے تو بتایا تھا کہ..... پھر تو میں مزید نام ہوا کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کہا ہر طرح نہیں چلائی۔“ میں مسکرایا۔ ”چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شریف نصیب ہوتا ہے۔“ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور اُن کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر کم ہو گیا۔ ”ویسے تم مجب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سر بازار زرموا کیا، اُسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا مکان پیش کر دیا۔ کیوں؟.....“ میں نے اُن سے بھی وہی کہا جو رات کو راجیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب انوش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نوبیا ہتا انگریز جوڑا ناشتہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ ”سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہونا۔“ لڑکی نے ہنسنے سے باز نہ آئی۔ ”ہاں“ کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اُن کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ نناشا مسکرائی۔ ”کتنی عجیب بات ہے برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اُس کے پاس ہاں کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔“ ”ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پہننے ہوا یہ سوال کرے گا؟“ میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں، لیکن اُن کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فانی رہی تھیں۔ میں نے اُن سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راجیل صاحب کا اُن سے جھگڑا ہوا۔

محسوس کیا، ہماری زندگی کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہون منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بجری جہاز تک، کوئی بھی ایجاد اٹھالو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ اس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسائشوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیر کہتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے جب کہ 'آرٹ' انہی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔ "نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔" ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانو تو..... تمہارا یہ حلیہ اور تمہاری باتیں آپہں میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟" میں مسکرایا۔ "اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید الجھ نہ جائیں..... آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔" نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ "صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جُدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو آخری چناؤ اُس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔" نتاشا نے جتنی بارنا گھر لوٹنے کا ذکر کیا تھا میں نے اُن کی آنکھوں میں ایک خاص ڈھک کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی جیہن شاید یکساں ہوتی ہے۔" میں جانتا ہوں شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جُدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟" نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا پھر اُن کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ "وفا..... ہماری جُدائی کا سبب وفا ہے۔" میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ "جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری 'درا انداز محبت' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنی گئی۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر کھادوں۔ میں نے اُسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں۔ اور یہ راحیل ہی

اُٹھ رہا ہے کہ اُس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں میں 'تجدید وفا' کے قائل نہیں ہیں..... اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے 'تجدید' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں انہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ رجت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فیصد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس میرا 100 سوالات تھا۔" میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی مایع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ اُن کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح اُن کی پہلی بات سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل ان سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شاندار شخصیت، متانت اور سمجھ کے اعتراف نے جلد ہی مشکل پسند اور بچی نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ درس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی، دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمانہ بندھ چکے تھے تو راحیل نے اپنے والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ ماں نے بیٹی کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقبل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہوگئی۔ دونوں کا ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ چھتا تھا، لہذا ہاٹش وہیں رکھی گئی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی یعنی پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاٹش، ماں کبھی ہنسنے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول کو ہی محبت کی معراج تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور پر دیکھتی تھی اور یہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہوگئی اور فرہاد اُن کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی درجس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ لاکھ بار جو راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی۔ جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک دوسرے قریب میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ واپس آکر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات افکار کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ "ان ہونیاں" سدا ہی سے ناک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویروں میں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک اٹھانکار، نتاشا چیننگنز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری مٹی ہر تصویر میں، رُوح میں سے رُوح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو لٹ کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی۔ وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ "کھوج" اس تصویر کا عنوان کھوج ہے..... لا حاصل کی کھوج..... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور بے لالے کے لیے چھپنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو جو اُسی کے سامنے شدید پیاس

”ایک محبت اور سہی“

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالانکہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ لری میں گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اُس کی کارخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُر سکون زندگی ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ تہ ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں، یہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا تو طوفان آجاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح ایک لڑاور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی۔ لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا بطا لوی نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں۔ اور پھر سب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ پکڑ کر گھر سے لے کر کسکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی تہ ہی کھودے۔ اپنا دقا، اپنی گرلیں ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈبوتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم رکھا۔ جس کے سامنے اس کی متاع حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی لے کر خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں سننے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے کا جو اپنی کم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے سامنے کبھی نہیں بتایا تو فیکہہ اُس نے راحیل سے ہر بات بانٹ لی۔ راحیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے

سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں پائے گا۔ اُس نے نتاشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راجیل کو یوں لمحہ بہ لمحہ نوٹے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو، اُس نے خود ہی اپنی فرد جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جدائی کی کہ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے تو وہ اصل میں ملزم کو اُس کے پیاروں سے عمر بھر کی جدائی کی سزا دے رہا ہوتا ہے۔ سو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ”عمر قید“ چن لی تھی۔ راجیل نے نتاشا سے بھی پوچھا کہ کیو پڑ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور مجرم کی سرزدگی بھی اُسی کے دل کے سرے سے تو راجیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور بھرنا کوئی..... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالانکہ اب اُس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی۔ وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا لیکن نتاشا نے راجیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا ظرف اسے بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راجیل کی ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی دے۔ پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے تو پھر سے روتی دھوتی راجیل کی زندگی میں واپس آ جائے۔ لہذا نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے راجیل کو بھی سختی سے منع کر دیا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھٹک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ اُن کی علیحدگی خود اُسی ”مرد مغرور“ کے ہاتھ سے کیونوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسرا پھر تیسری محبت میں ”جٹلا“ ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں سا عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شہیدہ دیکھے تو گھبرا کر خود ہی اٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلہ سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تلتا ہی نہیں۔ لیکن نتاشا نے ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم رکھنے کی یہ انوکھی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راجیل علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا۔ کیوں کہ تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط نہ تھی۔ راجیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے فر آرٹ گیلری چھوڑ آئے تاکہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راجیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی بل پاکستان میں مسلسل گھڑتی جا رہی تھی اور اُس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا لیکن میں اُس رات لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ یہ محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں چلتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسرے پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ”آخری محبت“ ہوتی ہے۔ کیا ”محبت“ اور ”وفا“ کے معیار بھی ہماری معاشرتی ہڈار کے تابع ہوتے ہیں؟ اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ جاتے۔ اس ”محبت“ نامی معصے کی کتنی پر تیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات پھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے اُن کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوا میں لینا بھی بھول جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید گھڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اُس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگتا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر ہٹک کر اٹھ کے ٹھنڈا پڑا۔ نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے بھٹ رہا تھا۔ لہذا میں اپنے کہن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس اُن کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کہن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راجیل صاحب کھڑے تھے۔ ”میں غل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔“ ”جی۔۔۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی اس وجہ سے نیچے نہیں آ سکا۔“ انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا تھا۔ انہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر گلائیں رہنا چاہیے تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے پتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں نماز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتے تختوں سے ایک اوٹے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ اُس ہاں سفید وردی پر نیلی کیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سلیز مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راجیل صاحب نے دُور بنتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”جانتے ہو یہ ملاح اُٹا اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اُوٹے نیچے کرلو۔ چور اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے۔۔۔ ہمارا ساحل

جی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا دے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی اُن بن اور دینی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راحیل نے دنیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا راحیل سے کیوں جدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے تو وہ نتاشا کو پالے۔ راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا لیکن خود انکاروں پر لوٹا رہا۔ دنیا میں بھلا کون ہوگا، جو کسی لیرے کو خود مدعو کرے کہ ”آؤ اور میری متاع حیات لوٹ کر چلتے بنو۔“

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آ کر یہ بتایا کہ پہلے پہلے تو فرہاد اُن کی جدائی کے صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا کیوں کہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اُسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی تھی۔ پھر اُس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اُسے سمجھا سکتا ہے۔ لیکن جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی تو اُس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راحیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا ہے کیوں کہ نتاشا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اُس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنا نا اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا۔ شاید کہیں دور اُس کے دل میں اب بھی یہ امید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ نتاشا کو اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اُسے بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا۔ البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام ایسا اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے ماتم دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں لڑا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ اُن کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازی طبیعت کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب اُن کے جانے کا وقت ہوا تو مجھے اُوپر والے چوٹی ڈیک پر جہاز کے آخری ریلنگ کے پاس نتاشا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اُوچائی پر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے سچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر اُن کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ”کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ

دور ہے اور کپتان کی محبوب پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔“ ”آپ کو اطلاع دی جاتی ہے؟“ ”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں۔۔۔۔۔ نتاشا کے گھروالوں کے سامنے بہت پاپڑ بنینے پڑے تھے مجھے وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی چلتی ہیں۔“ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”کیا یاد باں اُونچے کرنے اور پتوار تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جاسکتا ہے؟“ انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ”نہیں۔۔۔ طوفان تو آکر ہی رہتے ہیں۔ لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندروں کو دیران بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے انہیں طوفانوں سے کیا گلہ۔۔۔۔۔ گروڈ بنانا ہی مقدر ہے تو پھر مسکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔ شور مچا کر اور دوا دیا کر کے سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اُن کے چہرے ہی سے اُن کے اندر اُٹھتے طوفانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹولا ”آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں۔ جو ڈوبنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ طوفانوں کا رخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔ کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ ”وہ جس معاشرے میں پلے بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہو سکتا ہے، جرم نہیں۔ اور محبت جرم تب بنتی ہے جب وہ اپنے ساتھ احساس جرم لے کر آئے۔۔۔ اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آجانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے تو پھر یہ محبت نہیں ”سودا گری“ ہوئی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسایہ زہر نچوڑ نہیں سکتی۔“ ”پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جوا کھیلنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول نہیں کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اٹھانے، صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر مگن ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کس کی کا انتظار کرتی ہے؟“ ”میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ تلخ اور بلند ہو گیا تو تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم خشکیم سی نگاہ ڈالی۔ راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے۔“ ”جو نتاشا نے کھیلا ہے۔ لیکن بازی میں نے بجا ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اُس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ دو دن بعد ہم بندرگاہ پر اتر رہے ہیں وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔“ میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا ہوں۔ راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُن آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، نتاشا کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نتاشا سے

ل کے من کے ہولے کو ٹولا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف پانچ فی صد ہی لرتی ہوں۔“ نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ”لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ ہر دو میں اُس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اُس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر ہوں۔“ ”کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ.....؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سراہوں کے پیچھے بھاگتے گزار دے۔ اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کہا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کسی انسانوں کا۔ میں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔“ نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک بولی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ”پھر ان ہزار صدی کی باتوں کا کیا ہوا؟ دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟“ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ ”اگر اس دل نے ہمارے ساتھ مائل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ”لا مل“ رکھ چھوڑنا چاہیے تاکہ وہی ”لا حاصل“ اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح مائل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے تو پھر یہ بھی اُسی بچے کی رنج چندون کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل بھر گیا تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھلونے کے لیے نکلے لگے گا۔ تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے..... تاکہ وہ بڑے کے لیے اس کے لیے خاص رہے۔“

میں نتاشا کو سوچوں کے سمندر میں چھوڑ کر نیچے کیمین میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل بانہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی۔ یک جھک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دُور سے میں نے ماما اور پاپا کو میزبانوں والے حصے کی جالی کے پرے دیکھا۔ اُن کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ لیکن مجھے زہرا کا دھانی اٹھل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہا رہا تھا مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پاتی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر لنگر لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے میزہیاں اتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اُس کی بچی عینی اور اُنہی نے آخری میزہی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سچے سنورے شخص پر پڑی۔ اُن کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ”فرہاد.....“

تو نہیں کر رکھا؟“ وہ مسکرائیں۔ ”نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دعا نہیں رہی.....“ ”ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گھمتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟“ ”نہیں..... میں ابھی محبت کے ”م“ اور عشق کے ”عین“ تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”کیوں؟“ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لا حاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالنے کے بعد پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کند کوئی فصیلوں پر اٹکتے سے نہیں روک پاتے تو پھر ہم ایک نیا کلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟“ نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”کیسا کلیہ؟“ میں نے مزہ کر دیکھا۔ ”یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی پلٹ سکتا ہے۔ تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سردھڑکی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔“ نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی۔ ”لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنے نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میں نے آخری وار کر دیا۔ ”تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نقیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟“ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں وہ تو سودا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا۔ لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھینچا محسوس ہوا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے سارے خوابوں پر قابض ہو بیٹھا۔ تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں اُلجھا بیٹھے گا؟“ نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”لیکن تم.....؟“ ”میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے تو پھر ہمارا ایک شارک صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ دل پر زور نہیں..... آپ جس ماحول میں پلٹی ہوئی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہولے اُس کا دل کھینچنے کے لیے اُس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر..... تو پھر آپ کے کھینچے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سینکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کئی دوسرے کے بنائے ہوئے ہولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سیلیبرٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے

آخری محبت

بدا کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے۔ کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔“ میں نے مسکرا کر اس نئی نشا کو دیکھا۔ ”ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درازوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سمیٹنی ہوتی ہے۔ لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے..... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ نشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دُور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نشا پلٹنے سے پہلے راحیل کی طرف بڑھی۔ ”تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے

پانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ، اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور یعنی نمائش دیکھنے فرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹرینٹ بھی لیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔“ نشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور فراد کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دُور جا کر اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر اُٹھ بلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اُن کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے ہٹ گیا۔ اُسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اُتر آیا تھا کہ پکا کہ ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دے۔ ”ساحر..... ہم یہاں ہیں.....“ پکا کے ساتھ ماما بھی کھڑی تھیں لیکن اُن کی آواز اُن کے بپتے آنسو پہلے ہی گونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر اُن کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریب آچھ ماہ کے بعد اُن سے مل رہا تھا اور ماما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹول ٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی اُن کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایبوسینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایبوسینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید سینکڑوں بار اُس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس نے اُن فرس کو آتا تھا۔ لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ جھوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ ماما پاپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے ماما

میں نے بھی نشا کی نظروں کی تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اُس کے انداز میں جو ایک خاص لاپرواہی تھی اور اُس کے سفید لباس پر چھتی نیلی پی کیپ اُسے دُور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ سب ہی چھتوں کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ”فرہاد..... تم..... یہاں.....“ فرہاد مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا ”ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سر پرانز دے کر حیران کر دوں۔“ نشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نشا سے کہا۔ ”چلیں..... آپ کا کام آسان ہو گیا۔ لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔“ اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ”عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔“ نشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کا مقصد کارفرما ہے۔ اُس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور ابی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اُس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے یعنی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اٹھائے۔ یعنی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جے دیکھا اور پھر اُسے جاتے جاتے آواز دلا۔ ”ماما.....“ نشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی ”رک جاؤ راحیل.....“ راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نشا شاید تیزی سے میری جانب بڑھی ”کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو۔ تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی آخری محبت بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فسیل پر ہر بار اپنی کندی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ۔ اس ”تجدید وفا“ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ لیکن تم بھی مجھ سے الگ

کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ”بزرگ دانش“ بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلے نہیں گئے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک بیمار دہری وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے ماما سے کیا گیا وعدہ بھی یاد تھا۔ سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پاپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی ماٹوں دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوشبو..... وہی ماما کی اپنی اپنی نوکروں کو ڈانسنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لپٹی بلیں۔ شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا تو اُسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اُسی طرح ”بکھرا“ ہوا تھا جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید ماما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوٹس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر..... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کف لکس اور ٹائی بزنز بھی اُسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرا کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پھٹل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کی بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو۔ لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ زہرا موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ ماما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کمر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پاپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہوائے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر دیے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پاپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اندر تک جھنجھٹا اٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سننے ہی ماما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”کیا..... اوہ..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....“ ماما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی ”زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔“ میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ماما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی

سے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا۔ اُسے بھی زہرا کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم پکڑ ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اُس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرا کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نو جوان کی بنیضیں ابھی چل رہی تھیں۔ لہذا اُن کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اُسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرا سمیت اُسے لے کر قریبی ہسپتال کی طرف گاڑی بھگادی۔ یہ فون وہیں سے زہرا کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرا گھر سے نکلی تھی، تب تک اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے تو اس افتادہ سننے ہی وہ زہرا کی اماں کو لے کر فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نو جوان کسی اُونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرا کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیونکہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن ماما کے بقول زہرا کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی ٹھک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ”یا میرے مولا..... اُس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا۔“

ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس مرتبہ میں نے ازتہ ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانس اُلجھنے لگی تھیں، لہذا انہیں پھر سے آسپین پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ نوڈل میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں ماما پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرا لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورج تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں بھرے ہونے والے دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے اکثر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ ”کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اس فام کو متحرک کر سکتی ہے جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔“ افسوس وہ نظام متحرک و ابھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھبراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ ”ساحر..... خود کو منہ بولو بیٹا.....“ لیکن میں شاید بہت پہلے سننے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ذہنی آنکھوں اور بند ہوئی پلکیوں نے ماما کو چیخنے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا۔ لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ ماما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کمر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پاپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہوائے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر دیے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پاپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اندر تک جھنجھٹا اٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سننے ہی ماما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”کیا..... اوہ..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....“ ماما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی ”زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔“ میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ماما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی

”من کی دیوار“

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
 خبر نہیں کہ یہ سورج کدھر سے نکلا تھا
 یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا
 ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا
 یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
 کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا
 میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
 کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا
 وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
 تیری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا.....

ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی پر
 تھا۔ ایبولینس کی گھوٹی سرخ جتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کامیابی
 بورڈ، سفید گاؤں پہنے اور میرے اسٹرچر کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھینر کی ایک جگہ
 سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ جھپکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری کھلی
 بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی جھین اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس.....
 پھر وہی سرخ اندھیرا..... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں..... ہمیں انہیں
 ہے..... آپ کے پیٹے کے نیچے کی امید بہت کم ہے۔ البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں تو اسے فوراً لندن کے
 ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید
 کچھ کر سکتے ہیں۔“ پھر ماما کے رونے کی آواز، ایئر پورٹ ٹرمینل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہول
 رن وے پر رگڑ سے اُڑتی چنگاریاں، اور پھر ایک ملائم آواز، ”ہم لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر آپ کو خوش آمد
 کہتے ہیں۔“

۲۳۲

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

جج تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش و حواس تب میرا ساتھ چھوڑ
 گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھونے کو رہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا
 تھا۔ لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔ اس کا مقدر تو صرف اُسے چھونے کی خواہش میں
 اُڑتے جانا ہے۔ اُونچا اور اُونچا تر، حتیٰ کہ اُس کی سانسیں رُکنے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے
 زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے ایک آخری قلابازی اور پھر سب ختم..... شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔
 جگہ جگہ گزریوں کے چند لمحے مجھے ایک بہت بڑی سی شے کی کھڑکی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے
 ہاسے مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے
 کنارے بچے بیٹوں پر اس سے باتیں کرتے گزراے تھے۔ ہاں..... شاید یہ دریا بے نیل ہی تھا۔ میں اس کی
 نیلی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ دقنوں سے دھیرے دھیرے میرے
 ہڈوں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھانے میں کامیاب ہوا اور سب سے

ایڈیٹ وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین ٹی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ پاپا وقت گزاری کے لیے مختلف چینلوں بدل رہے تھے اور پھر لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا۔ پاپا جب تک تین چار مزید چینل گزرا چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل پلٹنے کو کہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹ دیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کو کہا۔ ہاں..... یہی وہ چینل تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان میں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ہر ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا ہو۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک وہی تھا، جب حبیب صاحب کی پہلی نظر اُس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے..... جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پتے کی طرح لرز کر چند گھنٹوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ماموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور جب رواں رواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا۔ تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مغرب میں ڈاکٹر اب ساری عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ اُن ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج قرار دے کر میرے لیے ساری عمر مد ہوشی یا جنون کے عالم میں مبتلا رہنے کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک ماہ میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ Miracle (معجزہ)..... اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہاں نادانوں کو کون سمجھائے کہ ”سانس کی آمد و رفت“ سے بڑا بھی کیا کوئی ”معجزہ“ ہوگا اس دور کا؟ اُس نے گھر سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی جب اُس کے حضور مانگی گئی دعا لپک جھپکنے سے پہلے اُس کی بارگاہ میں ٹانگ جاتی ہے تو پھر اُس کی چوٹ کو چومتے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق رے بیز کے کچھ جراثیم بے ہوشی ہوئے ہیں جو صحیح وقت پر دیکھیں دیئے جانے کے باوجود دین موقیے پر اپنے آپ کو کسی سیپ نما چادر میں چھپا کر خود پر کوئی ”جھوٹا خول“ چڑھا لیتے ہیں لہذا دیکھیں کے خلیے اُسے پہچان نہیں پاتے اور اُس کا اثر ختم ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے بچے کچھ اور دم توڑتے ہیں۔ انہیں ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق جب مجھے لندن کے روز ویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 فی صد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا ٹخروں پر کھینچ چکی تھی اور ایسے مریضوں کا زندگی کی طرف لوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو واپس پالنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن اُن کے سامنے ایک ایسا مریض موجود تھا، جس کے جھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند

پہلے جو شبیہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جانماز پر سجدہ میں پڑی ہوئی میری ماں کی تھی۔ ہاں..... وہ ماما ہی تھیں، جن کی جنہیں نے ہاتھ نیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ کھڑکی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا کھانا دیتی ہے۔ میری پلکیں اٹھتی دیکھ کر پپا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ ماما بھی وہیں جانماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے تو میں نے کینڈر پر مزید تین ہندے سے بڑھے ہوئے دیکھے اور ہر لمحے احساس ہوا کہ میں پورے پندرہ دن تک اس سوتی جاگتی حالت میں بیٹا جیسے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک جھوم جھوم تھا، جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا ”ہیلولو کے..... میرا نام البرٹ ہے ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو۔“ مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پپا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ ”تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوتل بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں رے بیز کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے منہ سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں۔“ وہ میرے گال تھپتھا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لکنت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ پپا نے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کوئے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے پپا کی بات ادھوری سی لگی۔ لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر ہوا تھا کہ خود اٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی ملا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی میرا اُن سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا۔ ٹیڑھی روالا لہروں میں ضم ہو کر فنا ہوتی ہوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات (میڈیم) عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ عرصے ہی ہوتا ہوگا، کیوں کہ ہم اپنی ساری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے انجمنی رہتے ہیں، کتنے جدا اور کتنے الگ سے۔ کہیں

مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن اس شکستہ بدن کے ساتھ اس کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ہوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا ہم پر کس وقت، کس صورت میں کھلے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی ادب سے بھی نہ ہو پائے۔ اس روز بھی میں ڈھیل چتر پہ بیٹھا اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں بے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے نفعے ستاروں کو اپنے موتی ٹانگتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی چوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے درو دیوار کو سفیدے کی لٹل سے ڈھک رہی تھی۔ برف گرتی ہے وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے ماں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بد صورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اور تھنی اڑتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر میرے سیاہ مقدر کی دل کی تلاش شروع کی تو نرس نے میرے متع کرنے کے باوجود ڈھیل چتر کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اٹھائی۔ گیزوے رنگ کا چولا، ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر عام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے ہوئے ایک عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند تھی۔ جیسے آخری دن کا پھر کا سوانیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ تک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں..... کس چمن تھی اُس کی نظر میں۔ میں ایک پل ہی میں اہولہان سا ہو گیا۔ ”مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈمین ہے اور میں آسٹریلیئن نژاد یہودی ہوں۔“ مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی لڑ ہے لڑکے..... نرس گروتامی اس پُر اسرار شخص کو دیکھ کر مودب سی ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گروتا نے میرے ماتھے پر اپنی دو انگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں ہائے کیا بوبڑا نہ لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے گرم دیکھنے والاؤں میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اتنے امانے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں ”ساتر برف باری رات ہو چکی ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔“ وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس نور کی برسات کو دیکھتا ہوں، تب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گروتا نے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند نہ لگی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چھپتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دو دھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا دریائے ٹیمز اور دُور نظر ڈاکٹر منٹر کا پل بھی برف سے بنا سا نچا لگ رہے تھے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برقی صبح سے زیادہ حیرانہ اور مبہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسی ہر برقی صبح کے بعد اپنی رُوح پھر سے اپنا جہنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا باہر بنے نور کے مجسوں

آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کمزور اعصاب کی فضا پر لگا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا۔ لیکن جدید ایلو پیتھی اور سائنس اس معرکے کو کبھی نہیں پائے گی۔ سچ ہے، انسان سدا سے خسارے میں ہے۔ سدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلے چاند تارے ڈوبتے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، آسمان..... بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے ”دلیل کے سوداگر“ کو مطمئن کرنے کے لیے؟ لیکن میرے اندر پھیلتی بے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پندرہ دن سے زہر اسے ماما پاپا کو کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بارہ بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پاپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، لیکن ماما کو کچھ ہوتی سی لگتی تھیں، جیسے زہر کا ایسی حالت میں مجھ سے لا تعلق رہتا انہیں پسند نہ آیا ہو..... تب ہی شام کو میرے حلق میں سوپ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُٹھ پلٹے ہوئے اُن کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ ”کون بے وقوف ہوگی، جو موت کے منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آئے گی یا اُس کا انتظار کرے گی.....“ پاپا نے نظروں نظر میں ماما کو ڈانٹا۔ وہ بوڑھا کرچ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال کھلبلائے لگے۔ وہ میری حالت جانے کے باوجود ایئر پورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری خیریت تو پوچھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں محبت دوسروں کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں کوئی نیا دوسرہ کچھ الگ ہی خدشہ نہ اُٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے مل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار پلٹ کر نہ دیکھے تو دیوانوں کی دنیا اٹھل پھٹھل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ رُوٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی بات بُری تو نہیں لگ گئی اُسے.....؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا چین و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی جسم کی لا چاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرواز کیوں نہیں عطا کی گئی؟ ایسا ہونا تو میں اُڑ کر اُس بے پروا کے در پر جا پہنچتا کہ اس تغافل کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب میں بے ہوش تھا، خود کو اُن کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس خرد نے انہیں مجھ سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز ترین رشتوں سے جسمانی طور پر دُور ہوں تو ہمارے اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں رُوحانی طور پر ان کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نزل بیساکھی اور ڈھیل چتر کی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، باغیچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریائے ٹیمز کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سڑک سے ملتی تھا۔ میں جانے کتنی بار اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیوں کہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت میں

پہلی قیامت

ٹی۔ گروہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ بعد میں مجھے اُس کی عمر کی ہیڈنرس کا نام اسٹاف ایکی معلوم ہوا۔ صبح
 ب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مہاپا رات کو میرے کمرے سے ملحق
 کمرے میں ہوتے تھے لہذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایکی کو
 منع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ کرے۔ وہ ناراض ناراض سی، تھرمائیڈ دیکھتے ہوئے
 بولی۔ ”تمہیں بخار ہو گیا۔ اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے۔“ مہاپا ڈور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر
 ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ فریضہ مہار دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں
 فوری بہت تبدیلی ضروری ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑی۔ ”باتیں خوب بنالیتے ہو۔ تم رات کو اُس عجیب شخص کے سا
 تھ کون سی بحث کر رہے تھے؟“ ”کون.....؟ وہ گرو.....؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔“ ایکی کے
 چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ”دیکھو، میری مانو تو اُس شخص سے دُور ہی رہو۔ پتا نہیں اسپتال والوں نے
 اُسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اُس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔“ ایکی، گرو سے کافی بد
 دل دکھائی دیتی تھی۔ ”میں نے سنا تھا کہ نرس ہرڈی رُوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے،
 لیکن آپ تو گرو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟“ ایکی نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”دیکھو کڑے! میں
 تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک ’مسیحوتی‘ ہے۔ دراصل.....“ ابھی ایکی نے بات
 شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور ایکی جلدی سے سامان
 کی کڑے اٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کی بارسیہونیت اور سیہونیت کی اصطلاح سنتا اور
 ہتھارتا ہوتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے۔ شام تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ
 ایکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر جڑے بادلوں میں سے کسی ایک شریر
 بوڑھے نے کچھ دیر کے لیے، اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیئے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر کسا
 اودے بادلوں کا خیمہ ایک جانب سے کھل گیا۔ اور مٹھی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے نصف پیا
 لے نے مسکرا کر زمین سے چھڑ خانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے پھٹی برف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے
 بچپن میں ہمارے محلے میں گولے گنڈے والا سفید دودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُٹھاتا تھا۔
 میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ
 اس وقت پورا لندن سورج کبھی کے کسی پھول کی طرح دمک رہا ہوگا..... زرو لندن کی تاریخی بہتی زمین اور جما
 ہوا دریائے ٹیمز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پھندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں کسا جاتا تھا، جیسے
 گیل بان کی رسی خشک ہونے پر سکڑتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں
 کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی

میں نے پینا نزم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس
 محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا جہاں جو تک جاگ رہا تھا۔ تب تک
 جب برف کی چادر پر اپنی موثر انڈویل چیز کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاس کے برف سے
 میدان میں گرو کے قریب پہنچا تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کر سکتا تھا۔ گرو کچھ دیر تک فاتحانہ انداز
 میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ”دیکھا..... کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے.....“ لیکن اگلے
 ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اُس کی نظر کا سارا غور چکنا چور کر دیا۔ ”کیا تم پینا نزم بھی جانتے ہو؟“
 گرو کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ ”کیا مطلب..... یعنی کہ تم..... تم یہ سب کچھ محسوس کرنا
 ہو.....؟“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ہاں میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو دکھانا
 ہے لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔“ آسمان سے برسی برف ہمارے وجود ڈھانپ رہی تھی۔ رات کے
 جب آسمان سے برف گرتی ہے تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم
 والے بہت سے دودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گرو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات۔
 سرکتے پہروں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گرو مزید بے چین ہو گیا۔ ”میں پہلے ہی سے دن سے
 کر رہا ہوں کہ تمہاری رُوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر
 کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آگیا ہے کہ تم
 مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر.....؟“ میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضطرب محسوس کر رہا تھا۔ ”تم
 ے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری رُوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دستکوں کا
 ہیں۔“ گرو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے توتا رہا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر کچھ کمزور اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہوگا
 مجھے اپنا راز دو گے اور بد لے میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤ گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی بولو منظور ہے؟“
 حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نامکمل اور زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اگر میری عاقبت کا سنورنا اور
 تقدیر نے تمہارے ذمہ ہی لگا چھوڑا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک سودا اور سہی.....“ اتنے میں ہم پر رات والی
 شفت کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری بل
 دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وکیل چیز سمیت دھکیلتی ہوئی اندر راہ داری کی جانب

ن نے یہ بات کسی خاص نقطہ نظر یا طرزِ لہجہ میں نہیں کی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے چنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا۔ لیکن گردیوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھونے ڈک مار دیا ہو۔ وہ شدید ہر میں بولا۔ ”تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رسوائی کی بادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو۔ لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ ملانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔“ میں نے حیرت سے گردی کی طرف دیکھا ”لیکن یہ کیسے ہوگا؟“ ”کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل پے دماغ کو سسٹ چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا۔ جیسے تم مجھے اپنے اعصاب کے ذریعے مدعو کر رہے ہو۔ لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔“ میں نے گردی کو ٹھولا۔ ”کیا تم پھر سے مجھ پرنا ناز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی پیٹھی کا سہارا لو گے.....“ گردی کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ”جنہیں پے چاہنے والوں کی دعاؤں اور خدا پر اتنا کامل یقین ہو..... انہیں ان پنا نازم یا ٹیلی پیٹھی جیسے معمولی شعبہوں سے نہیں ڈرنا چاہیے.....“ گردی میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مہمپا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مہمپا نے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کبل دُور کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظریں گھڑی کی ایگنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہندسے تک پہنچ گئیں۔ میں نے گردی کی ہدایت کے مطابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گردی کی ہیمیدہ وقفے وقفے سے ابھرتی رہی۔ اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گردی کی وہ جیتی آنکھیں بری طرح کلکنے لگیں۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گردی کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چٹکی چاندنی کی لہروں روشنی اس طرح اندر آ رہی تھی کہ لکڑی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چوکور نیلی روشنی کے مستطیل ٹکڑوں کے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David Star) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گرد سمیت تیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے فوں سے ڈھکے ہوئے موڈب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس کی بھیڑ کا خون بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا تو وہ باقاعدہ دھات کی تانکی ٹالیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گردی نے دھیرے سے زیر لب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی۔ یوں لگتا جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اُس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گردی نے عبرانی زبان میں زور زور سے قوم یہود پر مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرا نا شروع کر دیے۔ ”میکا، عاموس، ہرمیاہ، جون، یوحنا.....“ پھر سب سے پہلے گردی اور پھر اُس کی تقلید میں باقی سب چند پوشوں نے

ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار اُن کے قریب ہوتے ہیں، وہ گرم چینیوں کے سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کے مگر لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کالج سے پرے درختوں کو برف سے بوجھل شاخوں کو بچدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹیڑھی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی گردی دروازے پر ہلکی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مہمپا اور پکا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور ویچلے تھیٹر میں بہت عرصے سے لگا تار چلنے والا شیکسپیر کا ڈراما میکبث (Macbeth) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پکا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پارہے تھے۔ گردی نے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دُہرایا۔ لیکن آج میرے پاس بھی اُس کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ”مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے۔ ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر یہی ایک شفا تمہارے لیے معجزہ کیوں بن کر رہ گئی ہے؟“ ”اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو، مگر سچ یہ ہے کہ جب تم کو بے ہوش تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے روحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اور میں نے گھنٹوں تمہارے سر ہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری روح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعثِ مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب و غریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔“ میں غور سے گردی کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سا دانت پر آنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اُس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس بار اُسے تفصیل سے پانی کے جہاز کا سا بلانا، میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ڈی انچ کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ گردی کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں۔ شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ”تمہاری کہانی میں اب بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ خاص ہو۔“ میں مسکرایا۔ ”میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر یہی دُعا کوئی میرے لیے یروٹلم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے یقین نہ ہوتے.....“ حالانکہ

اپنے اپنے پیالے کا خون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں اُٹھیل دیا۔ خون تیزی سے چھ کونوں کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اُس میں چکنا فولاد اس طرح بھر گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بہنے میں کوئی وقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہموار فولادی نالیوں میں اُٹھا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگرے باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوٹے ہی داؤدی ستارہ مکمل ہو جائے۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رُک رُک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی اُن دیکھی رُکاوٹ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ سب ہی ہنر پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گرد کو اس مزاحمت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اُس نے زیر لب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن کے چلتی وہ فلم بھی ایکن دم یوں غائب ہو گئی، جیسے کسی سینما کی اسکرین پر ریل کا فینٹوٹ جانے سے سب کچھ ہل بھر میں مٹ جاتا ہے۔ با کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گرد کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوتی طرف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالم خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں بھی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چیختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مہبوت کر دینے والی..... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ”عاشق“ ہے تو برف ”معشوق“..... کہ دونوں کا مزاج خود اُن کی وجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مہاپا سے پہلے ایسی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ”لندن کی خوبصورت پرلٹا صبح بخیر.....“ میں مسکرایا۔ ”ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ مسیحا گری کی ابتدا خوبصورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔“ ایسی بھی ہنس دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مہم پرپا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اُس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ ”بہترین..... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان.....! سے جاؤ رکو۔“ ایسی وہاں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلنے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اُسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گردانے مخصوص طے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مہم کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے چپا کو نظروں نظروں میں

دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پپانے مسکرا کر پاپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی سے مہم کو وہاں سے لے کر اٹھ گئے۔ گرد نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ ”کیا مجھے گزشتہ رات کی اذہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟“ تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں رہا کوئی شعبہ تھا۔ اس لمحے مجھے شدت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ دے تو آج میں گرد کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں خانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یا قوت سے لے کر تیک جانے ایسی کتنی انہوئیاں جھیل چکا تھا۔ اطمینان سے تنکے سے فیک لگا کر گرد کو دیکھتا رہا۔..... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم چابک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟“ اب چونکے کر باری گرد کی تھی۔ ”گویا تم سمجھ گئے تھے کہ نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں اڑ رہا تھا،“ لیکن میں تو یہیں تھا..... اپنے کمرے میں.....“ گرد مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ”اس کمرے میں تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری ت میں رُکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔“ گرد نے مجھے بتایا کہ رات جو میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں ”مقدس بہاد“ اور بڑی میں ”پورا دور“ (Pour over) کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے ابو بھڑکی مقدس قربانی کے بعد تبرک کے طور پر بھڑکا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر نہ تھے اور پھر ساتویں دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس رسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گرد قدامت یہودیوں میں یہ رسم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی۔ اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل اُن دن کے خاتمے پر اُسی پورا دور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گرد سرگوشی میں مجھے یہ ساری بات بتا رہا تھا، جب ایسی نے دوبارہ قفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں نظروں میں کسی ناراض ل کی طرح ڈانٹا کہ میں اُس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ماہوہ ماسے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مہمائی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید ”اے بزرگیت“ سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں ایسی کو کیا بتاتا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی نیچے سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مہم آ کر کرتی تھیں۔ لیکن ایسی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع نہ پہر کی جائے کے بعد ہی مل سکا۔ جب مہم اور پپا لے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔ ”لو کہ..... میں نے تمہیں منع کیا تھا، اس گرد کے ساتھ بات کرنے سے“ مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”آخر آپ اُس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی مالکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے.....“ ایسی کو غصہ آ گیا۔ ”اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی

21 دسمبر 2012ء

زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا سحر تم پر بھی نہ آ رہا بیٹھے.....“ گویا ایسی کو بھی گرد کے کلاں کی کچھ خبر تھی۔ اُس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گرد کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا نروانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر ہفتہ اپنے درجنوں پیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گرتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدائیوں میں ایسی کا اپنا ہاؤس پٹیر بھی شامل تھا، جو بقول ایسی گرد سے ملنے کے بعد باقاعدہ اُس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اپنا گھریا چھوڑ کر اب سارا دن گرد کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ایسی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہ داری کے ابھرنے کسی ایمر جنسی کے لیے ایسی کا نام پکارا جانے لگا۔ ایسی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھکی برف باری بار سے ہلکے گالوں کی صورت آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گرد جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مددگار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے جائے۔ میں نیچے پہنچا تو مجھے دُور سے گرد اپنے لیے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا جانب آتے نظر آیا۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ قائلہ پر زک گئی۔ گرد نے میرے قریب پہنچ کر میری دھکیل چیر پر اپنی چھتری تان لی۔ ”اچھا ہوا تم آگئے۔ میرا تم وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔“ میں نے اپنی پلک پر برف کے ایک موٹے گالے کی غمی محسوس کی۔ ”میں سننے کے لیے تیار ہوں.....“ گرد نے عجب سے لہجے میں سرگوشی کی۔ ”تو پھر سنو..... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو.....“ جس ”قیامت“ کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے..... مجھے خبر ہے کہ وہ ”قیامت“ کب آئے گی.....“

میں گرد سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا لیکن اُس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا کیا مطلب.....؟“ ”مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیوں کہ میرے حساب سے قیامت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔“ برف ہمارے چاروں طرف بجے بجے قلعے کی فصیلیں کھڑی رہی تھی۔ سرد ہوانے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ”تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟“ ”لا تعداد نیاں ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا ذکر ایک ذہین نجوی ماسٹر آف میس، صدیوں قبل کر چکا ہے مثلاً چار فولادی ندوں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (ٹائن الیون)، یہودیوں کو اپنی مادر ملت (اسرائیل) کا واپس ملنا، ری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔ لیم دجال کی آمد اور یہود کی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب رف لدگشت کے مقام پر اُن کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اُٹل ہے.....“ میں گم سم سا گرد کی یہ ساری بحث نہا۔ اب مجھے ایسی کے کہے ہوئے لفظ ”صیہونی“ کی اصل تشریح سمجھ آ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جبل میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اُس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ بن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور باقی تھا اور گرد جس فتح کو یہود کی آخری اُتار رہا تھا وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اُس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا جسے ”دو آرمیڈون“ (Armageddon) کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اسی (جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرد کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اُس نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھٹکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً چھٹنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹنے اور برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھردی۔ میں نے غور سے گرد کی چھتی آنکھوں میں مانکا۔ ”کیا ہے وہ تاریخ؟“ گرد روپائے ٹیز سے بھی پرے خلا میں برستی برف کے ستاروں کے پار کسی اُن لمبی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ”21 دسمبر 2012“ کیا۔ اتنی جلدی؟ یعنی صرف تین سال بعد، ”ہاں میرا علم لیا کہتا ہے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت کی تیاری کو لو، وقت بہت کم ہے۔“ گرد واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے نشان بنا تا برف کی دُھند میں کہیں عائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دُھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے

کبرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اُس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزرنی کہ یہ نئی جنگ اُن کے بنائیں کیسے لڑاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دُھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اسی دُھند میں سے دُودھیا سفید لباس پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے لبوں پر وہی اپنی ازلی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے۔ ”کیوں میاں! پھر اُلجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں.....؟“ مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ”آپ کہاں رہ گئے تھے مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں ایک قدم بھی آپ کے بنا اٹھنا دو بھر ہو جاتا ہے میرا.....؟“ وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ”موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی ساڑھ میاں.....“ میں شدید پریشان ہو کر بولا ”آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کہیں جارہے ہیں.....؟“ ”سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اسی رستے کے مسافر ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبار زندگی رُک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دُور ہو جائیں تو رُوحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین ثابت کرنا ہوگا۔ جیتے رہو۔“ سلطان بابا نہ جانے اچانک ہی اُس دُھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسیلیوں کا کمرور بجنے تو ذکر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریائے یئمز یا دیسٹ منسٹر ہل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آرہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں ویل چیر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہیں۔ چاہے بیساکھی کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دو روز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور اُن کی تشخیص کے مطابق مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید کئی ہفتے درکار تھے۔ بقول ایملی، جب اُس نے البرٹ کو صبح کے معائنے سے قبل اُن کے دفتر میں یہ خبر سنائی تو اُن کے ہاتھ میں پکڑا شیٹہ گر گیا اور وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ ”کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نوجوان.....؟“ ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ ”نا قابل یقین..... اگر یہ صرف قوت ارادی کا کمال ہے تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔“ ممپا بھی بے حد خوش تھے۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا لہذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے سامنے بابا

ار کے ہسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا ہانک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہوئے لگی تو انہیں مصنوعی کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اُڑ کر واپس اپنے شہر پہنچ سکوں۔ مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور فانی ہی اصل زندگی کی ابتدا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کو ازل سے اب تک اسی فانی جسم کی محبت ہی میں مبتلا رہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی فانی..... سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھود دینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی بھر جی کر بھی جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک ”اجنبی موت“ کو گلے لگانے کا کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں تو مجھے بے بسی پر شدید غصہ آیا اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ ب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اسی خیال میں بیساکھیاں ٹیکتا شیٹے کی چھت اور شفاف دیواروں والی اوداری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں ایک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بیج نما تختے درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔ ہسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا دنوں کی دھوپ کا مزہ لے سکتے تھے لیکن اس وقت شیٹے کی چھت اور کاٹچ کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر

میا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرد پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں اب ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا ہی دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے۔ اُسے ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کیل کیوں کھیل رہے ہو؟“ گرد کا فانی غصے میں لگ رہا تھا۔ نہ نے اُس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی۔ لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی ڈاکٹر کا تھا لہذا بہتر یہی سمجھا تھا کہ اُسے کوئی جواب دیئے بنائی آگے بڑھ جاؤں۔ لیکن دو قدم ہی آگے مارتا کہ پیچھے سے گرد کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ ”کیوں خود پر سے بھر دسا اٹھ گیا ہے یا پھر اپنے اعلیٰ استاد کی ناکامی کا ڈر ہے.....؟“ مجھے یوں لگا جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کو اڑوڑتے ہوئے ساحر باہر لڑکر گرد کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیمار کھنے کی کوشش کی۔ ”تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعلہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک مجرہ ہے۔ تم جس ہنر اُٹھانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو میرے نزدیک وہ دعا کی صورت مل بھر میں قبول ہو سکتا ہے۔ بات صرف یقین کی ہے۔ اٹل یقین..... لیکن افسوس تم نے سب کچھ کیجھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا.....“

ہذا پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے کا جارہا ہے تو کسی کو چاند پر کچنے والے پلانٹوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیشوا تھا تو کوئی بنیاد سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گروا گر کھلے عام اپنے کارپرجار کر رہا تھا تو یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گروہ بھی دیکھے تھے جو حکومت ملائیہ اجتماعی خودکشی کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس لحاظ ان کے معاشرے میں گرو کی ”تعلیمات“ کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی کمی نہ تھی۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرو کو باقاعدہ ”روحانی دیوتا“ کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایکی اجماعی پیئر بھی شامل تھا۔

اگر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دور سے مجھے اور گرو کو اس ششے کی ایوب میں کھڑا دیکھتا تو اُسے یہ جھگمگاتی بقتہ نور بنی راہ داری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے دھسیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی لشکارہ تیر رہا ہو۔ راہ داری کی اندرونی حدت کی وجہ سے ششے کی ل اور بیضوی چھت پر برف جم نہیں پاری تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہ رہی تھی، جیسے ہم کسی ششے کے لبہ بند گھر سے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اسنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی۔ وہ گرو کو راضی کی درخواست پر زبکی کے لیے خصوصی کرہ نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیوں کہ یہ گرو کے دورے کے مخصوص اوقات تھے۔ سو، اُس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ”مجھے تمہارے جواب کا رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اس سچ کے سفر میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔“ وہ اپنی بات ختم، لے لے بے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گرو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں الجھا رہا۔ اسے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دیس پنے والدین کو مزید کسی نئی اُٹھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان نامیرے چا۔ پنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاتب تقدیر نے قسمت کی سیاہی کچھ زیادہ گاڑھی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرا کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ ٹانگے کے لیے اپنے بل کے لگا۔ ہمارے تھکے ہوئے بے دم پھیپھڑے اپنا پورا زور لگا کر کرتازہ ہوا کی ایک پنے اندر اُتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑ پھڑاتے ہیں لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس کا نام راستے پہلے ہی مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر میاں رگڑتا ہے، اتنی آواز اُسے اذیت ہوتی ہے۔ جان رُک رُک کر ٹپکتی ہے۔ ایسے میں فدا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ اپنے لیے اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی کی نچوڑ کی اجازت دے۔ اُسے سو میں نے بھی زہرا کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا۔ شاید

اور شاید اسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو.....“ گرو میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا ”نہیں..... میں اسے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پایا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیا خوف؟ ڈرنے کی ضرورت تو جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کیوتر کی طرح آنکھیں موند لیں عادت ہے۔“ میں نے غور سے گرو کی طرف دیکھا۔ ”مجھے صاف صاف کہو تم چاہتے کیا ہو.....؟“ گرو چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے قدر اُتار دو۔ پہلے پہل تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا موٹا شعبہ باز ہی سمجھا تھا لیکن اُس رات عبادت کے دوران جب تم نے ہم سب کا ارتقا توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا۔ تم واقعی اُس ابدی راہ کے مسافر ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ گرو باتیں حسب معمول اُس کی شخصیت کی طرح ابھی ہوئی تھیں لیکن آج میں نے اُسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ”اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی اُمید میں کرو گے۔“ گرو مجھے راستے پر آتا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ”تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا لیکن بے فکر ہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیوں کہ تمہارے پاس دوسروں سے کچھ سوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ تو میں تم سے ابدی سکون کا وعدہ کرتا ہوں وہی ابدی سکون جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی روح ازل سے بھٹک رہا ہے اور ابد تک سرگرداں ہی رہے گا بولو منظور ہے میری پیش کش.....؟“ گرو اُمید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرو چاہتا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُس کے نظریے کا پرچار کر دوں میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبہ سے محمول کر رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرو اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کر داتا تھا، جہاں اُس کی تعلیمات اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر وہ صرف اُسے سنتا اور سراہتا بلکہ اس کے گروہ کے رُکن باقاعدگی سے گرو کی روحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اگرچہ گرو کے فدائین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گروہ کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک میرے لیے ایک معماری ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اُسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت ہونے والی ہے اور بظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اُس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو آنے والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویے سے بہت آسان اور سادہ دکھائی دینے والی گرو کی یہ مہم بے حد پیچیدہ اور پُر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب کو لوگوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن

لو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روز کے لیے بسا کیوں کے سہارے چلانا لازمی قرار دے دیتا، تاکہ یہ کمزور حافظے والی مخلوق جب کبھی اکثر اس زمین پر چلنے کی کوشش کرتی تو اسے اُس کی حیثیت یاد دلائی جاسکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر کرنیں چھم سے گرتیں تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگدائی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں بندھی جاتی تھیں۔ ہسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدد میری کا مجسمہ تراشا ہوا تھا، پاس ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین کی اینٹوں والی روش سے برف ہٹا رہی تھی۔ تب ہی مجھے ایسی ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ مارے راستے ایسی سے کسی بات پر الجھتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایسی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر تعارفی کلمات کہے۔ ”پیٹر..... یہ ہے عبداللہ..... تمہارا بڑا بھائی۔“ پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔“ میں مسکرایا۔ ”تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو۔“ پیٹر عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ پیٹر ہنس دیا۔ ”میں نے سنا تھا کہ مشرق بڑا بخشنے والا ہے، آج دیکھ بھی لیا۔“ میں نے بات جوڑی ”ہاں..... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے سے ہی پوری ہو جاتی ہو تو مجھ جیسے بخیل بھی بخشنے ہو جاتے ہیں۔“ اس بار پیٹر اپنے قبضے کو روک نہیں پایا۔ ایسی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جانے کے ہونٹوں پر یہ جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ ”دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی ہے۔ اس کا علاج کیا جائے۔“ میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کی یہ اموں کھراستار ہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اُس نے ایسی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیوں کہ اُسے کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایسی کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گرو سے متعلق تھی۔ ایسی کو رخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گرو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ ”میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب میں مدعو کر سکتے ہو؟“ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میرا مقدر یہی یادوں کی امریتل تھی، کیوں کہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے جا چھپی تھی۔ دوسرے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی دوسروں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی۔ کہتا ہے کہ محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے تاریک گتوں ہی پائیز بدنامیاں، زسوائیاں، نا کامیاں، درد، تڑپ، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر ہے اور لندن کی کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو رونے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا کٹھن کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات چھلینا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایسی میری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی تو اُس کے چہرے پر معمول کی روٹھاپن سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا دھیمپن بھی اُن کی پوری شخصیت کو بچھا کر رکھتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایسی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا بتا پائی کہ اُس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیوں کہ وہ گزشتہ رات سے چوری چھپے کسی ”مقدس عبادت“ کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظر کے سامنے ایک لمحے ہی میں گرو کا عبادت خانہ اور پورا وہی رسم کا منظر کوئٹے کی طرح لپک کر رہ گیا۔ میں نے ایسی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میری کوئی بہن نہیں ہے ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا آپ وہ جگہ پر میری ماما کا ہاتھ بنانے کی رحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب ماما..... مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتا جلد ہی تھک جاتی ہیں۔“ میرا وار کا رگڑ رہا اور ایسی کا چہرہ پھر سے جگمگا گیا۔ ”بے فکر رہو میں اس صفت خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک وہ انعام کا اکیلا حلق دار تھا۔ آج سے عبداللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔“ ایسی جتنی اداس آئی تھی اُسی خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اُس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرسٹ کسی بھی طرح میری پیٹری سے ایک ملاقات ضرور کروائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی جتنے بھی واقعات رونا ہو چکے تھے، اُن سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایسی سے ملاقات بعد مجھے گرو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گرو ممالکی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدہ جذبات محسوس کر چکا تھا لہذا اب اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں ہی مجھ سے مل کرے۔ لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرے نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہمدردی بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لا چارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف

صیہونی

ہاں یا نہیں..... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی لے گی؟ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ گرد کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرد خود اپنے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہو گئی تھی۔ گاڑی رکتے ہی ایک خادم کی معیت میں ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی پہلے سے کچھ کھج بھرے ہوئے تھے۔ پتا چلا آج گرد کا لیکچر ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا روحانی علاج بھی کرنے گا۔ مجھے تیسری رو میں ہوئے پیٹر کی ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرد اپنے مخصوص جتنے میں اسٹیج پر نمودار ہوا تو میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اُس نے یونہی آنکھیں موندے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکانیکی انداز میں بند ہو گئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند ہوں کے پردے کے پیچھے گرد کی شبیہ مسکرائی ”خوش آمدید“۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرد طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار اقبال ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار سے لیس تھا اور میں بالکل جی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد اُن لوگوں کی تھی رو کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اُس کے اس ہفتہ وار روحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرد کے چاق نڈشاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں دم گم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرد کے گرد نور کا ایک ہالہ ناکے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرد کو لوگوں کو مسخر کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں مل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی شدہ شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے باسیوں سے خالی نہیں، جنہیں روح کی پیاس ایسی دل پر کھینچ لاتی ہے، جہاں روحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید ان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اُس کی روحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے لاشیں گرد جیسے لوگوں کی کامیابی اور تعظیم سونی صدیقینی ہوتی ہے، کیوں کہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ سب کچھ پالنے کے باوجود بھی کسی روحانی مسیحا کی تلاش میں در بدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرد نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ”قسم ہے مجھے اُس خدائے عظیم و کی جس نے ہمارے اکابر پر کبھی من و سلویٰ برساتی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تر جس نے ہمارے لیے بارہ جیسے تعویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر پھاڑ کر راستہ بنایا۔ اُسی رب اُمید دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا

شاید گرد مجھ سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا۔ لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا تھا۔ لہذا اگلے لمحے وہ غور پر قابو پا چکا تھا۔ ”ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آج نہیں، تو کل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی۔ لیکن تم ہسپتال سے چھٹی کیسے لو گے..... اور پھر تمہارے والدین..... وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تنہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔“ ”والدین کی تم پر روانہ کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔ البتہ ہسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے روحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دُور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔“ گرد مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔“

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر پاپا اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح نما سے مجھے گرد کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں گرد کی گاڑی میں ہسپتال سے باہر نکلا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ماں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اُس طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سنٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بنجارے لوہے کے بڑے ڈمر میں آگ سلگا کر اس کے گرد دکھڑے ہاتھ اور جسم تپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگرائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چروں، خوشبوؤں، کلوز اور ملبوسات کے جھوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپر اٹھیں زور و گلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدھوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھوجنا تھا۔ اس رنگ و خوشبو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اسی دنیا میں کال گڑھ اور تحصیل ماہی جیسے اندھیرے قطعے بھی موجود ہیں جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر بھج جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اُجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دلا

لیکن اگر ان کے دل میں کوئی چور ہو تو میری یہ دعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ لہذا تم بھی عہد کہ ہمیشہ اپنی رُوح کو پاک رکھو گے۔“ گرد کی آواز برقی ٹانگ کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں ت کی لہر کو ان سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گردو سے سامنا ہوا تھا میں نے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اُس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور پایا تھا، جسے دیکھ یا سن کر عام انسان خود کو صرف حذر زدہ ہی محسوس کر پاتا۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت رہتی تھی، جو مجھے گردو سے دُور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اُس کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد بھی مجھے بار بار خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اُس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اُس نے مجھے کچھ نہ کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی شہادت کی انگلی سمیت دو انگلیاں میرے ماتھے میں جیسے اندر پوسٹ ہو چکی تھیں۔ گرد کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اور ایک پل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ آب حیات نے میری نُس نُس میں ٹھنڈا، تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہریں دوڑا دی تھی۔ میں نے اس مدہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور زور سے زمین پر جمانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کسی خمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے ہاتھیاں چھوٹ گئیں۔ گردنے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھام لیا گیا اور اس کے بعد نشست پر بچائے جانے کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں مدہوش رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سُن کرنے والے بہت سے نیچے بیک وقت پوسٹ کر دیے گئے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد میں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ ممانے جب چوٹی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی آواز دی، تب میں باہر نکلا۔ اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں گلدستہ لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ممانے دونوں کو کافی کے گگ تھما کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر اُن کے جاتے ہی جلدی سے بولا ”بڑے بھائی، تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی لڑکے کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے کرا کر پیٹر کو دیکھا ”ٹیلی بیٹھی اور پناؤم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔“ پیٹر کو کچھ لگا لگا۔ ”گویا تم بھی.....؟ ایسی بھی ایسی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرد کی روحانی طاقتوں پر کتنی کیوں نہیں آتا۔“ میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا۔ ”یقین ایک ایسا سوا ہے، جسے دلیل کی تلواریں نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں..... تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہو اور مجھے میری بے یقینی

کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم اُس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیگر بے چین لوگوں تک پہنچائیں جنہیں تلاش ہے مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پاتے۔“ گرد کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگوں اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اُس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک ملگجا اندھیرا اور مکمل سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر اُن بڑے بڑے دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان پر جھلک رہا تھا۔ وہ چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ”نور بہاؤ“ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑا لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشیمنیں بھی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرد کی بات رہے تھے۔ درس کے بعد روحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت ترتیب وار نام پکار کر مریم کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بد حال اور بد حال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔ ان میں سے کئی ڈھیل چیز اور بعض دوسروں کے سہارے گرد کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ گرد اُن نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے دانے ہاتھ کی دو انگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ ہاتھ میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک ماردیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سندھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے آس پاس دو خادم پہلے ہاتھ کھڑے تھے، اور پھر چند لمحوں پر بعد جب اُسے ہوش آتا تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس اپنی نشست پر آ بیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان سا اُٹھتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرد سے میٹائی کا درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرد نے ہاتھ اٹھایا اور پورا ہال ایک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی رُوح موجود ہی نہیں تھا۔ گرد کا اشارہ میری طرف تھا ”عبداللہ..... میرے دوست..... تم بھی یہاں نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں۔“ سب ہی کی نظریں مجھ پر گز گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی ریگینے لگیں۔ میرے پاس انکا کا کوئی موٹہ نہیں تھا۔ گرد کا یہ جملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سُن ہو کر گیا۔ ہوش جب آیا جب میں اپنی بیساکھیاں نکیتے ہوئے گرد کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرد نے غور سے میری جانب دیکھا ”اپنے دل سے ہر شک و شبہ کو نکال دو میرے دوست۔ یاد رہے کہ دائمی علاج صرف میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف رُوح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف اُن پر ہوتا ہے جو آئندہ کے لیے اپنی رُوح کو کسی گناہ سے پرانگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے

کی اور آخر کار اپنے شوہر سے طلاق لے کر اُن جانے سفر پر ایسی روانہ ہوئی کہ پھر ایک روز اُس کی موت کی ہی واپس آئی۔ ایسی کا باپ اس صدمے سے کبھی سنبھل نہ پایا اور دو سال کے اندر اندر وہ بھی اپنی شریکِ حیات کے پیچھے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایسی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نرسنگ کا شعبہ اختیار کرنا پڑا لیکن سب ختم ہونے کے باوجود اُس کے دل سے صیہونیت اور اُس صیہونی جم کے خلاف نفرت کبھی ختم نہ ہو پائی۔ وہ ری لمحے تک اسی کھوج میں رہی کہ آخر اُس نیچر کی تعلیمات میں ایسا کیا محرک تھا کہ اُس کی ماں کی مامتا اور وفا اُسے نہ روک پائی۔ ایسی کی یہی کھوج اُسے اس حادثے والی جگہ پر لے گئی، جہاں اُس کی ماں ایک کاربنڈٹ میں ماری گئی تھی، تب ہی ایسی کے ہاتھ بیت المقدس کی عمارت کے وہ نقشے لگ گئے، جو ایسی کی ماں اپنے پرانے کپڑوں کے صندوق میں چھپا کر رکھے تھے۔ اُس وقت ایسی پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کی ماں یہودیوں کے کسی ایسے گروہ کی آلہ کار بن چکی تھی، جو مقدس دیکن سلیمانی کی تلاش میں بیت المقدس کے گروہ رانی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایسی نے پیٹر سے چھپا کر وہ نقشے تو گھر آتے ہی جلادے، لیکن اپنے دل میں جلتی لک کا لاد کبھی سمجھا نہیں پائی۔ وہ آج تک صیہونیت ہی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی، اسی لیے پیٹر کو اپنی نظروں سے ہٹا کر پھر سے اُسی جال کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسی اپنی بات ختم کر کے باوجود ضبط کے رو پڑی کہ نہیں جانتے عبداللہ۔ کمسنی میں ماں باپ کی جدائی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے بھی تقدیر سمجھ کر صبر کر لیتی تھی۔ وہ کون سی بہن ہوگی، جو اپنے سگے بھائی کو یوں پل پل مرتے دیکھ سکے۔ پیٹر کا جسم پچھلے تین ماہ میں مکمل سا لپا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سرخ خلیے ختم ہو رہے ہیں اور جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس لیے ہر چند دن اُسے تازہ خون کی بوتلیں لگائی جاتی ہیں۔ یہی سبھی کسر اُس گروہ نے پوری کر دی ہے۔ پیٹر آج بھی یہی فتنہ ہے کہ وہ گروہ کے روحانی علاج کی طاقت سے ٹھیک ہو جائے گا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سے کسی شکر کرانے کے باوجود اُس کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ ایسی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور اُسے تسلی کے دلفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول پارہا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ میں بیت المقدس کے باہر کھڑا ہوں، جہاں یہودیوں نے ایک لمبی سی خندق کھود رکھی ہے اور وہ زمانہ قدیم مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ لوگ قبلہ اول میں داخل ہو کر عبادت کرنا چاہتے ہیں لیکن وہی نجوم انہیں درخت کی لمبی لمبی شاخوں سے مار کر دھکیل رہا ہے۔ ایسے میں میری نظر سلطان بابا پر پڑی، جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور نہ جانے میں کس طرح خندق کے آخری کونے تک پہنچ جاتا۔ مجھے آگے بڑھنا دیکھ کر نجوم بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے اور مسلمان عبادت کے لیے بیت المقدس کے تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کوئی آنکھ مسلسل میری لائی کر رہی ہو۔ کھڑکی سے باہر دریاے ٹیمر کا جما ہوا بخ پانی آسمان سے گرتی برف کی ہلکی پھوار کے ساتھ اگلے سولے سو گوشاں کر رہا تھا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے ایسی کی لائی کتابوں کے صفحے پلٹنے شروع کر دیے۔

کے ساتھ جینے دو..... جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں کا نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔“ پیٹر میری بات سن کر ہنس پڑا۔“مجھے تمہاری یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے عبداللہ۔ تم ایسی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جلد ہی گرو کو اپنا استاد مان لو گے۔ وہ زبردست انسان ہے۔“ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عظیم تسلیم کر لوں گا، لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر زندگی میں تمہیں کسی لمحے بھی ایسا محسوس ہوا کہ تم نے ہر راہ چنی ہے، وہ منزل کی طرف نہیں جاتی، تو تم ایسی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنی تعلیم مکمل کرو گے اور ایسی کے خواب پورے کر دو گے۔“ پیٹر نے خوش دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔“چلو وعدہ رہا..... پکا وعدہ۔“ ٹھیک کر لے لی ایسی دواؤں کی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور پیٹر کو دیکھ کر بولی“چلو بچے، ڈاکٹر البرٹ کے راولڈ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہاں لے تو آئی ہوں، لیکن اسپتال کے نظم کا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے۔“ پیٹر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ ایسی نے بھیگی پلکوں کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔“آج سالوں بعد پیٹر نے خود کسی سے ملنے کی فرمائش کی۔ جانے کیوں۔ پر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ میرا پیٹر بہت جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔“ میرا دل اندر سے لرز سا گیا اور بس ایک ہی صدا نکلی کہ یا اللہ! معصوم بہن کے یقین کی لاج رکھنا۔ میں نے گزشتہ روز ایسی سے یہودیوں کے بارے میں کبھی گئی چند کتابیں لانے کو کہا تھا۔ ایسی نے دو کتابیں میرے حوالے کیں۔“تمہاری فہرست میں موجود کچھ کتابیں لندن کے کسی بھی بک اسٹور سے نہیں مل پائیں، لیکن میں نے ہالینڈ میں اپنی ایک دوست کو ای میل کی ہے وہ جلد وہاں سے کتابیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جانتی ہوں، تم ان کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو۔ چاہو تو تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ میں یہودیوں کے بارے میں بھی زیادہ جانتی ہوں۔“ میں نے چونک کر ایسی کو دیکھا۔“وہ کیسے.....؟“ ایسی نے گہرا سانس لیا۔“کیوں کہ میری سگی ماں ایک یہود تھی۔“ میرے ہاتھ سے کتابیں گرتے گرتے بچیں۔“ہاں، بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میری ماں تو یہود سے تھی۔ یہ باپ سادہ لوح عیسائی تھا۔ لیکن میری ماں کی زندگی برباد کرنے والا بھی ایک صیہونی ہی تھا۔ تم اُس کا صیہونیت کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا۔ تو سنو، یہ سچ ہے کہ ہر صیہونی یہودی ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر یہودی صیہونی نہیں ہوتا۔ بس، یوں سمجھو کہ تو یہودی کا وہ شدت پسند طبقہ، جو اپنے نظریے اور مقصد کے حصول کے لیے ہر ناجائز کو جائز سمجھتا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کا امن برباد کرنے پر تیار ہوتا ہے، اُسے صیہونی کہا جاتا ہے۔“ ایسی بولتی رہی اور میں دم سادھے بیٹھا سنتا رہا۔ ایسی نے مجھے بتایا کہ اُن کی زندگی بہت پرسکون تھی۔ جب وہ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی پیٹر کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتے تھے۔ ایسی تب اپنے اسکول کی نویں جماعت کی وہن طالبہ تھی۔ اُس کا باپ مضافات میں موجود ایک فیکٹری میں فائزین کا کام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تاوقتیکہ اُن کے قصبے میں جم نامی وہ یہودی اسکول نہ بچھڑا، جس کی طرف تعلیمات.....

آخری مسیحا

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرد کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات سر ہلا دیا۔ ”ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا۔“ گرد نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ رب سا لگ رہا تھا۔ ”تم..... آخر کون ہو تم؟“ میں پلٹا۔ ”یقین جانو میں خود اسی سوال کی کھوج میں یہاں پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا۔ تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو میرے نزدیک وہ سراب ہے۔ تمہارا ہی مسیحا کوئی اور..... اور میرا نجات دہندہ کوئی اور ہے۔“ گرد نے اطمینان سے میری بات سنی۔ پھر تاسف بولا، ”تو آخر تم بھی اُس مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے۔ جانے کیوں میں تمہیں دال سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔“ اچانک گرد کی نظر مابستر کے ساتھ جڑی چھوٹی سی میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایسی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرد کے ہونٹوں بطنی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”جانتے ہو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی فطرت سے جانا ہے، جب کہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جس دن مجھے جانے کے لیے خدا کی رسی ہلاؤ گے۔ سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔“ گرد اپنی بات ختم کر پلٹا اور پھر رُک گیا۔ ”اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ پر آئے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اُس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔“ گرد پلٹ کر چلا لیکن میرے لیے اُن گنت سوالوں کا بھنڈارا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ، لیکن مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا۔ کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی لیا آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا.....؟ میں شام تک سر پختا رہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن اندر بیٹھ نہ سکا۔ گرد ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں تو پھر اس نے اپنے خدا کی فطرت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جب کہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام نے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں مہمیا سے ضد کر کے تنہا اپنی بیساکھیاں ٹھیکتا باہر برف سے میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکے ہار جمبول رہے۔ شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے

دے اور صبح کا اُجالا پھیلنے تک مجھے قوم یہود کے بارے میں جو کچھ پتا چلا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کبھی یہ قوم واقف خدا کی محبوب ترین قوموں میں سے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہر اعزاز سے محروم ہوتی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس قوم کی ناشکری اور بدعہدیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور ذکر یا علیہ السلام، یوحنا (جون) اور میکھا پاہ کا خون ناحق اسی قوم کے سر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانیاں اور ناشکرے پن سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کر دینے کی سازش تک ہر موقع پر خود اس قوم نے خدا کے غضب کو دعوت دی اور آخر کار ان سے نبوت اور وطن چھین کر قدرت نے ان کی سزا پر مہر لگا دی۔ یہ قوم در بدر ہوئی، زمانے بھر کی لعنت اور پھٹکا راس کا مقدر بنی، لیکن اس نے پھر بھی اپنے اعمال نہ بدلے اور سو خوری کی شکل میں خدا سے جنگ جاری رکھی، جو آج تک جاری ہے۔ رفتہ رفتہ سود کے ذریعے انہوں نے دہ کی معاشیات کو اپنے قبضے میں لے کر مختلف سلطنتوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا جب دنیا کی عظیم طاقتیں (شہر پاورز) ان کے پنجہ سود تلے دبی ان کی انگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہی یہودیوں میں سے ایک انتہا پسند طبقہ ابھر تا گیا، جو بعد میں صیہونی کہلائے اور جن کے اندر نبوت چھنے اور وطن ہونے کا غصہ انتقام میں بدلتا گیا اور انہوں نے قبلہ ازل کو ڈھانے کی ناپاک سازشیں شروع کر دیں اور نبوت کی جگہ دجال کو اپنا آخری مسیحا مان کر اُس کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں، جو بقول اُن کے، اُن کی آخری فتح کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں سے ان کی بنیادی نفرت کی ایک وجہ ہمیشہ یہی رہی کہ مسلم عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصلی مسیحا ثابت ہوں گے، جو دجال کو قتل کر کے اس دنیا میں امن قائم کریں گے۔ مذہبی عقیدے سے قطع نظر یہ قوم بے حد منظم، متحد اور ذہین تھی اور ہے۔ اصل یہود اسلام کی سچائی اور عظمت واقف ہونے کے باوجود فطرت سازشی ہونے کی وجہ سے اسے کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پائے، اور کہیں نہ کہیں اب بھی اسلام ہی کو اپنی بربادی کی اصل وجہ گردانتے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے کسی موقع سے فائدہ چوکے۔ جب کہ انہی یہودیوں میں آج بھی ایک ایسا معتدل طبقہ موجود ہے، جو صیہونیت کو یہودیت کے لیے ایک گالی سے کم نہیں سمجھتا، لیکن ایسے یہودی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کہیں کم ہے۔

میں نے کتاب کا آخری صفحہ پلٹا تو نسبتاً صاف آسمان سے سورج اپنی پہلی جھلک دکھلا چکا تھا۔ میرا بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے گرم پانی کا شاور لینے کے ارادے سے اٹھنا چاہا، تب ہی میرے کمرے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دروازے کے پتوں سچ مجھے گرد کا تہمتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گرد ہی نے سانپ جیسی پھٹکار ڈال دیا اور اس خاموشی کو توڑا۔

”کیا تم کبھی بیت المقدس گئے ہو.....؟“

نچرے ہوئے چٹوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوٹی بیٹھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی ساہل کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دُور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک سرسراہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بخود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھایا سنا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ مؤذن کی آواز میں عجیب سا ہوا تھا، جو میں اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ”اشھد ان محمد رسول اللہ۔ اشھد ان محمد رسول اللہ۔“ اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھماکا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ ٹپے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں یہی تو تھا وہ کھلا راز، حیرت ہے اتنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی ﷺ کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی الزماں ﷺ کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہودی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ بن گئی تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھین گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہودی کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی ﷺ کا آئین ہوں جس کے لیے اس ساری دنیا کا کھینچا کھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ کس قدر بد نصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں۔ ایک عالم ہماری عظمت و بزرگی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بیٹھریوں کی طرح ہماری بوٹیوں کو نوچنے کے لیے ہمارے درپے درپے ہے اور ہم خود کو کھاتی ہیں۔ کرائیں پیش کر رہے ہیں۔ گرد ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرا اور اُس کا بھلا کیا مقابلہ۔ اُس نے ہم سے کچھ نہ نہائی۔ وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور میں جو مذہب کی محبت کا دعویٰ دار تھا، میں نے سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں..... کیا بس اتنا ہی تھا میرا دین.....؟ صرف ایک سال پہلے تک میں نے اسی لندن کے کلیمز اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد میں کیا تھا۔ دُور دُور بھٹکتا ہوا ایک بھکاری..... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے ضمیر کو پاک نہ کر سکے۔ کیا میں اُس نبی آخر الزماں ﷺ کے اُمتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا بت پانے کے لیے اُس کے نبی ﷺ کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس اُمتی روئے وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کلیے ہی کو شرط بنا لے۔ مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے، رف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسوؤں میں پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش ان کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے دھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایسی میری تلاش میں طرف آنکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیٹ کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس مغلط کرنے کے لیے تیار تھی۔ اور اصل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے رے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیٹر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ”مقدس ر“ پر جائے گا، جب کہ پیٹر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی۔ ایسی کوڈر تھا کہ وہ بارگرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اسی راج ایک روز اُس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلتی تھی اور کبھی نہیں لوٹی۔ ایسی کو سونی صدیقین تھا کہ گرو بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نوجوانوں کو کسی اسرائیلی فزری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایسی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں بھٹی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلاف توقع گرو نے دودن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری میں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد حال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے لیکن اُسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سیٹھ رکھنا اسے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ”کیا تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کمرے میں مغرب سے آگے کا اداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ماما شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسبِ معمول گرو کی آنکھوں میں وہی جیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں نے ہلکا تر بہ گرو سے درخواست کی ”کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیٹر بہت بیمار ہے، اُسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ۔“ گرو زور سے ہنسا ”تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ جتنی نہیں۔ جنہیں قدرت کے عزیز نے کاغذ پر ہووہ گز ارشاد نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔“ میں گرو کا یہ طنز بھی جھیل گیا۔ ”شاید میں کبھی خود

یہی ہنسا، اچھا..... تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کرلو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں ہر ادیا۔ میں نے غور سے گرو کو دیکھا۔ ”علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع نہ رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارتا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ اسی اس آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر۔“ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تو آخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے سے روت قبول ہے۔ لیکن شرط اب بھی وہی ہے۔ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا پڑے گی۔“ میں نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے.....“ ایسی گنگ سی کھڑی میری اور گرو کی یہ بات سن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلتے ہی چلا پڑی۔ ”یہ تم نے کیا کیا لڑے! وہ بہت طاقت ور ہے اور تم اہل۔ یہ کیسا سودا کر لیا تم نے؟“ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ”کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے پا رہے ہیں۔ دلوں کی سودوں کی طرح، سدا گھائے والے۔“ ایسی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے یہ بات کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیٹر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے۔ لیکن وہ ابھی تک پہنچ نہیں۔ ”آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی ’مناظرہ‘ کرنے کا ارادہ ہے؟“ میرا سرا بھی تک جھکا ہوا تھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے اپنی پوری گی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا۔ لیکن میں لڑے بنا ہا نہیں مان سکتا، کیوں کہ اب معاملہ صرف میری بات کا نہیں، بلکہ میرا ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے لیا ہے، وہ ساری جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری داؤ کھیلنا ہی ہوگا۔“ لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جواب بھی لہ نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایسی نے بتایا کہ پیٹر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اُسے اسی اسپتال کے انتقال خون والے بے کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ گرو کے روحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایسی کی رپورٹ، مطابق پیٹر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ تھوٹیش کی بات یہ تھی کہ پیٹر اب بھی بے ہوش تھا۔ وہ جیسے ہی چلے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہر اسی اختیار کر لے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحے بھی نہ ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور ہم ان کے رکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے ہارواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آجیجی جس سے پرے کا سورج میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان کر آتا۔ ماما اور پاپا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہ راست سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور ماما میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبا لگیں۔ میں نے اُن کا اپنے کاندھے پر کھرا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا

کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں۔ تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جان نثار مل جائیں گے۔ اگر معصوم لڑکے کو بخشش دو۔ وہ اپنی کمزور بہن کا آخری سہارا ہے۔“ گرو کو جیسے میری بے بسی دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیٹر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے.....؟“ میرے اندر بیک وقت جیسے بہت سی بدشعور ہواؤں کے جھجک چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب ہلے ”ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ پیٹر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اُس وقت اُس کے عقب سے ایسی کی تیز آواز ابھری ”نہیں، عبداللہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیٹر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں تو سہی۔“ گرو ایسی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بد مزہ دکھائی دے رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی! وہ غصے سے مزا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔ ”رکو..... اگر بات اختیار کر ہی ہے تو واقعی تمہیں اس وقت پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اس اختیار کا گھنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے۔ تو پھر ایک بیمار اور کمزور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل.....؟ اگر تمہیں پیٹر کو ساتھ لے جانا ہی ہے اُسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے کیوں نہیں آزماتے۔ یا تمہاری ٹیلی پتھی صرف لمحات اور کچھ دیر کے لیے مندل کرنے کا ہنر ہی جانتی ہے۔ پیٹر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ اگر اُسے تندرست کر دو تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا.....؟“ میری بات سن کر وہ سودا گر پلٹا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ”تو گویا تم مجھے لکار رہے ہو۔ تم شاید یہ بھول رہے کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کر دو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔“ گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک اپنی ہارڈ ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اڑا رہا تھا، اُسے اکسار ہاتھ کا یا تو وہ گھٹنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی تھکن سے چور لکھ لکھ اٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اصول بھول گیا تھا کہ ہارے ہوئے کو اتنا ہارانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیوں کہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی جنگ چھپا ہوتی ہے۔ پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے نئے شکاف ہی کیوں نہ ملیں، سپاہی وہ جنگ لڑنا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے تو یونہی سہی۔ میں تیار ہوں۔“

ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ ہمیں سب بھول بھال کر کسی چھوٹے بچے کی طرح صرف ”بیٹھا“ مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔ اپنے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو، صرف ”بیٹھے“ کے لالچوں کو سب کی ت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔

میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالانکہ دینے والے نے اپنے سب ہی کے منہ کھول رکھے تھے۔ صبح لندن کا موسم بہت اداس تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے پرانی رضائی پر نیا لالاف ادا کیا ہو۔ سہ پہر تک ایسی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیڑ کی حالت ابھی تک اُن نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گردنے جنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گردی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو ماما اور بابا پہلے سے لی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے، میں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گردے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز، اور ٹی وی چینلوں کے مایک دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا۔ میں جانتا تھا کہ گرداں اس موقع کی تشہیر سے نہیں چو کے گا۔ ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنا عقیدہ اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے اُس کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ کچھ کچھ بھرے ہوئے کی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر بھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زاویے اور فلش کی چکا چوند سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے راست بھی نشر ہو گا۔ گرد پہلے سے اسٹیج پر مایک سنبالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے آواز بلند کر دیا۔ ”خواتین و حضرات..... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا وہ اب ہمارے ہاں ہے۔“ سارے ہال پر ہل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکا کی انداز میں میری طرف مٹی۔ مجھے اپنی ریڑ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند چھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے کئی کئی۔ مناظرہ شرع ہو چکا تھا۔

رہا ہوں، جس کی ہار یا جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی کہ اب تک درست راستے پر تھا یا غلط..... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہو گا۔ مگر افسوس مجھے جنگ لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی پر لڑنا ہو گی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے۔ اور بس۔“ پس منظر میں کھڑی ماما میری بات سن کر پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں اس پل میرے مضبوط پایا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگایا۔ جب کہ بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہو تو روفوگری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لے گا۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں، ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار دھل جاتا ہے۔ پتا بھی مجھ سے اپنی بیگنی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائے ”مجھے اپنے ساحر اور اس کے یقین پر نذر سے زیادہ بھروسہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار..... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔“ پتا مجھے تھکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ کا بنیادی عنصر ”حوصلہ“ ہوتا ہے اور یہ ہمت و حوصلہ ہمیں ہمارے ”اپنے“ دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل برسنے کو بے تاب تھا۔ آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ اپنوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھ ہی لیا تھا مگر وہ اہم والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھالی اور پلکیں زمین پر بچھا کر سجے میں جس قدر گر گڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گر گڑا لیا۔ ”یا خدا..... تو جانتا ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سما، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے نبی ﷺ کا واسطہ، میری راج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اے بھروسے میرے مالک.....“ میں جس قدر گر گڑا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی اتنی ہی تیزی سے بہتی۔ اُس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے مجھے آج تک دعا مانگنے ہی سب کچھ جو ملتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو دیے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بس ”غوں غاں“ ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل

مناظرہ

دفعاً مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی جس پر ذریعہ ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی آج کا تمام منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تمام کر رہے تھے۔ مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے ماما اور پاپا کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہیں لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ گرد نے ”عبداللہ“ کے نام سے میرا تعارف کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے فلیش کی چکا چوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے جھوم کا بس ایک دھڑا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرد نے بات کا آغاز کیا۔ ”آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ کے لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی ہمت کا اعتراف کریں۔“ سارے ہال نے تالیاں بجا کر گرد کی بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نوجوان اور جو شیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرد کی فتح تسلیم کر چکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش اور بے چین سادکھائی دیتا تھا۔ گرد کی تقریر جاری تھی۔ ”ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے داروہو۔ ہیں اور وقت زحمت یہی ہمارا زادراہ ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی لیکچرز میں وقت کا پیہر رک جانے کی حقیقت بیان کر چکا ہوں۔ اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صدمہ اور سالوں کا وقفہ ہے۔ وہی وقت قدرت کے پیسے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔“ گرد نے چھت فانوس کی صورت لگے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف کھینچی دو نیلی لکیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو لکیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس خدائے بزرگ و برتر کی عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اوپر والی نیلی لکیر آسمان پر خدا کی خدائی کو بیان کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہوگا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔“ اس مثلث کے نیچے والی لکیر اس روئے ارض پر موجود مسندروں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔“ بے خیا

امیری نظر بھی گرد کی انٹھی انگلی کے تعاقب میں اٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو مذہب پر بنی ہوئی شبیہ تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس شبیہ کی توجیہ سمجھ میں آئی۔ وہی بات ختم ہو رہی تھی۔ ”میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم سب اس سفر کے لیے روانہ ہوں، تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔“ تالیوں کی شدید گونج میں گرد اپنی بات ختم کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کرنا ہوگا اور کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ پ جے رہنے پر کھانس کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلایا۔ ”آگے بڑھ کر اصفائی پیش کرو لو کہ..... ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔“ تب میرا ہاتھ ٹھکا اور میں کچھ یہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے نا سناٹا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ ایسی محفل کے تقاضے کیا تھے ہیں۔ میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو ”آداب مناظرہ“ سے بھلا میری کیا واقفیت لی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک رح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں، درود کی ٹھوکریں کھاتا ہوں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثاثہ نجی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر اور اپنے خدا اور اس کے خزانے نبی ﷺ پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پیہر تھے گا اور ضرور ختمے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اُسے صلیب پر سے نڈھ اٹھالینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور مسندروں کا مالک بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا (سچ) ہے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی شخص کا جھولنا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز اُبھری۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ”جیتے ہو سارے، تم مجھ پر فخر ہے۔“ اور پھر پاپا کی تالیوں کی آواز میں ماما کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے۔ کیا ہوا جو پورے ل میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے۔ کیمروں کا سماں مایا کی طرف ہو گیا۔ ہال میں گئی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بچنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں نگر کر گواہیاں ہونے لگیں۔

گرد نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ”اب میں عبداللہ کو ہمارا دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا

ہن کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے اب کہاں ہوں گے۔ میں اسی سوچ میں گرد کی آواز نے مجھے پھر سے اسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفا یاب کرنے کے بعد اب تہ دے رہا تھا۔ تب، عین اسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ بے لیے کچھ ڈھوک لایا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہو گئی، جتنی کبھی برف کے پہلے ہلکوں پر ٹہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایسی ہی تھی جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے زہر پیٹھے پتھر کو اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ل کے سانے میں وہیل چیئر کے پیروں کی آواز گونجی تو سب ہی کی کیمروں کا رخ پیڑ اور ایکی کی دگیا۔ گرد نے بھی چونک کر ایکی کی جانب دیکھا اور جلدی سے عملے کو اُس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں، چیئر سمیت اسٹنچ پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پلسیوں کی دیوار توڑ نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرد کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے لے۔ ”میں گرد کو علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں۔ اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے گرد علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیوں کہ اگر یہ ٹیلی پیتھی یا پیناٹوم کی بھی کوئی شاخ ہے تو بہر حال اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرد سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو کبھی ہرگز نہ دے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیڑ خود گرد کا بہت بڑا پرستار اور ہے اور گرد کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے امید ہے گرد میری یہ بات رد نہیں کرے گا۔“ گرد کے چہرے پر پیڑ کے ہال میں آنے پر جو کشت تاثر ابھرا تھا، اب وہ ایک ث میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے بڑے بچوں کی کسی ”شرارت“ پر تنبیہ کرنے لے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ”میں عبد اللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ات، انسان کو ان بیماریوں سے شفا یاب کرنے کا نام ہے، جو کسی روحانی پیچیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بھی انسان بظاہر کسی طبی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے حمل، دل کی بیماریاں، ذہنی تشدد، جگر کی پراگندگی، بصرات و سماعت کا متاثر ہونا یا پھر معدے کے امراض لیکن اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود روح کا گھائل ہونا یا روح کی نہ ہے۔ روحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہی اور روح کے مندرجہ ہوتے ہیں جسم کی خود بخود دور ہو جاتی ہے، لیکن روحانی علاج کے ذریعے ہم خاص خاص جسمانی بیماریوں کو فوری طور پر دیکھ سکتے مثلاً اگر کوئی حادثہ، جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے ناعصاب کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا ہاں، البتہ ایسی صورت میں روحانیت اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیڑ کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی

کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کر دوں؟“ ہال میں موجود سب ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ”میں پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں ثبوت یا کرشمے کے بنا، صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر میرا یقین سچا ہے تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے ذریعے میں لوگوں کو مسخور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرد نے روحانیت کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے اس کا عشر عشر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ لہذا میں پہلے گرد سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔“ گرد نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، ”تم نے تو لڑے بنا ہی آدمی بازی ہار دی۔“ ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ”تمناشے“ کی امیدیں گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددیہی چھانے لگی۔ ہال میں لگے کیمروں اسکرین پر ناظرین کے تاثرات جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے۔ پھر گرد کے عملے نے مریضوں کے نام اور ان کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹنچ پر آکر گرد کی کراثی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرد کی دو انگلیاں چھوتے ہی سارے دروازے کھنچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرد نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آج کے دن کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یہیں اسٹنچ پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں کی طبیعت سنبھالنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرد سے کہا کہ مجھے اُس کی سیجا گری پر پورا یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد ماما اور پپا کے چہرے کے تاثرات فوکس کر رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دینا کے سامنے شکست کھانا نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ ہر ماں کے لیے اُس کا بیٹا دنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اُس کا لخت جگر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ہال کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گالے لگتے لگتے نظر آرہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور میرے دوست کو بیٹھ کر پیٹھ پیٹھ سے پہاڑی علاقوں میں گزارے اپنے بچپن کے دمبر کے دوران، ان برقی شاموں میں گھنٹوں سر جھوڑے بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے لیے کتنے فرشتوں کی ”ڈیوٹی“ لگا رکھی ہوگی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے بور یوں میں بھر بھرا لائے ہوں گے، اور پھر کسی بہت بڑی چھنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دودھیادلوں ہی کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے وہ

اپنے اس عاجز گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا..... رحم
 میرا ایک ہاتھ پیڑ کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری
 میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور
 نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔
 رب تیزی سے اس وقت ہی یہ ورد دہرا رہے تھے..... قل یا ایہا الکفرون..... قل هو اللہ احد.....
 عوذ برب الفلق..... قل اعوذ برب الناس..... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر
 ہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیڑ کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان
 یں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے بل بل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند
 دن کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ ”پیڑ کا دل ڈوب رہا ہے۔“ ادوہ میرے
 ”..... ہال میں سراسیمگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی
 ت زور سے چلائی۔“ اس لڑکے کو روکو، یہ پیڑ کو مار دے گا۔“ میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیڑ کی
 میں اکھڑنے لگیں۔ ”روح کے سفید اور کالے قابضوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایسی کے رونے
 آوازیں میری سماعتیں شل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد ابھری۔“ مجھے تم پر بھروسہ ہے عبداللہ۔ میں نے
 اہم پر قربان کیا۔“ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید
 ب کے دوران پانی چھوٹے ٹکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے۔ پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا ”اوہ
 بے خدا۔“ بند کر دے سب کچھ..... مگر..... ٹھہرو.....“ میری گزارش جاری رہی۔ ”قل یا ایہا الکفرون
 “..... ارے یہ لڑکا تو ابھر رہا ہے.....“ ”قل هو اللہ احد.....“ ”پیڑ کو جھکے لگ رہے ہیں.....“
 ال اعوذ برب الفلق.....“ ”پیڑ کا بخار کم ہو رہا ہے۔“ ”قل اعوذ برب الناس.....“ ”پیڑ کا دل معمول پر
 آیا ہے۔ اُسے ہوش آرہا ہے.....“ میری التجا اور ہال کے ہجوم کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر
 نماز سے چلائی..... ”یسوع مسیح کی قسم، پیڑ کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔“ میں نے بے
 ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

بیاری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدا
 ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیڑ جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ سے طبعی علاج
 کہیں زیادہ اس کا دار و مدار میرے رُوحانی علاج پر ہی ہے۔ آج بھی میں رُوحانی عمل کے ذریعے پیڑ کی
 کو اس حد تک ضرور مندل کر دوں گا کہ وہ اس اہتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی
 بنا کسی رُوحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے تو مجھے اُمید ہے کہ پیڑ کی
 اس بیماری سے چھٹکارا پائی لے گا۔“ گرو نے زیر لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دو آنکھیں
 پیڑ کے ماتھے پر رکھ کر چھوٹتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیڑ کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔
 میں لگی برقی اسکرین پر پیڑ کا چہرہ اور لڑکتی، دھیرے دھیرے کھلتی پلکوں کا منظر واضح تھا۔ گرو اب اپنی آنکھیں
 بند کر کے مکمل ارتکا کر رہے ہوئے بنال بھائے پیڑ کی رُوحانی مسیاجری میں مشغول تھا۔ میں نے آواز
 جتنی مرتبہ پیڑ کو دیکھا تھا۔ جانے کیوں ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیر اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پتھی اور پٹانڈم
 جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیڑ سے پوچھا۔ ”اب تم کیسا محسوس کر رہے
 پیڑ.....؟“ ”پیڑ مسکرایا۔ وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔“ ”میں پہلے سے بہت بہتر ہوں.....“ ہال نے بڑے
 آواز سنستے ہی تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے کہ
 ہو ”تم مکمل ہار چکے ہو۔ لہذا اب ہتھیار ڈال دو۔“ میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چند
 میں پیڑ کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کر دی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات لفظوں کی صورت
 نمایاں ہونے لگیں۔ پیڑ کو ابھی تک بخار تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اُس کے فو
 دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیڑ کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی
 بھی بیان کر دی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ گرو کچھ حیرت اور
 سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آچکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے غلبہ
 کی دیواروں پر کھڑی ہو کر میں نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آنکھیں
 کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد ابھری۔ ”تیرا ہی آسرا ہے.....“
 مولا۔“ بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں جیسے کسی منافق اور چور سے در
 میری ریا کاری اور عیبوں کو صرف نظر کر دے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت جلوہ گر کر، اپنی رحمت
 صدقے، پیارے نبیؐ کی رحمت کے صدقے، میرے امتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم
 شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے ساری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حبیہ
 جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اُسی رحمت کی ایک جھلک دکھلا دے میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ جہاں پیڑ کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی حالت کی
 فیصل جگمگا رہی تھی۔ پیڑ وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر
 لڑکے کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے امی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے
 سنے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دُور سے میری ماں نے مجھے پکارا..... ”عبداللہ.....“ میں نے بیگنی پلکوں سے
 ناکی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ ممانے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود
 نماز و قنطار رو رہی تھیں۔ لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا ادراک نہ تھا۔ ممانے دُور سے مجھے اپنی

آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جہاں ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر کیوں نہ ہوں پھر رفتہ رفتہ ہال کے پچھلے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رد نہیں ہوئی تھی۔ میرے سارے گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اُس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پڑھنے کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور خود پیڑ بھی بیٹھی پلکیں لیے حیرت زدہ سا منگ کھڑا تھا۔ ایسی کبھی اُسے اپنے ساتھ لپٹائی اور کبھی میرا سر اور ماتھا چومتی۔ ماما سے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پاپا بھی اُن کی تقلید میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمرہ والے کے زادیے، فلیش کی کچا چونڈ، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، بیک وقت سینکڑوں سوال..... لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا..... سہرا سوال..... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اُس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی حد لا محدود ہونی چاہیے۔ اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا چاہیے۔ جتنا کسی مصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ اگر مجھ جیسے نالی کے کیڑے کے لیے اُس کی رحمت کی یہ وسعت تھی تو پھر نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابرکس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل اسے ماننے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر بمشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد شور مچا، میری آنسوؤں سے لرزتی آواز ابھری۔ ”شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اُسی اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی ہار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب بڑھنے کا اشارہ..... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ..... یہ کوئی معجزہ ہے نہ کوئی کرشمہ..... یہ بس اُس کی بے کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اُس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی تلاش میں روشنی کے جگنو..... اور یہ رحمت اور اُس کا کریم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اور میرا پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے..... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے۔“ میں اپنی بات ختم کر کے ماما، پاپا اور اُمی کو لیے اسٹیج سے اُتر تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سراپے کا نہ ہسے سے لگا رکھا تھا۔ پاپا لوگوں سے درخواست کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گرد آسنے آگئے۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور آواز دہلی ہوئی تھی۔ ”تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہو گا کہ تم کون ہو.....؟“ میں نے

اور حیرت سے اس گم راہ کو دیکھا، شاید دلوں کو آہنی پردوں سے ڈھک دیے جانے کی ایک مثال میرے سامنے کھڑی تھی۔ گردنے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز ہجانی تھی۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون.....؟“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا ”عبداللہ۔ اللہ کا ایک بندہ.....“ گرد اپنی جگہ جمادہ گیا اور ہم اسے اکرا ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک لی گئیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اُنچی عمارتوں پر لگی برقی اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال سے ہوتی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر برٹ سمیت بہت سا عملہ استقبال پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی ہیں اور میرا سارا بوجھ، اپنے جسم پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ایسی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ اُگ کسب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے لپٹی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ”آپ کے ملک سے آپ کے لیے ضروری اہل آیا ہے۔ اس پرارجنٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔“ پاپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔ جس اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ اُن کی حالت اتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک میں پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔“ میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ ”کل صبح کی فلائٹ ہے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا رد نہ کیجئے گا۔“ پاپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم انٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود تھرو واٹر پورٹ کے ٹرمینل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اُترتے ہی اُمی پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ گرد تھا۔

ایک اور عبداللہ

نے ابھی کچھ مزید اندھیر اس کی تقدیر کے لیے بچار کھا تھا۔ آمنہ نے پیڑ کا ہاتھ تھاما اور اُسے میرے
بکرا کر دیا۔ ”اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی۔ اس نے اپنے نام کا حق تمہارے لیے بچار کھا ہے۔
اس کا نیا نام تجویز کر دو۔ جو اس راہ حق پر تاجر اس کے ساتھ رہے۔“ مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح روشنی
ردی گئی ہو۔ نور کے جھماکے میرے چہرے سے چھلک کر اُس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی
ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرد الوداع کہنے
کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنچ میں لگے اسٹیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر
تھے۔ میں نے پیڑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اُس کے
سے جھلک رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی جیٹھی کے ذریعے سارے ایئر پورٹ
باتی اور ساعت سلب کر لیتا تاکہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں۔ لیکن آج گرو بے بس تھا کہ
لڑائیں رونما ہوں تو تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیڑ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی تھیلی سے
مذکب کی۔ ”آج میں پیڑ کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کاپیلاٹ کر رکھ دی۔ عبداللہ..... پیڑ آج سے
نہ ہے۔“ سارا ایئر پورٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا
پاجم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و بیہودگی
لیوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اُس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فنون کی سازشوں کا جال بچھا
میں نے رن وے سے ٹیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دُھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے
دعا کی کہ ”یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔“

ایئر ہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ناگوں پر پڑا کبیل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ جب ہی
انٹرنس انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم ہی گئیں۔ ”فلسطینی مسلمانوں کا قبلہ اول کے
لڑھوئی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروٹلم کی سڑکوں پر مظاہرہ.....“ میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر
ڈالی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری
کے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ”ہیکل سلیمانی“ کی تلاش تھی صیہونیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا
تھا کہ ان کا مقدس ترین نشان یعنی ”ہیکل سلیمانی“ اسی قبلہ ازل کے نیچے کہیں دفن ہے، لہذا اس تک پہنچنے کا
بیت المقدس کی بنیادوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو
نا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ”میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہو
گئی۔“ جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلی محسوس کی، اور پھر اس بے چینی
تک میں میرا پیچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پیہوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئر پورٹ
نکلنے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ سے

میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دُور کہیں پس منظر میں مجھے ایسی اور پیڑ کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے
کے لیے اسپتال کے سارے عملے سمیت ایک جہوم بے کراں اس وقت بیتھرو ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری
جانب بڑھا۔ ”تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا تم کچھ دن مزید لندن میں بتاؤ گے تاکہ اپنی
فتح کا لطف لے سکو..... لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمہیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت
ہے۔“ میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ”تم اپنے ہر گزرتے دن کو یونہی فتح اور شکست کے پیمانے
پر جانچتے رہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر یہ ہے
حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔“ میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک
دیے۔ ”میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے لڑکے۔ اور میں آج تمہیں یہی بتانے
کے لیے یہاں آیا ہوں کہ میری اور تمہاری ایک آخری جنگ ابھی باقی ہے۔ اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی
یروٹلم میں۔“ میں چونک کر پلٹا۔ ”یروٹلم میں.....؟“ ”ہاں، بیت المقدس میں۔ میرا گمان کہتا ہے کہ تم سے
میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔“ جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے اُس زخمی بھیڑنے کی ایک
جھلک دکھائی دی، جس کے بچوں سے میں اُس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کھجار میں معصوم سمیٹے کو
چیز چھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو۔ اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے سمیٹنے کی آواز سنائی دی۔ ”عبداللہ..... تم لپٹ
ہو رہے ہو میں۔“ پیڑ اور ایسی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دُور ماماچا، ڈاکٹر البرٹ اور
عملے سے رخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پاپا کو میرے لیے برتی جانے والی ہدایات
کی فہرست دہرانے میں مصروف تھے۔ ایسی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار
کھڑی تھیں۔ جانے یہ بہنیں اتنا بہت سانس لین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں ان کٹوروں میں۔ میں نے پیڑ کا کار
درست کیا۔ ”کیسے ہو کھنڈر سے لڑکے؟ اپنا بہت خیال رکھا اور ایسی کا بھی۔“ پیڑ کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی
محسوس ہوئی۔ ”وہ اب ایسی نہیں رہی، آمنہ بن چکی ہے۔“ مجھے یوں لگا، جیسے سارا ایئر پورٹ ہی پل بھر میں
رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ”کیا.....؟ آمنہ.....“ میں ایسی کی جانب پلٹا۔ اُس کی آنکھیں برس رہی
تھیں۔ ”ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پالی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو
دکھائی تھی۔ دعا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔“ میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی۔ لیکن شاید

وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاہد تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو جنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم روک ہی لینے چاہئیں۔ لیکن کیا میری زہرا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے دور چلا جاتا۔ آخر، اُس نے ساحر کو اتنا کمزور کیوں جانا۔ جب میں اپنی ہر سانس اُس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔ صرف ایک بار..... بس ایک بار وہ اپنے ابرو گر کر اشارہ تو کرتی، میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر میرے اندر کی اُلجھی ڈوریں مزید اُلجھتی گئیں۔ جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک پہنچا، تب تک رات اسپتال کے دروازے پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور برقی قہقہے جلا کر اور ان کی مکمل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے ”رات“ کو شکست دے دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ تو بھلا ازل کو کیسی شکست۔ میرے اندر کی رات بھی ازلی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگہ کی طرح لپکی۔ ”آپ کے مریض کو ہوش آرہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے“ میں تیزی سے اٹھا۔ میری بیساکھی چپکنے فرش پر پھلتی اور میں گرتے گرتے بچا۔

جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے تھے۔ میری بیساکھی پر اُن کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں قلم لیا۔ ”کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ عبد اللہ بہت تھک گیا ہے۔ اسے اور نہ رلائیں۔“ انہیں چپ کراتے کراتے خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو فضاہت کی وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اُن کی سرگوشی نما آواز ابھری۔ کیا ہے میاں.....؟ رلاتے بھی خود ہو اور الزام بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے۔ تمہیں ابھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ ابھی سے عبد اللہ تھک گیا تو پھر.....“ اُن کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جو اُن کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اُن کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو پکارا۔

نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر سلطان بابا کو پھر سے آسجین اور مختلف انجکشن اور ڈرپ کے کیولا ز سے لا دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹا دوں کمرے کے ایک کونے میں بے دم رہ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری رُوح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قیامت کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں رُوح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس فانی دُنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے

سیدھے اسپتال پہنچے تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کمرے میں ہیں۔ ماما پتا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال ملنے والا نہیں، لہذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہارا بن گئے۔ لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی۔ میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بیچ کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی، جہاں میں چپکھٹا ہوا تھا۔ سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار شیشے کی قد آدم کھڑکیوں کا سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھلتی پھلتی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے طویل برآمدے میں بھی اترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے سمیت سب کچھ ڈھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال چاہے بھر پور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اُٹا جاتا ہے۔ میں بھی اُس ڈھلتی شام میں اُداسی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نگوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے باہر کی جانب مل کھاتی اسپتال کی مرکزی سڑک پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ کون تھا وہ؟ اچانک ذہن دوسرا جھماکہ ہوا۔ ”ارے..... یہ تو انور تھا۔ زہرا کی مرشدین کا ڈرائیور۔“ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی۔ اور میں بیساکھی بھول بھال کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر ہلکا گئی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی۔ لیکن وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر ڈور تک بیساکھی تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن اُس پاس گزرتے چروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انور ہی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھنٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے، اور میں سودا کا تقدیر کا مارا تھا۔ لہذا جس راہ میں زہرا کی کالی مرشدین کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلنے دیکھا۔ میرا ہوا میں اٹھا ہاتھ اٹھایا رہ گیا، لیکن گاڑی مجھ اتنی دُور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی پچھلی نشست پر نے کسی کا ہولنا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرا ہی ہوگی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے پارکنگ کے چکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے۔ جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی فنا میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس کے لیے میں ساری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دُور تھی۔ میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی۔ لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اُس کو میری خبر لینے سے روک رکھا۔ کہیں ماما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے جنوں کے لیے کون اپنی عمر بے ادب کو تیار ہوگا۔ فرزا لگی کا یہی تقاضا ہوگا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اور پھر یہاں سے لندن جا

اُڑا۔ کارنے زور کی بریک لگائی۔ ڈرائیور غصے میں بکنا جھٹکا گاڑی سے اُترا۔ ”مرنے کا ارادہ ہے یا؟“ میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اُپر اٹھایا۔ ”مارہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے اے نہ چھوڑ جانا؟“ انور کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔ ”ارے..... ساحر بابا.....“ یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ آپ نے.....“ انور نے جلدی سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر میرے چہرے پر خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے رُومال بھی بنا دیتی جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اُسی بیچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا ”ساحر بابا..... یہ کیا.....؟“ آپ ابھی تک.....؟“ میری کئی زبان پر آئی گئی ”ہاں..... میں ابھی تک معذور ہوں..... کیا تم بھی اپنی مالکین کی طرح معذروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟“ انور نے جلدی سے بے ہاتھ جوڑے ”میرے بچے آپ پر قربان ہوں ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟“ پھر نہ جانے کیوں خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا دعا کچھ گیا تھا۔ ”کیا آپ کی زہرابی بی سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ میں رو ہنسا ہو گیا۔ ”نہیں انور..... تمہاری زہرابی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے ایک باتوا سکتے ہو.....؟“ انور کچھ دیر چپ رہا پھر اُس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرا کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار، کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور پینڈی بی ایم ڈبلیو بھی انہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اُس سے زہرا کا پتا پوچھا۔ کیوں کہ اُس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرا کے لبا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلا ہے، جو سالوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے ہانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کوڑکھول کر پھر سے تازہ قلمی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سی سانس لی، تب ہی زہرا کے پرانے گھر پر ہمارا فون اٹھانے والا بھی لٹی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چھلک جاتی تھیں۔ اُسے میرے ساحرے عبداللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر رُکا تھا۔ میں نے انور سے زہرا کے گھر سے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ کچھ ہلکا یا۔ ”آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا..... میرا مطلب ہے پہلے آپ پوری طرح لگ ہو جاؤ۔ پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے غور سے انور کو دیکھا ”تم جانتے ہو انور، ہزاروں اُس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی چلوں وہ راستہ خود مجھے زہرا کی چوکھٹ پر پہنچا دے گا۔ تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔“ لٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ساحر بابا..... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تیش سے سخت فولا دو کھٹکتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آپ

پھٹنے اور اُن کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں ساری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا کھٹکتے دیکھتا رہا۔ اُن کی سانس رُک رُک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے بنجر سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پیچھے ہڈوں میں بیک وقت ہزاروں چھریاں کھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے رُوح۔ شاید وہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری رُوح بھی نہ جانے کتنی بار جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سنبھل توئی میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مہمان ناشتا لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوائے نظروں سے مہمان کی طرف دیکھا۔ وہ میرا دعا سمجھ گئی، لیکن اُن کی نظر جھجکتی چلی گئی۔ اور میں اُن کے کچھ کہے بنا ہی سمجھ گیا کہ اُن کا زہرا سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بنا جا رہا تھا۔ میں نے انور کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا میں مہمان کے اصرار پر چائے کے کچھ کھونٹ حلق سے نیچے اُٹھ ل کر وہیں برآمدے کے بیچ پر اُن کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشی ہوئی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا درد کیوں نہ پل رہا ہو، تھک تھک کر بن بولوں والی مٹھی لوری سنا کر سلائی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے اپنے لاڈ لے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی صورت بنے بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے ذرہ برابر بھی جنبش ہو جائے ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دو پہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ مہمان کے گالوں پر اُن کے بچے آنسوؤں کی دھاریاں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ”آپ رورہی تھیں۔ اتنی دیر ہو گئی مہمان۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟“ وہ مسکرا دیں۔ ”بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبداللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی.....؟“ مہمان مجھے ساحر کی جگہ عبداللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بیٹے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اُسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ اُمید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بچے ایک بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سودا راہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا سکہ کشکول میں پڑے یا خالی کشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی کشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا اندر آنے والی ہر گاڑی کو اُسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چپکتے سکوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا سکہ چمکا۔ میں بیجان انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لبا سا موڑ کا انا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا۔ جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اُسی گاڑی کے سامنے

جانشین

سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرا بی بی کی مگنی کی تیاری ہے۔ پر..... خرم میاں اسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ جائیں۔ اسی میں شاید سب کی بھلائی ہے۔“ انور نہ جانے اور کیا کچھ بہتا رہا لیکن میرے کانوں میں وہ پہلے ایک ایسا پگھلا سیسہ انڈیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سماعتوں کو اور کچھ سننے کا چارہ ہی نہ تھا میں وہیں ٹھہر ڈھے گیا۔

جاتے جاتے انور میری حالت کے پیش نظر مجھے زہرا کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا بلکہ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا ہم سفر تو اپنی راہ بدل چکا تھا، پھر وہاں جا کر اُس کی راہ کھوٹی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی باتیں دینے والے بہت بُرے لگتے تھے۔ جیسے وہ اپنے کسی اُن مول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی کیا، جسے زور اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوٹا ہے تو پھر اپنے وفا کے چمکتے سکے کی بے رخی کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفا کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔ چیخ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی زسوائی کا تماشا دکھا کر خود کو کم ظرف ثابت کرنا کئی کئی گوارہ نہ تھا لیکن یہ دل..... ہاں..... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا پھینکتا ہے۔ ہماری خودداری،..... ہمارا سب کچھ، اسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے۔ تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سودے پر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ ہمیں پھر سے اُس بے چینی اور اُسی تڑپ کی تنگی بھجوں کے جنگل میں لا پھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا ہی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خود اپنا آپ بچ کر بھی ہم اس دلبر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں میں ذلت ٹھگ رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اُسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرا کی چوکھٹ کا رخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی ہرا پتا پھینک دیتا۔ نہیں، ضرور اُس کی کوئی مجبوری ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔“ میں پھر تڑپ کر لڑت بدلتا۔ ”تو کیا مجھے ایک آخری بار اُس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہیں.....؟“

نہیں، اُسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آخری بار اُس سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبردار جو تم نے اُس جانب کا رخ بھی کیا تو.....“ اسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اندھیرے میں کیے گئے فیصلے دن کے اُجالے کے ساتھ ہی اُس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو صل کر خوف، خدشات اور

پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے.....؟“ ممانے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا خواب تھا۔ اتنے میں نرس نے آکر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقت کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر اُن کے بستر کے قریب پہنچا مجھے دیکھ کر وہ دھیسے سے مسکرائے۔ میں نے اُن کے اشارے پر اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اُن کی آواز بشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ”ساحر میاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رخصت کر دو۔“ میری بدحواسی فزوں تر ہو گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اس حالت میں کیسے جا سکتے ہیں۔ اور پھر جانا طے ہی ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ۔ آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا؟“ اُن کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دُور ہوتی گئی۔ ”عبداللہ بھلا سلطان سے کب جدا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں یہاں ابھی میرے بہت سے اُدھورے کام سرانجام دینا ہیں، لہذا تمہارا سہمیں رکتا ضروری ہے۔ اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آندھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی تمہارے قدم اُٹھانے کی کوشش بھر پور کرے گی، مگر تمہیں جتنے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔“ میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اُن کی تھیلیوں کی پشت بھیکتی چلی گئی۔ ”لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہِ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا.....“ اُن کی آواز ٹوٹ کر ابھر رہی تھی۔ ”کوئی بھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحر میاں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکِ خاکی جسم کی جدائی ہو گئی۔ سلطان بابا ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو ابھی اپنے سحر کے حصار میں ہی لیا میاں۔ واقعی کچے ساحر ہو۔“ میں اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی اُن کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اُن کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی۔ اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی اُلجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ صبح اُن کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے۔“ میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اُن کے منہ میں پانی ٹپکایا تھا۔ پھر یہ ڈاکٹر کیا ان اپ شاپ بولے جا رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ ”سعودیہ اسپتال کا فلکس آگیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی

دوسو سو سے بھر دیتا ہے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار نے آگھیرا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پہانے میری بگڑی حالت دیکھی تو دوڑ کر ڈاکٹر بلا لائے۔ ماماٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ کر نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھول ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی ماردیں تو اُن کی محبت کی معجزاتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک میرا بخار نہ اُترتا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے گا۔ شام تک میری حالت کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر اُٹھنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہِ داری میں چلتے دیکھا۔ ارے..... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں، وہی پہلا عبداللہ جس نے اپنی گدی مجھے سونپی تھی اور پھر آخر میں نعمان..... وہ جسے میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحلِ دال درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور ابھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں اُن کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ حاکم بابا نے میرا ہاتھ حاکم بابا ”میرے جوگی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا شاید..... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں۔“ میں نے اُنہی کی کوشش کی، لیکن پہلے عبداللہ نے میرا کاندھا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز میں نفارت تھی۔ ”آپ سب ایک ساتھ..... یہاں کیسے؟“ ”ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں۔“ میں نے حیرت سے اُن سب کی طرف دیکھا ”لیکن سلطان بابا تو..... میرا مطلب ہے کہ کیا حکم.....؟“ ”مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ”اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت..... ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاج مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رخصت کرنے آئے ہیں۔“ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ”حجاز مقدس۔ لیکن وہ تو بہت پیار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے؟“ حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نہ جانے اُن کے ہاتھوں میں کیا جادو تھا کہ مٹا پل بھر ہی میں مدھوش سا ہو گیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود دگرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دُور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دئی ”آنکھیں کھولو بیٹا۔ دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔“ میں نے نفارت کے بوجھ تلے دبے پتھوؤں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخار اُتر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے ادھر ادھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا..... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی ماما سے پوچھا کہ ”کیا ابھی کچھ“

اجازت دے دی ہے۔ اب ان کے علاج کی آخری امید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس۔“ سب کی نظر میری جانب اٹھ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر ہنسوں یا اُن کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور اُن کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا۔ لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر اُن کے شاگرد کے طور پر دستخط کروائے اور ضمانت نامہ بھی بھر دیا کہ کسی بھی اُن ہونی کی ذمہ داری میری ہوگی۔ یہ نادان طبیب کیا جانیں کہ جو اُن ہونی ہونی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے جیسے میری رُوح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کومے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سور ہے ہوں۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ اُن سے کیا وعدہ تو زردوں اور اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اُسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ لیکن ایبویونس سے اُترتے ہی میرے دل کا یہ جو بھی پکڑا گیا۔

مریضوں کے لیے بنائی گئی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رانے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اسی غیر مرئی نظام کا حصہ بننا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے ارد گرد اور اُن کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔ کتنا بے بس تھا میں اس لمحے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ سلطان بابا نے خدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس..... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گا، لہذا انہوں نے چپ سا دھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھکتے رہے۔ کچھ سفر آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں۔ صرف ایک میں ہی ہوں ان سب میں ایسا کم ظرف تھا جسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی..... ”الوداع.....“ کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے خلا پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورت حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اسی پرانے ساحر کی یاد نے شدت سے آگہرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرا کی سلتکی یادوں کے انگاروں کی آج اور حدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی

لہوہ جھٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جب کہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے دیکھ کر بھی ہونٹ بٹا تھا۔ آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا تو کسی کیا مجال تھی کہ وہ یوں اطمینان سے اُس کی محبت کو چھین کر لے وہ زہرا کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرا کا ہاتھ، کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس بن۔ یہ کیسا الیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبداللہ نام کی عاجزی سے باندھ لیں۔ جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں تو ہمارا جھگڑا، ہمارے خدا سے شروع ہے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائزہ لگنے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دُور یہ خواہش انگڑائیاں اٹھانے کہ کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اُسی طرح منالے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو پر ہماری ماں مناتی ہے۔ بالوں میں انگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رُود کر..... میں بھی اپنے خدا سے اسبابا کھانا کھائے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میرے نہ ہو پھر انسان خود آپ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا در دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہذا میں خود ہی اپنی رُوح کو غم، دکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے بند کی وادی میں پہنچ گیا۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا میرے پکلیں موندنے کے انتظار ہی میں بیٹوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ اُن کا لباس سفید اور وسیع کارنگ دودھیا تھا۔ دُور پس منظر میں سبز لی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلاف معمول بے حد تازگی اور ن کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے تردد تازہ لہجے میں مجھے اُسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا جو اس دنیا میں بس افاغ تھا۔ ”کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس لڑکھائی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر مل ہو لہان کیے رکھتے ہو۔“ میرے لہجے میں شکوہ تھا ”آپ کو اس سے؟ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے نا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پکڑے بنا ایک قدم کے نہیں چل سکتا۔ پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان بھی بھٹکتا چھوڑ کر چل دیئے۔“ سلطان بابا دھیرے لائے۔ ”پوندے کو پرواز سکھانے کے لیے اُس کے اپنے شہپر کو بھی ایک مرتبہ اُسے چوٹی سے نیچے پھینکا نا ہے۔ یہ اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب آتی مازمین کی کشش اور آندھی جیسی چٹکھاؤتی آوازیں اس شاہین بچے کو اپنے پتکے پھڑ پھڑانے پر مجبور کر ہی لاتی۔“ میں گڑگڑایا ”لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیئے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق ملے گا آپ۔ میری اُڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔ اب میرا مقدر ہنٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے۔ فنا ہی میرا مقدر ہے، اُنکس کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کندھا تو دے۔“ میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آگئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پوری رات میں

کرد میں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمرے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا تو ماما اور پاپا دونوں ہی تاریک چہرے لیے باوجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ ”کیا ہوا.....؟“ ”ممانے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز اندر گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں“ میں نے پاپا کو پکڑ کر جھنجھوڑا..... ”خدا کے لیے کچھ تو بولیں.....“ پاپا نے میرے کاندھے زور سے تھام لیے۔ ”ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے دریا نہیں رہے.....“ میری سامتیں شل ہو گئیں۔ اس کے بعد پپا نہ جانے کیا بولتے رہے مجھے صرف اُن کے ہلنے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھٹے دروازے کی چوکت میرے سر سے ٹکرانی بھی تھی کیوں کہ میں نے ماما کو جلدی سے اپنا دوپٹہ بچھا کر سر پر باندھتے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی۔ میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر میں واقعی بڑا ”کم ظرف“ تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقا تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اُسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پپا سے وہ لفظ سنا تھا۔ لیکن حیف مجھ پر کہ میں اب بھی پپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ ”ساحر ہوش میں آؤ۔ مولوی خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نمازہ جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص کلمہ وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی کوئی آخری خواہش ہو۔“ لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قابل ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دو نوکرانوں کی مدد سے سنبھالے اپنی گاڑی میں درگاہ جانب روانہ ہوئے۔ کچھ انہوئیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی درپیش آنے کے بعد ابھی بڑا اعصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ اُن کا آخری سفر ہے، لیکن اُن قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی رخصتی کا ٹھیک وقت تھا جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی بات گونجی۔ ”یار۔ یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دُوری ہوگی۔“ لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا۔ میں اُن رُوح کی حدود تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے کس نے محن میں وہیں بٹھا دیا جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب جانب دی نظر آ رہے تھے، پھر یہ لوگ اُن کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آواز کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ”سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے.....“ ”سوگ.....“ میں نے حیرت۔ اُن کی جانب دیکھا ”کیسا سوگ.....؟ آج یہ سب کیسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہے تھے۔“ ظہر کی نماز شروع ہوئی

سی نے مجھے بھی صف میں لاکھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کی نیت بھی باندھ لی گئی۔ کبھی سی نے زندوں کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبداللہ، مولوی خضر اور کچھ انجان لوگ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ پپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے دن بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہا تھا کہ پپا سے کہوں کہ آج رات ہی نکٹ کر والیں۔ میں بابا کے پاس سوویہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد ولوی خضر نے حجرے سے ایک کانڈ منگوایا اور دھیرے سے بولے ”سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت ہوں گا۔“ پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو اُن کی وصیت کے مطابق نشتہ گئے۔ کسی کے حصے میں شیع آئی تو کسی کو اُن کا جنازہ ملا۔ کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی..... ”اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق اُن کے ہاشین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جانشین اُسے مقرر کیا ہے جو اُن کے مطابق سب سے زیادہ سزا کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں..... سلطان بابا کے عبداللہ.....“ میرے ہاتھ سے شیع گر گئی۔

فریفتہ

میں..... البتہ پچاس کپے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی فرار کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو، انہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کسی بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند میرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہذا..... آنکھیں بند کرتے ہی میری روح کے بند کوڑ کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی میلاد کی محفل میں پایا۔ سب ہی چپ چاپ درد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے اُن کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر اُننگی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی اُن ہی کے ساتھ فرش پر بھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر دن چڑھ کر اترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن سوتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سوا ذہن میں سلایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس..... بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ ممانین چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ کر ہی دھشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلاوا بھیج دیا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ٹالی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں چپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی تو کچھ تہائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شریر، لیکن نامکمل کلڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی غلامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد روٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھپکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہڑکی طرح تیزی سے پلٹے ہوئے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپیں کنویں تک آتی پگ ڈنڈی پر نہ گونجی ہوں اور اب وہ بے چاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھر لوٹ رہی ہو کہ گھر کے آگن میں ٹھیلے بابل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”مخل

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر ڈک گئیں اور فضا میں تیرتے پرندے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جانشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے۔ اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے میری جانب یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اُن کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے۔ پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوت گوئی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گفتگو میرے اندر پنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چپکی رہنا چاہیے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتنا بڑا ابوجھ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکل کر درگاہ کے چکنے فرش پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے ”ارے..... یہ کیا عبداللہ میاں..... یہ آنسو.....؟“ بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی بند خُش و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ میلے میں اپنوں سے پیچھے کر تباہ رہا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام جھولے اور ٹھیلے سسنا ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھاتا اندھیرا اُسے ڈرانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں کا ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے چپ کرانے کراتے سب ہی غمِ حال ہونے لگے اور پتا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو رو دنا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ہمارا رونا اُن دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے رونے میں پہل سے پیچھکاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پچانے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زبان و مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں بڑا رہے یا پھر کسی مکان کی طاق

ب صورت چہروں کے ارد گرد گھٹنوں منڈلانے کے لیے چل چل جاتا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حد م، بلکہ کسی حد تک بھڑی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں بند نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹ پیچھے مجھ پر ہنسی اور میری مذہب داری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے آتے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا، تو میں بزم ادب کا منتظم منتخب ہو گیا۔ تب تک میری ن کے برعکس میری شاعری کافی کھربھی تھی۔ اردو شعبے میں میری کافی دھماکے بیٹھتی تھی اور جو نیر لڑکیاں ہفتوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ ساری عزت میرے شعروں کی مرہون منت فو میرا وجود ان کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امرتیل کی طرح پھلتی چلی گئی، لیکن پوری ٹی میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری کلاس والا بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی۔ جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے ہی لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اُس کی راہ میں پھنس جاتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ میرا دل بھی گل لالہ کے لیے اسی شدت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو فامیرے پاس، نہ شکل و صورت، نہ روپیہ پیسہ اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بد قسمتی سے اُسے ادب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہذا یونیورسٹی کے چار سالوں میں چار مرتبہ بھی میری اُس بات نہیں ہو پائی۔ لیکن میرا دل وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی پڑ گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے ارد گرد خوب صورت چہروں کا جھنگھا ہے اور ان سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو بی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرم رہا ہے، تو کبھی پوری محفل لوٹ لینے والا موسیقار یا رہن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا۔ لیکن میری ہر مہم جوئی کا انعام صرف مد رُخوں کا کوئی ٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور سب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے ایک گل رُخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بیک وقت کئی نازنینیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں۔ لیکن بتو پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر نکلتا تو میری عام سی شخصیت میرا منہ لٹا۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اُس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بار بار کرتے لیکن کسی مرد کی کم تر شخصیت اور اس سے جڑے دکھوں کو آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اور بھی کیسا..... مجھ جیسا ”فریفتہ مفت“..... جسے ہر لڑکے پری رُخ کے عارض پر پھلتے گلال کے گلابی پن ضرورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بد کردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت

ہونے کی معذرت چاہتا ہوں..... لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا لیتا جاؤں۔“ میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک اچھے عرصے سے مودب ساسر جھکائے میرے قریب کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر چچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اڑے ہوئے تھے۔ گھر اسانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوشش کی اور مولوی خضر کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود ازرائین میں نیاز بڑانے میں مشغول تھے۔ ”آپ اُن صاحب سے مل سکتے ہیں۔ وہ میرے استاد بھی ہیں اور وہی اس درگاہ میں اس وقت سب سے معراور قابل احترام شخصیت ہیں۔ وہ آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو دعا دینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ وہ شخص اپنی جگہ جم رہا۔ ”جی..... میں پہلے اُن ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ دیکھیے، آپ مجھے ٹالے گا نہیں۔ میں بڑی دُور سے یہاں تک آیا ہوں۔“ میں نے حیرت سے پہلے اُسے اور پھر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ مذہب داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے وہ شخص ملتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اُس سے پوچھا ”آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن آپ کے لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت.....؟“ وہ شخص کچھ ہچکچایا ”کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی دھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا پتہ دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔“ میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اُس کی جانب پلٹ چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے اپنا گلزار کیا اور بے شکل بولا ”میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں فریفتہ ہوں۔“ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”جی.....؟“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”میرا مطلب ہے میں ”فریفتہ مفت“ ہوں۔“ ”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ میں نے ایک گہری سی سانس لی۔ ”جی مجھے اندازہ ہے۔ دراصل یہ بات ہی اتنی اُجھٹی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری بخت سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھے، لیکن تب یہ چچک کے داغ میرے چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تختہ ہے۔ البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے مرادوں لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بھر میں بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیواری ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبے دے دیے۔ بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں سوئس جماعت میں ٹوٹے پھوٹے شہر میں کہنا شروع کر دیے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا دراک ہوا کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور متاثر کرتی ہے۔ میرا

چکا ہے۔ یہ دنیا، بد صورت لوگوں کے لیے بڑی بد صورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت نے میرا من اتنا کول ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو کبھی اتنا ہی شگفتہ کیوں نہ بنایا.....؟ قدرت نے میرے وجود کے سب ہی تاروں کو اگر سر اور موتی کی مہر تانوں سے جوڑ کر کرسوں میں عجب جہان خیز خواب دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر ہی دی تھی، تو پھر بے دقتی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری جاہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا قصور ہے۔ جانے یہ میلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے اندر سب کچھ اٹھل پھٹل کیسے کر دیتی ہے۔ میں ہل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری قدرت میرے سامنے دوڑا نو ہو جاتی ہے۔ پر ایں رقص کرتی ہیں اور میرے روم روم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ ہی سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دس فی صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اندر اور باہر صرف ایک شور ہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی جگہ نہیں.....“ بختیار اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوڈ دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تھکن تو ساری زندگی کی تھی۔ اندھیرا اصل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے دو آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں کی طرح دکھائی دیئے، جو کسی گم نام کے دیوان مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس جھکے ہوئے معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اُسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو فریفتہ نہیں ہے۔ کوئی عورت پر فریفتہ ہے تو کوئی جاہ و چشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے تو کوئی سونے کے مخلوں پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی ”فریفتہ صفت“ ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار پر پوری اُترتی ہے انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس تڑپ اور کک کی کانٹوں بھری غلش اور لا حاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ کہے بنا دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھا دیئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میری پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ دعاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے دوبارہ یہاں آئے گا۔ اُس کے جاتے ہی مجھے ماما درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پاپا کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے اُن کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سنانا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پاپا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی ماما کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کر پائیں۔ ”ساحر..... آج میری زہرا سے ملاقات ہوئی تھی.....“ کوئی اور دقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لیے جس ایک عجیب سی بے گانگی تھی۔ ”اچھا.....؟“ ماما کچھ دیر چپ رہی، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ زہرا کی پرانی ہمسائی کو خصوصی تاکید

تھی، جو ہر لمحہ میرے چارنو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدود سے بڑھ گئی تھی۔ پرفسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ ان تقاریب میں سب سے پراہٹج جاتا، جہاں کسی بھی اچھے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی امید ہوتی۔ بظاہر میں لا پرواہ سا باہاس مختل میں ٹھہلا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم بھی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ مختل سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشی گی جب خود اُس مدہ جیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اُردو شاعر میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلا لے..... لیکن افسوس میرا کوئی خواب پورا نہ ہو سکا اور آخر کار گھر والوں کا پسند سے میری شادی ہو گئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور نیک دل عورت تھی، پر، وہ کبھی مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کر سکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار اُس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چپک کے داغوں کا تھک میرا منتظر تھا۔ بار بار کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لیے دہی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے امید تھی کہ پیسہ ہاتھ آنے کے بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیسہ مرد کی تمام بد صورتیاں چھپا لیتا ہے۔ دس سال میں۔ دن رات بھلا کر دہی کے ریگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ملک لوٹا تو ایک رئیس تھا میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں اداہی و سماجی تنظیموں کا اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہر کی کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور کمپا چکا تھا، لیکن محبت کا ایک نظراب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچا دیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سرفراں امید پر کر کہ شاید میری ساتھ والی نشست پر کوئی حسین بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس، ہی میری طرف نظر بھر کر دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کر دیا تھا کہ شاید میری طیب بایز ہی چہرہ ہوں جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر کٹ گئی۔ میں جان بوجھ کر اپنے ارد گرد کسی نہ کسی بہانے حسین چہروں کا ہتھکھا لگائے رکھتا، مگر کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھٹکار سنائی نہ دی۔ کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی پجاریں نکلیں..... میرا پیسہ بھی میری ادھوری اور بد صورت شخصیت کو مکمل نہ کر سکا۔ میں سدا سانول ہی رہا، کبھی سا جن نہ بن سکا۔ اور آج زندگی کی 68 خزاںیں جھیلنے کے بعد بھی میں یہاں اس دعا کی امید میں کھڑا ہوں، جو میرے وحشی من کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کر دے۔ مگر بے حد نڈھال ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ”فریفتہ پن“ میری جان کا روگ بن

کر چکی تھیں کہ جب کبھی زہرا کے گھر والے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں تو ماما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی ہمسائی ہی نے ماما کو بتائی تھی کہ زہرا کے گھر والے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی ماما کو اس ہمسائی کا فون آگیا کہ اُس نے ابھی ابھی ڈرائیور سمیت زہرا کی گاڑی کو اُن کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ماما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں تو زہرا واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ماما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے اُن سے ملی۔ البتہ ماما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اُس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ ”شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں۔ اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بہتر ہوگا کہ ساحر بھی اس اُن ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔“ لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاہی سے جوڑ دیتے ہیں؟ ماما اُس کے سامنے بہت روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ بس ایک باری مجھ سے مل لے تاکہ ساحر کے وحشی من کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرا نے بیگنی آنکھوں سمیت ماما کی یہ درخواست بھی نامنظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں ماما کو اُس کی بے زحنی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اُس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رہنے والی ہے، لہذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ ماما اپنی بات ختم کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرا نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے کمزور بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ کر تہمت لگا رہی ہے۔ میں نے پاپا کے کوٹ کی جیب میں انکا چین نکالا اور قریب پڑے ایک کانڈ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔“ پتا نہیں یہ نظم تھی، شہر تھی، یا پھر صرف چند بھٹکے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو.....

یوں تو پورا یقین ہے.....

پر..... زمانے کے دار کا کچھ بھر دسا نہیں ہے

سوگر کبھی ایسا ہو جائے..... اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا..... جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے..... بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا راستہ؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدہمت ویرانی سے..... بھلا ان خوبصورت نظاروں کو کیا واسطہ؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں

کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ..... بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ.....؟

ان خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے

کہ کسی ”پیکر بد نصیب“ کے گھناؤنے پن سے..... بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ.....؟

بس مجھ ہی سے نفرت کرنا..... کہ میری رُوح کی سیاہی سے ہی..... چار سو یہ اندھیرا ہے.....

میری بد صورتی کی وجہ سے ہی..... دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے..... ہر راہ بے راہ ہے.....

ہر نظارہ مکروہ ہے..... ہر خواب سراب ہے.....

بس مجھ سے ہی نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی تھا..... تمہاری اس نفرت

اہل ہوں،،

ساحر

میں نے کانڈ لفافے میں ڈالا اور اس پر زہرا کا پتا لکھ کر پاپا کی جانب بڑھا دیا۔ ”اس پر زہرا کا پتا لکھا ہوا

ایک اور احسان کر دیں مجھ پر، گھر واپسی پر یہ لفافہ اُس کے گھر دیتے جائیے گا..... آج اس

نے کا اختتام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے.....“ ماما پاپا کے چہرے سفید پڑ گئے۔

پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے کے حجرے کی پرانی
 ما کے پیچھے سے صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دھول اور کالک میں اٹالا۔ میں نے اُسے جھاڑ کر
 کیا اور اُس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سو.....“
 مجھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے بہت دفعہ
 بابا کو مختلف رقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذیوں ایک ایک کر کے بعد میں مجھے
 لے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوجھا تھا۔ ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پرچیاں سینت سینت کر سنبھال
 میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔
 نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی
 کی ”عصر کا وقت اہم ہے..... کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے..... دھیان رہے..... مسائل نہ چوکے.....“
 تا ہی سمجھ آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سال کا ذکر ہو رہا تھا۔
 کی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے خود ہی سے اُلجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی
 چند سالوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اُکاتتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے
 نہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اُوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک
 دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا،
 قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی۔ ابھی مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دُعا
 نہ بتائی اٹھ کر چل دیئے اور ٹھیک اُسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی
 دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے دیکھ کر جلدی سے صف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی
 اُن نے دُعا کر لی۔ دُعا کے خاتمے کے بعد اٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔ باقی نمازیوں کے جانے
 بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں میاں، دیکھا تم نے محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کے
 ؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”دُعا کو عبادت کا مغز کہا
 ہے۔ شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دُعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو
 ٹھاس نماز پڑھ کر بنا دُعا مانگے اٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی پر انعام لیے بتائی
 دے، اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دُعا میں شامل ہو گئے، انہوں
 محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام اُن کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دُعا میں اپنا حصہ مانگنے کا
 مُل گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دُعا ہو، جس میں دُعا میں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں.....“
 وہی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو

”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن اور رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور میر
 زمانہ و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، ٹھنڈوں کھڑا رہتا، اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خاک
 سے جُوار رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانے لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھنے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا تھا
 لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و خواہ
 چھین جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید کبھی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ کر
 نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جانب
 پلٹ چکے تھے۔ لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جان نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب ہم
 میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی دیرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیوں کہ اب یہ
 ان انسانوں کی محفل میں گزراہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا، اُن
 ہی مجھے اُن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید ان مزاروں پر ”پہلو تھی“ انسان کو مزید معتبر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پانچ
 خط لے کر زہرا کے در تک پہنچے تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پپانے اُس سے زہرا
 پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پپانے اُسے میرا رقعہ دے کر زہرا تک پہنچا۔
 کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب اُن کی گاڑی زہرا کی حویلی کو مڑی
 والی سڑک کے موڑ تک پہنچی تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک ک
 جانب آتے دیکھا تھا لیکن میری التجا کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرا کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے برا
 راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالانکہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آ۔
 والی زہرا ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار میری ساعتوں میں زہرا کے نام
 امرت اُٹھایا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان بابا
 انتظار کرتا مختلف محفلوں اور دیرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھ نہ ملتے۔ ہاں البتہ اُن کے پیغام بھی کبھار
 تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار اُن کے ہاتھ کے لکھے پُرانے اور اراق مجھے حجرے میں یاد درگاہ کے ک
 اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو اُن کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھیں، مگر دوسری یا تیسری مرتبہ
 پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کچھ

جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا..... میں بھی شاید وہ مجدد قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو کتنی بھی اب مجال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔ تحصیل ماہی کے مزدوب کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کر تھا۔ عصر کے بعد مولوی خضر حجرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے، اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے کی ناکام کوشش کرنے درگاہ کے صحن میں آکر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی ادھر ادھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میرا جانب بڑھی۔ ”سنو لڑکے! یہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں.....؟“ شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ”وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی.....؟“ وہ کچھ ہچکچاتی ”تم..... میرا مطلب ہے تم تو..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ۔ درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے بیڑھیوں تک چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے خصوصی دُعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آسکتا۔“ مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے لاڈلے کے لیے دُعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ ماما مجھے پکارتی رہ جاتیں لیکن اگر میرا کہیں جانے اُموڑ نہ ہوتا تو میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا دم عاجز سے بیان کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور اُن کو بتایا ”یہ عبد اللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔ بہر حال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔“ عورت کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے ”تو یہ عبد اللہ ہے؟“ میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آکر ٹھہر گیا، کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ سائل کو خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اُس لڑکے کے لیے دُعا کریں۔ کیوں کہ یہ اُن کے اعتماد اور یقین کا معاملہ اور دُعا پنا کامل یقین کب اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اتر چکے اور انہوں نے مجھے ہم قدم نہیں پایا تو وہ بھی تھک کر رک گئے ”عبد اللہ میاں..... آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ ان کے صاحبزادے کو دُعا دینے.....؟“ مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈ فون لگائے کسی نغمے کی ڈھن پر اپنی انگلیوں کی تال ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے اپنی ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ”شہزاد بیٹا..... بزرگ تمہیں دُعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے.....“ شہزاد مسکرایا ”واہ..... کیا بات ہے

کیا۔ آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے سی ایس ایس یا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے لگے ہیں۔ آئی میں، ہی از کوائٹ ایک فارابی بیچ پلیس مام۔“ ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہ کی۔ مولوی خضر نے ہنسا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے کھڑے شہزاد کے لیے دُعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جمنا بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو ماں نے ممنونیت سے ہمیں دُعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جو ماں ہمیں دُعا دے رہی تھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے دُعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دُعاؤں پر اک ڈرا سا اعتماد بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دُعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دُعا بھلا کیا ہوگی؟ ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا ”آپ نے خوادخواہ اتنی دُور آکر اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دُعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس دیرانے میں نہ پڑے ہوتے۔“ میں سنی اُن سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلاف معمول اور خلاف توقع نہ جانے مولوی خضر کیوں رک گئے اور انہوں نے شدہ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔ ”دُعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ کوئی دُعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دُعا کے لیے ان دیرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے، میری دُعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔“

ہم شہزاد اور اُس کی ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر اوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن میں نے حسبِ عادت انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے اندر وہی اک عجیب سی بے چینی سراپت کرنے لگی، جو اب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ لیکن آج بہت دنوں کے بعد زہرا کی یاد کا وہ مستقل کاٹنا سر شام ہی ٹیس دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بے اختیار رونا آگیا اور نہ جانے کب حجرے کی دیوار سے ٹک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں رونا ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھنٹوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھا زور ہاتھ تھا، تبھی مجھے اپنے سر کے اوپر کسی کے ہاتھ کا مانوس شفقت بھرا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے۔ ہاں..... وہی تو تھے، لیکن میں تو اُن سے رُٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی تھیلیوں سے صاف کر کے رُٹھا سا بیٹھا رہا۔ اُن کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ تھی ”یہ کیا ساحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی نہیں کرو گے کیا۔ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟“ میں نے اُن کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی ”آپ جانتے ہیں آپ کے بنام میری ہر جیت، ہمارے۔ اور جانے

وگا۔“ مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھمادی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلاف معمول ضرور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالانکہ نہ جانے کیوں میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا متوجہ برتاؤ بھی میرے پیش نظر تھا، لیکن بس صرف قہقہہ کرنا جانتا تھا، لہذا پانی کی بوتل اٹھائے چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ لیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوشی میں گاڑی داخل ہوئی، تو کینوں کی ناست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باڑھ ہی سے ہو گیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی وجود تھیں۔ ہم مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ سامنے بستر پر نذرانہ پر ایک بڑا سالفاں ڈالے پڑا، بخار میں جپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ یوانگری مین! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم می کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی لریڈ کرنے کی حفاقت کی تھی، مجھے اُسی وقت تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بھی میری ات سمجھ گئے ہو۔ لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہو سکے تو میری معذرت مان کر لو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑا بنا دیا ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ بھول جاؤ ب کچھ..... یہ پانی پی لو..... انشا اللہفاق ہوگا.....“ شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔“ تمہیں سچ ناؤں..... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس می کی وجہ سے.....“ شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی۔ شہزاد بادل خواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی“ بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا پلا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کھہہ کر ابھی آئی۔“ میں نے جلدی سے انہیں روکا نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں..... اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق بند دُعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔“ لیکن مائیں بھلا کب کسی کی نئی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے اوجود خاصہ تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لیٹا ہی رہا۔ میں نے دُعا کے لیے اٹھ اٹھائے تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُعا ختم ہونے کے بعد اُس کا سوال ہونٹوں پر آئی گیا۔“ کیا تمہیں ہنڈ دُعا پر پورا یقین ہے.....؟“ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔“ جب تک دُعا کے لیے اٹھ اٹھتے نہیں، تب تک میں بھی اُتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو۔ لیکن اٹھ آسمان کی جانب اٹھنے کے بعد نہ جانے کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ اٹھ گرنے سے پہلے سارا جہاں اپنی ان دو جڑی پھلیوں کے واسلے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم بھی آزمانا۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے گا۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری.....؟“ شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری“ کہتے ہیں جس کو خلل..... خلل ہے دماغ کا..... بس یوں سمجھ لو کہ یہی خلل دماغ کی چولیس ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے

آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کر لیں ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔“ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے.....؟ واپسی کا رستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزل مقصود تک جاتی ہے۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو ذرا کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہ میں جا لینا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سپہیاں اور گھونکھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔“ جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں انہیں زیادہ محضے نہیں ستاتے۔ اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اٹھ ہی جائیں گے۔“ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی منڈیر کے پاس کھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اب بھی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اسی جگہ میرے دل پر اب بھی اُسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اُسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جانی تھی، لیکن یہ گرہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں کیوں کہ مجھے سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح چھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے محسن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کیوں کہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری ابتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اُن کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ محسن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے“ عبد اللہ میاں..... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے بیٹے کے لیے میرے ساتھ دُعا کی تھی نا۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے، اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ اُٹا سیدھا کھہہ دیا تھا تو کہیں یہ اُسی کیے کی سزا تو نہیں ملی اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دُعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بد دُعانا م کا کوئی بھی سکہ ہمارے کنٹرول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے ان کے ساتھ ان کے گھر ہو آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اُس نوجوان کو پلا دینا۔ انشا اللہفاق

اسدا کا پگلا ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور نیکی کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے سے اپنے آپ سے بولا۔۔۔۔۔“ اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق۔۔۔۔۔“ ماں نے ہنس کر بیٹے کی تصویر لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر مجھ سے بولیں۔۔۔۔۔“ بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دُعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی بہو کو لے کر درگاہ دُں گی۔۔۔۔۔“

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری پچھلتی سی نظر ماں کے ہاتھوں میں پکڑی بہو کی تصویر پر پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھماکا ہوا اور زمین شق ہو گئی۔ میں چکرا کر زمین پر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزاد کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرا کی تصویر پر ہی جمی رہی۔

..... وہ زہرا ہی تھی..... جو کبھی میری تھی۔

من میں بھی سا گیا ہے۔ بولو..... ہے کوئی دُعا تمہارے پاس اس خلل کو رفع کرنے کے لیے.....؟“ میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منج کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی ان بل کھاتی پگ ڈنڈیوں پر واپسی کے راستوں میں گھٹے جنگل اُگ آتے ہیں۔ دُکھ کی امرنیل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لپٹی ہے کہ پھر کوئی مڑنا بھی چاہے تو واپسی کا کوئی راستہ سمجھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے عفریت ان گھٹے جنگلوں میں سرشام ہی اہل تاس کے پیڑوں سے نیچے اُتر آتے ہیں اور واپسی کے بھٹکتے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے باسیوں کے لیے پل بھر میں اُس برفیلے شہر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے گھل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار کبھی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے پیچھے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے ٹائی ٹینک کی طرح.....

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی مُمی کے کھکانے کی آواز سن کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی کڑائی دھکیلتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ ”کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا تا کہ عشق لا علاج ہوتا ہے۔ اس جرثومے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے زوہانی علاج کی حدیں آزما دیجھو۔“ شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا ”شیری! تم باز نہیں آؤ گے نا۔ کیوں مہمان کو زنج کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔“ خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلاف توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُٹھالیے اور واپسی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لینے لینے ہاتھ بڑھایا۔ ”پھر کب ملاقات ہوگی پیری جی.....“ میں جانتا تھا کہ ”پیری جی“ کی اصطلاح صرف اُس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ ”جلد ہوگی، لیکن پہلے تمہارے اس خلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں حالانکہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات اس جرثومے کے زہر کا شکار ہو کر مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت چھوٹ کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔“ شہزاد کی مُمی حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی اس گفتگو کو سن رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ ”اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی خدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آگن میں بہار بن کر اُترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرا

”دوسرا رقیب“

بچے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کروانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں فنا کہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری اُمید کا گلاب بھی اپنے رقیب کے حوالے کر دے اور اُس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پرو کر بولہبان اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے محن میں دھول میں اٹا بیٹھا تھا، دھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ہاتھ چوما تو مولوی خضر جگرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفانِ دبانے کی کوشش کی ”آپ جانتے تھے کہ خرم شہزادی زہرا کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا اُس کی تیمارداری کے لیے.....؟ کیا آپ کو بھی عبداللہ کو بار بار جتنی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے مجسم کیوں نہیں کر دیا جاتا ہے۔ یہ روزِ روز کے سکتے داغ میری رُوح کو کب تک سہتا ہوں گے.....؟“ شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہوتا گیا لیکن مولوی خضر حسبِ عادت چپ چاپ سر جھکائے سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے بولتے میرا گلزارِ زندہ گیا اور ازل سے بیٹھی پلکیں پھرے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ”یقیناً جانو، عبداللہ میاں..... میرے بس میں ہوتا تو یہ ماری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا لیکن تمہاری رُوح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا۔ پر ہم دوسروں کے نصیب مول پاتے تو بات ہی کیا تھی۔ بس، اتنا سمجھ لو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ اور ہم شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی دُعا کی گئی ہے بھی کچھ بدلتا کھول نہیں پاتے.....“ مولوی خضر یونہی چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھپکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آگھیرا تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی بڑھیوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات انجمنی ہجوم بھی ذہن کی الجھی گر ہیں انکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی میرے قدم تیسری بڑھی ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اُن کا ڈرائیور بھی اُن کے پیچھے چلا آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جلدی سے میری جانب بڑھیں ”عبداللہ..... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا.....؟“ میں رُک گیا۔ ”جی..... بس ذرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹھہر آؤں.....“ انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ”اوہ..... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ”اب ایسی حالت میں مجھے آرام ملتا ہے۔“ لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سلتے ہی رہے۔ مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس سے بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا تو شہزادی کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف کھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کر لوں، لیکن میں نے بمشکل اُن سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لرزش ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب لا کر اتار دیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے زہرا کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اُس نے تو زہرا کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا۔ تو پھر یہ شہزاد.....؟ میں فوراً واپس پلٹا۔ ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”یہ جو لڑکا بیمار تھا..... اُس کا پورا نام کیا ہے.....؟“ ڈرائیور چونکا ”کون..... چھوٹے صاحب۔ ان کا نام شہزاد ہے..... خرم شہزاد.....“ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے.....؟ میں تو آج بھی اُتارنا ہی تھی دامن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اُپر محن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر جگرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں بمشکل خود کو کسی طرح کھینٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی انہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرا کسی اور کی ہونے والی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اُسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی اُمید کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آتا ہوتا ہے..... وہ آکر ہی رہتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی اچکا تھا اور کسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید اُن کے لیے ہی طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہڑکتا رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بھتی شبنم درگاہ کی زمین پر کھرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی۔ لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدہم اور کالک زدہ تھا۔ مجھے جس کی سیمائی کے لیے چنا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق تو

پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکریہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ سب اُن کے بقول اس ”کراثی پانی“ کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آتا تھا۔ مولوی خضر مسکرا کر بولے ”اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اُس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر چھوکی تھیں۔ اور یہ عمل آپ خود اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا۔“ خرم کی والدہ میری جانب مڑیں۔ ”وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب کبھی وقت ملے تو ہماری طرف ضرور چکر لگاتا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آواز بھڑاسی گئی ”ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اُس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں جب زہرا خرم شہزادی کی دلہن بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے اُس دن میرے پنگے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان ابھرے گی اور اُس کی زندگی کا ہر درد ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔“ زہرا کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آنکھیاں چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کمزور بچے کی طرح اڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ جسے زہرا نصیب ہو جائے، پھر بھلا اُسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں.....؟ کبھی وہ میرے مقدّر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی منڈیر پر چٹک جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے پتیل کے پیر سے لپٹ کر اُس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدّر سے گلے کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرا تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی رُوح سوچنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اُسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آچکا لہذا میں چاہوں تو زہرا کا ہاتھ تمام کرواہیں لپٹ سکتا ہوں۔ میں نے جیھی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو دسترخوان پر بیچے رزق کی طرح ہوتا ہے، اُسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے تو اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدّر دُکھ جاتے ہیں، کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ لیکن میں بھلا کب ناشکرا تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے تو وہ بھی بلا وجہ کے تو نہیں تھے۔ زہرا کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اُس کی نکل پلکوں کو اپنی راہ میں بچھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آگینے جیسے نازک بھرم اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی دہائی ہم اوروں کو دیتے پھرتے ہیں۔ میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرا پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ”نادان دوست“ کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا۔ زہرا اگر میرا انتظار نہیں کر پائی تو کیا ہوا۔ اُس نے کبھی ایک بار مجھے اپنی رُوح سوچی تھی۔ کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم

کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کوئل رُوح کے پرزے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدّر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اُس ایک جادواں پل ہی میں گزار دیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سینے کی دھن میں اتنی دُور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے؟ خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اُن کے مستقبل کے سنہرے سپنوں کی داستان میں اپنا آج جلنے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار سیر ہو چکنے کے بعد پھر سے پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دُعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں جھکنے لگا۔ بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بیک وقت جھیلنے کی سکت رکھتا تھا، لیکن یہ حدت تو میری رُوح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ اس عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج میرے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اُسی باد نسیم کے معطر اور رخ جھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوشبو تھی، جو اُس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل مہندی کا رنگ سجے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرا کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اُس وقت محن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ مولوی خضر ”ارے..... ارے“ ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے محن میں داخلی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنسان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا ہوا میاں..... کس کی راہ دیکھ رہے ہو.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”وہ..... جس کی راہ کی دُھول بننا میرا مقدّر ٹھہر چکا ہے۔“ مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا۔ ”لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے میاں.....“ میرے دل نے آج تک پہلے کبھی اُس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ لیکن آج درگاہ کا سنسان دروازہ میرا یہ بچا کھپا اور آخری مان بھی تو دینا چاہتا تھا۔ میری نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بہنے لگا اور تبھی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اُس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا بجنر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاں!..... وہ زہرا ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں لمبوس۔ ویسے ہی جیسے پانچوں پر تیرتی ہوئی رازِ ہنسی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا۔ زہرا کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو۔ یا پھر

درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات الٹ دی تھی۔ وہی پکوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے خرم کی والدہ کے پیچھے مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں۔ یا شاید ہمارا دوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دوریوں کا بخلافا فاصلوں سے کیا واسطہ۔ ٹھیک اسی لمحے مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور ان کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آگھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبوں اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ”دوری“ کہتے ہیں لیکن رُوح سے رُوح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے وہ ”آگ“ کہلاتی ہے، لیکن جو رُوح کو جھلسائے اُسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہوا ہے ”لفظ“ کہتے ہیں، لیکن جو بن بولے اور بن سننے ہی رُوح کو جھوٹو جائے اُس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرا کی رُوح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ رُوح جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرانے کے تصرف کے بوجھ تلے دبی نظر آرہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں۔ ”آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب۔۔۔۔۔۔ یہ تو یہاں آنے کے لیے کبھی راضی ہی نہ ہوتیں اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی ضرور آتا۔ لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دُعا کریں کہ ان کے آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے تو دُعا کریں کہ وہ بھی پوری اور بھرپور ملے۔“ مولوی خضر ہلکے سے بولے ”بی بی میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کم یابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہودہ ”خوشی“ نہیں رہتی، معمول بن جاتی ہے۔“ مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ”یہ تو یہاں کبھی نہ آئی اگر خرم ضد نہ کرتا۔۔۔۔۔۔“ گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں بلکہ اُس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھا۔ مولوی خضر نے دُعا ختم کر کے زہرا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”سدا سکھی رہو۔۔۔۔۔۔“ خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹنے پلٹنے رُک گئیں۔ ”ارے ہاں عبد اللہ بیٹا! وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اُس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو۔ نا۔ خرم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمہیں واپس چھوڑ جائے گا۔۔۔۔۔۔“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی ”عبد اللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بُری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے تو میں خود لے کر آؤں گا آپ کے دولت خانے پر۔۔۔۔۔۔“ جانے یہ میرا وہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا تو اُس بے رحم کی جھکی

اُس کی جھال میں ارتعاش کی اک لہری پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہو گئیں اور اُس نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا ”ہاں بخار تو بڑا اتیز ہے۔ عبد اللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج بن نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے۔۔۔۔۔۔؟“ اور یہی وہ لمحہ تھا جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان پھسل گئی۔ ”وفا کا روگ ہے مجھے۔۔۔۔۔۔ آپ دُعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا مہم عطا کرے۔“ خاتون حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح پچھتایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران تیر پھسل جائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی ہانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرا کی پلکیں اٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھس گیا۔ یہ کہانی کا آغاز بھی اسی درگاہ سے اور زہرا کی انٹھی اک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی وہی ایک رہی۔ پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس نہ گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا بے نوحے پر ہمتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بیٹھا دیا اور کہیں سے نکیل لا کر میرے لرزے جسم پر ڈھک دیا، پر رُوح کی لرزش کا کیا علاج۔۔۔۔۔۔؟ اتنے میں میرے قریب ہی بھوں کی آہٹ اُبھری اور شام کے ملجے اندھیرے میں کوئی سایہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ مجھ میں گردن ناکر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا دیے۔ میں نے چہرہ پچانے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ وہی ”فریفتہ نصیب“ بختیار۔۔۔۔۔۔ لیکن آج اس نے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آرہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھرپور تھا۔ ”آپ کی ایک دُعا نے میری لدگی بدل دی۔۔۔۔۔۔ مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر اُمید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچا دیا، جہاں میں نے سب لیا ہے۔ میں آپ کا شکر یہ کیسے ادا کروں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے بھجان میر خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اُسے پوری کائنات کھوجنے کے بعد وہ اک نگاہ میسر ہوئی گئی، جو صرف اور صرف اُس کی مدح سرائی میں اٹھی اور پھر اُس کے لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول وہ ایک مجسمہ ساز تھی، جس کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اُس کے مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا تو بختیار کو بھی بطور مہمان خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تبھی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس سین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ ی فریفتہ پن ہی کا تو شکار رہا تھا۔ لیکن یہ معاملہ تب ”خلاف معمول“ تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی بالی اپنے فن کی تعریف سن کر شرما تے اور کچھ جھپکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کرنا۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ بختیار کی ضروریات کے پیش نظر اُس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری

ہی میں اُس نے کچی مٹی اور پکے سے بختیار کا بت تراشنا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلٹی رُوح پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اُسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات اور شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اسی لیے اُس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی سے فرمائش کر کے اُس کا مجسمہ گوندھے۔ آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول اُس نے آج تک کبھی اپنے آپ پر پیار آنا محسوس نہیں کیا تھا لیکن سائرہ کے کمال فن نے اُسے بھی اتنا حسین کر دیا کہ خود بختیار کئی گھنٹے اپنے چہرے کے زاویے اور خط سرائتار ہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دُعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اُس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھا پاتی۔ میں نے بختیار کی جانب دیکھا۔ ”کاش میں اتنا معتبر ہوتا کہ میری دُعا میں بھی قبولیت کا شرف پاتیں۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔“ بختیار کچھ ہچکچایا۔ ”ہاں، مگر ابھی ایک اُلجھن باقی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دُعا کریں گے۔“ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا، ”کسی اُلجھن.....؟“ بختیار نے نظر میں چرائیں۔ ”آپ یہ دُعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بیٹائی نہ لوٹائے۔“ میرے اندر ایک زور دار چھٹکا ہوا اور میری رگوں اور نسون میں وہ سب کانچ دُور تک پیوست ہو گیا۔ ”کیا.....؟ کیا مطلب..... کیا سائرہ نابینا ہے..... مگر..... مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آپ کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر.....؟“ بختیار نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا ”ہاں..... یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ نابینا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بینائی ہی سے ہو.....؟“ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا وہ۔ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف ”بینا نظر“ ہی لکھی ہو؟ بختیار نے اپنی بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اُس نے اپنی پوروں کی بینائی سے چھو کر اور محسوس کر کے گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا۔ کوئی سلوٹ کوئی بد نما زاویہ نہیں تھا۔ مجھے اسی شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی جیسے بد بینوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ کاش میں بھی سائرہ کی طرح نابینا ہوتا اور قدرت میری اُنکلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت بینائی عطا کر دیتی..... کاش.....“ بختیار بولے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بد دُعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیوں کہ اُسے خوف تھا کہ بینائی لوٹ آنے کے بعد اُس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی۔ پھر سے وہی نفرت اُس کا مقدر ہوگی، جو جنم سے اب تک اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی آئی ہے۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ڈاکٹروں کے حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی۔ بات صرف اُس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی تھی۔

بختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش بد خود غرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی لیکن وہ بے بس تھا۔ شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود ی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ بے لیے دُعا کریں گے نا..... دیکھیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجئے گا۔“ میں.....“ ”آپ نے ٹھیک کہا..... نظر کا بھلا بینائی سے کیا واسطہ.....؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بینا وہ نظر نہیں لیتے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک رب بھی عطا کر دے۔“ وہ بے چین سا ہو گیا ”بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی دُنیا سائرہ کی دُنیا کی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بد صورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بد نما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت بن کر پائے گی۔“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن دُعا میں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس میں پلٹا کرتیں۔ اس لیے دُعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام ایک دوبارہ سوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بد دُعا کی عرضی کی ڈال دیں گے۔“ اچانک میرے عقب سے وہی رُوح کھینچ لینے والی ملائم سی آواز ابھری ”اگر بد دُعا کسی یاہ نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے تو ایک بد دُعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔“ میں تڑپ کر پلٹا۔ درگاہ کے دروازے کے قریب زہرا کھڑی تھی۔

تار عنکبوت

ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ لیکن وہ تعبیر تھی۔ میرے نہ سہی..... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی..... لیکن زہرا یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلے یہاں..... میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں بھی حیرت کی جھلک تھی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر زہرا کے لیے جگہ خالی کی اور زہرا میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی ”لرزش بے کراں“ میرے اندر کی دنیا اٹھل پھٹل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اُس کے لب بے ”خرم کی ای ای آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ اُد پر تک نہیں آسکتے اس لیے.....“ میرے اندر زور کا جھکڑ چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا آخری پتا بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا قریب لکھ گامے۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا ”معافی چاہتا ہوں..... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بد دعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو دعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے۔ اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔“ زہرا نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کچھ ہڑبڑا سا گیا ”جی جی..... ضرور کیوں نہیں..... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ سائل کی سن لیں.....“ ”جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون.....؟“ بختیار میری بات سن کر اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر ٹھٹھک گیا اور پھر موفتے کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرا درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرا کی لرزتی پلکیں کچھ خمی ہوئے لگیں۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا ”چلیں..... میں حاضر ہوں۔“ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرا کی آواز نے میرا تعاقب کیا ”سنیں.....“ میں رُک گیا، لیکن پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ طلسم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر بنا دیتا ہے۔ ”میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیوں کہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہ آتی۔ لیکن ساری بات ہی اختیاری ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔“ کاش وہ اتنی ہی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ انہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور

پ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپنا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری جیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ بہ میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تردیدوانے اور کسی شہزادے / امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ رہا ہو تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذوری کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے کسی نبوط شائن کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ میں نے اپنی بش کے بھی تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھال کی خری ڈوہتی آواز سنائی دی ”آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے دے میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔“ زہرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا، ایک نہ شدہ رن میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ ”نفرت“ محبت کا سب سے غریب رنگ روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اتر کر ہیرا کے نقش قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر آئیں، لیکن خرم حب معمول گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آج بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے آج پیلا ہٹ جھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ”بڑے مغرور ہو برے سیجا۔ آخر مجھے ہی یہاں تک آنا پڑا۔“ خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کی تنبیہ کی۔ ”شہزاد..... تمیز سے.....“ تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا عجیبہ ہوتیں تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ ”میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے۔ سب مان، سارے غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گہنے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔“ خرم نے چوک کر میری آنکھوں میں جھانکا ”سوری..... میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا عبد اللہ، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابل فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے۔ جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔“ خرم نے مسکرا کر زہرا کی جا ب دیکھا۔ وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹتے اور تاج بدلتے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اُد پر درگاہ ہی پر لے چلیں تاکہ مولوی صاحب ہی اُس کو وہ پانی بھی پلا دیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا تردّد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دو گڑھی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آجائے تاکہ مولوی خضر سے بھی اُس کی ملاقات ہو

کہتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزے قدموں کو سنبھالتا واپس درگاہ کے صحن تک پہنچا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید..... اسی لیے ان کے چنگھاڑنے رلڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس شور سے کئی گنا زیادہ شور اس وقت خود برے وجود کے سمندر میں اٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور۔ شاید بہت شدید اور حدوں کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی ساعت میں میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے زہرا کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرا کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر نامہ ”خط“ ہی ہو، یا ہر ”خط“ کسی کی تحریر ہی سے جزا ہوا؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ”خط“ لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ ان سیاہ موتیوں پر بھٹکنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اُتر جانے والی تحریر اور وہی اندازِ تکلم۔ کون کہتا ہے کہ ثبات صرف اک تغیر کو ہے.....؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے ہشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔ ”میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں بھول، بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرودوں کی، ایسا بھلا کب سوچا تھا.....؟ آپ کی ہر بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا تو شاید میں انہی بدگمانیوں کے تپتے سائے تلے اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیوں کہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔“ میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرا کی کہانی ٹھیک اُسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اُس دن ”کاسا بلانکا“ کو زہرا کے شہر اُسی ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا، جہاں اُس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرا کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرا کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے کہ یہی تو وہ ساحل تھا جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لنگر انداز ہو کر زہرا کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرا کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کاٹے تھے۔ لیکن آج کا دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لنگر انداز ہونے والا تھا مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال ہا سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرا بھی بمشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دوپہر کو آنے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دھن میں اتنی سرشار تھی کہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک سپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش اُس کی گاڑی

جائے۔ خرم بھی کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرا کے چہرے پر بھی کئی رنگ آکر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر خرم نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی ”اچھا چلو..... آج ہم بھی یہ معرکہ سر کر ہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر پھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی دو قدم چل کر اُپر نہیں آسکتا۔“ خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اُتر کر خرم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی چیز نکالی اور پھر خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مصنوعی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم کو گاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اُسے تھما دیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا کر پہلا قدم اٹھایا۔ میں سوچنے سمجھنے سمیت اپنے تمام حواس کھو چکا تھا۔ گویا خرم اپنی اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کار کے کچ اور ایکسپلیٹر کا وہ مخصوص خود کار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نصب کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈنگا تے ہوئے دوسرا قدم اٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اتنے میں اُوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی سے آواز سنائی دی۔ ”ارے میاں..... تم وہیں زکو میں نیچے آ رہا ہوں۔“ مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے اور انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جو ان دو قدموں کے سفر ہی میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ”میں نے کہا تھا نا..... میرے پاس فخر کرنے کی بس ایک ہی وجہ رہ گئی ہے لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کافی ہے۔“ ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بیٹھا دیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرا ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانے، میں جیسے کسی خواب کے اثر سے نکل کر ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ ہوا میں اٹھارہ گیا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اُڑتی ریت کے ساتھ ڈھول ہوتا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مولوی خضر نے مجھے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھنکھار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس میں تھا ہی کب.....؟ کاش دنیا کے کبھی دیوانوں کے ہاتھ پر قدرت ہوش چھیننے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُن کی جبین پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا اُن سے کسی ادب آداب یا تہذیب کی کوئی اُمید

کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیملٹ پہنے یہ نوجوان گزشتہ چند روز سے زہرا کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی زہرا ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی تو وہ اُس وقت تک زہرا کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرا سے پہلے زہرا کے ڈرائیور نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور اُس نے ایک آدھ بار ڈک کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زوردار ایکسیلیٹر کے ساتھ فرائٹ بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرا کی توجہ بھی اس جانب مبذول کر دائی، لیکن تو زہرا کو بھی ہوئی مگر اُس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرا نے خود گھر سے نکلنا کم کر دیا اور اگر کسی اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا تو وہ دن کے اُجالے ہی میں کام منٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے کی کرتی، لیکن اُس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اُسے ہوش تب آیا، جب اُس نے ایک قدرے دیران سڑک پر اُسی نیلے رنگ کی ہیوی سپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ زہرا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کیوں کہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی تھی اور اُسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اُس کی گاڑی کے پیچھے پھر سے بالکل چھوتے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرا نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ مگر فاصلہ بڑھنے کے بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرا کا پاؤں ایکسیلیٹر پر دیتا چلا گیا اور مر سڈیز کا بھرپور طاقت ور انجن اپنے وحشی زور کے بل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک مصروف سڑک پر موڑ کاٹنے ہی اچانک اشارہ سرخ ہو گیا تو زہرا سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ غلٹ میں لگائی گئی بریک نے مر سڈیز کے چاروں پہیے تو تارکول کی سڑک پر پیوست کر دیئے لیکن گاڑی کی بقیہ باڈی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بُری طرح جھول کر گھوٹی اور پیچھے سے آتی ہیوی بائیک زوردار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے دروازے والی طرف سے ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اُچھلا جیسے کسی توپ سے ٹکلا کوئی گولا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا! گاڑی کے اوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دم سے گر کر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اُس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ سوار نے کسسا کر اپنا وجود بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن کار رُکے رُکے بھی اس کی گھماں ناگوں کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اڑے اور زہرا جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زوردار طریقے سے اسٹیرنگ سے ٹکرا چکا تھا یہ سب دیکھ کر وہ ہیں بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی اور جب اُسے ہوش آیا تو رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ شہر کے معروف ہسپتال کے آئی سی یو میں اپنے پریشان والدین اور ڈاکٹروں کے جھوم میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ساحر کا جہاز بندرگاہ پر نکلر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر نے

اکو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ ضرور ساحر نے زہرا کے گھر پر بھی بٹے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اُسے کوئی تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرا ڈاکٹروں سے پہلا سوال اُس سپورٹس بائیک والے گھماں کے بارے میں پوچھا لیکن جواب میں اُسے کا انجینشن ملا اور زہرا اپنے سر میں اٹھتی ٹیوس سمیت پھر سے غافل ہو گئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب مری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرا کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے س کے آخری دورے سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا۔ لیکن زہرا کے لیے کا آخر بھی لکھا جاتا باقی۔ ایک نئی قیامت اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اُس کی گاڑی سے ٹکرا کر نکلنے والا موٹر سائیکل سوار موت و زندگی کے اس دورا پہ پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر تو زہرا کی روح ہی اُس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے پچھنے غائب تھیں۔ کار نے اس بُری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس امر پر انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کے باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اُس کے حال سے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرا تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی مذاقی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرا کی تیز رفتاری پر اچانک بریک تھی لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر نے بڑے متحمل تھے اور براہ راست زہرا کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ اُن کے بڑے خاندان رُز رُجے سے واقف تھے۔ خرم نے بھی پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرا کی تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتار کا عادی تھا۔ زہرا کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر زم کا خاندان جذبات میں آکر زہرا کے خلاف کوئی شکایت درج کر دیتا تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کتنی بھاری قیامت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں اپنے تیروں کا نشانہ بناتا، لیکن یہ اُن کی بھی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا بالاطرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر اگلے کے طرف کا بوجھا اٹھانا بھی نہ صرف ظرف والوں ہی کا خاصہ ہے۔ جی تو زہرا کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو اُن کا دکھ کوئی کیا ہے؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی، وہ تیز رفتار کا دلدادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم اُگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی زندہ دلی اور ہمت پر کہ اُس نے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد دھونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر اُس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی کوئی نہیں سنبھال پائے گا۔ لیکن ابھی کسی اور کے من آئینے میں دراڑ آتا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے

لے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے لیکن زہرا نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی کہ ماضی کے نہری دھاگوں سے نانا توڑنے کے لیے شہر والی کوٹھی چھوڑ کر مضامات والی حویلی میں بسیرا ڈالا جائے۔ پرانے لھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرا کے سامنے دو ہی اتے تھے کہ ساحر کو یہ سب بتا کر اُس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاموشی سے سب کچھ بہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آنے تک خود کو کہیں چھپا لے۔ بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ بڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر شے جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرا نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اس میں اُسے سب کا بھلا نظر آیا۔ لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرا کا سامنا ایک بار پھر ساحر سے ہوتا بھی تو اسی مقدر نے طے کیا تھا۔ ”میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرا کا خط تہہ کیا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں برقی بارش میں درگاہ کے صحن میں بیٹھا بیٹھتا رہا اور زہرا کی تحریر کے لفظ دھل کر صحن میں بہتے چلے گئے۔“ کاش میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی سچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے دھل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اسی مجذوب کی پیش گوئی گونجی ”تجھے خدا ہی ملے گا..... نہ وصال صمن.....“

کافیصلہ کر لیتی ہے تو پھر ہر عابد عا میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خرم نے پہلی تنہائی پاتے ہی زہرا کو بتا دیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اُس کی کوٹھی کے چکر کاٹا رہا ہے۔ خرم نے زہرا کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک بڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ زہرا کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن اُس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوندا اور پل بھر میں ہی سب بھسم کر گیا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اُس پہلی نظر کا انجام اُس کی ازلی معذوری کی صورت نکلے گا۔ خرم کی حالت حادثے کے دن سے لے کر اب تک بنتی بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طویل آپریشن نے اُس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن زہرا کو دیکھتے ہی اُس کے اندر پھر سے جینے کی خواہش جاگ اٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں خرم نے زہرا سے اُس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی بہر حال زہرا کو میسر تھی اور خرم نے ”نہ“ کا حق بھی اُسے تفویض کر دیا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ حق اور یہ ”اختیار“ خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ زہرا ابھی خرم کو یہ بتا بھی نہیں پائی تھی کہ اُس کی رُوح پہلے ہی ساحر کی راہ میں ملیں۔ بچھائے منتظر ہے کیوں کہ خرم کی بنتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرا نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرا کی سب سے بڑی مجبوری بنتی چلی گئی، کیوں کہ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں اُس کی اس حالت کا ذمہ دار خود ہی کو سمجھتی تھی حالانکہ کہ خرم نے خود اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد وہ خود کو کسی طور بھی زہرا کے قابل نہیں سمجھتا اور زہرا کے انکار کا اُسے صدمہ ضرور ہو گا پراچنہا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرا تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے وسیلے ہی سے پہنچے اور زہرا یہ چاہتی تھی کہ وہ خرم کو انہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اُس کی ”نہ“ کی وجہ خرم کی معذوری نہیں کوئی ”اور“ ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ اُن کہی رہ جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ زہرا انہیں کچھ بتا پاتی، خرم کی ماں نے اُس کی تازہ لمبی رپورٹ زہرا کے سامنے رکھ دی جس میں واضح درج تھا کہ خرم کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اُس کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اُس کا بیٹا اب زندگی کی طرف تھپی لوٹ پائے گا، جب اُسے دوسرے کنارے پر زہرا اپنا انتظار کرتی ملے گی، ورنہ خرم کا بخار اب اُس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی دن خرم کی مسلسل اور لگا تار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرا اسی شش و پنج میں تھی کہ ہسپتال سے خرم کی والدہ کے لیے جلد پہنچنے کا پیغام آ گیا کیوں کہ خرم کی سانس پھر سے اکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگ بھاگ ہسپتال پہنچے تو اس اتر حالت میں بھی زہرا کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہی خرم کو ماں سسک پڑی اور اُس نے زہرا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ زہرا نے روتے ہوئے اُن کے جڑے ہاتھ کھول کر اپنے مقدر کے کبھی دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔ زہرا کے والدین کے ہاتھ تو حادثے

دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے

زہرا کی تحریر نے ایک ہی پل میں میرے اندر کی ساری دنیا لپٹ کر دی۔ سیدھ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا مگر اس کا غند نے رہا سہا بھی سب اُلٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اس وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ میں آج تک جتنے بھی انقلابات رُو نما ہوئے ہیں، وہ سب اسی ایک لمحے کی کایا پلٹ کا کرشمہ ہیں۔ پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بد نصیب اس لمحے کا شکار ہو کر ہر سکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو پھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرا دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں میرے اندر یہ سوال شدت سے ابھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرا کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلایا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا۔ میں نے زہرا کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک نیا شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، چسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اُسی بے خیالی میں رقعے کی یہ کھولی اور اندر لکھی تحریر نے میری رُوح کا آخری ریشہ بھی اڑھڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبانے لگی ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“..... ”نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرا کی تھی۔ اُس نے دوبارہ وہی سطر میں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔“ ”سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو..... یوں تو پورا یقین ہے..... مگر.....“ میرے اندر کا شور بڑھتا گیا..... ”سو، تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“..... ”نظم تو اُن راہوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے.....“ تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا.....؟ ”ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں..... اُن خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے.....“ مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرا کے کول وجود میں پیوست کر دیئے تھے ”بس مجھ سے..... اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی..... تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں.....“ ”نفرت.....“ چار حرنی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی جھن چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اُسی لمحے ہوا تھا۔ لیکن نفرت، زہرا سے نفرت..... یہ اُس نے کیسے سوچ لیا.....؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر بہتی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سنے سج نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرا بھی تو یہی کر رہی تھی لیکن میرے

خواب، اُن کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ ساری رات میں برقی بارش میں زہرا کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے مسم میٹھا رہا۔ تیز بارشیں کا غند کی تحریر تو دھو ڈالتی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دُھلے ہیں۔ اگلی صبح کی پہلی اُجلی کرن کے ساتھ ہی بختیار اپنے چہرے پر زمانے بھر کے اندھیرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کا انداز بچپانی تھا ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کسی جھیلے میں پڑے بنا ہی میرے لیے دُعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی اور جانتے ہیں اب کسی نے سارہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اُسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ ”دیر“ بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو۔ اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سارہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نوجوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی تن دہی سے سارہ کی بے پنا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں پتلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اُس کا آج کل زیادہ تر وقت سارہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوبصورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔ اور دن بدن سارہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اُس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سارہ کو اُس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اُس نظر کو کھودے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اُس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر ٹال رکھیں تو اُس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بُری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں نکلے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے خود کو ساحل کی نم ریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں کچھ ہی دور میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر اُن کے گھر وندوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔ پھر مجھے ایک عجیب خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اُڑ جانے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے اُسے اُڑ ہی جانا ہوتا ہے، وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آواز کے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور دھنکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دُور ایک ٹیلے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اُس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے۔ اور وہ بوڑھا انہی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسی شرارتی ہجوم کی طرف تھا لہذا چلتے ہوئے اُسے ایک زوردار ٹھوک لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اُس فقیر کو اٹھانے کے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ایک گرج دار آواز آئی ”ہٹ جا میرے سامنے سے..... جو خ

گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے.....؟“ بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اُس نے زور سے اپنی دراز لٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے میرا جوداٹ گیا ہے۔ یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھا نہ ماہی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اُسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گمان کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھائی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا ”آپ..... یہاں..... کیسے.....؟“ مجذوب نے بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے ”فقیروں کے لیے زمین کبھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شاندار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے اُس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ ”آپ ہمیشہ آدمی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جو نبی غصے سے زمین پر بھگا، میں نے کسی متوقع گھاؤ کی امید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ لیکن وہ ہنس پڑا ”تو کیا سمجھتا ہے تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں۔ ضد چھوڑ کر عاجز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔“ ”میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے.....؟“ میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آگیا۔ ”بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہی نہیں، اُسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگا ہوں اور دیرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ اللہ کا بندہ بھی زخمت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔“ مجھے ایک جھکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اُونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔ ”ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی تو یوں بچھنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں.....؟“ مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔ ”لڑکے! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اُس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب فانی ہے۔“ میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اُٹا دیا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دُعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دُھند لے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں؟“ مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا..... ”فنا تو تو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔ ابھی بہت کام اُدھورے پڑے ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں۔ اتنا بے بس دلا چار، میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا، لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو فک کر زمین کو بھر کر گیا۔ مجذوب قدم اٹھا چکا تھا، لیکن میری بھیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اُسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا ”روتا کیوں ہے بچے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلانے گا.....؟“ پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی رُوح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب

ہے یوں چپ کر رہا تھا جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس پاس سے گزرتے لوگ رت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچاننے کی دشواری ہو رہی ہوگی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون.....؟“ میں نے کہا تھا نا، تو بہت بدی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہوگی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ تا تیری راہ نکتا ہوگا اور ایک بات یاد رکھنا۔ تو جس خدا کو ان درگا ہوں اور دیرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ بڑے اندر موجود ہے۔ تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو ریافت کر..... تیری اسی دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی نوکریں کھائیں۔ پر تو آخر کار پھر وہیں آٹھرا، جہاں سے چلا تھا.....“ میں ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب بی بی دُھن میں نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے جب میں درگاہ پہنچا۔ ”تو مولوی خضر پریشان سے، میری تلاش میں نکلنے ہی کو تھے۔“ کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو۔“ ”کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔“ مولوی خضر چوکنے ”کوئی خاص بات.....؟“ میں نے انہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر بہت اریک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ ”مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔“ بتائیں نا، ان درگا ہوں کا اسرار کیا ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں ملے ہے.....؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہم ان دیرانوں میں رہ کر خدا سے دُور ہو رہے ہیں یا اُسے پارے ہوتے ہیں.....؟“ مولوی خضر کچھ دیر تک میرے چہرے پر جیسے کچھ ٹوٹے رہے۔

”رہبانیت کی حدود ہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی کڑی دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال بنا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اُس کے بندوں کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔ سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔ ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس تنہائی ساری تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اولیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا۔ وہ اللہ کے انتہائی قریبی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگا ہیں اگر مستند ہوں تو بس اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہ ہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اعجاز بھلا کسی مقبرے کو کہاں.....؟ تقدیر صرف دُعا سے بدل سکتی ہے اور کون جانے کہ ان درگا ہوں پر مانگی گئی وہ دُعا کس جو قبولیت کا شرف پا گئیں وہ اُس کامل یقین کا انجام ہوں، جو دُعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھہرے مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا دیرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ ہجوم میں دل سے دُور..... وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی

میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ”ذرا دیکھو تو..... ان درگاہوں کی آڑ میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا ہے.....“ ”ہونہہ! حلیہ تو بڑا مذہبی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھ ہے۔“ ”توبہ ہے بھئی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“ ”یہ شخص تو زنا کا فرہے۔ ماتھے پر خراب سجائے ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرتا ہے۔“ ”اے تو سنگسار کر دینا چاہیے..... یہ ایمان کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔“ میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینا چاہیں لیکن کان بند کر لینے سے رُوح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا تو میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھر دے کہ دنیا کی سبھی محبتیں جھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھورے مجازی عشق کو مکمل جنون میں بدل دے تاکہ خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دودھاری تلوار پر نہ چلا میرے رب ج بھی بخشا ہے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدھی دنیا میں سے کسی ایک تو مکمل کر دے۔ ورنہ یہ آدھے جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں اپنے بقیہ نصف کے حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر دینا چاہیے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جان نشینی کا تاج اور درگاہ کی ذمہ داری کے اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بد نصیبی کی یہ تھی کہ نہ میں ساحر ہا اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ رہنے دیا اور زہرا کی محبت نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا۔ لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی آج اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پاسکتے۔ بیک وقت دونوں حدود کو اپنے میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جب کہ دونوں ہی معاملوں میں اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کمزور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نااہل ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیتی۔ کہنے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو ڈھونڈتا رہتا، اگر بختیاری کی آواز میرے خیالات کا تسلسل توڑ نہ دیتی۔ ”کہہ کھوئے ہوئے ہیں جناب! دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں.....“ سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیاری کی آمد کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اکتا سے جاتے ہیں، تب اس میں کسی تیسرے آئینے کی موجودگی، ہمیں خود اپنی شبیہ سے چھڑکا کر دلا جاتی ہے۔ لیکن خود بختیاری کا کچھ کرچی کرچی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے نہایت پریشانی اور ڈھکی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اُس نوجوان مجھ ساز نے سارہ کی جزاؤں آنکھ کی پتلی ڈھونڈ لی ہے اور اسی ہفتے وہ سارہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی ہے۔ سارہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مربی بختیاری کو بھی دیکھ سکے

طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے.....“ میرے اندر چلتے سوال باہر آنے لگے..... ”تو پھر میں اُسے اپنی شرک سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اُسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھاننا پڑ رہی ہے.....؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔“ ”نہیں میاں! یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے۔ سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے۔ تمہارا رستہ زہرا کے گھر کی پگ ڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشق مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے تو قدرت چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے۔“ مولوی خضر جاتے جاتے رُک گئے اور پلٹ کر بولے۔ ”تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر اُدھار رہا۔ ہم اپنی درگاہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں، وقت آنے پر حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی..... اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھر بن میں مبتلا رہا کہ میں زہرا کی تلاش میں عشق حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبداللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبداللہ کو دو غلطیوں کا طعنہ دیتا تھا کہ بظاہر اللہ کی راہ کھوجنے والا اب بھی اُسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اُس کی شناخت چھین کر اُسے عبداللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبداللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبداللہ کی راہ کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرا نہیں ملی تو اس میں عبداللہ کا کیا قصور.....؟ اگر ساحر، زہرا کو نہ پاسکا تو اب انشاءً عبداللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچھائے.....

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ میرے اندر وین اور دنیا میں نئی ہوئی یہ دُہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرا کی محبت کا حصول تھا تو یہ کند توبہ بام ہی ٹوٹ چکی لہذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رُخصت ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر اس سال مہر سے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا تو اب اُسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرا کو نہیں پاسکا مگر عبداللہ بھی تو زہرا کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ”مات“ اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر بنی تو ”جیت“ عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا نشان بن چکے ہیں۔ اور دونوں کی بیک وقت موجودگی اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمتے نہیں دے گی۔ زہرا کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پراڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کی کسی رُسوائی کا سبب بنے مجھے اس شہری سے کہیں دُور چلے جانا چاہیے کیوں کہ میرے دل کا معاملہ زیادہ دیر تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھلنی کرنا ہی جانتی ہے۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے سب تضا ہو گیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے درگاہ لوٹ آیا، جہاں مولوی خضر پریشانی کے عالم میں نہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے ”خرم کے گھر سے پیغام آیا تھا مایاں! اُس کی حالت گزشتہ رات سے کافی ابتر ہے۔ جانے اُس کے ذہن میں یہ بات کیوں سا گئی ہے کہ وہ اگر صحت یاب ہو گا تو صرف تمہاری مسیحا سے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانا چاہیے۔“ میرے ذہن میں مجذوب کی آواز گونجی ”وہ صرف ایک بد دعا کی دوری پر ہے.....“ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اچانک درگاہ کے دروازے سے خرم کی ماں بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔ جانے کیوں اُن کی حالت دیکھ کر میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہو گیا۔ خرم کی والدہ میری جانب لپکیں۔ ”جلدی چلو، عبد اللہ بیٹا..... خرم کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ میرے بچے کو اب صرف تم ہی بچا سکتے ہو۔“ میری نظر مولوی خضر کی نظر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا، مجذوب کا انڈیشہ لگوٹا لوری اہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔

جس نے اُس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اُنچلی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی سارہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اُسی طرح اُس کا تمسخر اڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اڑاتی رہی ہے۔ میں نے قتل سے اُس کی ساری بات سنی۔ ”مجھے افسوس ہے اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لہذا اگر میری دُعا میں خدانے کوئی تاثیر رکھی تھی تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی چاہیے۔“ بختیار ہکا بکا سا رہ گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پہ پہنچ کر پھر سے رخت سفر کیوں باندھ رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدارا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”کچھ لوگوں کا مقدر سدا مسافت ہی رہتا ہے۔ اُن کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا ’فریفتہ‘ ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیر میں کھو جانا ہے۔“ جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا ”کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں۔ اور آج آپ سے ایک آخری دُعا کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دُعا بھی نہیں کریں گے.....؟“ میں نے ہتھیر ڈال دیئے۔ ”مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ دُعا صرف انسان کے اپنے کامل یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی.....“ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا ”آپ دُعا کریں کہ میرا رقیب مرجائے.....“ میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کسی کی موت کی دُعا کیسے کر سکتا ہوں؟“ بختیار رو ہانسا ہو گیا۔ ”تو پھر آپ یہ دُعا کریں کہ سارہ کو بصارت ملنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ آپ نہیں جانتے، رقیب لفظ کی دھار ہی کسی دل جلے کے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی دوسرا عذاب ہے۔“ میں چونک گیا۔ میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہر کی کڑواہٹ سے آشتاء، مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہمارے طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں تک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اُس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کر دادی کہ مجھے اُس کے لیے کوئی ”منت“ مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”گویا تمہاری دُعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔“ میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا ”کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دُعا سن لے گا۔ جب کہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دُعایں خود مسائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آکر دُعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہِ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھادیتے کہ اسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکھٹ پر بھی ہاتھ رگر گریں گے تو خدا اُن کی ضرورت سنے گا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگاہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔“ ٹھیک کہتے ہو میاں..... لیکن اگر ایک شخص اتنی دُور چل کر، اس اُمید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ تم اُس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اٹھا کر اللہ

”کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا“

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کبھی باتوں کی بازگشت نے گھیر رکھا اور پھر خرم کے سرہانے زہرا کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اُس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا طبی تشخیص کے مطابق حادثے کے بعد اگرچہ خرم کو فوری طور پر آپریشن تھیز پہنچا دیا گیا تھا، لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھایا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم دن بدن ٹھہر رہا تھا اور اس کا ہر چوہیں گھٹنے بعد پلٹنے والا بخار اب دن رات مستقل اُس کا وجود بھٹکانا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی ہی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ اُن کی آخری اُمید بیرون ملک سے منگوائی گئی ایک خاص دیکسین تھی، جو اگلی شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود خرم اپنی ہر اُمید تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اُس کے جلتے بدن اور کٹتی رُوح کو اگرچہ چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی تو وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند مخصوص آیات پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دیں اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ کچھ بلّا کے لیے اُس کی انگارہ سانسوں کو قرا سائل کیا۔ میں بغور اُس کی حالت دیکھتا رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ..... تم میرے لیے دعا کرو گے نا۔“ ”تمہاری جینے کی خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسے کی ضرورت ہے۔“ اُس نے سر جھکا ”نہیں..... مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحائی کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دُور کہیں میری رُوح سے جڑے ہو۔ کچھ نا تو تم سے ایسا ضرور ہے جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے درد کی ہر دوا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اس بار بھی تم نے میری مسیحائی نہیں کی، تو میں مرجاؤں گا۔“ خرم کی بات سن کر اُس کی ماں رو پڑی۔ میری نظر اٹھی اور زہرا کی ڈبڈبائی نظر کا سارا ترش نمک میرے حلق میں اُنڈیل گئی، پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔ درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں صحن کے چوبارے پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ”کہو میاں، کچھ آرام آیا تمہارے مریض کو.....؟“ ”آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا۔ آخر اُن سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ میں

ی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔“ مولوی خضر نے غور سے میری نِب دیکھا ”جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی دعا نہ دینے کا مطلب بد دعا دینا بھی ہو جاتا ہے۔“ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرا مجھ سے صرف ایک بد دعا کی دُوری پر ہے۔ نہیں، یہ وہی بد دعا تو نہیں۔ یہ کیسا ستم ہے کہ قدرت نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے کا رکھ چھوڑی تھی۔ اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کر دی گئی تھی۔ بھلا وہی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے پوترے پر ہاتھوں کا نکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دھندلا ستارہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری دُھند تھی اور وہ وہی اک نیا دُھندلا جہاں بانہیں بیلانے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے صحن میں طزم بنا کھڑا تھا اور میری فرد جرم بڑھ کر نائی جا رہی تھی ”یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب لیا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے لیکن اس کا اندر شدید آلودہ اور کالا لک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں مگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی چاہت میں در بدر ہے۔ یہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے اور بس مقدس چار دیواریوں کے بیچ بھی بس اُسی ایک چہرہ کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے سب ہی سرد گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے اٹار ہا۔ اس کا دل کبھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔ تو بولو، ایسے گھناؤنے جرم کی سزا کیا ہونی چاہیے؟“ سارا مجمع چلانے لگا ”اسے سنگسار کر دو۔ اسے مار ڈالو۔“ چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر خود کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ ”نصہرو، مجھے مت مارو..... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کیا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی اعلان بزرگیت نہیں کیا، پھر مجھ سے پاکی دامان کا تقاضا اور اُمید کیوں.....؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اس گناہ محبت کے داغوں کو کھرچا نہ جاسکا تو اس نہ روا دیا کیوں؟ ایک بے اختیار کوسزا کیوں؟“ میں یوں ہی چلاتا رہا اور تب ہی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سویرا ہونے کو تھا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی اُبھرتا جو دلوں کے اندھیرے دُور کر پاتا۔ دن چڑھے بختیار بھی آپہنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے آتے ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ نے کیا فیصلہ کیا.....؟“ میں نے اُس سے پوچھ لیا ”کیا محبت خود غرض بھی ہو سکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔“

اختیار میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اٹھا۔ ”سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہیٹھ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں..... کہ محبت کے بنا بھی تو صرف فنا ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روزمرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند پل جینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اُسے کسی رقیب کی بھیٹ کیوں چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لیے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کمزور جذباتی لمحے کی نذر ہو کر برباد نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہوگی۔“ بختیار اپنی دھن میں گتہ جانے کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں.....؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لیے بھی قدرت کے کشکول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے ہاتھوں لکھ دیا گیا ہے تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُر امید لگا ہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ بختیار پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی، جیسے واقعی میری دعا ہی اُس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہو سکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامراد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو بختیار سے رہا نہ گیا۔ ”آپ نے میرے لیے کیا مانگا۔“ مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔ ”میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے..... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایثار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کاندھوں پر رکھ دے۔“ بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گیا، جو اپنا کھلنا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بہلاوے میں آکر روتا بھول جاتا ہے لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح چل رہا تھا اور کسی بہلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کوئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اُس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اُس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی مان اتنا ہم ہو سکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہرا کو دیتا۔ اس کش مکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیئے اور جب میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا تو صحن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور اُن کی تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش تب آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں بھگوئی بیٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے حجرے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر

اٹھنے کی کوشش کی تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا۔ ”لینے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔“ میں کسماسیا۔ ”لیکن.....“ مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ”اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں لیکن تم اُس وقت ہذیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر انہی کا ڈرائیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔“ میں نے بولکھار کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ”میں کچھ زیادہ ہذیان تو نہیں“ ”نہیں..... وہ کچھ نہیں سمجھیں..... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہر حال، وہ نامراد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔“ میں نے ہلکے کر نیکی سے سر نکا دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ سے لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کمزور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی اُن ہوئی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کش مکش بھانپ گئے۔ ”خود سے اتنا نہ لڑا کرو عبد اللہ میاں! دل پھٹ جائے گا تمہارا۔ سب اُپر والے پر چھوڑ دو۔“ لیکن کاش، یہ کلیہ میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے تو لڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کسی کو نیند کی صورت اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیر اثر تھک ہار کر پلکیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے زکے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر حجرے سے نکل کر باہر گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ”ساحر۔“ مجھے یوں لگا جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی گہرے پانیوں کو کاٹی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اُس آواز کو میں لاکھوں کروڑوں کے جہوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرا کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سنہرا سپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سر ہانے کھڑی تھی..... ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے زمان و مکان کی ہر حرکت رک سی گئی۔ میری نظر اُس کی بھیگی نظر سے ٹکرائی اور مقصد حیات تمام ہوا۔ اس کے یا قوت لب پھر سے ہلے۔ ”ساحر..... آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اُس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا پنا آپ مٹا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر اُبڈبائی ہوئی کیوں تھی۔ اُس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور حجرے سے باہر درگاہ کے صحن میں بھی کسی عورت کی دبی دبی سی رونے کی آواز آرہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ ان ہوئی پیش تو نہیں آگئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ”عبد اللہ میاں..... زہرا بی تمہیں لینے کے لیے آئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ اُمید اپنے آخری دم پر ہے۔“

باہر محرم میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملائے بنا حجرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے ایسے کسی بد نصیب گھائل کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں پانی کی بچی ہوئی، آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہو اور جب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جان بہ لب بد نصیب کی نظر سے زہرا کی جانب دیکھا۔ اُس کی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تھا خاضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے خنجر کی چمکتی دھار کو اپنے جگر کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ لبوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرا کپکپاتی آواز میں بولی ”آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں اُن سے کہتی ہوں کہ.....“ ”زک جاییے..... قیدی اگر تختہ دار تک نہ جاسکے تو پھانسی ملتوی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ اندر سے آتی ہوئی آہٹوں کی آواز سن کر خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سمیٹنے پڑا رہا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے بکھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑ گئی تھی کہ اُسے میری دعا ہی سے مسیحائی نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا جو کھلتا نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ سورج کبھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سر ہانے بڑی چھوٹی میز پر در آمد شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اُسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اُس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُس کے پریشان کھڑنے والدین کی طرف دیکھا۔ ”دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک آ گیا ہوں اور اوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں۔ خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔“ خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے کبھی ان باتوں پر اعتبار نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے لڑ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان امتحانہ باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین

بیمین اور تمام قابل ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی تھی لیکن سر شام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہی ہے۔ سن لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔“ مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کس مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے۔ ”مجذوب.....“ خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔ ”ہاں..... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو گئے تھے، وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں انا بیٹھا تھا۔ اُس نے خرم کو دیکھتے ہی بنا اُس کی بیماری یا تکلیف جانے بغیر فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہوگی۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ اُس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔“ میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اُس مجذوب سے ملی تھیں؟“ ”یہ اُسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب کبھی دکھائی نہیں دیا۔“ میرے وجود میں بیک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہرہ تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سہائی کہ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکی سی لی اور اُس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے تسبیح ختم کر دی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ”اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سر ہانے آ کر ایک دعا پر ہی ختم ہونا ہے تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے خدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔“ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہاتھ نضا میں بلند کر لیے۔ ”یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کمزور اور ناشکرا بندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ تو نے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا یقین کامل پیدا کیا ہے تو اب تو ہی اس دعا کا پردہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ..... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا۔ تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بخوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ، تجھے اس ستر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدقے اس مجبور ماں کی بھی سن لے جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سرگردانی پھرتی ہے۔ اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدقے مجھ جیسے عاصی کی دعا سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دُور فرما کر اسے شفا عطا کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دنیا پرست اور گناہوں سے لہڑنے انسان کی

اس کی عقیدت کو اتنا اتنا اس کیسے جانا۔ اُسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے جو میرے بقول اُس سے میرے حصے کی نظر چھین لے جائے گی۔ اس کے اس فیصلے نے جانے کیوں پر مجھے بہت رلایا۔ میں اور سارے بہت دیر تک روتے رہے۔ لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔“ بختیار نہ جانے کیا اور کیا کچھ بتاتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی انک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خود غرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے بختیار پر رشک آ رہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خود غرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خود غرضی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور دوپہر تک اُس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے در آمد شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے۔ لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا۔ اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملتا تھا۔ کتنا شاندار وار پلاٹ بنایا تھا اُس نے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو، خرم کے والدین کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ ”اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر سہرا سجاؤں گی اور آپ سب کو آنا ہوگا۔ اور عبد اللہ تم بھی تو میرے بیٹے ہونا، تو تمہیں خرم کا شہ بالا بننا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا، دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔“ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ اُن کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رتھاں تھے۔ اُن کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ ”میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبد اللہ کو منتخب کر لیں۔“ میری آواز آنسوؤں سے بندھ چکی تھی۔

مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”ٹھیک ہے اگر یہی رضائے خداوندی ہے تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو شہر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“ ”جو آپ کا حکم۔“ میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا۔ ”اور ہاں عبد اللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر۔ تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا امیراں دہگاہوں اور ویرانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو تو شہ رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اُس

تمام خامیاں اور کمزوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں لیکن تیری رحمت اور تیری لازوال عطا کسی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا رحم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔“ میں دل ہی دل میں گڑگڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رخصت طلب کی۔

ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر کمرے سے نکلے نکلے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آگئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس، عبد اللہ، ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ جیتے رہو، آباد رہو۔“ مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس بارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھے گیا، جو اپنی آخری جمع پونجی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی بھینٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا، حتیٰ کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر درسی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری ”میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے قریب پڑا کھس شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آگیا اور پریشانی سے بولا ”یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔“ ”ہاں..... شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ لیکن آج ماشاء اللہ آپ کا چہرہ خلاف معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہوگئی ہے۔“ بختیار نے فرط عقیدت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے حصے کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سارے نے آپریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا ”کیا.....؟ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا.....؟“ ”جہاں نہیں۔ آپ شاید اسے میری شدید خود غرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت سے زیادہ خود غرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہوگا بھی نہیں۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خود غرض نہ ہو۔ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سارے نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں تو میں اُس کے سامنے خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رو پڑا۔ وہ پریشان ہوگئی اور مجھے اسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سارے کو کھو دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بد صورت ہوں۔ یہ سن کر تو وہ پہلے ہکا بکا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رو پڑی کہ میں نے

شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی شادی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، رہبانیت سے بچو گے تو دنیا پرستی کا الزام لگائے گی اور دنیا داری سے دامن چھڑاؤ گے تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضا مندی کے لیے اپنایا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اور ہاں، عبد اللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو تمہارے نصیب کا جوڑم تک پہنچ کر رہے گا۔ اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔“ سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دھند میں گھونگی۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغام رسانی کے ذریعوں میں سے ”ایک“ مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر متشکر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بنا زہرائی کے میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دیے۔ شاید وہ تمام انتظامات کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ مہ پہر تک میرے بعد والد عبداللہ، نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا ان درو دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شناسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبد اللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبد اللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے پلت جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اور پھر خضر کے وقت وہ سواری بھی آچکی جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیض و غلبہ کے ساتھ۔ لیکن آج ان کے لبوں پر ایک عجیب ہی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے گلے لگا لیا۔ ”کیوں بھی نوجوان..... واپس چل دیے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر دیکھو..... ہم خود تمہیں رخصت کرنے یہاں چلے آئے۔“ میں خاموش رہا لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں کیوں کہ ان کا ہدایت دینے کا انداز اور ان کی ہر معاملے پر ہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رخصت ہوئی، کیوں کہ میں مہماور پیا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور ان کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ ’وداع‘ بھی میرے لیے کسی خنجر کی طرح تھا۔ رُوح میں پیوست ہونے والی دھار..... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔“ ”جار ہے ہو میاں! چلو ٹھیک ہے، تمہارا استقبال کرنے والے بھی آچکے ہیں۔ اور ہاں..... گھر پہنچ کر اس رقعے کو کھول کر پڑھ لیتا۔“ انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لفافہ تھا، جس کے ارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مہما کی آواز ابھری ”ہم آگئے ہیں بیٹا.....“ میں نے

کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ، ویرانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھیڈ بھی بتا: ضروری ہو گیا ہے۔ میں..... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم..... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبد اللہ، حاکم یا سلطان تعینات نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اترا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا۔ درگاہ سے پھانسی گھاٹ، پھر یاقوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ”خدا کا تعارف.....“ اُس کے بندوں کے ذریعے۔ اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بخوبی نبھایا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے..... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔“ مولوی خضر پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں چوڑے پر ڈھسے سا گیا۔ وہ اگر میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن جسے میں نیند سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جاگنے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معما ہی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں۔ اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہی مہربان لمس محسوس ہوا جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں! وہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی ملیح سی مسکراہٹ، وہی مہربان احساس۔ میں رو پڑا ”کہاں چلے گئے ہیں آپ..... آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبد اللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔“ وہ مسکرائے ”اچھا تو گویا عبد اللہ اپنے سلطان بابا سے رُڈھ گیا ہے، لیکن میرا ساحر تو مجھ سے خفا نہیں نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟“ ”آپ جانتے ہیں کہ عبد اللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی۔ پھر آپ نے میرے اندر کے عبد اللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبد اللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟“ ”تمہیں ایسا لگتا ہے کہ عبد اللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فحاشی دوسرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر آدھا ساحر اور آدھا عبد اللہ بستا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف پیغمبر کا نصیب ہوتی ہے۔“ میں سسک پڑا ”تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں۔“ سلطان بابا پھر سے مسکرائے ”بس..... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مردوزن کی آپسی کشش فطرت کی طے کردہ ہے۔ میں..... تم..... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی رشتے کی پیداوار اور نتیجہ ہیں۔ ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندھن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاہد یا متولی کی

میکانی انداز میں گردن گھمائی اور پھر مہاپا کے ساتھ وہیل چیئر پر بیٹھے خرم اور اُس کے والدین کو ساتھ کھڑے دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ ”آپ سب یہاں.....؟“ تب خرم نے اپنی وہیل چیئر دھکیلی اور میرے قریب آگیا۔ اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ”واہ میرے میچا! ساری مسیحائی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کسی مرسلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائیں تو اُن کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ساحر۔“ خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے مہاپا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرا کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اُس کے والدین پر یہ بھید ہرگز نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار اُن میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں نبھایا تھا۔ خرم میری نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ”نہیں..... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور اُن کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا۔ اگر کل سہ پہر یہ تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔“ خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زیر لب دہرایا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....“ پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھ گئے، میرے نام پر اپنی انگلی رکھ دی۔ ”یہ نظم تمہاری ہے نا ساحر..... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر..... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے.....“ میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دوپہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا تو کئی دنوں کی اکٹھاٹ آمیز جھکن اُتارنے کے لیے اُس نے اپنی ماں باپ سے کھلی نفضا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا لہذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرا کی حویلی میں اُتار دیا جائے تاکہ وہ زہرا کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کا اُردو ادب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُردو ادب زہرا کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اُس کی کمزوری ہے، لہذا اُس نے زہرا کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اُٹھائی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اُس کی گود میں جاگرا۔ خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرا کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اُس سے پوچھ لیا کہ یہ ”ساحر“ کون ہے؟ یہ سوال زہرا کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے چہرے کے بدلنے رنگ نے خرم کے تجسس کو ہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جاسکتا تھا، بھڑتی چلی گئی۔ زہرا نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی۔ لیکن اگر بات ختم ہی ہونا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اُٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری

کتاب کیوں نہ اُٹھائی؟ کچھ مسودے قدرت صرف خالص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرا کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبد اللہ ہے، جو گزشتہ رات خرم کی مسیحائی کے لیے اپنی شدید اہتر حالت کے باوجود اُس کے سر ہانے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرا نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اُجالا ہونے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں اس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو۔ لیکن یقیناً جانو..... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔“ میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں۔ ”ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔“ خرم کی والدہ آگے بڑھیں۔ ”نہیں..... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبد اللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرا تمہاری امانت تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جاتی تھی اور اب عبد اللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری ماما سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔“ انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مہاپا میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے گرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بانیٹھکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پل بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے زوٹھے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جائے گی۔ زہرا کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پپانے میری نظروں کا مفہوم جان لیا۔ ”زہرا ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا..... وہ نیچے ساحل پر ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں لہذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرا کا ساتھ چاہتے ہو۔“ خرم نے مجھے سمجھوڑا..... ”جاؤ عبد اللہ..... دیر نہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو جو کئے نہ دینا۔ بہت زخم کھالے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم..... جاؤ تمہارا امر ہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے.....“

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چھتا ہے، وہی اُس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبد اللہ..... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے تو شاید یہ نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخرو

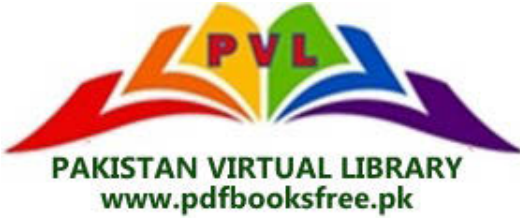
کھڑے ہو تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ، تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ”ہم سے رخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں..... جانے پھر کب ملاقات ہو.....؟“ میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری رخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرا کے نام کا تقدس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کا فرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گا۔“ حاکم بابا بولے۔ ”جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے..... اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے.....“ میں اُن کی بات سن کر رو ہانسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاکم بابا بولے۔ ”مولوی صاحب..... بہت ستایا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔“ مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ”عبداللہ میاں..... تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خالی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لفافہ جواب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہو.....“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے غلت میں اپنی جیب سے وہ لفافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے ویسی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی، جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبداللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پرچی کھولی تو اس میں میرے ہی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام..... اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے عبداللہ..... تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا.....“ میں اپنی آواز سے جھپکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ ”گو میاں اب بھی عبداللہ ہوں..... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا.....؟“ مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبداللہ صرف درگاہوں اور دیوانوں ہی میں نہیں..... زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کو حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی اور یہ دونوں فرضات تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، اُن کے لیے ضرور کرنا۔ جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جت جاؤ تا وقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا امر اسلٹل جائے۔ ہم تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود رہیں گے.....“ حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبداللہ) نے فردا فردا مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ہی ساحل کی جانب چل پڑا۔ ماما، پاپا، خرم اور اُس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رُک گئے اور میں لرزتی دھڑکن لیے دُور ڈوبتے سورج کے پیش نظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرا کے قریب پہنچ کر کچھ

کے فاصلے پر رُک گیا۔ کہتے ہیں کچھ لمے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جن کا انتظار خود ”وقت“ کرتا ہے۔ بے قدموں کی آہٹ سن کر اُس ”ماہ تاب منتظر“ کی پلکیں اٹھیں اور پس منظر میں دو تباہ سورج ایک لخت پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری نبض چل رہی تھیں۔ میں نیند تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے جگ گیا تھا۔ زمین پہنے لگی تھی یا سمندر ات ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرا کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے کو دمکار رہی تھیں۔ یا یہ زہرا کے چہرے کا نور تھا جو ان کروں کو مزید اجال رہا تھا۔ ہم دونوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی لہروں نے ہمارے خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراہٹ نے اُن کے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیئے۔ زہرا کی آنکھوں نے کہا۔ ”آپ آگئے ساحر..... میں کب آپ کی راہ دیکھ رہی تھی.....“ میں نے بند لہروں سے جواب دیا۔ ”میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا..... آپ راہ کی دھول بن کر..... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دھول.....“ اُس کی گھنیری پلکیں تڑپ کر جھپکیں لیں..... آپ میری راہوں کی دھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کاجل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کبھی منزلیں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔“ ہم باہر بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اضافی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھللاتے سمندر کا عکس ہماری پگلوں سے جھٹک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دُور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اُسے یہی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست بھلائی کی باتیں کیا جانیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرزِ تکلم اور مخاطب کی خوبصورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب محوِ سماعت ہوں تو بھی کمالِ خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اُس لمحے وہ لپ پری۔ اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی کی آنکھیں، جھپکتی پلکیں، جبین پر پسینے ندیں، لرزتے بند لب اور کسی کی خم کھائی زلف کا بل بھی تو ہماری اُن کئی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔ زہرا بھی اس وقت مجسمِ سماعت تھے، ہر اُس اقرار، ہر اُس بیان کے لیے، جو ہم نے لبوں سے ادا نہیں کیا تھا۔ ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دُور ٹیلے سے ماما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ ”..... دیر ہو رہی ہے بیٹا..... چلو گھر چلیں..... میں نے زہرا سے کہا.....“ چلیں سب لوگ ہمارا انتظار ہے ہیں.....“ اس ناز آفرین نے پہلا قدم اٹھایا، لیکن میں رُک گیا۔ لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھائیے گا اللہ کی مسافیتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں..... تھک تو نہیں جائیں گی.....؟“ میرے سے مسکرائی۔ ”ڈر رہے یا تنبیہ کر رہے ہیں.....“ میں بھی مسکا دیا۔ ”صرف اپنے نصیب کی جلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔“ تب زندگی میں پہلی مرتبہ، زہرا نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں مانکا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ”اب جو عبداللہ کی راہ ہے..... وہی زہرا کا راستہ ہے..... جب مقدر جڑ

جائیں تو نصیب کی گرحیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں۔ آپ زہرا کو ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔“ ر
دور سمندر کے اس پار اُفتخ پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے اور زہرا میرے پیچھے چل
پڑی۔ میرے نقش پا پر اپنے نازک قدم دھرتی..... پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ
لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔ ”نئی مسافتیں..... نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست..... آ۔
والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام..... اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع..... الوداع
عبداللہ..... الوداع.....“

(ختم شد)

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش



مزید خوبصورت کتابیں اور ناول پڑھنے اور مفت ڈاؤنلوڈ کرنے کے لئے
ابھی وزٹ کریں۔ پاکستان کی سب سے بہترین آن لائن لائبریری۔

www.pdfbooksfree.pk